جنوری 2016
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
سالِ نو نمبر

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

جنوری 2016

جلد 30 شمارہ 5

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: ۲۰۱ سی ای بی، ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ جمیل

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری کا شعاع آپ کے ذوق کی نذر ہے۔
روشن دن، رات کے اندھیروں میں غروب ہوتے گئے اور کوچۂ روز و شب سے ایک اور سال دبے پاؤں گزر گیا۔ وقت کا تند و تیز ریلا ہر چیز کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ ہر لمحہ ایک نقش تازہ بناتی زندگی۔ حساب لگانے بیٹھو تو ایک عمر اور سوچو تو پلک جھپکنے کا وقفہ۔ یہ بھاگتی دوڑتی زندگی رکتی ہے نہ رُکنے دیتی ہے۔ ایک عمر گزار کر بھی اس کی حقیقت نہیں کھلتی، نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ آغاز بھی حیرت ہے انجام بھی حیرت۔ اس حیرت کدہ میں نہ آنا اپنے اختیار میں، نہ ٹھہرنا اپنے بس میں۔ بس ایک مہلتِ عمل ہے جو ہمیں دی گئی ہے۔ انسان حال میں زندہ رہتا ہے۔ ماضی محض ایک یاد، ایک حسرت، خواہش اور پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے جبکہ مستقبل پردۂ راز میں ہے۔ ہم اسے نہیں جان سکتے۔
گزرے وقت میں اگر کچھ ناکامیاں، غلطیاں ہوئی ہیں تو اسے حسرت یا پچھتاوا نہ بنائیں۔ جو کھو دیا اس پر افسوس بے کار ہے۔ جو وقت گزر گیا اس پر پچھتاوا فضول ہے۔ ہاں اگر کسی غلطی کی تلافی ممکن ہو تو ضرور کریں۔
دو دہائیوں کے بعد سال گزشتہ وطن عزیز کے لیے کئی حوالوں سے بہتر سال ثابت ہوا۔ خصوصاً امن و امان کی صورت حال کافی حد تک بہتر رہی۔ کراچی میں آپریشن کے بعد دہشت گردی اور قتل و غارت میں نمایاں کمی ہوئی۔
بہت سی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ ایک نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔
آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔
ہماری دعا ہے نیا سال صرف ہندسوں کی تبدیلی کا نہیں، حالات کی تبدیلی کا بھی سال ہو۔ ہم سب کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- شفق افتخار کا مکمل ناول۔ خاک نشیں،
- حرا بتول کا مکمل ناول۔ ابرِ رحمت،
- صدف آصف اور صائمہ اکرم کے ناولٹ،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- شازیہ جمال طارق، ایمل رضا، مصباح علی، تسنیم شریف اور بنت سحر کے افسانے،
- نیا سال آیا ہے۔ نئے سال کے حوالے سے معروف فنکاروں سے سروے،
- تقریب کچھ تو بہر ملاقات۔ قارئین سے سروے،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ نیا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

جو مالک ہے سب کا وہ مالک ہے میرا
اسی نے بنایا اُجالا اندھیرا

وہ سارے جہانوں کا واحد خدا ہے
وہ مشکل کُشا ہے وہ حاجت روا ہے

اسی نے بنائے چمن زار سارے
اسی کی ہے تخلیق چاند اور تارے

زمیں آسماں بھی اسی نے بنائے
وہی سخت مٹی سے سبزہ اُگائے

وہی زندہ رکھتا وہی مارتا ہے
ہو ظاہر یا باطن وہ سب جانتا ہے

نہیں کوئی کام اس کی حکمت سے خالی
ہے معروفِ حمد و ثنا ڈالی ڈالی

اسی نے زمیں میں خزانے چھپائے
باذنِ خدا ہر کلی مسکرائے

ریاض حسین قمر

غمِ دل سے رہائی مل گئی غم آشناؤں کو
نوا بخشی مرے آقاؐ نے آکر بے نواؤں کو

عرب کے ریگزاروں کو گل و گلزار کر ڈالا
معطر کر دیا ہے آپؐ نے ساری فضاؤں کو

دلِ انساں میں توحید کی شمعیں جلائی ہیں
اُٹھا باہر کیا کعبہ سے پتھر کے خداؤں کو

کریں گے ہم پر سایہ وہ شفیع المذنبین بن کر
سُنیں گے حشر کے دن اُمتی کی التجاؤں کو

نہ کوئی تخت ہے نہ تاج اُنؐ کی بادشاہی ہے
جہاں بانی کے گر بتلا دیے فرماں رواؤں کو

دیا ہے سادگی کا درس سارے کجکلاہوں کو
سکھائی راہنمائی آپؐ نے سب راہنماؤں کو

وہاں کی دھوپ بھی اک سائباں محسوس ہوتی ہے
کہ اک ٹھنڈک سی ملتی ہے قمر کے ننگے پاؤں کو

ریاض حسین قمر

ادارہ

تعمیر

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گول خیمے کے پاس سے گزرے جو ایک انصاری صحابی کے دروازے پر بنا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

"یہ کیا ہے؟"

لوگوں نے کہا "گول خیمہ ہے جو فلاں نے بنایا ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو مال بھی اس طرح (بلا ضرورت خرچ) ہو' وہ قیامت کے دن اپنے مالک کے لیے وبال کا باعث ہو گا۔"

انصاری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا علم ہوا تو اس نے وہ خیمہ ہٹا دیا۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے تو وہ خیمہ نظر نہ آیا۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ انصاری کو آپ کے فرمان کا علم ہوا تو اس نے اسے ہٹا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ اس پر رحمت فرمائے۔ اللہ اس پر رحمت فرمائے۔"

فائدہ: "قبہ (خیمہ) اس چھوٹے سے گھر کو کہتے ہیں جو گول شکل میں ہوتا ہے۔" گھر کے آگے اس قسم کا خیمہ لگانا غالباً "امارت و ثروت کا اظہار ہوتا تھا اور صرف فخر کے لیے اس قسم کی زینت جائز نہیں۔

معمولی گھر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا تھا (اور آپ حیات تھے) تو میں نے یہ کیفیت بھی دیکھی کہ میں نے ایک کمرہ بنایا جو مجھے بارش سے محفوظ رکھ سکے اور دھوپ سے بچا سکے۔ اس کی تعمیر میں میری کسی شخص نے مدد نہ کی۔"

فوائد و مسائل:

1۔ گھر کا اصل مقصد بارش اور دھوپ سے بچاؤ' اپنی نجی زندگی کا تحفظ اور پردے کا اہتمام ہے۔ یہ فائدہ معمولی گھر سے بھی اسی طرح حاصل ہوتا ہے جس طرح مزین اور خوب صورت کوٹھیوں سے حاصل ہوتا ہے' اس لیے ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا بے فائدہ ہے۔

2۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ذاتی ضروریات کے لیے سادہ سے سادہ اہتمام کرتے تھے اور باقی مال اللہ کی راہ میں اور دوسرے مسلمانوں کی مدد کے لیے خرچ کر دیتے تھے۔ یہی سادگی مسلمان کی اصل شان ہے۔

3۔ کسی کے مدد نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مدد کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتنا معمولی گھر تھا کہ خود ہی بنا لیا' کسی سے مدد لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

حضرت حارثہ بن مضرب رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا "ہم لوگ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی بیمار پرسی کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔

"میری بیماری لمبی ہو گئی ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان۔

"موت کی تمنا نہ کرو۔" نہ سنا ہوتا تو میں ضرور موت کی دعا کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا۔ "بندے کو اپنے تمام (جائز) اخراجات کرنے کا ثواب ملتا ہے مگر جو مٹی میں خرچ کیا جائے۔" یا فرمایا "عمارت بنانے میں خرچ کیا جائے (اس کا ثواب نہیں ملتا۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے۔

2۔ موت کی دعا کرنا منع ہے بلکہ اللہ سے مصیبت دور کرنے کی دعا کرنا چاہیے۔

3۔ بندہ اپنی جان اور صحت کے لیے جو خوراک استعمال کرتا ہے یا بیوی بچوں وغیرہ کو خوراک مہیا کرتا اور ان کی دوسری لازمی ضروریات پوری کرتا ہے' یہ اس کا صرف اخلاقی فرض ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ بھی ہے جس پر وہ ثواب کا مستحق ہے۔

4۔ رہائش کے لیے گھر پر صرف اس حد تک خرچ کرنا چاہیے جس سے ضرورت پوری ہو جائے۔ زیب و زینت پر رقم ضائع کرنا مناسب نہیں۔

توکل اور یقین

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرما رہے تھے۔

"اگر تم لوگ اللہ پر اس طرح بھروسا کرو جیسے اس پر بھروسا کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دے جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح (گھونسلوں سے) بھوکے روانہ ہوتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں۔" (حاکم)

فوائد و مسائل :

1۔ پرندوں کا توکل یہ ہے کہ وہ رزق جمع کر کے نہیں رکھتے بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آج رزق دیا ہے' اسی طرح کل بھی دے گا۔

2۔ انسان عام طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس لیے گھبراتا ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں فقرو فاقہ سے ڈرتا ہے۔ اسے یقین رکھنا چاہیے کہ جس طرح اللہ نے اسے اب رزق دیا ہے' مستقبل میں بھی دے گا۔

3۔ توکل کا مطلب یہ نہیں کہ جائز اسباب اختیار نہ کیے جائیں۔ پرندے بھی گھونسلے چھوڑ کر نکلتے ہیں اور تلاش کر کے رزق کھاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو حرص سے بچتے ہوئے جائز ذرائع سے رزق حاصل کرنا چاہیے۔

اچھا گمان

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"ہر شخص کو اس حال میں موت آنی چاہیے کہ وہ اللہ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ انسان کو اللہ کی رحمت کی امید اور اس کی ناراضی کا خوف' دونوں کی ضرورت ہے۔ امید اسے نیکیوں کی رغبت دلاتی ہے اور خوف اسے گناہ سے باز رکھتا ہے۔

2۔ زندگی میں امید پر خوف کا غلبہ رہنا چاہیے لیکن وفات کے وقت امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے۔

3۔ اللہ سے حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں یہ امید رکھے کہ اس کی توفیق سے زندگی میں جو نیک کام ہوئے ہیں' اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے گا اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔

4۔ امید کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی میں اللہ کی نافرمانی کی عادت ہو اور نیکیوں کی طرف رغبت نہ ہو۔ جب نصیحت کی جائے تو کہہ دے : "اللہ بہت رحم

کرنے والا ہے۔ یہ امید کا غلط تصور ہے۔

طاقت ور مومن

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کمزور مومن کی نسبت طاقت ور مومن بہتر ہے اور اللہ کو زیادہ پیارا ہے اور سب میں خیر موجود ہے۔ جو چیز تجھے نفع دے سکتی ہے' اس کی (کوشش اور) حرص کر اور عاجز نہ بن۔ اگر تجھ پر (تیری مرضی کے خلاف) کوئی چیز غالب آجائے تو کہہ "یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اس نے جو چاہا کیا۔ "اگر" سے بچ کیونکہ "اگر" سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ طاقت ور مومن اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو نیک کاموں کی انجام دہی' نیکیوں کے فروغ اور برائیوں کی راہ روکنے میں خرچ کرتا ہے جب کہ کمزور آدمی بہت سے ایسے کام نہیں کر سکتا جو طاقت ور آدمی انجام دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے طاقت ور مومن کمزور سے بہتر ہے۔

2۔ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کے لیے جائز طریقے سے کوشش کرنا مستحسن ہے۔

3۔ جسمانی اور ذہنی قوتوں کو ظلم و زیادتی کے لیے استعمال کرنے سے پرہیز ضروری ہے ورنہ ایسا طاقت ور اللہ کو کمزور سے پیارا نہیں ہو گا بلکہ اللہ اس سے ناراض ہو گا۔

4۔ مومن دنیوی فوائد کے لیے محنت کرے تو اچھا ہے کیونکہ وہ انہیں نیکی کے کاموں میں استعمال کرے گا۔

5۔ اچھے مقصد کے حصول کے لیے پوری کوشش کرنا ضروری ہے لیکن اللہ پر اعتماد ہونا چاہیے۔ کامیابی ہو تو اللہ کا شکر ادا کیا جائے ورنہ سمجھ لیا جائے کہ ناکامی میں انسان کی کسی کوتاہی کو دخل ہے' یا یہ مطلوب چیز انسان کے لیے مفید نہیں' اور اس کا نہ ملنا انسان کے لیے بہتر اور اللہ کا احسان ہے۔

6۔ ناکام ہونے والے منصوبے کی خامی سامنے آنے پر افسوس کو خود پر مسلط نہ کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے: کاش یہ کام اس طرح کے بجائے اس طرح کیا جاتا' البتہ خامی تلاش کر کے آئندہ اس سے بچنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

7۔ شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ ناکامی کو بہت بڑا کر کے پیش کرتا ہے۔ جس سے اللہ کی رحمت سے مایوسی یا اللہ کی ذات اقدس سے ناراضی اور شکوہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسان کی آخرت کو تباہ کرنے والی ہیں۔

8۔ بعض اوقات انسان اپنی ناکامی کا ذمہ دار کسی دوسرے انسان کو قرار دے دیتا ہے اور پھر حسد اور بغض کے جذبات کے تحت اسے نقصان پہنچانے یا بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی شیطانی عمل ہے۔

دو نعمتیں

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اکثر لوگ خسارے کا شکار ہیں صحت اور فراغت۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ صحت میں انسان بہت سی ایسی نیکیاں کر سکتا ہے جو بیماری میں نہیں کر سکتا لیکن غفلت کی وجہ سے یہ موقع ضائع کر دیتا ہے' اس طرح اپنے وقت کی صحیح قیمت وصول نہ کر کے گھاٹا پالیتا ہے۔

2۔ ہم عام طور پر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں نیکی نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس وقت نہیں' حالانکہ بہت دفعہ ہم اپنا وقت کھیل کود' لہو ولعب' ہنسی مذاق' غیبت وغیرہ اور فضول گپ بازی میں گزار دیتے ہیں۔ یا ایسے لٹریچر (کہانیاں' افسانے' ناول اور گندی شاعری وغیرہ) کے مطالعے میں ضائع کر دیتے ہیں جن کا کوئی فائدہ

نہیں۔ ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو گیم وغیرہ پر وقت کا ضائع ہونا بہت واضح ہے، پھر کسی بھی کھیل کا میچ ہو رہا ہو تو چھوٹے بڑے سب ہی ضروری کاموں کو نظر انداز کر کے کمنٹری سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ ان فضولیات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ایسی تفریح کو اختیار کرنا چاہیے جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو۔ بہت سے غیر اسلامی تہواروں، **مثلاً** "بسنت وغیرہ پر بے شمار وقت اور پیسہ ضائع ہوتا ہے اور طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب کر کے شیطان کو خوش کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں پر ان سے اجتناب کرنا فرض ہے۔

دین

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

"اللہ کے رسول! مجھے (دین کی باتیں) سکھائیے اور اختصار کیجیے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب تو نماز پڑھنے کھڑا ہو تو ایسے نماز پڑھ جیسے تو دنیا سے رخصت ہونے والا ہو۔ اور کوئی ایسی بات نہ کہہ جس سے (بعد میں) معذرت کرنی پڑے۔ اور لوگوں کے ہاتھ میں جو کچھ ہے، اس سے پوری طرح مایوس ہو جا۔" (مسند احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ وعظ و نصیحت میں حسب موقع اختصار یا تفصیل سے کام لینا چاہیے۔

2۔ نماز کا پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نماز میں پوری توجہ اور انہماک ہو۔ دل اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو اور نماز میں جو کچھ پڑھا جائے، پوری طرح سوچ سمجھ کر اللہ کے حضور عجز و نیاز کی کیفیت کے ساتھ پڑھا جائے۔ ادب و احترام کے ساتھ کھڑے ہو کر غیر ضروری حرکتوں سے اجتناب کیا جائے۔

3۔ جب کسی انسان کو معلوم ہو کہ وہ تھوڑی دیر بعد دنیا سے رخصت ہونے والا ہے تو وہ اللہ کے سامنے انتہائی عاجزی کا اظہار کرتا ہے، اور خلوص سے دعا کرتا ہے۔ ہر نماز کو اسی طرح ادا کرنا چاہیے۔

4۔ بات کرتے وقت اس کے نتائج پر غور کر لینا چاہیے کیونکہ ایک دفعہ جو بات زبان سے نکل گئی، وہ واپس نہیں ہو سکتی۔ بعض اوقات ایک غلط بات کے نقصانات لامحدود بھی ہو سکتے ہیں۔

5۔ دنیا میں انسان ایک دوسرے کے کام آتا ہے لیکن انسانوں کے دل بھی اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اس لیے امید بندوں سے نہیں، اللہ سے ہونی چاہیے۔ اسی سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ حاجت پوری کر دے، جیسے بھی اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا ہو۔

تکبر

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کے دل میں رائی کے ایک دانے جتنا بھی تکبر ہو گا، وہ جنت میں نہیں جائے گا اور جس دل میں رائی کے ایک دانے جتنا بھی ایمان ہو گا، وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ سب سے بڑا تکبر حق کا انکار ہے۔ دوسروں کی خوبیوں کا انکار اور ان کی تحقیر بھی تکبر ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "تکبر کا مطلب حق بات کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔"

2۔ تکبر کی معمولی مقدار بھی اللہ کی ناراضی کا باعث ہے۔

3۔ جو شخص تکبر کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یا اللہ کے احکامات پر ایمان لانے سے انکار کرے گا، وہ جہنمی ہے۔ اگر کوئی شخص مال و دولت، حسن، طاقت، علم، نسب وغیرہ کی وجہ سے فخر

کرتا ہے اور خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے تو یہ بھی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

اللہ کی چادر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ عزوجل فرماتا ہے "بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میرا پہناوا ہے۔ جو شخص ان میں سے کوئی چیز بھی مجھ سے کھینچے گا' میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ عظمت و کبریائی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں۔ اگر مخلوق میں کسی کو وقتی طور پر محدود عظمت و شان حاصل ہے تو وہ اللہ ہی کی عطا کردہ ہے' لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ اس پر اللہ کا شکر کرے نہ کہ اپنی عظمت کا دعوا کرتے ہوئے تکبر کی روش اختیار کرے۔

2۔ تکبر کرنے والا گویا خدائی صفات کا حامل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے' اس لیے یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

3۔ انسان کی عظمت اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کا بندہ بننے میں ہے' فخر و تکبر میں نہیں۔

تواضع

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اللہ پاک (کی خوشنودی) کے لیے ایک درجہ تواضع اختیار کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے سامنے ایک درجہ تکبر اختیار کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کا ایک درجہ کم کر دیتا ہے حتیٰ کہ (درجات کم ہوتے ہوتے یہ نوبت آجاتی ہے کہ) اسے سب سے نچلے طبقے میں ڈال دیتا ہے۔"

کمزور سے سلوک

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"مدینہ والوں کی ایک لونڈی بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی تو آپ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے تھے حتیٰ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کسی کام کے لیے مدینہ میں جس جگہ چاہتی لے جاتی۔"

فوائد و مسائل:

1۔ معاشرے کے کمزور افراد سے زیادہ شفقت کا سلوک کرنا چاہیے۔

2۔ بڑے آدمی' سردار یا امام کو کسی معمولی آدمی کا کام کرنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیے۔

3۔ ضرورت کے وقت اجنبی عورت کے ساتھ کہیں جانا جائز ہے' بشرطیکہ لوگوں کے دلوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور نہ تنہائی ہو۔

فخر نہ کرو

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا' اس میں آپ نے یہ بھی فرمایا۔

"اللہ عزوجل نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تواضع اختیار کرو حتیٰ کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ تواضع (انکسار' فروتنی) کا مطلب ہے فخر و غرور سے اجتناب' دوسروں کا احترام اور کم درجے کے لوگوں سے میل جول اور حسن سلوک کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھنا۔

2۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے تواضع کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

3۔ اللہ کی دی ہوئی کسی بھی نعمت پر فخر و تکبر جائز نہیں بلکہ شکر کے جذبے کے ساتھ اس نعمت سے مخلوق کے بھلے کا کام لینا چاہیے۔

4۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کے علاوہ بھی وحی نازل ہوئی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی فرماتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال (احادیث) اسی وحی کی وجہ سے واجب التعمیل ہیں۔

نیا سال نئی خوشیوں نئی آرزوؤں امنگوں اور جذبوں کی نوید دے رہا ہے۔

2015 بیتتے ہوئے وقت کے سمندر کا حصہ بن گیا' ہر دفعہ کی طرح شعاع میں قارئین کی شرکت کے لیے کچھ سوالات کیے ہیں' سوال تو خیر کیا آپ کو جاننے' آپ کی سوچ اور فکر سے آگاہ ہونے کا بہانا ہی کہے کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

ہماری قارئین کی اکثریت کے لیے ٹی وی ہی آگاہی کا واحد ذریعہ ہے۔ ہماری قارئین جنہیں اپنی ذمہ داریوں سے ہی فرصت نہیں ملتی اس کے باوجود وہ اردگرد سے کتنی باخبر ہیں اور آیا وہ اپنی بھی کوئی رائے رکھتی ہیں یا بس صبح و شام کرنا ہی زندگی کا حاصل ہے۔

ہمارا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے

ملے کہاں سے خبر آج کل تو اخبارات
خبر بناتے نہیں سرخیاں بناتے ہیں

الیکٹرانک میڈیا نے جو سنسنی خیزی پھیلائی ہے۔ اس نے اخبارات کی سرخیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ معمولی سا واقعہ چھوٹی سی خبر بریکنگ نیوز کے نام پر دھاڑتے ہوئے میوزک کے ساتھ چیخ چیخ کر سنائی جاتی ہے۔ بلکہ ذہن نشین کرانے کے لیے اسے بار بار دہرایا بھی جاتا ہے۔

پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔

ٹی وی پر چیختی' دھاڑتی بریکنگ نیوز کا سلسلہ معمول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے' بہت کم خبریں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بریکنگ نیوز کہا جا سکتا ہے' اس سال ملکی یا غیر ملکی حوالے سے کون سا واقعہ یا خبر تھی جو آپ کے لیے حقیقتاً "بریکنگ نیوز تھی؟

دوسرا سوال آپ کی ذات کے حوالے سے ہے۔

2۔ زندگی محبت بھرے رشتوں کے ڈورسے بندھی ہے' کسی بھی رشتہ یا تعلق سے بندھی شخصیت نے آپ کی تعریف میں کوئی جملہ کہا جسے سوچ کر دل آج بھی خوشی سے بھر جاتا ہے۔

اور تیسرا سوال شعاع کے حوالے سے

3۔ گئے سال کے بارہ ماہ میں شعاع کا کون سا ٹائٹل آپ کو اچھا لگا۔

آئیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

ادارہ

مہناز یوسف ..... کراچی

1۔ ٹی وی کے ساتھ اب میرا رشتہ اس حد تک رہ گیا ہے کہ آتے جاتے چلتے پھرتے ٹی وی دیکھتی ہوں' وہ بھی ایسے کہ بچے کارٹون دیکھ رہے ہیں تو میں بھی دال چنتے ہوئے "اوگی" سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ نعیم (میرے شوہر) کے ساتھ کھانا کھا رہی ہوں' وہ نیوز چینل دیکھ رہے ہیں تو میں بھی اپنے "عجب" سیاست دانوں کے "غضب" کارناموں' پر کف افسوس مل رہی ہوں۔ جب نعیم قلم لگا لیتے ہیں تو فلم دیکھنے لگتی ہوں' جب اسپورٹس چینل لگاتے ہیں تو بیزاری کے ساتھ ٹینس بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی

ساتھ "ان" سے ٹینس کے رول بھی معلوم کرتی جاتی ہوں مگر جب وہ ریسلنگ دیکھتے ہیں تو ان سے کہتی ہوں کہ پلیز یہ ریسلنگ ہٹا دیں۔ ننگ دھڑنگ آدمی ایک دوسرے کو "دھنک" رہے ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بچے بھی آپس میں بعد میں "ڈھشن ڈھشن" کرتے ہیں۔ تو بریکنگ نیوز تو یاد نہیں' ہاں مجھے حادثاتی اموات کا بڑا دکھ ہوتا ہے۔

2۔ اس سال میری چھوٹی بہن سمیرا محفوظ نے میری بارے میں ایسی باتیں کہی ہیں جنہیں میں تعریف کے زمرے میں لا سکتی ہوں مثلاً "سمیرا نے ایک بار کہا کہ۔

"ممناز باجی! آپ کی باتوں نے سسرال میں میری رہنمائی کی۔"

"یا پھر یہ کہ "میں نے ممناز باجی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

کچھ اسی قسم کے چند جملے صحیح سے تو یاد نہیں۔ اس کے جملے' پر سمیرا نے میری کہی ہوئی باتوں کی تعریف کی جو کہ مجھے اچھی لگی۔ اس کے علاوہ سفیان (میرا بیٹا) نے کچھ دن پہلے کہا۔

"مما! آپ میری ہر فرمائش پوری کر دیتی ہیں۔" مجھے بہت اچھا لگا گو کہ میرے بیٹے کی زندگی میں' میری طرف سے بہت زیادہ کمی رہی ہے پھر بھی مجھے اس کا یہ جملہ اچھا لگا۔ میری کہانی "تو میرا ہیرو" کی تعریف دسمبر کے شعاع میں آسیہ ارم نے کی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اپنی کہانی کی تعریف والا جملہ انڈرلائن کیا اور بار بار پڑھا۔ اس کے علاوہ عائشہ رباب' طاہرہ آصف' مریم حنیف روزینہ نعیم' یاسمین نعیم نے بھی اپنے خطوں میں میری تحریر کی تعریف کی۔ مجھے ان تمام بہنوں کے لکھے ہوئے جملے بہت اچھے لگے۔

3۔ اگست کے سرورق کی تصویر تو میں نے فیس بک پر بھی اپ لوڈ کی تھی کیونکہ اگست کے شمارے میں میرا پہلا افسانہ "چھوٹی نند" شائع ہوا تھا اس لیے مجھے تو سب سے اچھا ٹائٹل اگست کا ہی لگتا ہے گو کہ یہ ہے تو خود غرضی پر کیا کروں۔ میں نے اپنے موبائل میں بھی اگست اور نومبر کے سرورق کی تصاویر محفوظ کر رکھی ہیں کیونکہ ان دونوں مہینوں میں میری تحاریر جو شائع ہوئی ہیں۔ تھینک یو شعاع۔ اور آئی لو یو شعاع۔

حرا قریشی.... بلال کالونی ملتان

دن بدلتے نہیں.... سال بدل جاتے ہیں۔
شب کے دوسرے پہر میں "حرا قریشی" عزیزی شعاع سے محو کلام ہیں۔ بوقت شب.... تین بجے کے بعد

رات ابھی تنہائی کی پہلی دہلیز پر ہے
اور میری جانب اپنے ہاتھ بڑھاتی ہے
سوچ رہی ہوں' ان کو تھاموں
زینہ زینہ سناٹوں کے تہہ خانوں میں اتروں
یا اپنے کمرے میں ٹھہروں
چاند مری کھڑکی پر دستک دیتا ہے!

جی بالکل اسی طرح' سال نو سروے کا بہانہ لیے عزیزی شعاع نے دل کی دہلیز پر دستک دے ڈالی ہے۔

1۔ بریکنگ نیوز؟ آمدم بر سر مطلب.... فہرست پر نظر ڈالیے

بیسٹ ٹیچر کا ایوارڈ وصول کرنا (دکھ اور حیرت کی ملی جلی کیفیت.... دکھ یہ کہ دیر سے ملا خفیہ.... حیرت' بہت قابل ہو گئے آج آپ بھی)

مکمل ناامیدی کے بعد "شعاع کے ساتھ ساتھ" میں حرا کی آمد (کمال ہوا بھئی)

خواتین ڈائجسٹ میں "اپنی نظم" کی اشاعت (بڑے عرصے میں یاد کیا سوہنیو!)

ویسے تو اچانک دہلیز پر ہونے والی آہٹ' کشادہ بادلوں کے سینے پر چاند کی کشش' کسی حسین دوشیزہ کی سراپا تشنگی سے لبریز ترپلکیں' کسی جزیرے پر تنہا اداس بیٹھے بچے کی آنکھوں میں در آنے والی اچانک فاتحانہ چمک' چشم بصیرت کے تخت پر جنت کا گماں اور ہر وہ صدا جو عزیزی شعاع کے آنے کا پتا دیتی ہے' وہ بھی چونکا دیتی ہے ہر دفعہ ہی

وی بریکنگ نیوز کا ہونا ضروری نہیں۔

2۔ عزیز پیارے سے اسکول کے کولیگز دل میں برملا صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں پر فراخ دلانہ سراہنے سے اجتناب برتتے ہیں۔ (اس معاملے میں بلا کے کنجوس!)

فیملی ممبرز.... تنقید و خامیوں کی گٹھڑی ہی کھلی رہتی ہے .... مدح سرائی بھی ہوتی ہے پر کسی کی جانب سے کہا کوئی جملہ فی الحال یاد نہیں آ رہا (معذرت)

احباب من.... بڑا دقیق انداز تحریر ہے آپ کا (سندس

سید بٹ) لیجئے کرلیں گی۔

انداز وہی کہ بڑی سادگی سے پیاری پیاری باتیں کر جانا' لہجہ وہی کہ قاری جب تک پوری تحریر نہ پڑھ لے' سانس لینے کو بھی نہ رکے.... یہ نعمت کسی کسی کو حاصل ہوتی ہے کہ الفاظ کے بڑے ذخیرے میں سے اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق موتی نکال سکے۔

آج ایک ایڈیٹر نے کہا کہ "الفاظ پہ قادر ہیں" کل ایک زمانہ اعتراف کررہا ہوگا کہ آپ بہت پیارا لکھتی ہو۔ اب ڈی سیجن (فیصلہ) آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ میں قلم رکھنا ہے یا اسے توڑ دینا ہے۔

شعاع کے پیارے قارئین کے جملے جو تنہائی کے لمحوں سے ملال کی کیفیت سے نکال کر ایک مخلص، پرخلوص دوست کا سا لمس عطا کرتے ہیں۔

"حرا قریشی بیسٹ الفاظ تھے خود کی وضاحت کے لیے' یار کیا لکھوں۔ بس اتنا سا "تم سا کوئی نہیں" (شمع مسکان۔ جام پور)

"حرا قریشی کا خط' دل باغ باغ ہوگیا۔ کیا خوب صورت الفاظ کی جادوگری تھی۔ (فوزیہ ثمرہٹ)

"تبصروں میں حرا قریشی بڑے فلسفیانہ انداز میں طویل تبصرہ کرتی اچھی لگیں۔" ویسے حرا اتنے مشکل الفاظ مجھے مشکل میں ڈال گئے (اچھی خاصی نالائق ہوں نا؟) صدف مختار

"مقابل ہے آئینہ' حرا! آپ اتنا پیارا کیسے لکھ لیتی ہیں! ایسی قاری بہنوں پر تو رشک آتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت قابل ہیں آپ۔" عائشہ خان

اب پیاری مدیرہ کے الفاظ قلم بند کرتے ہیں....

"حرا آپ افسانوں پر توجہ دیں۔ کوئی اچھی کہانی اپنے اردگرد تلاش کریں اور اسے لفظوں کا جامہ پہنائیں کیونکہ آپ الفاظ پر قادر ہیں۔" جس پر حمیرا نسیم نے کہا۔

"کانگریٹس! مدیرہ نے بالکل ٹھیک کہا کیونکہ آپ کے الفاظ کی ادائیگی واقعی کمال کی ہے۔"

یہ وہ چند ستائشی سطریں ہیں جو اکثر اداسی کے عالم میں مجھ سے گفتگو کریں تو شام ڈھلتے ہی دور افق پر طلوع ہوتی سحر کا عندیہ دیتی ہیں۔

یہ وہ لفظ ہیں جو میرے لیے مقناطیسی کشش اور گراں قدر اثاثے کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگر میں اپنے دل سے پوچھوں نا (صدق سے) تو ان محبتوں کے آگے "حرا" کا قد بہت چھوٹا ہونے لگتا ہے....! رب کریم! آپ کے گلشن حیات کو اپنی نعمتوں کی خوشبوؤں سے سدا معطر رکھے۔ آمین!

3۔ عزیزی شعاع کے لیے.....!

ہر چیز حد میں اچھی لگتی ہے....

مگر تم بے حد اچھے لگتے ہو.....!

سرورق کی دنیا میں قدم دھرتے ہیں.... جنوری کے شمارے پر عیاں تیکھے نینوں سے دیکھتی دوشیزہ اپنے مخصوص انداز میں جلوہ گر تھیں۔ فروری کے شمارے پر سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا حیا کا عنصر بھی تھا۔ ماہ مارچ کا سو سو۔ ماہ اپریل کا سرورق دلکشی و جاذبیت کے رنگوں سے لبریز تھا۔ مئی کے سرورق کا حسن سرسوں کے کھیت سا

نمایا تھا۔ جون کا پیار اتو تھا پر دل نے جانے کیوں پسندیدگی کی سند نہ بخشی۔ جولائی کا... ایسے ناز و انداز ہمیں کہاں اٹریکٹ کرتے ہیں! اگست کے شمارے پر مہندی کمال تھی۔ تو ستمبر کے شمارے پر ڈریس۔ اکتوبر کا من موہنا سا آنچل کسی گاؤں کی سی خوب صورتی سموئے ہوا تھا۔ نومبر کا سرورق قتل اور غضب کرنے کے تمام ہتھیاروں سے لیس تھا۔ دسمبر کا شمارہ ابھی دست نازک کی گرفت میں نہیں آیا (اس لیے ناقدانہ تبصرے سے محفوظ رہا) شعاع اگر جلدی مل جائے تو گرمیوں میں رسیلے آم اور سردیوں میں خوبرو مالٹوں کا مزہ آجائے۔ (ٹھیک کہا نا!) یہ سندس صاحبہ کی عنایت ہے کہ ہم سروے میں شرکت کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

اقصیٰ مریم ملغانی، اسوہ مریم ملغانی... کاسی اسٹریٹ کوئٹہ

1۔ سروے کے پہلے سوال نے ہی میرے رگ و پے میں تلاطم خیز موجیں برپا کردی ہیں... اس سوال کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن "سانحہ قصور" کی طرف چلا گیا۔ میرا "سانحہ قصور" ہی لکھ دینا کیا کافی نہیں؟ ان انسان نما درندوں نے اس قدر سفاکیت اور درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذرا نہیں سوچا!

2۔ میری تعریفیں اور جملے ہائے؟ ہائے کیا پوچھ لیا آپ نے 'میں ہوں ہی اتنی اچھی کہ میری تعریف تو ہر کوئی کرتا ہے۔ میرے اخلاق' تمیز' ادب' میانہ روی' رواداری' ایثار' محبت کا ہر کوئی قائل ہے۔ (نوٹ کریں: میری اس لائن کو ہرگز' ہرگز اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا خطاب نہ دیا جائے) کیونکہ جو سچ ہے وہ سچ ہے بھئی ہاہاہاہاہاہا۔ ماں کا رشتہ بہت عظیم اور اٹوٹ ہے۔ مائیں سب کی اولاد کے لیے مر مٹ جانے تک تیار ہوتی ہیں۔ میری ماں بھی ایسی ہی ہیں۔ کہتی ہیں 'میری بیٹی جس گھر جائے گی' سب کو اپنا گرویدہ کرلے گی' میری قربانیوں کا صلہ اس نے اپنی عمدہ کارکردگی اور حسن اخلاق کی صورت میں مجھے لوٹایا ہے۔"

اسی طرح چونکہ میں ایم اے اردو پارٹ ون کی طالبہ ہوں' تو ایک روز طبیعت کی خرابی کے باعث یونیورسٹی نہ جا سکی۔ میم تنزیلہ ناز جو کہ افسانوی ادب پڑھاتی ہیں۔ مجھے کلاس میں غیر حاضر دیکھ کر میری بابت پوچھتی ہیں اور جب آسیہ میری طبیعت کی خرابی کا بتاتی ہے تو میم کچھ اس طرح سے مجھے دعا دیتی اور میری تعریف کرتی ہیں۔

"بہت محنتی' قابل' ذہین اور ہونہار بچی ہے اقصیٰ۔ اس لڑکی کی مثال نہیں ملتی' میرے دل سے ہمیشہ اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر دعائیں نکلتی ہیں کہ جس آنگن میں یہ چاند اترے وہاں کبھی روشنی ماند نہ ہو۔"

3۔ یہ بھی بڑا انوکھا سوال ہے۔ پر جواب دینے کی غرض سے پورے کے پورے بارہ شمارے آگے رکھے بیٹھی ہوں اور جس شمارے پر بار بار نظر کرم اٹھ رہی ہے' وہ اکتوبر کا شمارہ ہے۔ جی ہاں ٹائٹل کے حساب سے بیسٹ' عمدہ اور اعلا ترین۔ ہلکی سی مسکان کے ساتھ ساتھ پیلے جوڑے میں ماڈل کیا غضب ڈھا رہی ہے۔ واہ' واہ' واہ...

نوال افضل گھمن... لاہور

1۔ بریکنگ نیوز... اس سال واقعہ حرم شریف میں حادثہ کرین۔ واقعی میرے لیے بریکنگ نیوز تھی... حجاج اکرام کی اجتماعی شہادتیں' پھر ابھی تک کئی افراد لاپتا۔

2۔ زندگی واقعی محبت بھرے رشتوں کی ڈور سے بندھی ہوئی ہے' اس بات میں کوئی شک نہیں مگر آج کل کے دور میں نفسا نفسی کا عالم ہے۔ اس بات میں بھی شک کی گنجائش نہیں... رواں سال... ایم اے ایڈ کے لاسٹ سمسٹر پریکٹس ورکشاپ میں ٹیوٹر صاحب کے الفاظ "کانفیڈنس... اور لہجہ واقعی ختم ہے نوال پر..."

دوسرا جملہ ایک عزیز از جان ہستی ماریہ اعجاز گھمن کا... "یار! تمہاری باڈی لینگویج سے بہت پر اثر محبت کی شعاعیں نکلتی ہیں... جو اگلے کو اپنے حصار میں قید کرلیتی ہیں۔

3۔ اس سال اگست کا ٹائیٹل بہت پسند آیا۔

سنبل ملک اعوان... ونڈالہ دیال شاہ

1۔ جی ہاں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے آپ بہت حساس ہوتے ہیں (خون کے رشتوں کے علاوہ۔

2۔ ویسے ہی عمران خان کی ریحام سے طلاق کی خبر میرے لیے شاکنگ تھی۔

اور میں سچ مچ حیرت زدہ تھی۔ جب ٹی وی کی پٹی چلتی اس خبر کو دیکھا۔

3۔ میری زندگی میں تو سارے ہی رشتے ہیں (کہنے کو) مگر

اصلی رشتے کا احساس تو ماما سے ہی ہوا۔ (اللہ میری ماما کو زندگی دے۔ صحت و تندرستی دے۔ خوشیاں دے۔ میری والدہ دنیا کی عظیم ترین ماں ہیں۔ ان کے جیسا کوئی بھی نہیں۔

تو ماں تو محبت بھرے جملے بولتی رہتی ہیں مگر ایک دفعہ یوں ہوا کہ میری والدہ۔ بہت تھکی ہوئی تھیں۔ باہر کا سارا کام ماما کے ذمے ہے۔ کوئی مہمان آئے۔ کہیں آنا جانا ہو۔ شادی ہو' یا سبزی لانی ہو' ذمہ داری مما کی ہے۔ گروسری بھی مما کا ذمہ ہے۔ پھر محرم بھی آگئے۔ اور نانی جان کی قبر کی صفائی بھی کروانا تھا' مٹی منگوا کر قبر کی لپائی وغیرہ کرنا تھی۔ ماما ادھر چلی گئیں۔ میں شفٹنگ ڈیوٹی میں تھی لہٰذا میں نے کمر کس لی۔

تمام گھر کی صفائی کی' برتن دھوئے۔ کچن صاف کر کے کپڑے دھوئے اور ساتھ میں چولہے پر ہنڈیا بھی چڑھا دی۔ اور جب تک مما اور بھائی گھر آتے' میں ان کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کر چکی تھی اور سلاد بنا کر روٹیاں بنا رہی تھی کہ مما آگئیں۔ ماما لوگوں کو بھوک بھی لگی تھی سہ پہر جو ہو چلی تھی۔

صاف ستھرا گھر اور تیار کھانا دیکھ کر مما آب دیدہ ہو گئیں اور بے اختیار گلے لگا کر میرا ماتھا چوما اور کہنے لگیں۔

''کاش میری دونوں بہویں بھی اتنی سلیقہ شعار اور خیال رکھنے والی ہوتیں۔''

مما کا میرے ماتھے پر بوسہ دینا (وہ لمس) مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ ان کا بوسہ ہی میرے لیے تعریف تھی کہ میں ہر لمحہ خود کو ان کی دعا کے حصار میں محسوس کرتی ہوں۔

2۔ ویسے تو شعاع کے سارے ہی ٹائٹل ٹھیک ہی تھے مگر مجھے سب سے زیادہ خوب صورت ٹائٹل ماہ مارچ کا لگا تھا۔

مسز عنبر سعید۔۔۔۔ گل دامن لاہور

1۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے تو ہر خبر ہی چونکا دینے والی ہوتی ہے سبزی' گوشت' دودھ' پھل کے نرخ آسمان سے باتیں کرتے ہیں روز جب سبزی لینے جاؤ تو وہاں جا کر ایک بار تو لازمی چونکنا پڑتا ہے چیزوں کے بڑھتے ریٹ جان کر۔ ملکی حوالے سے دیکھا جائے تو اکتوبر کے مہینے میں آنے والا زلزلہ جو کہ اس قدر شدید تھا کہ سب لرز گئے لیکن مجھے خبروں سے پتا چلا۔ جبکہ میرے گھر والے چیخ چیخ کر بتا رہے تھے۔ ''اماں! زلزلہ آرہا ہے زمین ہل رہی ہے۔ مجھ پر اللہ کا خاص کرم تھا کہ مجھے زمین ساکت ہی لگی۔ بس بچوں کے شور سے بوکھلا گئی۔

فرانس کے دھماکے' یہ واقعی چونکا دینے والی خبر تھی' اس قدر ترقی یافتہ ملک اور ایسے حملے! اللہ معاف کرے۔

2۔ سعید صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا'' تم میری زندگی میں ایسے ہو جیسے صبح کی تازہ ہوا جو تمام دن فریش رکھے۔''

3۔ اپریل' اگست اور دسمبر کے شماروں کے ٹائٹل بلاشبہ خوب صورت تھے۔

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھروڑپکا

کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو؟

سنسناتی ہوا' ٹھٹھرتی رات کی فسوں خیزی۔ میرے اردگرد خاموشی راج کرتی ہے اور میں اپنے ڈریم لینڈ

(میرے روم کا نام) میں بیٹھی لکھ رہی ہوں ہے ناں سوچ رومانٹک (ہاہاہا)

یار! فاصلہ ضرور ہے مگر میں یہ فاصلہ دور کرنے کے لیے لکھ رہی ہوں ناں۔ زندگی ہے گزارنے کا نام تو چلو تو ایسے کہ "آئے اگر کبھی غم تو مسکراؤ اور ہنستے ہنستے جیتے جاؤ اور آگے بڑھتے جاؤ" تو ڈیئر۔

اگر میرے ہم سفر یہ پوچھیں تو ان سے کہنا
میں پیچھے رہنے کے ڈر سے آگے نکل گئی ہوں

اس سرد موسم میں جب ہر کوئی سو رہا ہے' ایک مجھے ہی شوق اور جنون سوار کہ لکھوں۔ اس دفعہ کچھ ڈیفرنٹ سا اور مزے کا ہے سوال نامہ۔ واہ واہ۔

اب آتے ہیں سوالوں کی جانب تو جناب ـــــ اہم حاضر ہیں۔

1۔

بیکراں تشہیر تو بڑی بات ہے
ہم تو اخبار کی سرخی سے سہم جاتے ہیں

اب یہاں اخبار کے بجائے ٹیلی ویژن ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میڈیا نے ہر خبر کا بہت شور مچایا ہوتا ہے۔ "شاہنواز فاروقی نے کیا خوب لکھا ہے۔

"پاکستان میں ٹیلی ویژن صحافت کا ایک ایسا بھیانک چہرہ ہے جسے اگر صحافت کے ذمے دار خود بھی غور سے دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔"

ہر خبر کو اتنا چیخ چیخ کر شور مچا کر بتایا جاتا ہے۔ میرا پوائنٹ آف ویو اگر پوچھا جائے تو مجھے تو عمران خان اور ریحام کی علیحدگی والی نیوز بہت بریکنگ لگی۔

وہ ریحام جو ایک دعوت یہ کہتی نظر آرہی تھیں کہ "جس کا خان جیسا شوہر ہو اس کو زیور کی کیا ضرورت۔

صرف دس ماہ حیرت کی انتہا ہے' اتنی رفاقت؟

اور ریحام خان نے ایک جگہ بتایا کہ میں خان کے لیے کھانا پکاتی ہوں' شام کے بعد ہماری اپنی لائف ہوتی ہے اور یہ کہ عمران خان جاگنگ کرتے ہیں تو میرے لیے پھول ضرور لاتے ہیں۔ ایک مووی بن سکتی ہے جو ریحام اور عمران خان کے تعلقات انٹرویوز میں بیان ہوتے رہے اور اچانک علیحدگی بات۔ آسانی سے ہضم نہیں ہو رہی

وطن پاکستان پر قربان ہونے والے تمام شہدا کے نام

ساری لاشیں ٹکڑے ٹکڑے
ساری آنکھیں پر نم پر نم
محسن ہم اخبار میں گم ہیں
صفحہ صفحہ کالم کالم

2 دسمبر کی رات ایک انسان جس کی روزی کا واحد ذریعہ ریچھ کا تماشا وہ دکھایا کرتا گلی گلی اور اپنی فیملی کا پیٹ پالتا تو پولیس نے اس کا ریچھ اپنے قبضے میں کر لیا اور اس انسان کو "مجرم" بنا کر قید کر دیا گیا۔ اس بندے کی فالج زدہ ماں تڑپتی روتی دیکھی' اس کی بہن التجا کر رہی تھی۔ وہ واحد سہارا اپنے گھر والوں کا۔ مجھے واقعی حیرت اور صدمہ ہوا۔ بریکنگ نیوز....

میں کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں
میرے شہر جل رہے ہیں میرے لوگ مر رہے ہیں
کوئی اور تو نہیں ہے پس خنجر آزمائی یہاں
ہم ہی قتل ہو رہے ہیں' ہم ہی قتل کر رہے ہیں

یہی نہیں فلاں صاحب چہل قدمی کے لیے نکلے.... لو بھئی یہ بھی بریکنگ نیوز.....! اب کیا ہوا.... ؟ کہا کہ اب گاڑی میں بیٹھ گئے ہیں اور جا رہے ہیں فلاں جگہ.... ! گدھے کا گوشت مسلمان ملک میں بک رہا ہے؟ بتائیے کیا کریں تو بہتر ہے کہ کان بند' آنکھیں بند....

2۔ یہ پڑھ کر میرے بے ساختہ آنے والی مسکراہٹ کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ کیوں.... بتائیے بتائیے؟ (ہاہاہا) چلیے آپ کو اپنی بہترین فرینڈز کے تعلق کا بتاتے ہیں سب سے پہلے تو میری فیملی اور فرینڈز کے نام یہ شعر

ہمارے بعد نہیں آئے گا تمہیں چاہت کا ایسا مزا
تم لوگوں سے کہتے پھرو گے مجھے چاہو نسبت زہرا کی طرح

(ہاہاہاہا..... شاعر سے معذرت)

مجھ سے وابستہ میری کئی فرینڈز نے ایسے کئی باتیں' شعر اور تعریفیں کی ہیں کہ دل جب جب یاد کرتا ہے تو آنکھیں مسکراتی ہیں۔ ڈیئر نگینہ' ارم' صوفیہ' عابدہ' نائلہ تمہارا ذکر ہے۔)

میری فرینڈ سنعیہ بیگ نے کہا۔ "نسبت تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔"

ہم نے گیارہ سال سے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں۔ ملے نہیں' صرف بات ہوتی ہے۔

کسی پرخلوص دوست نے کہا تھا کہ "دنیا کے اندر تو کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تم مجھے یاد نہ آؤ۔"

میں اپنی ان تمام پیاری پیاری دوستوں سے کہنا چاہوں گی جو مجھ سے وقت کی تیزی اور مصروفیت کی وجہ سے جدا ہو گئیں "یار کہاں کھو گئی ہو' آئی مس یو۔"

3۔ اب آتے ہیں تیسرے کی طرف یہ فیصلہ کرنا تھوڑا مشکل ہے۔

بہت احتیاط اور نفاست سے رکھے گئے یہ 15ء کے سارے ڈائجسٹ میں نکال کر لائی ہوں فیصلہ کرنا تھوڑا

مشکل لگ رہا ہے کسی کی ماڈل گرل اچھی' کسی کا ڈریس جلیبی جناب سب پر کمنٹس پاس کرتی ہوں سب ہیں تو اچھے مگر آپ نے جو اس کا پوچھا تو لیجئے 'میری رائے۔

پسندیدہ سرورق ۔ فروری کا بیسٹ 'اینڈ اپریل کا اسٹائلش ڈریس لگ رہا ہے اگست کی دلہن پیاری اینڈ دسمبر کا ریڈ 'مائی فیورٹ کلر تو بس یا اور بھی....

حمیرا طاہر.... کوٹ رادھا کشن لاہور

1۔ بریکنگ نیوز تو سانحہ پشاور تھی۔ بہت دکھ ہوا۔

2۔ میرے شوہر نے کہا تھا کہ "تم جھگڑتی نہیں ہو کسی سے 'اس لیے اچھی لگتی ہو۔"

3۔ شعاع تو سرورق سے لے کر آخری ورق تک لاجواب ہوتا ہے۔ پر مجھے "جون 2015ء" کے شمارے کے سرورق پر موجود ماڈل تانیہ بہت اچھی لگی۔ نہایت سادہ' سرخ رنگ میں اس کی رنگت اور مسکراہٹ دونوں بہت بھلی لگی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔

آمنہ ولید.... ٹاؤن شپ لاہور

1۔ ٹی وی سے میرا ناتا نہ ہونے کے برابر ہے 'نجانے کیوں ٹی وی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پھر چاہے ٹی وی پہ کوئی ڈرامہ چل رہا ہو یا نیوز 'فلم چل رہی ہو یا گانا میری دلچسپی صفر ہے۔ کیونکہ میں اپنا فارغ وقت کتابوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتی ہوں۔ کتابیں ہی میری سنگی ساتھی ہیں۔ ساتھ ساتھ فیس بک چلتا ہے۔ فیس بک پہ ہی ایک خبر نے نہ صرف چونکایا بلکہ زار زار رلایا بھی۔

اردو زبان میں بچوں کے ادب کے سب سے بڑے خالق اشتیاق احمد کی وفات کی خبر.... جو 19 نومبر بروز منگل ملک کے لاکھوں بچوں کو یتیم کر گئے۔ جنہوں نے 45 برس ملک کی تین نسلوں کی اپنے 800 ناول اور 100 کتابوں سے فکری رہنمائی کی اور بعد میں جاوید چوہدری کے کالم "مولوی صاحب مر گئے" پڑھ کے میں بہت روئی۔

اکثر اوقات اپنے عزیز و اقارب کے چاشنی سے بھرپور جملے سننے کو ملتے رہتے ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف اپنی پیاری دوست شمیم اختر (جو وقت کے آئینہ میں دھندلا گئی ہے) کے الفاظ آپ سے شیئر کرنا چاہوں گی۔ جو میری آٹوگراف بک میں اس نے میرے لیے تحریر کیے تھے۔ جب جب وہ الفاظ پڑھتی ہوں میرا دل اس کی یاد اور خوشی سے بھر جاتا ہے۔

"میرا بہت دل چاہتا تھا کہ میں محبت کو ایک مجسم شکل میں دیکھوں۔ تم سے ملنے کے بعد میری یہ حسرت پوری ہو

گئی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ لیکن محبت کی اگر کوئی مجسم شکل ہے تو وہ "آمنہ عاشق" ہی ہوگی۔ تب میں آمنہ عاشق تھی۔ آج آمنہ ولید ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے۔
سوال نمبر 3 گئے سال کے بارہ مہینوں میں شعاع کا کون سا ٹائیٹل آپ کو پسند آیا۔
ج: اگست کا ٹائٹل پسند آیا۔

ملائکہ کوثر ـــ بسم اللہ پور

کوئی سا بھی نیوز چینل دیکھیں تو یہ ہو ہی نہیں سکتا آپ کا فشار خون بلند نہ ہو۔ ایسی دل دہلانے والی خبریں ہوتی کہ بس۔ ایک دن ایک ایسی ہی خوفناک خبر سن کر میں صدمے سے گنگ ہوگئی۔

1۔ "گول روٹی نہ بنانے پر سگے باپ نے اپنی نو عمر بیٹی کو وحشیانہ طریقے سے مار ڈالا۔" بیٹی وہ رحمت ہے جس کی اچھی تعلیم و تربیت پر پیارے رسول کریم نے جنت کی بشارت دی ہے۔

2۔ گاہے بگاہے میں ایسے تعریفی کلمات سنتی رہتی ہوں جن کا مجھے گمان تک نہیں ہوتا کہ ایسا وصف کوئی مجھ میں ہے۔

چند برس پہلے میری دوست نے میرے متعلق ایک بات کہی تھی کہ۔

"کوثر! اگر دن کو رات بولے تو میں آنکھیں بند کرکے یقین کرلوں۔"

ابھی بھی کبھی یہ بات سوچوں تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔

"کوثر کے ہاتھوں میں نجانے کیسا جادو ہے جو عام سی دال کو محبت کا بگھار لگا کر مزے دار بنا دیتی ہے۔" خالہ پڑوسن کی رائے۔

بچے ہوئے پینٹ سے گھر کے زنگ آلود پنکھے' آٹے کا کنستر' اسٹینڈ ٹوکری چمکائی تو ملازمہ بچی حیرانگی سے بولی۔

"باجی! آپ اتنی سگھڑ کیسے بن گئی ہیں۔"

دل میں سوچا یہ سارے ہنر' طریقے' قرینے مجھے شعاع و خواتین نے سکھائے ہیں۔ شکریہ اے میرے پیارے رسالوں۔

3۔ 2015ء کے بارہ مہینوں کے بارہ پرچوں میں بہت سے شماروں کے دیدہ زیب سرورق جو دل کو یاد رہ گئے' وہ لکھ رہی ہوں کیونکہ رسالے تو ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ عید الفطر والے رسالے کا ٹائیٹل بہت خوب صورت تھا۔ جس سرورق پر نیلم منیر براجمان تھیں' وہ بھی اچھا لگا۔ انعم فیاض کے پھول سے چہرے نے سرورق کی زینت بڑھائی۔ مہینوں کے نام یاد نہیں (سوری)۔ ایشانور نے کافی گرد منگ کی ہے دسمبر کا ٹائیٹل سرفہرست نظر آرہا ہے۔

طلعت ثنا ـــ سیال شریف

1۔ واقعی ٹی وی پر بریکنگ نیوز کا سلسلہ بہت بڑھ گیا ہے ویسے تو دن میں کئی بار ہر چینل پر بریکنگ نیوز چل رہی ہوتی ہے لیکن اس سال جس بریکنگ نیوز نے مجھے چونکایا' وہ پیرس حملہ تھا۔ اس سے پہلے پشاور حملے میں ہمارے معصوم بچوں کے ضیاع نے بہت دکھ دیا۔

2۔ زندگی واقعی محبت بھرے رشتوں کی ڈور سے بندھی ہے۔ اور ان رشتوں کے بغیر زندگی ادھوری اور بے معنی ہے۔ میاں صاحب اور بچے تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ساس کے ان الفاظ نے دل خوشی سے بھر دیا۔

"تم نے اپنی سلیقہ مندی اور کفایت شعاری سے میرے بیٹے کے گھر کو خوشیوں کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ تم نے صحیح معنوں میں ہمارے مکان کو گھر بنایا ہے۔ میں تم سے بچوں کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت کے حوالے سے بہت خوش ہوں۔"

3۔ مجھے اس سال ٹائیٹل مئی کا سب سے بیسٹ لگا۔ اس کے بعد نومبر' دسمبر اور اکتوبر کا بھی اچھا تھا۔

ایمہا ـــ کوٹ ادو

ویسے تو میں زیادہ ٹی وی دیکھتی نہیں ہوں۔ ہر وقت لکھتی یا پھر پڑھتی رہتی ہوں بس رات کا 8 بجے والا ڈرامہ دیکھتی ہوں اور نو بجے والی ہیڈ لائنز بھی' ویسے تو ہر وقت ہی بریکنگ نیوز دیتے رہتے ہیں پر میرے لیے اس سال کی بریکنگ نیوز عمران خان کی شادی اور طلاق تھی۔

2۔ تعریفی جملے تو بہت ہیں جو میری بہنیں' میری مما' میری فرینڈز میرے لیے کہتی تھیں پر جو خوب صورت تعریفی جملہ میرے دل پر نقش ہے۔ وہ میرے شوہر نے شادی کے شروع دنوں میں مجھے کہا تھا

"تم خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی ہو۔ تمہارا سلیقہ دیکھ کے جب سب تمہاری تعریف کرتے ہیں تو میں بہت فخر محسوس کرتا ہوں۔"

یہ جملہ یاد آتا ہے تو آج بھی وہی مسکان چہرے پہ آجاتی ہے جو اس وقت تھی ویسے میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ میں ایک گاؤں میں رہتی ہوں۔ شہر بہت دور ہے پھر بھی میرے شوہر مجھے ہر ماہ ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں میرے خط پوسٹ کرتے ہیں۔ میری ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ لکھنا میرا جنون ہے اور میں ایک دن ضرور رائٹر بن کے دکھاؤں گی۔ (ان شاء اللہ)

3۔ ٹائٹل اس سال کا دسمبر کا ہی اچھا تھا ریڈ کلر کے سوٹ میں ایسا ریڈ کلر کی نیل پالش اور لپ اسٹک لگائے بہت پیاری لگ رہی تھی۔

منزہ اکرم بھٹی...... کراچی

1۔ نیوز چینلز ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں ہر چھوٹی، بڑی خبر کو بریکنگ نیوز بنا کر پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والا چونک جاتا ہے۔ اب جیسے عمران خان اور ریحام خان کی علیحدگی کی خبر نیوز چینلز پر اس طرح پیش کی گئی کہ جیسے یہ کوئی عالمی مسئلہ ہو۔ حالانکہ یہ بالکل ان دونوں کا ذاتی معاملہ تھا مگر بہر حال میں بھی یہ خبر سن کر چونک گئی تھی۔

2۔ میری زندگی محبت بھرے رشتوں سے بھری ہوئی ہے۔ الحمد اللہ میں بہت خوش قسمت ہوں اس حوالے سے کہ میرے ارد گرد ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ میں بہت سوشل ہوں۔ نئے دوست بنانا، نئے نئے لوگوں سے ملنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرے لیے ایک دوست نے کہا۔

"آپ کمال کی کڑی ہو"

یہ بات سوچتی ہوں تو چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوست نے کہا۔

"دوست آپ اتنی اچھی ہو کہ خود محبت کو آپ سے محبت ہو جائے۔"

شکر ہے اللہ تعالٰی نے مجھے اتنے پیار اور خیال رکھنے والے لوگوں سے نوازا۔

3۔ اپریل میں شعاع کا ٹائٹل جس پر نیلم منیر تھی بہت اچھا لگا۔

فرح ناز...... گجرات

اوائل دسمبر کی نرم سی دھوپ میں کاغذ رکھے پھر سے نئی امید باندھ کر سروے میں شمولیت کرنے جا رہی ہوں۔ پچھلے گلے شکوے بھلا کر نئی کوشش!

1۔ بریکنگ نیوز ہر لمحے پر بنتی ہے۔ لیکن شاکنگ نیوز، جسے سن کر میں لمحہ بھر کو تو تھم گئی۔ انڈیا میں شیو سینا کا ادیب کے منہ پر کالک پھینکنا۔ غم و غصے سے میرا برا حال ہو گیا تھا اور عمران خان اور ریحام کی ڈائیورس بھی کافی شاکنگ تھی۔

2۔ مجھے اپنی تعریف یاد نہیں رہتی۔ پورے سال میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر یاد کرنا تھوڑا مشکل ہے۔ پر ایک تعریف کبھی نہیں بھولوں گی۔ اس سال میٹرک میں A گریڈ لینے پر میرے سر جی بہت خوش ہوئے تھے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ "مجھے پتا تھا" آج بھی مسرور کرتا ہے۔

3۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گی کہ میں نے آج تک شعاع کا ایک ٹائٹل بھی خراب نہیں ہونے دیا۔ اگر کوئی بد قسمتی سے ہو بھی جائے تو مرمت کرتی رہتی ہوں۔ اس سال ستمبر 2015ء کا ٹائٹل خوشگوار تاثر چھوڑ گیا۔ بہت ہلکا پھلکا تھا۔ ٹائٹل نل دیا کریں اور نیو فیشن کے لحاظ سے دیا کریں نا۔

✡

دستک دستک دستک

شاہین رشید

انعم فیاض

انعم فیاض بھی آج کل کی ان لڑکیوں کی طرح ہی ہیں جن کی نظر میں وعدے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی جو انہیں کسی قابل سمجھ کر ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کئی بار ٹائم دیا اور عین وقت پر غائب اور غائب بھی ایسی کہ نہ ایس ایم ایس کا جواب دینا ہے نہ ہی کال ریسیو کرنی ہے۔ ہاں چند گھنٹوں بعد یا ایک آدھ دن کے بعد سوری کا ایس ایم ایس آجاتا ہے کہ میں بزی تھی اس لیے آپ کو جواب نہ دے سکی۔ خیر یہ ایک چھوٹا سا شکوہ تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انعم فیاض ایک بہت اچھی اور بہت باصلاحیت فنکارہ ہے۔ کئی بار فون کرنے پر جو بات چیت ہوئی آپ بھی پڑھیے۔

"کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں؟"

"یہی کوئی چار پانچ سال۔"

"انٹرویو کیوں نہیں دیتیں؟"

"سچ بتاؤں بہت مصروف رہتی ہوں۔ پھر ایک عجیب سی جھجک سی ہوتی ہے کہ پتا نہیں کوئی کیا پوچھ لے۔ میں جواب دے سکوں نہ دے سکوں۔"

"تمہاری اداکاری میں ماشاء اللہ کافی پختگی ہے۔ کیا بچپن سے اس فیلڈ میں ہو۔۔۔ مطلب چائلڈ اسٹار ہو۔"

"بچپن سے تو اس فیلڈ میں نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے چائلڈ اسٹار سے شروعات کی تھیں۔ البتہ بچپن سے اداکاری کا شوق بہت تھا تو کبھی کبھی جب اسکول میں تھی اور جب کالج میں آئی اداکاری کا موقعہ مل جایا کرتا تھا اور یہی شوق مجھے ٹی وی تک لے آیا۔"

"مگر کیسے؟"

"پاکستان میں بڑھتے ہوئے چینلز کی تعداد دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں بھی ٹرائی کروں۔ چنانچہ "ہیرو بننے کی ترنگ" کے نام سے اداکاری کے مقابلے ہو رہے تھے۔ میں نے بھی شرکت کی۔ بڑے بڑے نام بڑے سینئرز زریتم، فیصل قریشی، سید نور اور جان ریمبو **ججز** کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میں اس مقابلے میں فائنل تک پہنچ گئی مگر پھر فائنل میں ہار گئی، جس کا مجھے بہت افسوس ہوا، مگر فیصل قریشی نے مجھے اپنے مارننگ شو کے ویڈنگ شو میں آنے کی دعوت دی اور میں نے شادی کے ایک گانے پر پرفارم کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔"

"گھر والے خوش ہوئے؟"

"کوئی خاص نہیں جب تک مجھے سوپ سیریل "احمد حبیب کی بیٹیاں" میں کام کرنے کی آفر بھی آچکی

تھی۔"

"پھر؟"

"مما تو راضی تھیں مگر والد صاحب نہیں۔۔۔ خیر' جب تھوڑا اصرار کیا تو مان گئے اور یوں میرا پہلا ڈرامہ "احمد حبیب کی بیٹیاں" تھا اور یوں باقاعدہ طور پر میں اس فیلڈ میں آگئی۔"

"بڑے مختلف قسم کے رول ہوتے ہیں۔ اتفاق ہے یا ڈیمانڈ ہے؟"

"نہ اتفاق ہے نہ ڈیمانڈ ہے۔ مجھے کوئی رول آفر ہوتا ہے تو ضرور دیکھتی ہوں کہ اس میں کرنا کیا ہے اور ایسا رول یا ملتا جلتا رول کر تو نہیں چکی اور جب ایسا کچھ نہیں ہوتا تو پھر وہ رول لے لیتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ابھی تک بہت اچھے اور مختلف قسم کے رول ملے ہیں۔"

"لوگوں کا کیا رسپانس ہوتا ہے؟"

"ناظرین کا رسپانس ہی تو مجھ میں ہمت پیدا کرتا ہے کہ میں مزید کام کروں اور بہت اچھا کام کروں۔ میرے ناظرین میرے استاد ہیں۔ میں ان کی بات بہت توجہ سے سنتی ہوں۔ ان کی تنقید جو میرے کام پر ہوتی ہے' وہ مجھے میرا کام مزید اچھا کرنے میں مدد دیتی ہے۔"

"شوبز کا ماحول صاف ستھرا ہے؟"

"ماحول تو کہیں بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ پرفیکٹ آپ کو خود کو رکھنا پڑتا ہے۔ اور اس میں آپ کے گھر والوں کی تربیت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ اب آپ سیٹ پہ آکر دیکھیں تو آپ کو کچھ لڑکیاں سگریٹ پیتی ہوئی بھی نظر آئیں گی اور کچھ لڑکیاں نماز کی پابندی کرتی ہوئی بھی دکھائی دیں گی۔"

"اچھا۔۔۔ اپنی ہم عمروں اور دیگر کے ساتھ ماحول فرینڈلی ہوتا ہے۔"

ہنستے ہوئے "فرینڈلی کم ہی ہوتی ہیں اور یہ جو آپ ڈراموں میں دیکھتی ہیں ناکہ ایک دوسرے سے حسد کرنا' سازش کرنا' کڑھنا۔۔۔ یہ سب حقیقی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ بہت سنبھل کر اور بہت بچ بچا کر رہنا پڑتا ہے' آپ یقین کریں کہ چھوٹی چھوٹی بات پر لڑکیاں ایک دوسرے سے لڑ رہی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی بہت عجیب سا ماحول ہو جاتا ہے۔"

"رات دیر سے آنے پر ڈانٹ پڑتی ہے۔ یا وقت پر آجاتی ہو'؟"

"اس فیلڈ میں جانے کا تو ٹائم ہے مگر آنے کا کوئی ٹائم نہیں ہے۔ رات کو اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ریکارڈنگ کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ ڈانٹ اس لیے نہیں پڑتی کہ گھر والوں کو معلوم ہے کہ اس فیلڈ میں کوئی ٹائم کی پابندی نہیں ہے دیر سویر ہو جاتی ہے۔"

"اتنی رات گئے گھر آنا' کام کرنا' تھکاوٹ کا ہو جانا۔ صحت تو متاثر ہوتی ہوگی تمہاری؟"

"جی بالکل ہوتی ہے۔ رات دیر تک جاگنے سے آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ چہرے کی رونق بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ مگر ایسا روز روز نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھار ہوتا ہے۔"

"اب ہمارے ملک میں بھی بڑی اچھی فلمیں بن رہی ہیں۔ کوئی آفر آئی؟"

"نہیں! ابھی تک تو کوئی آفر نہیں آئی اور اگر اچھی آفر آئے گی تو یقینا" کروں گی' کیونکہ مجھے بھی سلور اسکرین پہ کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ پڑوسیوں نے بھی فلم کے لیے اچھی پیشکش کی تو ضرور کام کروں گی۔ اب اداکاری میرا جنون ہو گئی ہے۔"

"ٹھوڑی پہ تل رکاوٹ تو نہیں بنتا؟ ویسے اس نے تمہاری معصومیت میں اضافہ کیا ہے۔"

"جی جی۔۔۔ بالکل۔"

"غصہ تیز ہے؟ فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"ارے نہیں' لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتی ہوں۔ غصہ کم آتا ہے مگر چونکہ حساس طبیعت کی مالک ہوں تو ہر بات بہت جلدی دل کو لگ جاتی ہے اور فارغ وقت میں راحت فتح علی اور عاطف اسلم کو سنتی ہوں۔"

رابعہ انعم

"کیسی ہو... ڈیئر؟"

"جی بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"روز اسکرین پہ دیکھتی ہوں۔ ماشاء اللہ بہت پیاری لگتی ہو' تھوڑی موٹی ہو گئی ہو۔"

"تعریف کا شکریہ... اور ہر گز موٹی نہیں ہوئی' یہ کیمرے ایسا دکھاتے ہیں' جب میں کسی "مال" میں لوگوں سے ملتی ہوں تو سب حیران ہوتے ہیں کہ ارے آپ تو اسکرین پہ بڑی بھی نظر آتی ہیں اور تھوڑی موٹی بھی... جبکہ نہ بڑی ہوں نہ موٹی ہوں۔"

"نیوز پڑھنا بوریت والا کام ہے یا انجوائے کرتی ہو؟"

"اچھی خبریں ہوں تو انجوائے بھی کرتی ہوں۔ ویسے زیادہ تر خبریں تو بس ڈپریشن ہی دیتی ہیں۔ اور پھر مسلسل بول بول کر کبھی کبھی بوریت بھی ہوتی ہے اور زبان بھی تھک جاتی ہے۔"

"اکثر اوقات آپ کی ڈیوٹی رات کی ہوتی ہے۔ تو گھریلو تقریبات اور اپنی ایکٹویٹی تو نہیں ہو پاتی ہو گی؟"

"بالکل جی... خاندانی تقریبات خاص طور پر شادی بیاہ کی تقریبات میں تو جانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کیونکہ میری ڈیوٹی عموماً" شام چھ بجے سے رات 1 بجے تک ہوتی ہے' اور اس وقت ساری تقریبات ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔"

"کبھی ایسا موقع آیا کہ آپ پروگرام کے دوران یعنی نیوز کے دوران رو پڑی ہوں؟"

"بالکل روئی' مگر نیوز کے دوران نہیں بلکہ کیمرہ آف ہونے کے بعد... جب سانحہ پشاور ہوا تھا اور ہم سب پورا اسٹاف لائیو ٹرانسمشن کر رہے تھے اور یہ ٹرانسمشن میرے لیے ایک بڑا چیلنج تھی۔"

"اپنی کمائی خرچ کر دیتی ہیں یا بینک میں محفوظ کرتی ہیں؟"

"کمانا اور خرچ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اور اپنی کمائی اپنے پر ہی خرچ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مجھے کپڑوں کا بہت شوق ہے۔ اچھے اچھے کپڑے پہننا میری کمزوری ہے۔"

"اس فضول خرچی پر ڈانٹ تو پڑتی ہو گی؟"

"بالکل پڑتی ہے۔ امی ناراض ہو جاتی ہیں کہ کپڑوں کا ڈھیر لگائے جا رہی ہو۔ اتنا بھی کیا شوق..."

"کہ پرائے گھر جاؤ گی تو کیا کرو گی۔ میک اپ کا بھی اتنا ہی شوق ہے کیا؟"

قہقہہ... "جی جی' ماؤں کے ریمارکس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور مجھے میک اپ کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ میک اپ میں مجھے لپ اسٹک اور کاجل کا ہی شوق ہے۔ تو اسی کا استعمال زیادہ کرتی ہوں۔"

"فون' فیس بک اور انٹرنیٹ سے دلچسپی؟"

"بالکل ہے... اور قسم خدا کی اگر یہ چیزیں ہماری زندگی سے نکال دی جائیں تو ہمیں یہ ضرور پتا چل جائے گا کہ ہماری پڑوس میں کون لوگ رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟"

"گڈ! شادی تو ہر لڑکی کی ہونی ہوتی ہے۔ اگر سسرال والوں نے کہا کہ یہ فیلڈ چھوڑ دو تو...؟"

"اگر کسی نے اس بات پر رشتہ مانگا کہ یہ جاب چھوڑ دے تو میں وہاں شادی سے انکار کر دوں گی۔ ہاں

اگر شادی کے بعد میں خود محسوس کروں کہ میری فیملی لائف متاثر ہو رہی ہے تو میں اس فیلڈ کو اپنے شوق کو چھوڑ دوں گی۔"

"آپ ایک مشہور نیوز چینل سے وابستہ ہیں۔ پہلے جب اس چینل سے وابستہ نہیں تھیں تو یہاں کی نیوز اینکر سے کچھ خائف رہتی تھیں یا حسد ہوتا تھا آپ کو؟"

"نہیں نہیں۔ حسد کا مادہ تو مجھ میں ہے ہی نہیں، سب کو رزق دینے والا خدا ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں حسد کرنے والے۔ ہاں رشک ضرور آتا تھا اور شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مجھ پہ کرم کیا کہ مجھے اس چینل پہ کام کرنے کا موقع مل گیا۔ ویسے اس چینل کو جوائن کرنے سے پہلے مجھ سے لوگوں نے کہا کہ یہاں کے سینئرز جونیئرز کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ مگر ایسا تو کچھ نہیں ہوا، سب سینئرز بہت اچھے ہیں اور سچ ہے کہ مجھے ان سے سیکھنے کا موقع بھی ملا ہے۔"

"رابعہ! آپ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہیں... کبھی کوئی مسئلہ ہوا کہ بہن پر زیادہ توجہ ہے اور ہم پر نہیں۔"

"ارے نہیں... میں تو اپنے بھائیوں کی بھی بہت لاڈلی ہوں۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرے بھائی میرا اور امی بتاتی ہیں کہ جب میں پیدا ہوئی تو میرے بابا (والد) اور دادا کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا نام ہو جس سے اظہار ہو کہ بیٹی ہمارے لیے اللہ کا انعام ہے۔ تو میرے بابا اور میرے دادا نے مل کر میرا نام "رابعہ انعم" رکھا ہے جس کے لغوی معنی "چوتھا انعام" ہے اور گھر والے کہتے ہیں کہ تم واقعی اللہ کی طرف سے ہمارے لیے انعام ہو... اور میں ہوں بھی چوتھی (4th) اور آخری۔"

"جیو" پہ اکثر برا وقت آتا ہے، کبھی سوچا کہ کسی اور چینل کی راہ لوں؟"

"برا وقت تو کسی پہ بھی آسکتا ہے۔ خواہ کوئی بھی چینل ہو، ہاں آفرز مجھے آتی رہتی ہیں۔ مگر میں اتنی خوش اور مطمئن ہوں کہ کہیں اور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ خواہ برا وقت ہو یا اچھا اور وہ انسان ہی کیا کہ جو برے وقت میں ساتھ چھوڑ دے... اور وہ بھی اس کا جس نے آپ کو سب کچھ دیا۔"

"جیو سے وابستہ ہوئے کتنے سال ہو گئے؟"

"2012ء میں جوائن کیا تھا اس حساب سے تین سال تو مکمل ہوئے ماشاء اللہ سے۔"

"گھر میں آپ کے علاوہ کس کو آپ کے جیو جوائن کرنے کی خوشی ہوئی؟"

"سب کو ہوئی، بھائیوں کو بھی، امی کو بھی، خاندان والوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا، لیکن سب سے زیادہ خوشی میرے بابا کو ہوئی اور وہ بڑی باقاعدگی سے میری نیوز دیکھتے ہیں۔"

"ایک باپ کے لیے اس سے زیادہ فخر کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی بیٹی پوری دنیا میں پہچانی جاتی ہے۔"

"جی بالکل... یہ سچ ہے۔ بابا مجھ پر فخر کرتے ہیں۔"

☆

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

پہلے آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں
آپ کی سلامتی عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط عاصمہ امجد کا ہے لکھتی ہیں

میں شعاع نہیں پڑھتی بہن لاتی ہے تو سرسری دیکھ لیتی ہوں' خط لکھنے کی وجہ ماہنامہ شعاع کا سلسلہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ہے۔ پہلی دفعہ خط لکھنے کی وجہ یہی ہے کہ مجھے یہ سب پڑھ کر بہت حوصلہ ملا بہت اچھا سلسلہ ہے اس کو ہمیشہ برقرار رہنا چاہیے۔ اپنے جیسی عورتوں کے حالات زندگی جان کر نہ صرف حوصلہ ملتا ہے بلکہ دل سے شکر بھی نکلتا ہے کہ ہم اس سے بہتر حال میں ہیں۔

بہت شکریہ عاصمہ! اس سلسلہ کو شروع کرنے کا مقصد ہی یہ تھا اور یہ تو بتائیں کہ آپ شعاع کیوں نہیں پڑھتی ہیں؟

سمیرا اشرف بھٹی نے صفدر آباد سے لکھا ہے

میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ میری لکھائی بھی اچھی نہیں اسی وجہ سے میں کبھی خط نہیں لکھ پائی لیکن آج میں خود کو روک نہیں سکی آپ کے ناولز بہت اچھے اور اصلاحی ہوتے ہیں لیکن اس میں آنے والا نبیلہ عزیز کا ناول بہت ہی برا ہے اس کو ختم کردیں اور کوئی اچھا سا ناول شروع کریں۔ نایاب جیلانی کا ناول بھی اچھا تھا۔ سمیرا حمید یا سائرہ رضا کا ناول شروع کریں "سیاہ حاشیہ" بھی زبردست ہے۔ بنت سحر کا افسانہ بہت اچھا تھا' ان سے مزید لکھوائیں۔

ج : سمیرا! جہاں تک لکھائی خراب ہونے کی بات ہے تو آپ کی لکھائی اتنی بھی خراب نہیں کہ آپ نے اس کی وجہ سے ہمیں خط نہیں لکھا۔ یقین کریں ہمارے پاس ڈبل ایم اے اور ایم ایس سی کرنے والوں کے خط بھی آتے ہیں اکثر کی لکھائی آپ کی لکھائی سے زیادہ خراب ہوتی ہے۔ کم پڑھا لکھا ہونا بھی ہمارے نزدیک اہمیت نہیں رکھتا ہمارے لیے اہم آپ کی رائے ہے۔

نبیلہ عزیز ہماری بہت اچھی رائٹر ہیں۔ کچھ ذاتی مسائل کی وجہ سے وہ ناول پر توجہ نہیں دے پا رہی ہیں۔ آپ دعا کریں کہ وہ اپنے مسائل سے نکل آئیں۔

نمرہ شیرازی پنڈدادن خان ضلع جہلم سے شرکت کر رہی ہیں' لکھتی ہیں

میں ضلع جہلم کی خوب صورت تحصیل پنڈدادن خان میں رہتی ہوں اور اس کے قریب سے دریائے جہلم گزرتا ہے اور اس کا ایک اور نام بھی ہے ارے بھئی وکٹوریہ پل نام ہے اس کا۔ ہمارے شہر سے دو کلومیٹر دور کھیوڑہ بھی ہے جسے آپ کو نمک کی کان کھیوڑہ بھی کہتے ہیں میں اسی خوب صورت علاقے کی خوب صورت سی لڑکی اور شرارتی بھی ہوں' جو اپنے والدین کی دوسری اولاد ہے۔ مجھ سے دو چھوٹے بہن بھائی بھی اور ایک بڑا بھائی' اور سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں گرلز کالج میں پڑھتی ہوں۔ میں چھٹی کلاس میں تھی جب سے پڑھتی ہوں میری امی کو بھی بہت جنون ہے شعاع پڑھنے کا۔ میں ہر مہینے خود منگواتی ہوں اپنی پاکٹ منی سے۔ اب میں شعاع کے بارے میں بتاتی ہوں شعاع میں ہر چیز

زبردست ہے "رقص بسمل" "اک تھی مثال" زبردست اور "جام آرزو" کا اینڈ کیا تھا مزہ آ گیا اور "سیاہ حاشیہ" بھی اچھا جا رہا ہے لیکن بہت لمبا ہو گیا اور پلیز آپ شہریار خان کا انٹرویو لیں اور پلیز میرا خط بھی شائع کر دیں نہیں تو مجھ معصوم بچی کا دل ٹوٹ جائے گا۔

ج: واہ مرہ! آپ تو معصوم بھی ہیں اور شرارتی بھی اور خوب صورت بھی یقیناً ہوں گی۔ آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ اس کا ہمیں واقعی افسوس ہے۔ "سیاہ حاشیہ" اختتام کے مراحل میں ہے۔ دو یا تین اقساط مزید ہوں گی۔

آپ کی امی کو شعاع پڑھنے کا جنون ہے یہ جان کر خوشی ہوئی آپ ان سے کہیں کہ وہ آپ کو شعاع منگوا کر دیں۔ آپ اپنی پاکٹ منی سے خواتین لے لیا کریں، دیکھیں مفت میں کتنا اچھا مشورہ دیا ہے ہم نے آپ کو۔

مہناز یوسف نے کراچی سے لکھا ہے

شعاع میں "خطوط آپ کے" سلسلے میں تمام خطوط جو کہ بروقت مل جائیں ضرور شامل کیے جائیں چاہے مختصر ہی کریں مگر شامل ضرور کریں۔ اس مہینے میرا افسانہ بھی شامل ہوا تھا مگر خط نہ شامل ہونے کا دکھ اپنی جگہ تو پھر وہ بہنیں جو کہ صرف اپنے خط کے ہی شائع ہونے کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں انہیں کتنا دکھ ہوتا ہو گا۔ یہ بات کہ آپ تمام خطوط بہت توجہ سے پڑھتی ہیں تسلی بخش ہے پھر بھی۔ اور

پہلے "پیاری" لگاتی ہیں تو بہت "پیارا" لگتا ہے مجھے۔

نایاب جیلانی کا "منظر سے ہٹ کر" زبردست ناول تھا۔ شرارتی ذوہیب بہت پسند آیا اور ذوہیب کی امی کا کردار تو بہت ہی دلچسپ تھا۔ ویسے اس قسم کی خواتین اصل زندگی میں بھی دیکھی ہیں میں نے۔

نازیہ رزاق کا ناول "عشق پل صراط جیسا" مجھے بہت پسند آیا۔ کچھ کچھ فلمی سا مگر بہت دلچسپ ناول تھا۔ مریم بنت ارشاد کا "انوکھے رشتے" بھی اچھا لگا۔ میت کے گھر میں اپنے جوتے رکھوا دینا۔ کچھ انوکھا سا قصہ لگا۔

شہبانہ فاطمہ، بنت سحر اور فرزانہ عامر بھی اچھی رہیں۔

بشریٰ سعید کی والدہ کے انتقال کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بشریٰ سعید کی والدہ کی مغفرت فرمائیں۔ (آمین)

"سیاہ حاشیہ" میں بختاور اور ہاشم کی داستان دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔

اور آخر میں ان تمام بہنوں کا بہت شکریہ جنہوں نے میرے افسانے "تو میرا ہیرو" کو پسند کیا۔

اور ہاں نومبر کے شمارے میں مریم عزیز کا ناول "وہی راستہ وہی منزل میری" بہت بہت بہت ہی اچھا ناول تھا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اس ناول کی تعریف مجھ پر ادھار تھی۔ سو آج ادھار چکا رہی ہوں۔

ج: پیاری مہناز! ہم نام کے ساتھ پیاری صرف لکھتے ہی نہیں بلکہ ہم اپنی قارئین سے پیار بھی بہت کرتے ہیں اور آپ تو ہمیں ڈبل پیاری ہیں کہ آپ قارئین کے ساتھ ساتھ ہماری مصنفین کی فہرست میں بھی شامل ہو گئی ہیں بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ ہمارا پورا پرچا پڑھتی ہیں۔ آپ کو شعاع کی تحریریں پسند آئیں۔ بہت شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ ایک بات آپ سے بھی کہنی ہے، وہ یہ کہ آپ میں مزاح لکھنے کی صلاحیت ہے ہلکے پھلکے مزاحیہ افسانے لکھیں تو زیادہ کامیاب رہیں گی۔ ویسے بھی ہمارے ہاں مزاح لکھنے والوں کی کافی کمی ہے۔

ستارہ خان نے میانوالی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل سے شعاع کا آغاز کیا، ماڈل میرا فیورٹ رنگ کا سوٹ پہنے مجھے تو دہری خوشی سے نواز گئی۔ جانے کیوں خوشیاں پل کی مہمان لگتی ہیں اور جانے کیوں دنیا میں خوشیاں کم پائی جاتی ہیں.... یا ہمیں کم لگتی ہیں....

حمد و نعت سے دل کو شاد کیا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں.... دجال کے حوالے سے معلومات اور ہمارے پیمبروں کے قول دل میں اترتے چلے گئے۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ ن ق کا کافی تلخی بھرا احوال دکھ اور افسوس ہمارے ساتھ چلتے رہے جب جب پڑھتے گئے۔ بندھن میں نادیہ حسین کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ خطوط پڑھے تمام کے تمام شاندار رہے۔

نہلے پہ دہلا افسانہ بہت ہی خوب صورت تھا۔ علیزے اور علی شیر کی نوک جھوک پر کافی ہنسی آئی۔ وڈا کھیل وڈا کھیل ہی رہا مکمل ناول منظر سے ہٹ کر ضروری نہیں جیسا دکھائی دے ویسا ہی ہو۔ انسان انسان کو چاہے جتنا بھی کند ذہن جاہل گنوار سمجھ لے کہہ لے پر قدرت

اپنے بنائے ہوئے شاہکار کو کبھی نامکمل اور ناقص نہ سمجھے گی اور نہ بنائے گی۔ کھٹی میٹھی یادیں۔ آج میری خاموشی کو توڑا بنت سحر کے افسانے نے' بہت ہی خوب صورت اور شاندار الفاظ کا چناؤ کیا گیا۔ یقین مانیے ایسا پانچ سالوں میں پہلی بار ہوا کہ کسی افسانے کو میں نے کئی بار پڑھا ہو....
عشق پل صراط جیسا.... عشق واقعی پل صراط جیسا ہی ہے' کوئی بھی اس پر آسانی سے نہیں چل سکتا۔ داور ملک اور عیان شاہ کا کردار دل میں اتر گیا۔ وقت کا آئینہ بھی اچھی کاوش تھی۔ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ "جام آرزو" جیسے شاہکار کہانی بھی ختم ہوئی۔ "سیاہ حاشیہ" اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ جاری ہے.... "رقص بسمل" جمود کا شکار ہے۔

ج : پیاری ستارہ! خوشیاں تو واقعی کم ہی پائی جاتی ہیں اس دنیا میں جتنا ظلم' زیادتی' غربت' بیماری اور دکھ ہے' اس میں خوش ہونا تو بڑی بات خوشی کا لفظ بھی محال لگتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں دوسروں کو خوشی دیں' وہ لوٹ کر آپ کے پاس ہی آئے گی۔ اپنے حصے کی شمع جلانے والی بات ہے۔ جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے' وہ ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے میں عورت اتنی بھی مظلوم نہیں جتنا آپ کو دکھ ہوا' انہوں نے کچھ تکلیفیں ضرور سہیں لیکن بالآخر ان کے حالات بہتر ہوئے۔ عورت مظلوم ضرور ہے لیکن کبھی غور کیجئے گا عورت کو مظلوم بنانے والی ظالم بھی عورت ہی نظر آئے گی۔

بنت سحر واقعی بہت خوب صورت اضافہ ہیں۔ ان کے ہاں واقعی الفاظ بہت خوب صورت ہیں کہانی پر تھوڑی توجہ دیں تو شاہکار تخلیق کر سکتی ہیں۔

کراچی سے مریم یوسف خان لکھتی ہیں

آپ نے ایک خط کے جواب میں لکھا کہ "ہمیں کراچی سے خط ہی موصول نہیں ہوتے۔ تو پھر میرا خط؟" یا تو آپ کو میرے خط ملتے نہیں ہیں یا تو پھر میں چیچہ وطنی میں رہتی ہوں۔ آپی! خط شائع کریں یا نہیں کریں لیکن یہ تو نہ کہیں کہ خط ہی نہیں ملا!
خیر یہ شکوہ تو اب ختم۔ اصل میں جس سے محبت ہوتی ہے ناں اس سے شکایت جتنی بھی ہو لیکن ناراض ہوا ہی نہیں جاتا۔ کچھ ایسا ہی تعلق میرا شعاع کے ساتھ ہے۔
لیکن اب میں میٹرک کی طالبہ ہوں اور میری ماما بھی رسائل کی بے انتہا شوقین ہیں سو میرے اور شعاع کے درمیان ظالم سماج تو نہیں ہے لیکن میری اور ان کی شعاع پہلے پڑھنے کے لیے لڑائی ضرور ہوتی ہے۔ جس میں میں جیت جاتی ہوں (سوئیٹ پاکستانی مائیں) خیر بات کہاں سے کہاں نکل گئی' بات تھی شعاع پڑھنے کی تو بقول پھپھو (اور ان کی بیٹیاں) یہ اتنا موٹا چشمہ اسے پڑھ پڑھ کر لگا ہے" اب آپ ہی انصاف سے بتائیں۔ پڑھتے رہنے سے تو صرف قریب کی نظر کمزور ہوتی لیکن میری تو دور کی ہے؟ (کوئی تو انصاف دلائے معصوم بچی کو)

: معصوم بچی! اگر کراچی والوں کے خط ہمیں پرچا شائع ہونے کے بعد ملیں تو ہم انہیں شامل تو نہیں کر سکتے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ جنوری کی کاپیاں پریس جا رہی ہیں۔ آج 13 دسمبر کو آپ کا خط ملا ہے۔ جس میں نومبر کے شمارے پر تبصرہ ہے' بلاشبہ تبصرہ بہت اچھا اور تفصیلی ہے لیکن....؟
آئندہ خط جلدی لکھیں اور ہاں اپنی امی کو ہمارا سلام پہنچا دیں۔ ان ہی کی وجہ سے تو آپ کی شعاع سے دوستی ہوئی ہے۔

صائمہ مشتاق احمد نے حافظ آباد سے لکھا ہے

ماڈل خوب صورت تھی مگر تاثرات مصنوعی سے تھے۔ کچھ اکڑی ہوئی سی لگ رہی تھی جیسے کمر درد میں مبتلا ہو۔ ہی ہی ہی "سیاہ حاشیہ" میں جو شک تھا' یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ سارے کردار رشتوں کی ڈور میں بندھنا شروع ہو گئے ہیں۔ بہرحال بے حد مزہ آ رہا ہے تجسس کے باوجود۔

"سیاہ حاشیہ" کے بعد جب "منظر سے ہٹ کر" دیکھا تو بے حد لطف آیا۔ نایاب جیلانی کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا آئینہ۔ اس کی بہت ساری باتوں کو بہت سارا انجوائے کیا۔ شافعہ کی ساس کا کردار بھی بہت پسند آیا۔ خاص طور پر ان کی ہمہ وقت تیار رہنے والی عادت بہت بھائی اور شافعہ کے لیے آخر میں ان کی فکر بھی دل کو خوب بھائی۔ "جام آرزو" شروع سے ہی اچھا رہا۔ مہوش افتخار کو اتنا اچھا ناول لکھنے پر بہت سی مبارکباد۔ نازیہ رزاق کا "پل صراط" بس ٹھیک تھا اور واقعی کہانی تھا۔ کچھ باتیں قابل وضاحت ہیں۔ قدرت اللہ شاہ آٹھ سال بعد داؤد کو ڈھونڈ

لیتے ہیں' زیبائش وغیرہ ہر چیز حتیٰ کہ یہ بھی کہ اس کی بہن کس ہسپتال میں کام کرتی ہے' وہ یہ کیوں نہ جان پائے کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔ ہر چیز کی کھوج لگانے والے قدرت اللہ شاہ سے کم از کم یہ بات نہیں چھپی رہنی چاہیے تھی۔ داؤد اور عیان کا ایک ہی سے ایک جیسا خواب ڈرامائی سا تھا۔ عیان کی آواز جانے کا دکھ ہوا اور کورین فلم "ڈیزی" یاد آئی جس میں ہیروئن ہیرو کی جان بچاتے ہوئے ایسے ہی گلے میں گولی لگنے سے آواز سے محروم ہو جاتی ہے۔ بہرحال ٹائم پاس کرنے کے لیے اچھی کہانی تھی اور کچھ نہیں۔

ایمل رضا! تعریف کے لیے الفاظ نہیں اور دل افسردگی کی تہہ میں لپٹ لپٹ گیا کہ کاش ہم بھی ایسا لکھنے کے قابل ہوتے یا ہو ہی جائیں۔ انداز تحریر بے حد عمدہ۔ پرانے دور کی یاد دلا گیا جب نثر نگاری لاجواب ہوتی تھی۔ بہت سے جملوں نے نگاہوں کو روک لیا۔ اختتام کا تو اندازہ ہی نہیں ہو پایا کہ ایسا ہوگا۔ عاصم کا وڈا کھیل دل دکھا دینے والا تھا۔ لیکن زہرہ بھی ٹھیک کہتی تھی۔ "وڈا ڈاکٹر" ہی اب علاج بھی کرے گا اور انصاف بھی۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ خاص طور پر "نہلے پہ دہلا" اور "کھٹی میٹھی" یادیں کمال تھے "کھٹی میٹھی یادیں" طرز اسلوب بے حد شاندار اور "نہلے پہ دہلا" میں مکالمے زبردست۔

مستقل سلسلے کمال کے' زبردست' شاندار اور سب کچھ تھے۔ خاص طور پر تاریخ کے جھروکے اس بار بہت اچھا تھا۔ اچھا شعاع کے افسانے اب کبھی کبھی مزے کے نہیں ہوتے۔ پلیز اس طرف تھوڑی نظر کرم کردیں۔

ج : پیاری صائمہ! شعاع میں عام طور پر تین یا چار افسانے ہوتے ہیں اور دسمبر کے پرچے میں دو افسانے تو آپ کو پسند آئے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک یا دو افسانے آپ کو اچھے نہیں لگے۔ پھر بھی ہم آپ کی فرمائش پر افسانوں پر خصوصی توجہ دیں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

خدیجہ نیر اللہ بخش سعیدی نے لکھا ہے

پہلی شعاع کا پورا صفحہ پڑھا' بابائے قوم کی یوم پیدائش پر لکھی تحریر دل کو بھا گئی۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اچھی تھیں۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے شاندار سلسلہ ہے اس سے نئی نویلی دلہنوں کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ بندھن میں نادیہ حسین ہمراہ عاطف حسین بہت اچھے لگے خط آپ کے پڑھ کر خوشی ہوتی ہے اور جواب پڑھ کر یہ خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ کھٹی میٹھی یادیں بہت اچھی لگی۔

ج : پیاری خدیجہ! آپ نے صرف سلسلوں میں تبصرہ کیا ہے اور ایک افسانے پر لکھا ہے۔ خط بھجوانے کی جلدی تھی' اس لیے پورا شعاع نہیں پڑھ سکیں یا صرف سلسلے ہی پڑھتی ہیں؟

آپ نے شاید پہلی بار خط لکھا ہے۔ آئندہ بھی شرکت کرتی رہیے گا تفصیلی تبصرے کے ساتھ۔

رابعہ حسین کراچی سے شریک محفل ہیں' لکھتی ہیں

کئی ماہ تک سختی سے قلم روکے رکھا لیکن اس دفعہ "سیاہ حاشیہ" کی قسط پڑھ کر مزید ضبط کرنا ممکن نہ رہا۔ یوں تو پہلی قسط سے ہی اعتراض تھا کہ مصنفہ خوامخواہ بڑھا چڑھا کر بینش کو برا دکھا رہی ہیں حالانکہ حالات و واقعات کے مطابق یہ اس کا صحیح رد عمل ہے۔ مگر اس قسط میں بڑی اماں اور ان کی اولاد کے تضحیک آمیز جملے اور اس کی صورت شکل کو برا بھلا کہنا' بہت ہی برا لگا۔

افسانوں میں اکثر ہی یہ انتہاپسندانہ رویہ ہوتا ہے کہ جسے اچھا دکھانا ہے وہ کوثر و تسنیم سے دھلا ہوا ہے اور جسے برا دکھانا مقصود ہے' وہ سر سے پاؤں تک برا ہے۔ صائمہ کے حوالے سے دیمک زدہ محبت کی ماہم اور جنجوعہ ہاؤس میں پھوپھی کا گھرانہ اس کی مثال ہیں۔

نازیہ رزاق کا "عشق پل صراط جیسا" بھی گھسے پٹے پلاٹ پر مبنی تھا۔ 1960ء سے اس موضوع پر افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ اب تو جیسے ہی پڑھتے ہیں کہ خاندان کے ایک فرد نے مخالفت کے باوجود اپنی مرضی سے شادی کر لی تو باقی کہانی خود ہی سمجھ جاتے ہیں۔ خدارا اب تو اس پلاٹ کو بخش دیں۔

ہمارے معاشرے کا اخلاقی معیار کافی زیادہ گر گیا ہے۔ مذہبی شعار تو ایک طرف' عام معاشرتی اقدار بھی دم توڑتی نظر آ رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرا حسن ظن ہے کہ کچھ نہ کچھ غیرت ابھی بھی موجود ہے۔ لیکن "رقص بسمل" کا تیمور اور "سیاہ حاشیہ" کا ماہیر نہ جانے کیسے بھائی ہیں اور ان کی غیرت کہاں جا سوئی ہے۔

ایسے مردوں کو ہیرو بنا کر پیش کرنا کم علمی ہے' ماڈرن ازم ہے یا معاشرے میں بے غیرتی پھیلانے کی مہم؟

ج : آپ تو بہت زیادہ ناراض ہیں لیکن کسی بھی کردار کو اس کے پس منظر سے ہٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا' ماہیر کی تعلیم و تربیت باہر ہوئی ہے۔ وہ اپنی بہن سے بے تکلف ہے اور اس سے ہر موضوع پر بات کرتا ہے۔ بہر حال آپ نے توجہ دلائی ہے تو ہم آئندہ مزید احتیاط کریں گے۔ بینش کے بارے میں آپ سے متفق ہیں۔ اس کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ہمارے ہاں ابھی تک شادی بیاہ کے مسائل ہی حل نہیں ہوئے۔ ہم یہ ہی طے نہیں کرپائے کہ شادی میں لڑکی کی رضا مندی بھی ہونا چاہیے۔ تیمور کا کردار آپ کو اسی لیے قابل اعتراض محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اپنی بہن کی رضا سے اس کی شادی چاہتا ہے' وہ اس پر زبردستی کے حق میں نہیں ہے' یہ ضرور ہے کہ اس نے غلط راستہ چنا ہے۔

کنزی جدون نے ایبٹ آباد سے لکھا ہے

میں شعاع کی بہت پرانی قاری ہوں۔ اتنی پرانی کہ جب پہلی کہانی پڑھی تو سر کے اوپر سے گزری کیونکہ تب میں پانچویں کلاس کی طالبہ تھی۔ میں نے ایک ناول لکھا ہے "اب کے ہم جدا نہ ہوں گے" کیا میں ایک قسط بھجوا سکتی ہوں جس کو پڑھنے کے بعد آپ مجھے بتا دیں کہ یہ ناول قابل اشاعت ہے کہ نہیں۔

ج : پیاری کنزی! آپ ہمیں کم از کم چھ اقساط بھجوائیں تب ہی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

طوبیٰ' مریم اور ایشاع نے سنجرپور سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین تین دسمبر کو موصول ہوئے۔ پہلی بار ایسا ہوا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کون سا پہلے پڑھیں۔ سب سے پہلے صائمہ جی کی کہانی کی طرف بڑھے۔ صائمہ جی ہم گورنمنٹ ڈگری کالج صادق آباد میں پڑھتے ہیں۔ ہماری پھوپھو نے آپ سے پڑھا ہے۔ اگر کوئی لڑکی آپ کا ذکر کرتی ہے تو ہم اسے یہ بتانا ضروری سمجھتی ہیں کہ آپ اس کالج میں لیکچرار تھیں۔ صائمہ جی آپ نے خواتین میں لکھا تھا کہ فاطمہ زاہد اگر آپ کی تحریر کی تعریف کر دیں تو آپ مطمئن ہو جاتی ہیں۔ ہم اتنا خوش ہوئیں کہ ہم ان سے آپ کا نمبر لیں گے' اب "رقص بسمل" کی طرف چلتے ہیں۔ نبیلہ جی! آپ جو دو چار صفحے دیتی ہیں وہ بھی نہ دیا کریں' اکٹھی ایک بار دے دیجئے گا۔ "ایک تھی مثال" کو اب ختم ہو جانا چاہیے۔

ج طوبیٰ! مریم اور ایشاع "سیاہ حاشیہ" کے بارے میں آپ کے تمام اندازے درست ہیں۔ (شائع اس لیے نہیں کیے کہ قارئین کا تجسس ختم نہیں کرنا چاہتے۔) صرف عبداللہ کے بارے میں آپ کا اندازہ غلط ہے' صائمہ جی تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

✡

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، نا قابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

رخسانہ نگار عدنان

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

پچیسویں قسط

دونوں کا ہی یقین ٹوٹا تھا۔
دونوں ہی بے بھروسا ہوئے تھے' ایک دوسرے سے نظریں چرائے دونوں کتنی ہی دیر خاموش بیٹھے رہے تھے۔
"میں پہلی اور آخری بار تم سے صرف یہی کہوں گا میرا پری سے کوئی تعلق نہیں ہم دونوں کے درمیان کچھ نہیں۔۔۔ لیکن اگر وہ اسی طرح ہم دونوں کے درمیان ڈسکس ہوتی رہی تو شاید۔۔۔ ہم دونوں کے درمیان کچھ بھی نہیں بچے۔" واثق پشت پھیرے ٹوٹے ہوئے تھکے تھکے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اور مثال یک ٹک اس کی پشت کو دیکھتی جارہی تھی۔
کمرے میں پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھاگئی۔
"جتنا تم اسے جانتی ہو۔ میں نہیں جان سکتا' پھر بھی تم نے اس کی بکواس پر یوں یقین کرلیا کہ مجھ سے باز پرس کرنے لگیں ہیں اب اس پہ کوئی بات نہیں کروں گا۔ تمہیں جیسا ٹھیک لگے اسی پر یقین کرلینا۔" کہہ کر لمحہ بھر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
مثال اس سے کچھ کہنے کے لیے تیزی سے آگے بڑھی اور اگلے قدم پہ وہیں رک گئی۔
"جب اس نے کہہ دیا کہ اب وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرے گا تو میں بھی اب کچھ واثق سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ نہیں بات کروں گی۔" اس نے اسی قدم پہ کھڑے کھڑے فیصلہ کرلیا۔
واثق نے اگر اپنے اور میرے درمیان دیوار اٹھانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو یونہی سہی۔۔۔ میں بھی مزید کوئی سوال نہیں کروں گی۔
اس نے ان لمحوں میں بہت کچھ سوچ لیا تھا جس میں صرف دوری کے امکان تھے اور فاصلوں کا ارادہ!
وہ نڈھال سی یونہی کرسی پہ گرگئی۔
تو پھر سے وہی کہانی شروع ہونے جارہی ہے' جو ماما اور پاپا کے درمیان ہوئی تھی۔ معمولی سی رنجش' چھوٹی موٹی لڑائیاں اور ان کے بیچ نامحسوس انداز میں دیواریں اٹھتی چلی گئیں۔
"مثال بیٹا! یوں اکیلی کمرے میں کیوں بیٹھی ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" عاصمہ ہلکے سے دروازہ بجاکر اندر آئی تھی اور عادتاً نرم لہجے میں پوچھنے لگی۔
مثال ایک دم سے سیدھی ہوئی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں آنٹی! آئی ایم فائن' آپ آئیں نا' بیٹھیں۔" وہ جلدی سے انہیں بٹھانے کے لیے کمرے میں بکھری چیزیں اٹھانے لگی۔
"مثال! مجھے انٹرفیئر تو نہیں کرنا چاہیے تم دونوں' آئی مین تمہارے اور واثق کے معاملے میں۔۔۔ لیکن واثق اس کی عادت نہیں ہے غصے میں یوں ری ایکٹ کرنے کی۔۔۔ دروازہ بہت زور سے بند کرکے گیا تو مجھے کچھ پریشانی سی ہوئی۔" وہ رک رک کر بولی۔
"کیا تم دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہے کوئی ایسی بات؟" وہ کچھ جھجک کر پوچھ رہی تھی۔
مثال نے آہستگی سے نفی میں سرہلایا۔
"نہیں آنٹی۔۔۔ ایسا کچھ تو نہیں ہوا۔" وہ نظریں چرا کر آہستگی سے بولی۔ عاصمہ اسے بس دیکھتی رہ گئی۔ پھر کسی خیال سے ہلکا سا مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔
"ایک تو بیٹا! مجھے یہ آنٹی وانٹی مت کہا کرو' جس طرح میں واثق کی امی ہوں' ماما ہوں تمہارے ساتھ بھی میرا یہی رشتہ ہے۔ امی کہا کرو مجھے۔" وہ اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔
"جی۔۔۔ امی!" آہستگی سے وہ کہہ پائی۔

”جیتی رہو۔۔۔ مثال! یہ تمہارا گھر ہے اب بیٹی اور یہاں کے سب لوگ بھی تمہارے اپنے۔“ وہ کچھ سمجھانا چاہ رہی تھی شاید۔

”جی!“ مثال کچھ ناسمجھی سے بولی۔

”میری جان! لوریہ کو تھوڑا ٹائم دیا کرو' میرا مطلب ہے' اس کے ساتھ تھوڑی دوستی تھوڑی انڈر اسٹینڈنگ ڈویلپ کرو۔ اسے بھی اچھا لگے گا اور تم بھی بہتر محسوس کرو گی۔ گھر کی فضا تو لازما“ اس سے خوشگوار ہو گی ہی۔۔۔“ وہ عادتا“ پھر مسکرائی۔

”تم سمجھ رہی ہو ناں میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں؟“ مثال سرہلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

واثق سے آفس میں بھی کچھ کام نہیں ہو پا رہا تھا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مثال اس کے شدید جذبوں کی' اس کی محبت کی ایسی توہین بھی کر سکتی ہے۔

بری۔۔۔ آخ۔ اسے جیسے خود سے بھی گھن آئی' وہ لڑکی کتنی سستی ہے' یہ کوئی مجھ سے پوچھے جو میرے یا کسی بھی ایک لڑکے کے اشارے پر۔۔۔

”اور مثال نے مجھے اس کے ساتھ جوڑ دیا“ واثق کو رہ رہ کر اپنے جذبوں کے کم قیمت ہونے کا اور مثال کی نظروں کا عجیب تضحیک بھرا احساس زخمی کیے جا رہا تھا۔

اس نے تھک کر پین واپس ہولڈر میں رکھ دیا۔ شہزاد آج بھی آفس نہیں آیا تھا۔

واثق کو اس سے اب پارٹنر شپ ختم کرنی تھی مگر زہیر کے مسلسل ہاسپٹل میں ہونے کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ بات شہزاد سے نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ آج کل اپنے لیے آفس دیکھ رہا تھا اور کچھ بنیادی قدم جو اسے پارٹنر شپ ختم کرنے کے بعد لینے تھے اس کے لیے روز اپنے قانونی مشیر سے مل رہا تھا۔

آج بھی اسے آفس سے واپسی پر وہیں جانا تھا لیکن اب اس کا دماغ بالکل غیر حاضر تھا' وہ رات تک آفس میں ہی بیٹھا رہا بنا کچھ کیے۔

☼ ☼ ☼

آئینہ ہاتھ میں پہنی ڈائمنڈ رنگ کو دیکھتے ہوئے مسلسل روئے جا رہی تھی بشریٰ اسے چپ کراتے کراتے خود بھی جیسے ہلکان ہو چلی تھی۔

”میری جان! آئینہ بس کرو' اب اور کتنا روؤ گی میری بیٹی! یہ موقع تو خوشی کا ہوتا ہے۔ لڑکیاں اسے انجوائے کرتی ہیں۔“

وہ بار بار مختلف انداز میں اسے یہی ایک بات سمجھانے کی کوشش کر چکی تھی مگر آئینہ تو جیسے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

”مجھے نہیں کرنی نا شادی' پھر میں کیسے انجوائے کروں اس بات کو جس میں میری مرضی' میری خوشی شامل ہی نہیں۔“ وہ روتے ہوئے پھٹی آواز میں چیخی تھی۔

”تمہاری خوشی کس میں ہے۔ تمہاری مرضی کہاں ہے۔ بتاؤ مجھے' میں اس کو ارینج کر دیتا ہوں۔“ احسن کمال ایک دم سے اندر آیا تھا اور کھردرے لہجے میں براہ راست آئینہ سے بات کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

بشریٰ لمحہ بھر کو پریشان سی بیٹھی رہ گئی۔

"احسن! آپ ٹینس نہیں ہوں یہ کچھ نہیں کہہ رہی۔" بشریٰ احسن کی طبیعت کا خیال کرکے فوراً" کھڑے ہوتے ہوئے آئینہ کو ناراض نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"بشریٰ! تم پلیز کچھ دیر کے لیے باہر جاؤ۔" احسن بے تاثر لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ لحہ بھر کو خاموش کھڑی رہ گئی۔

"جاؤ بشریٰ!" وہ اب کے کچھ ناگواری سے بولا۔

بشریٰ ایک نظر آئینہ کو دیکھ کر آہستگی سے باہر نکل گئی' آئینہ اب خود کو سنبھال چکی تھی ؛ احسن چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"ایک بات آئینہ! اپنے دل میں بٹھالو۔ آپ کے پیرنٹس سے زیادہ کوئی بھی آپ کی بہتری نہیں چاہ سکتا۔ خود آپ بھی نہیں' آپ سمجھ رہی ہوناں؟"

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"ولید وہ لڑکا ہے جو میرے خیال میں تمہارے لیے اس پورے ورلڈ میں بہترین چوائس ہے۔" وہ رک کر بولا تو آئینہ نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

"اسے میری جانب داری نہیں سمجھنا' یہ فیکٹ ہے ولید تمہارے لیے پرفیکٹ میچ ہے۔ آج نہیں تو ایک دو سال بعد بھی تمہاری شادی تمہیں کرنی ہے ناتو اب ایک اچھی فیملی ؛ اچھا لڑکا مل رہا ہے تو تمہیں کیا پرابلم ہے اگر تم کسی اور میں انوالو ہو تو۔"

"پلیز پاپا!" وہ جیسے تڑپ کر رہ گئی۔

"میں جانتا ہوں تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی۔" وہ طمانیت بھرے لہجے میں جیسے ہلکا پھلکا ہو کر بولا۔

"بیٹا! دن کبھی بھی ایک جیسے نہیں رہتے اور وقت ہمیشہ آپ کے لیے پھولوں بھری خوب صورت ٹوکری ہاتھ میں لیے آپ کے رستے میں نہیں کھڑا رہتا کہ ہمیشہ ہی آپ پر محبتوں' خوشیوں اور پیار کے پھول برستے رہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"پاپا۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" وہ کچھ ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مجھے لگتا ہے آئینہ میری جان کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے کہ میں دیکھ سکوں کہ وقت وہ ٹوکری میری اس پیاری سی باربی ڈول کے اوپر خالی کررہا ہے' بلکہ اس میں مزید پھول بھرتے جارہے ہیں' رنگ برنگے خوشبودار وہ باسکٹ کبھی بھی خالی نہیں ہو۔" وہ کھوئے ہوئے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"پاپا! میں بالکل نہیں سمجھ پارہی کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں پلیز میں واقعی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی' مجھے پڑھنا ہے اپنی اسٹڈیز کمپلیٹ کرنا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" وہ کچھ چڑے ہوئے انداز میں تیز تیز کہتی چلی گئی۔

"او کے میں سب سمجھتا ہوں' ولید اور اس کی فیملی بھی سمجھتی ہے مگر کیا کریں۔ یہ تقدیر نہیں سمجھتی۔ یہ مہلت نہیں دیتی جبکہ میں خود بھی دل سے چاہتا تھا۔ میں اپنی بیٹی کو یہ ساری کامیابیاں سمیٹتے ہوئے دیکھوں۔"

وہ افسردہ سے انداز میں کہہ کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"پاپا! کیا ہوا ہے' آر یو آل رائٹ۔" وہ کچھ ڈر سی گئی۔

احسن نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرا کر اس کے بال ہلکے سے سہلا کر بولا۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں میری آئینہ ہمیشہ خوش رہے اور میرا دل اس کی خوشیوں کا سوچ کر ہمیشہ ہلکا پھلکا رہے

’میری بیٹی کو کبھی کوئی غم نہیں ملے۔“
”آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔
”تو پھر بس اتنا جان لو میرے پاس وقت کم ہے‘ مہلت تھوڑی ہے کہ میں تمہاری ساری کامیابیاں دیکھ سکوں۔ اس لیے صرف دلہن بنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے باپ کی یہ خواہش‘ خوشی تو پوری کرو گی ناں آئینہ؟“
وہ ششدر سی باپ کو دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

”یہ کیا کہہ رہے ہو درانی تم؟“ عدیل شاکڈ سا دانیال کی شکل دیکھنے لگا تھا۔
”پاپا! آئی ایم سوری۔“ وہ جھکے ہوئے سر کو اور بھی جھکا کر بولا۔ عدیل کو لگا کہیں قریب میں چھوٹا موٹا بم پھٹا تھا۔
”تم نے کیا کیا ہے۔ پلیز مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ؟ اگر تم کچھ چھپاؤ گے تو.... دانی مجھے کچھ ہو رہا ہے۔“ عدیل کو ایک دم سے سینے میں عجیب سی گھبراہٹ کا جان لیوا احساس ہوا تھا۔
”پلیز پاپا! میں اس لیے آپ کو کچھ نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔“ وہ پریشان ہو کر باپ کا سینہ سہلانے کے لیے جھکا تھا۔
عدیل نے سرد مہری سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔
”مجھے تم سے کسی ہمدردی کی بھیک نہیں چاہیے جو کچھ تم میرے ساتھ کر چکے ہو۔ کرنے جا رہے ہو‘ یہی کافی ہے۔“ وہ سینہ سہلا کر تلخی سے بولا۔ دانیال خاموش شرمندہ سا باپ کی شکل دیکھے گیا۔
”پاپا! آپ میرا یقین کریں....“ اس نے کچھ دیر بعد بولنا شروع ہی کیا تھا کہ عدیل نے رکھائی سے اسے ٹوک دیا۔
”مجھے تمہارا یقین رہا ہی نہیں۔“ دانی بے بسی سے باپ کو دیکھنے لگا۔
”پھر میں کیا کروں کون سی قسم کھاؤں کہ آپ کو میری بات کا یقین آجائے... پاپا میں بہت ٹائم سے مطلب بہت دنوں سے یہ سب کام.... دوستوں کو‘ ان کی کمپنی کو چھوڑ چکا ہوں اور اسی بات پر وہ لوگ مجھ سے ناراض تھے۔“
وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا جب اندر آتی عفت اس کی بھاری آواز سن کر وہیں ٹھٹک کر رک گئی تھی۔
”انہوں نے مجھ سے اس بات کا بدلہ لینے کے لیے انتقاماً میرا نام اپنے ساتھیوں میں دے دیا ہے جنہوں نے بینک میں ڈکیتی کی اور سیکورٹی گارڈ کا مرڈر کیا۔“
عفت کو لگا زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرک رہی ہے‘ اس نے بے اختیار دروازے کو تھاما تھا۔
”دانی!“ عدیل پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔
”پاپا! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے‘ پلیز مجھے بچالیں میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔ بلیو می.... میرا اب ان سب سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ جیسے برداشت کھو کر باپ کے زانو کے پاس بیٹھ کر سسکنے لگا۔
”میں تو اب ان سے ملتا بھی نہیں۔ ان کی کال بھی پک نہیں کرتا۔ اتنے دنوں سے کلاسز بھی نہیں لے رہا... گھر سے بھی نہیں نکلتا آپ ماما سے پوچھ لیں۔“
وہ آنسو ضبط کرتا اپنی صفائیاں دے رہا تھا۔ جن پر اب عدیل کو ذرا بھی بھروسا نہیں رہا تھا۔ وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ فوزیہ پھپھو سے بات کریں وہ مجھے بلوالیں فوراً" میں چلا جاؤں گا یہاں سے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا میں وہاں سیٹل ہوتے ہی آپ کو اور ماما کو بھی وہیں بلوالوں گا۔"

وہ بڑے بڑے ارادوں کے ساتھ جوش میں بولتا ہوا آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھ رہا تھا۔

"اس مہربانی کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے' اب اس عمر میں نہ میں نہ تمہاری ماں کہیں اور جانا چاہیں گے۔" عدیل تلخی سے بولا تھا۔

"پھر آپ کریں گے نا پھپھو کو فون؟" وہ پھر سے ملتجی لہجے میں بولا عدیل تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ایف آئی آر کون سے پولیس اسٹیشن میں درج ہوئی ہے اس کیس کی؟" عدیل کے اچانک سوال نے دانی کو بے مزہ سا کیا تھا۔ وہ کچھ ناگواری سے باپ کو دیکھنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ کوفت سے بولا۔

"تو معلوم کرو۔ بتاؤ مجھے ابھی کال کرو کسی کو؟"

"لیکن پاپا اس طرح تو۔۔۔" وہ جھنجلا کر بولنے لگا تھا۔

"دانی! فرار تمہارے کیس کو اور خراب کردے گا۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے اور ویزا' پاسپورٹ وہاں جانا اس سارے پروسیس میں ٹائم لگتا ہے' دن نہیں کچھ مہینے نہ سہی' ہفتے تو ضرور لگیں گے اگر پولیس نے اس دوران تمہیں اریسٹ کرلیا۔ نہیں' پہلے تمہاری بیل بی فور اریسٹ (ضمانت قبل از گرفتاری) ہونا چاہیے مجھے پتا کر کے بتاؤ' سارے معاملے کا۔"

عدیل خود کو کچھ سنبھال چکا تھا' رک رک کر دانی کو سمجھاتے ہوئے جیسے خود کو تسلی دے رہا تھا۔

"پاپا۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر یہ معاملہ ایک بار چل نکلا' آئی مین کورٹ وغیرہ میں تو پاپا میرا پورا کیریر تباہ ہو جائے گا پھر مجھے باہر بھی سیٹ ہونا مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔"

وہ باپ کے ہاتھ پکڑ کر ملتجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"دانی ٹھیک کہہ رہا ہے عدیل! اس طرح تو اس کا فیوچر تباہ ہو جائے گا اگر پولیس کیس میں اس کا نام چلا گیا تو۔" عفت ہمت کر کے اندر آتے ہوئے بولی۔

"چلا نہیں جائے گا جا چکا ہے۔ تمہارا بیٹا یہ کارنامہ انجام دے چکا ہے ڈونٹ وری۔" عدیل کہہ کر جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گیا عفت اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

✡ ✡ ✡
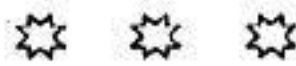
شام سے گھر کر آنے والے بادلوں نے رات سے پہلے سب طرف اندھیرا کردیا تھا۔

اس کے بعد جو موسم سرما کی پہلی بارش نے برسنا شروع کیا تو پھر رات تک نہیں تھمی۔

"مما! پری یہیں رک جائے اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔ باہر بہت بارش ہو رہی ہے اور ہم دونوں کو ابھی کافی کام کرنا ہے۔"

وردہ کچن میں آکر عاصمہ سے کچھ محبت بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔ عاصمہ نے چونک کر وردہ کو دیکھا۔

"کتنی دیر کا کام باقی ہے۔ تم دونوں کا؟" وہ کچھ سوچ کر پوچھنے لگی۔

"ابھی تو دو تین گھنٹے لگیں گے۔" وردہ کچھ کوفت سے بولی۔

"ٹھیک ہے' باقی کل ہو جائے گا۔ ابھی کھانا کھا کر میں خود اسے چھوڑ آتی ہوں اس کے گھر سے اگر کوئی نہیں آ رہا تو۔۔۔" عاصمہ بے لچک لہجے میں بولی تو وردہ خفگی سے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"بس کھانا تیار ہے۔ کہو تو لگوا دوں؟" عاصمہ اسے کھڑے دیکھ کر بولی۔
"اب یہ تو ٹھیک نہیں لگے گا کہ میں خود سے اسے یہاں سے جانے کو کہوں کہ اسے ہم چھوڑ آئیں گھر۔" وہ ناگواری سے منہ میں بڑبڑا کر بولی۔ عاصمہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"کیا اس نے خود یہاں رکنے کے لیے کہا ہے؟" وہ کچھ سوچ کر بولی۔
"ایسی بات نہیں ہوتی تو میں کیوں کہتی آپ سے آکر؟" وہ جتا کر ماں سے بولی۔
عاصمہ کچھ سوچنے لگی۔ وہ پری کے یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں تھی اس لڑکی کی موجودگی عاصمہ کو عجیب سے ان دیکھے خطرے کا احساس دلاتی تھی۔
"تم پریشان نہیں ہو' اول تو اس کے گھر سے کوئی نہ کوئی لینے آہی جائے گا۔ نہیں بھی آیا تو گھنٹے بھر میں کھانے کے بعد بارش بھی رک ہی جائے گی میں اسے واثق کے ساتھ چھوڑ آوں گی ابھی تم جا کر کام کرو۔"
"مگر... مما۔" وردہ جزبز ہو کر رہ گئی۔
"وردہ جیسا کہا ہے ویسا کرو' جب ایک بار یہ بات ہو چکی ہے کہ دن میں جتنا چاہیں آپ لوگ پڑھیں لیکن رات میں اس طرح کمبائن نہیں تو پھر نہیں۔ جائیں اب میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ واثق آتا ہے تو کھانا لگواتی ہوں۔" کہہ کر وہ دونوں چولہے بند کر کے باہر نکل گئی۔
مثال کچھ خالی برتن رکھنے کچن میں آئی تھی' وردہ کو دیکھ کر ذرا سی رکی اور پھر خاموشی سے برتن رکھ کر جانے لگی۔
بلو اینڈ بلیک پرنٹڈ سوٹ میں اس کے خاموش چہرے پر گہری اداسی تھی۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے۔" وردہ نے پیچھے سے کہا تھا۔ مثال ہلکا سا مسکرا کر مڑی۔
"کیوں نہیں... پوچھو۔" اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی تھی۔
"پری اتنی اچھی ہے۔ چلیں آپ کی دشمنی اس کے ساتھ اپنے فادر کے گھر تک تھی۔ اب یہاں وہ میری فرینڈ کی حیثیت سے آتی ہے آپ کو مما کے کان اس کے خلاف بھر کر کیا مل جائے گا۔"
وہ جیسے قطرہ قطرہ زہر مثال کے کانوں میں انڈیل رہی تھی۔ وہ صدمے بھرے انداز میں سامنے کھڑی وردہ کو دیکھتی جا رہی تھی۔ وردہ کی آنکھوں میں مثال کے لیے کیا نہیں تھا وہ صرف سوچ ہی سکی۔
"اس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"
"وردہ! میں نے پری کے بارے میں آنٹی سے کچھ نہیں کہا۔" بہت نڈھال سے لہجے میں وہ صرف یہی کہہ سکی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ اور مجھے آپ کی بات کا یقین کر بھی لینا چاہیے بلکہ ہر کوئی کر لیتا ہے آپ کی بات کا یقین۔" وہ طنز بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ مثال اسے دیکھتی رہی۔
"آپ کی شکل پر جتنی معصومیت' جتنا بھولا پن ہے کوئی بھی آپ کی کسی بھی بات کا یقین کر سکتا ہے۔"
اس کا طنز کی کاٹ سے بھرا جملہ مکمل ہو چکا تھا وہ مڑ کر جانے لگی۔
"اور ہاں اب مجھے بھی یقین آگیا ہے' پری جو مجھے بتاتی تھی کہ آپ کی رئیل مدر نے کس طرح انکل عدیل کو ہمیشہ اپنی مٹھی میں کیے رکھا کہ وہ پری کی ماما کو کبھی دل سے قبول ہی نہیں کر سکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی چہرے کی معصومیت تھی۔ جو در اصل اندر کی مکاری اور..."
"شٹ اپ وردہ! اسٹاپ اٹ... ایک بات... میں اگر یہ سب کچھ تمہاری مدر کے بارے میں کہوں تو تمہیں کیسے لگے گا۔ تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے۔" وہ شدید جذباتی پن میں بمشکل بول پائی تھی۔

"بھائی! آپ سن رہے ہیں، یہ ماما کے بارے میں کیا کہہ رہی ہیں کہ اگر تم نے میری مدر کے بارے میں کچھ کہا تو میں تمہاری امی کو گالی بھی دے سکتی ہوں۔" کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

اور مثال مڑتے ہوئے شاکڈ سی کھڑی رہ گئی۔

واثق اس سے چند قدم کے فاصلے پر بالکل خاموش کھڑا تھا۔

"میں اپنے لیے سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں بھائی! لیکن اپنی ماما کے لیے ایک لفظ نہیں سن سکتی، آپ پلیز آپ اپنی مسز کو سمجھالیں، ہماری ماما ہمارے لیے کیا ہیں یہ سوچ بھی نہیں سکتیں۔" کہہ کر روتے ہوئے بھاگ گئی۔

واثق نے مثال پر ایک تیز نظر ڈالی اور واپس مڑ گیا مثال ساکت کھڑی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼
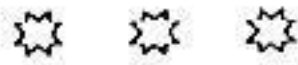
تو جو کچھ میں سوچتی تھی وہی کچھ ہونے جارہا ہے۔

کہانی دہرائی جانے والی ہے۔

وہ برستی بارش کی بوندوں کو اندھیرے میں کہیں گم ہوتے ہوئے دیکھ کر بے سبب یونہی بس سوچے جارہی تھی۔

اس کے بعد کیا ہوگا یہ بھی اسے معلوم تھا۔

صرف اسی لیے تو میں چاہتی تھی کہ میں شادی نہیں کروں۔

وسوسے بے سبب نہیں ہوتے۔

اندیشے بے وجہ سر نہیں اٹھاتے۔

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ مگر کس کے؟

اس کے جس نے بہت دعوے باندھے تھے جس نے اندھے اعتماد کے بلند بانگ وعدے کیے تھے۔ آج اس کی آنکھوں میں بدگمانی، بے اعتباری دیکھی تو وہ جو زندگی سے وابستہ رشتوں سے کچھ امیدیں بندھنے لگی تھیں سب ہی ریت کی بھربھری مٹی کی طرح اس کی مٹھی سے پھسلنے لگی تھیں۔

وہ اپنے ہاتھوں پر سر رکھ کر گہرے بادلوں کے ساتھ اندھیرے میں بیٹھی اسی اندھیرے کا حصہ لگ رہی تھی جانے رات کا کون سا پہر تھا۔

اس کا دل پہلے پہل تو امید کا خوش گمان جگنو اس کے دل کے کونے میں ٹمٹمائے ہوئے تھا کہ کچھ بھی ہو واثق اسے کھوجتا ہوا ضرور یہاں تک آئے گا۔

مگر وہاں بیٹھے بیٹھے جیسے اس کا پورا وجود ہی شل ہو گیا مگر محبت و بیتاوں کی ہلکی سی آہٹ کے ساتھ بھی اس کے کسی پہلو میں نہ سرسرائی۔

وہ سخت دل گرفتہ ہو رہی تھی۔

جی میں صرف یہی سما رہا تھا کہ ان آتی جاتی سانسوں کو روک دے، خود کو ختم کرلے اس بے مقصد، زندگی کا کیا فائدہ جو اتنے سالوں سے مسلسل ایک جہنم کی طرح سلگ رہی ہے۔

"بس بہت ہو گیا میں کل یہاں سے چلی جاؤں گی اور کسی کے بھی روکنے پر نہیں رکوں گی کیونکہ یہاں میں ہزار سال بھی پڑی رہوں تو بھی کوئی مجھے قبول نہیں کرے گا۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی اور اندھیرے میں کھڑے اس کے وجود کو دیکھ ہی نہیں پائی جس سے یہیں اس اندھیرے سرد گوشے میں بیٹھی ان گنت شکوے کیے جارہی تھی۔

"کیا خود کو بیمار کرنا ہے یہاں اتنی سردی میں بیٹھ کر، کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں میں۔" وہ اس کے بے حد

قریب کھڑا ابو جھل لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"لا حاصل جذبوں کے ساتھ جڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں' یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔" وہ خود کو الٹے قدموں پیچھے ہٹا کر بے مہر لہجے میں بولی۔
"تم سے کس نے کہا یہ بے کار ہے۔" وہ اسی طرح ملگجی روشنی اور اندھیرے کے سنگم میں اس کے چہرے کے نقوش کھوجتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"ایسی باتیں کسی سے پوچھی نہیں جاتیں۔ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔" وہ اسے دیکھے بغیر بارش کی آواز کو بغور سنتے ہوئے کہہ گئی۔
"حالانکہ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے۔" وہ بالآخر شکوہ زبان پر لے ہی آیا۔
"مثال!" اس نے ذرا پاس آکر اسے پکارا تھا۔
"شاید آپ کو اچھا نہیں لگے جو کچھ میں کہنے جا رہی ہوں پھر شاید آپ اس ناراضی اور رضامندی کے الجھاؤ سے بھی نکل آئیں گے۔" وہ بہت دیر کی خاموشی کے بعد بہت رک رک کر بولی تھی۔
"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وہ اس کے لہجے سے زیادہ الفاظ سے چونکا تھا۔
"وہ سب جو میں نے آپ سے کہا تھا اور آپ نے اسے ہوا میں اڑا دیا تھا۔ بہت مان تھا آپ کو اپنے جذبوں پر ان کی شدت پر' کسی کو پالینا اتنا مشکل نہیں جتنا پالینے کے بعد کھو دینا ہے اور ہم دونوں کے ساتھ یہی ہونے جا رہا ہے۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"پاپا!" شہزاد کچھ پریشان سا باپ کی شکل دیکھ رہا تھا۔ زبیر کو آج بہت دنوں کے بعد مکمل ہوش آیا تھا۔
اسے وہ مبہم سا دھندلا دھندلا سا منظر یاد آرہا تھا۔ عاصمہ اس کے اوپر جھکی نفرت بھری نظروں سے دیکھتی کچھ کہہ رہی تھی۔
اسے نہ الفاظ یاد تھے نہ ان کا مفہوم!
لیکن عاصمہ کی آنکھوں سے چھلکتی گہری نفرت۔۔۔ سب کچھ اسے یاد دلا گیا تھا۔۔۔ وہ سب کچھ جو اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔
روح اور جسم پر پڑا ایسا بوجھ جو کسی بھی طرح کبھی بھی کم نہیں ہوا تھا' نہ اس کے زوال کے دنوں میں نہ اس کے کمال کے وقت! ہمیشہ' ہر لمحہ ہر پل اس کے ذہن اور دل پر ثبت دھڑکتا رہا تھا۔
"ان کا نام۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔۔۔ عاصمہ آنٹی ہے اور واثق کے فادر کا نام عفان ہے۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"
شہزاد کچھ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔
زبیر کے سینے پر دھرا اتنے برسوں کا بوجھ کچھ اور بھی بوجھل ہو گیا اور گناہ کا بوجھ غم کی طرح نہیں ہوتا جو گزرے وقت کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے۔ اس کا وزن گزرے وقت کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پھر ایک دن اتنا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے کہ آدمی اس وزن کے نیچے دب کر ہی ختم ہو جاتا ہے۔
زبیر کے سینے میں درد کی تیز لہر اٹھی تھی۔ لیکن نہیں ابھی اسے وہ اہم کام کرنا تھا جانے سے پہلے!
بمشکل اس نے اس درد کو دبایا۔
"شہزاد! میری بات غور سے سننا۔ شاید اس کے بعد مجھے دہرانے کا ٹائم نہیں مل سکے۔ دوبارہ موقع نہ دے

قدرت۔" وہ تکلیف سے بھاری آواز میں بمشکل بولا۔
"پاپا پلیز آپ زیادہ بات نہیں کریں۔ آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔" وہ اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ سا تھا۔

زبیر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔
"میرے لاکر میں پیلے رنگ کی ایک فائل ہے' وہائٹ اینولپ میں اس کے اندر ایک خط ہے اور فائل میں جو ڈاکومنٹس ہیں اور وہ خط... دونوں واثق کی والدہ کی امانت ہیں۔"
وہ سینے کو دبائے بمشکل بول رہا تھا سانس کا ردھم ٹوٹ رہا تھا۔
"پاپا! میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" شہزاد گھبرا کر جانے لگا۔
"نہیں بالکل بھی نہیں۔ سن لو پہلے ساری بات۔" زبیر نے پوری طرح سے سینے سے آواز کھینچ کر کہا تھا۔
"شہزاد!" وہ ہلکان ہو چکا تھا اتنا سب کچھ بولنے میں ہی!
"پاپا پلیز خود پہ اتنا دباؤ نہیں ڈالیں۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولا۔
"جس دباؤ میں اتنے سالوں سے ہوں شاید وہ کسی طرح کم ہو جائے اگر وہ فائل اور خط تم اس عورت واثق کی ماں تک کسی طرح سے پہنچا دو ضرور۔" زبیر کی ہمت اس کے بعد ٹوٹ گئی وہ نڈھال ہو کر تکیے پر گردن گرا کر لیٹ گیا۔

"پاپا' آپ ٹھیک ہیں نا؟"
وہ تشویش سے جھکا اس کے سینے پر ہاتھ رکھے اس کی دھڑکنوں کو جانچ رہا تھا۔
زبیر کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہا تھا۔
"پاپا! میں بلاتا ہوں ڈاکٹر کو آپ ٹھیک نہیں ہیں؟" وہ پھر جانے لگا تھا۔
"رکو۔" وہ بدقت چیخا شہزاد ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔
زبیر اسے ویران خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔
شہزاد دھیرے سے اس کے پاس آ کر محبت سے اس کے ہاتھ تھام کر اسے پیار کرنے لگا۔
"پاپا آپ ٹھیک ہو جائیں گے ان شاء اللہ... میرا دل کہتا ہے۔ آپ کو اگر لگتا ہے کہ آپ کے گناہ زیادہ ہیں تو آپ یہ بھی تو سوچیں نا آپ نے مجھ یتیم' بے سہارا کی جس شاہانہ انداز میں پرورش کی ہے وہ نیکی کچھ کم نہیں۔"
وہ اس کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگائے تسلی دینے لگا۔
امید بھرا آخری دلاسا!
زبیر اسے دیکھتا رہ گیا۔
"آپ بالکل بھی رنجیدہ نہیں ہوں' آپ کے پاس بہت ساری نیکیوں کا ذخیرہ ہے' اللہ آپ سے خوش ہے۔ میرا دل کہتا ہے اور ابھی آپ بہت سال اور جئیں گے۔ آپ کہتے تھے نا آپ نے ابھی میرے بچوں کو بھی گود میں کھلانا ہے تو دیکھیے گا... وہ دن بھی آپ دیکھیں گے۔" وہ نم آنکھوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے تسلیاں دے رہا تھا۔
"نہیں اور نہیں... مجھے اور نہیں جینا شہزاد! مجھے جینے کی دعا نہیں۔" وہ جیسے گڑگڑا رہا تھا۔
بے اختیار شہزاد کے آگے اس نے دونوں ہاتھ باندھ دیے تھے۔
"پاپا پلیز یہ نہیں کریں۔" وہ خود بھی رو پڑا تھا۔
"واثق کی ماں کے آگے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر میری طرف سے معافی مانگنا اور ان کی منت کرنا کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔" وہ پھر گڑگڑایا۔

شہزاد ششدر سا باپ کو دیکھتا رہ گیا۔
"پاپا... ان کے ساتھ میرا مطلب ہے۔" وہ سمجھ نہیں پایا کہ کیا سوال کرے۔
"کچھ نہیں پوچھو اب اس کا وقت گزر چکا بس وہ فائل ان کی امانت پہنچا دینا اور میری معافی۔" کہہ کر اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں شہزاد دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں کیوں... کیا ہوا ہے انہیں۔" عفت کی بات پر مثال سخت بے چین ہو کر بولی۔
اس نے یونہی گھر فون کیا تھا یہی سوچ کر کہ اس وقت عدیل گھر پر ہو گا۔
عفت نے کال ریسیو کرتے ہوئے کچھ کوفت بھرے لہجے میں بتایا تھا۔
"موسمی فلو اور کچھ ٹمپریچر سا ہوا ہے۔" عفت کے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بتانا تو نہیں چاہ رہی مگر مجبوراً اسے مثال سے بات کرنا پڑ رہی ہے۔
"کل تو وہ ٹھیک تھے بالکل۔" مثال بڑبڑائی۔
"تم نے کل بھی فون کیا تھا عدیل کو؟" عفت چونک کر بولی۔ مثال ایک دم سے چپ کر گئی۔
"کیا تمہارا جی نہیں لگتا اپنے گھر میں یوں ہڑک کر باپ کی طرف کیوں لپکتی ہو؟ ہر روز کا رابطہ کہاں تمہارا جی لگنے دے گا وہاں، لڑکی! سنبھالو خود کو... یہ گھر بسانے کے طریقے نہیں ہوتے۔" وہ اس پر جیسے برس ہی پڑی۔
"پاپا گھر پر ہیں، میری بات کرا دیں ان سے۔"
"نہیں ہیں گھر پر... آرام کرنے دو انہیں اور خود بھی کچھ کام وام کر لو، تمہاری ساس نے تمہیں یوں ہی چھوڑ رکھا ہے، بڑی بھاگوان ہو کہیں کوئی روک ٹوک نہیں۔" عفت بول رہی تھی۔ اس نے فون رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا کہہ رہے ہیں احسن آپ؟" بشریٰ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
"تم سے زیادہ یہ خبر میرے لیے کسی بم بلاسٹ سے کم نہیں ہے۔" وہ سخت اذیت میں جیسے کراہ کر بولا۔
دونوں کے درمیان چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔
"مگر وہ کیوں چلا گیا پاکستان؟" کچھ دیر کے بعد بشریٰ ہی بولی تھی۔
"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کا ایسا کچھ ارادہ ہے تو کیا میں اس سے بات نہیں کرتا اسے منع نہیں کرتا۔" احسن تلخی سے بولا۔
یوں بھی کچھ دنوں سے احسن ایسے ہی تلخ لہجے میں بات کرنے لگا تھا بشریٰ کو پہلے اس کے سخت لہجے نے ہراساں رکھا۔ اب اس تلخ لہجے نے اندر تک دکھی کر دیا تھا، یہ الگ بات کہ بہت سالوں سے اس نے اپنے دل میں خود سے سمجھوتا کر لیا تھا ان ساری سختیوں، ان ساری تلخیوں کو اس نے اپنی زندگی کا حصہ سمجھ کر جینا تھا۔
اور اس خود ساختہ سمجھوتے کی سختی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔
"آپ کی بات ہوئی اس سے فون پر؟" اس نے کچھ دیر بعد پھر ڈھٹائی سے خود ہی پوچھا۔ ورنہ سیفی سے اسے رتی برابر دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ اگر دنیا میں کسی سے نفرت اور شدید بیزاری تھی تو وہ یہ سیفی ہی تھا! مگر اس کی مجبوری کی انتہا تھی کہ وہ یہ کسی پر ظاہر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ احسن کمال پر تو بالکل بھی نہیں۔
"نہیں، نہ وہ میری کال پک کر رہا تھا نہ مجھے کال بیک کر رہا تھا، کئی دنوں سے یہی معاملہ چل رہا تھا اور اب میری

اس کے ایک دوست سے بات ہوئی' اس نے مجھے بتایا کہ سیفی باہر چلا گیا ہے' میں نے اس کا فون ٹرائی کیا۔ پہلے تو آف تھا پھر بعد میں اس کی کال آگئی۔" وہ بولتے ہوئے تھک کر رک گیا۔ بشریٰ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کتنی ڈھٹائی سے اس نے اقرار کر لیا کہ کچھ دوستوں کے ساتھ پلان بنا تھا یونہی انڈیا' پاکستان کا وزٹ کرنے کا ابھی تو کچھ دن پاکستان رکے گا۔ پھر دیکھے گا اس نے کیا کرنا ہے۔" احسن ہارے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اور اس کی اسٹڈیز....."

"جہنم میں گئیں میری طرف سے' یہ موت سے پہلے میرے مرنے کا بندوبست کر کے رہے گا۔" وہ تلخی سے کہہ کر اٹھ کر چلا گیا' بشریٰ گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"یار یہ سب ایکسکیوزز ہیں تمہارے فادر کے۔" وکی دانی کا کندھا اپنائیت سے تھپکتے ہوئے بولا۔

"نہیں یار!" دانی نے کمزور سا دفاع کیا۔

"نہیں بیٹا ایک بار تمہارا نام پولیس کی ایف آئی آر میں آگیا تو پھر تمہارے یہ فادر بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔" وکی تفریحاً" کہہ رہا تھا یا سنجیدہ تھا دانی اسے دیکھتا رہ گیا۔

"باہر کی آزاد عیش بھری زندگی یا پھر ادھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے گلی سڑی قابل رحم زندگی' ایک بار حوالات میں چلا گیا پھر تو شہر میں جو چھوٹی موٹی واردات ہوتی ہے اس میں بھی پولیس نے تجھے ہی لائن حاضر کر لینا ہے۔ تیرا آنا جانا تو بھیا وہاں اب لگا ہی رہے گا۔"

وکی نے اس کے ہوش مماورتاً" نہیں حقیقتاً" اڑا دیے تھے۔

"یار ایسی باتیں نہیں کرو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ خوف زدہ ہو کر بولا۔

"بہت آسان میری جان۔" وہ اس کا کندھا زور سے تھپک کر بولا۔ دانی اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

"اپنے جاوید بھائی ہیں نا یار! کیا ہاتھ کی صفائی ہے اس بندے میں۔" وہ آنکھ دبا کر بولا۔

"میں سمجھا نہیں بالکل بھی۔" دانی نا سمجھی سے بولا۔

"صرف تھوڑی سی رقم کے بدلے وہ تجھے تیرے ڈریم لینڈ میں پہنچا دے گا۔ بس تجھے حوصلہ دکھانا ہو گا۔" وہ پھر سے اسی لہجے میں عادتاً" آنکھ دبا کر بولا۔

"میں ابھی بھی نہیں سمجھا۔"

"یار! تیری عقل دانی تو بہت چھوٹی ہے سُن صرف چھ سات لاکھ روپے کا انتظام کرنا ہو گا۔ جاوید بھائی تجھے پانچ دن کے اندر ملک سے باہر بحفاظت بالکل لیگل طریقے سے پہنچا دیں گے اور وہاں جا کر تیری جاب کا بھی بندوبست ان کے ذمے ہو گا' ایڈمیشن بھی ہو جائے گا تیرا کالج میں' شان دار زندگی بن جائے گی تیری سوچ لے' صرف چوبیس گھنٹے ہیں تیرے پاس سوچنے کے لیے۔ آگے تیری مرضی۔"

"مگر یار! اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں گا؟" دانی پریشان سا بولا تھا۔

"تو بھی نرا ہی ہے دانی سن بہت آسان ہے۔" وہ آہستہ آہستہ اسے بتانے لگا۔

☆ ☆ ☆
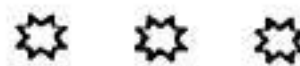
"مثال! تم ٹھیک ہو ناں؟" بشریٰ بے چین لہجے میں اس سے فون پہ پوچھ رہی تھی۔

جب سے اس نے احسن کمال سے سنا تھا کہ سیفی پاکستان چلا گیا ہے جانے کیوں بشریٰ کے دل کو عجیب سی بے کلی نے آگھیرا تھا۔ اسے رہ رہ کر مثال کا خیال آرہا تھا۔

"جی ماما!" وہ بہت آہستگی سے بولی تھی۔ بشریٰ ذرا سا چونکی۔
"کوئی آیا تھا۔ تم سے ملنے۔" رک کر اس نے بے ربط انداز میں پوچھا تھا۔
"کون... کس نے آنا تھا؟" مثال بے دھیانی سے پوچھ رہی تھی۔
"نہیں...." بشریٰ نے یونہی سر جھٹکا۔
"تم خوش ہو ناں؟" وہ برے خیالات اور وسوسوں کو دور بھگاتی ذرا بشاش لہجے میں بولی۔
"ہوں!" مثال کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔
"عدیل... مطلب اپنے پاپا سے ملنے جاتی ہو۔ وہ ٹھیک ہیں نا؟"
"آج صبح کال کی تھی۔ عفت ماما کہہ رہی تھیں انہیں ٹمپریچر ہے۔" مثال کے بتانے پر بشریٰ خاموش ہو گئی۔
"واثق تمہارے ساتھ کیسا ہے؟ مطلب اس کا رویہ... میری دو بار بات ہوئی ہے اس سے کافی اچھے مزاج کا لگا ہے مجھے وہ۔" بشریٰ جانے کیا معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔
"جی!" مثال بہت مختصر جواب دے رہی تھی۔ جانے کہاں الجھی ہوئی تھی۔
"تم کچھ پریشان ہو مثال؟" وہ چونک کر پوچھ رہی تھی۔
"نہیں میں ٹھیک ہوں ماما... آپ پاکستان نہیں آئیں گی... آئی مس یو ماما۔" وہ آہستگی سے بولی تو بشریٰ کے دل کو کچھ ہوا۔
"مس تو میں بھی بہت کر رہی ہوں تمہیں۔ دیکھنا چاہتی ہوں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ شادی کے بعد میری بیٹی کیسی لگ رہی ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں، تمہیں گلے سے لگانا چاہتی ہوں۔" بشریٰ ایک دم سے جذباتی ہو کر کہتی چلی گئی۔
"مما!" وہ آہستگی سے بولی۔
"بولو میری جان! کچھ چاہیے تمہیں؟" وہ آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے اسی جذباتی لہجے میں بولی۔
"نہیں...." وہ گہرا سانس لے کر بولی۔
"مثال!" بشریٰ کچھ چونکی۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا۔
"بہت اکیلا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔" وہ ہولے سے بولی بہت جی چاہ رہا تھا بشریٰ کو وہ سب کچھ بتا دے۔ جو کچھ اس کے دل پر بیت رہی ہے لیکن... ہمیشہ اس لیکن نے ہی تو اسے روکے رکھا تھا سو اب بھی اسے خاموش ہی رہنا تھا۔
"کسی سے جھگڑا ہوا ہے" بشریٰ فوری طور پر یہی سوچ سکی تھی۔
"نہیں۔"
"پلیز مثال! مجھے پریشان نہیں کرو میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟" بشریٰ حقیقتاً" پریشان ہو گئی تھی۔
"کیا ہوا آپ کیوں ڈسٹرب ہیں۔"
"احسن ٹھیک نہیں ہیں۔ بائی پاس ایڈوائز کیا ہے ڈاکٹرز نے۔" وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر آہستگی سے بولی۔
"اوہ...!" وہ بے اختیار صرف یہی کہہ سکی۔
"تم کیوں پریشان ہو۔ بتاؤ مجھے؟" بشریٰ کو پھر سے خیال آیا۔
"نہیں کچھ خاص نہیں ماما!" وہ ٹال کر بولی۔

"تمہاری ساس آئی مین عاصمہ بہن تمہاری نند وہ تو ٹھیک ہیں نا... تمہارے ساتھ ان کا رویہ' ان کا سلوک۔" بشریٰ اس کی پریشانی کو پہنچ گئی تھی۔
"نہیں مما! سب ٹھیک ہے۔ بس یونہی کچھ ڈیپریشن سا ہو رہا تھا۔ ہو جائے گا ٹھیک خود ہی۔" وہ ٹالتے ہوئے بولی۔
"مثال! ایک بات تم سے کہنا چاہتی ہوں۔" پتا نہیں بشریٰ نے اس کا جواب سنا تھا یا نہیں کسی اور ہی دھیان میں بولی۔
"کون سی بات ماما؟" وہ کچھ چونکی۔
"سیفی پاکستان میں ہے اگر وہ تمہیں کہیں نظر آئے تو پلیز تم اسے اگنور کر دینا' بالکل بات نہیں کرنا اس سے ہم سمجھ رہی ہو ناں۔" مثال اس کی بات سن کر جیسے سناٹے میں آگئی۔

☼ ☼ ☼

شہزاد کو لاکر میں مختلف ڈاکومنٹس کے درمیان وہ زرد فائل مل گئی تھی اور خط بھی!
وہ چند لمحے دونوں چیزیں ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔
"اس فائل اور خط میں کیا ہے؟ پاپا نے یہ دونوں چیزیں مجھے عاصمہ آنٹی تک پہنچانے کو کہا تھا' مگر انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں انہیں کھول کر دیکھ سکتا ہوں یا نہیں؟"
وہ لاکر بند کر دونوں چیزیں لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں پاپا کا عاصمہ آنٹی کے ساتھ کیا تعلق ہے' شاید دونوں رشتہ دار ہوں یا پھر کچھ اور۔"
وہ فائل کھولتے کھولتے رک گیا۔
"نہیں۔ مجھے امانت میں خیانت نہیں کرنی۔ میں پاپا سے پوچھ لوں گا کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں یہ دونوں چیزیں دیکھ لوں۔"
وہ ایک بڑے لفافے میں ڈال کر باہر جانے لگا۔
اس کا ارادہ آفس جانے کا تھا۔
آفس اتنے دنوں سے واثق ہی دیکھ رہا تھا لیکن جانے کیوں شہزاد کو آج کل واثق کا رویہ بھی کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔
بہت اکھڑا اکھڑا اور روکھا سا!
وہ شہزاد سے بات بھی کرتا تو نظریں چرا کر۔
واثق نے مجھ سے آج کوئی بہت ضروری بات کرنی تھی اسے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے یاد آیا۔
اس نے گاڑی کا رخ آفس کی طرف کر لیا۔
"میں وہیں سے واثق کے ساتھ اس کے گھر چلا جاؤں گا عاصمہ آنٹی سے مل کر انہیں یہ امانت پہنچا دوں گا۔"
وہ پلان کر رہا تھا کیونکہ اسے جلدی فارغ ہو کر ہسپتال بھی پہنچنا تھا' پاپا اکیلے تھے واثق آفس میں موجود نہیں تھا۔
"واثق صاحب تو کچھ دیر پہلے چلے گئے ہیں۔" شہزاد کے مینجر نے پوچھنے پہ اسے بتایا۔
"کیا گھر چلے گئے ہیں؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"نہیں کچھ بتا کر نہیں گئے لیکن کہہ رہے تھے۔ شاید وہ واپس چکر لگائیں گے آفس کا۔"

"اوہ لیکن میں ویٹ نہیں کر سکتا یہاں بیٹھ کر پاپا کے پاس جانا ہے مجھے ہسپتال۔" وہ بڑبڑایا۔
"میں واثق صاحب کو کال کرتا ہوں اگر وہ کہیں قریب میں ہوں تو آجائیں گے اگر آپ کو ضروری بات کرنا ہے ان سے۔" منیجر اس کی شکل دیکھ کر بولا۔
"نہیں اس کی ضرورت نہیں میں خود بات کرلوں گا آپ سنائیں آفس میں سب ٹھیک چل رہا ہے نا؟" وہ اس سے تفصیلات پوچھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

واثق پری کو اپنے سامنے دیکھ کر کچھ حیران سا رہ گیا۔
اسے عاصمہ کی کال آئی تھی کہ اس کی ایک بہت ضروری دوا قریب کے اسٹور سے نہیں مل رہی اگر واثق بھجوا دے۔
واثق کو خود اٹھ کر اس مخصوص اسٹور تک جانا پڑا جہاں سے وہ ٹیبلٹ عموماً ملا کرتی تھی وہ میڈیسن لے کر نکلا تو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ٹھٹھک گیا۔
"کین یو ڈراپ می پلیز۔" وہ گاڑی کی کھڑکی پر جھکی کچھ رسمی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ وہ فوری طور پر کچھ بول ہی نہیں سکا۔
"میں اپنی فرینڈ کے ساتھ بک شاپ پر آئی تھی۔ اسے ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا۔ آٹو یہاں سے مل نہیں رہا ٹیکسی میں اکیلے جانا مجھے عجیب سا لگ رہا تھا آپ نظر آگئے تو سوچا۔ کسی اجنبی کے ساتھ جانے سے بہتر ہے آپ سے لفٹ کی ریکویسٹ کرلوں۔" اس نے لمبی چوڑی تفصیل بتائی تو واثق کچھ کہہ نہیں سکا۔
"میں بیٹھ سکتی ہوں۔" وہ اسے یوں خاموش دیکھ کر پھر سے بولی۔
اور وہ صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا پری نے اسے کچھ حیران نظروں سے دیکھا تھا تھینکس کہتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼
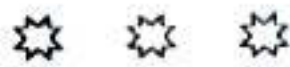
سیفی ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چٹ لیے ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ سمجھا رہا تھا۔
"ٹھیک ہے صاحب پہنچا دوں گا لیکن پیسے ڈبل لوں گا۔"
آج کل اس طرف جانے والی تقریباً "سب ہی سڑکوں پر کام ہو رہا ہے گھنٹوں ٹریفک جیم رہتا ہے۔" وہ سرہلا کر بولا تھا۔
"اوکے میں دے دوں گا لیکن کوشش کرنا ذرا صاف راستے سے لے کر جاؤ مجھے ڈسٹ الرجی ہے۔" وہ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے جی! آپ فکر ہی نہ کریں۔" وہ سرہلا کر ٹیکسی بڑھا لے گیا۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

شازیہ جمال

"آج بریانی نہیں پکی کیا؟"
کھانے کی میز پر دھرے لوازمات دیکھ کر ربیعہ نے بڑی بھابھی کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ باقی سب بھی کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ روکے ان دونوں کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ بڑی بھابھی گڑبڑا گئیں۔
"نہیں! اصل میں کپڑے دھوتے کافی دیر ہوگئی آج اور عانیہ، آئمہ بھی صبح سے مٹر قیمہ کھانے کی فرمائش کررہی تھیں تو میں نے مٹر قیمہ پکا لیا بریانی کل پکا لوں گی۔"
ان کا انداز قدرے وضاحتی سا تھا۔ ربیعہ کے چہرے پر تناؤ سا آگیا۔
"چہ خوب بھابھی! اپنی بیٹیوں کی فرمائش تو آپ کو یاد رہی۔ لیکن میری پسند ناپسند کی کوئی اہمیت نہیں۔

ان دونوں نے تو آج قیمہ مٹر کی فرمائش کی جبکہ میں کل رات ہی آپ کو بریانی پکانے کا کہہ چکی تھی۔"

لقمہ توڑتے بڑے بھیا کا ہاتھ رک گیا تھا۔ خشمگیں نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔

"جب ربیعہ بریانی پکانے کا کہہ چکی تھی تو پکائی کیوں نہیں؟" الفاظ سے زیادہ کڑا لہجہ تھا بڑی بھابھی نے تھوک نگلا۔

"وہ۔ میں نے سوچا۔"

"یہ سوچنے سمجھنے کا کام تو تم رہنے ہی دیا کرو۔ جو کہا جائے بس وہ کیا کرو۔" انہوں نے بات پوری ہونے سے پہلے بیوی کو بری طرح جھڑک دیا تھا۔ بڑی بھابھی سب کے سامنے بہت سبکی محسوس کر رہی تھیں۔ شوہر کے آتش فشاں مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں اور یہاں تو معاملہ بھی چار بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن کی فرمائش کا تھا۔

"آج دن میں بھی ڈھنگ سے کچھ نہیں کھایا۔ سوچا تھا رات کو پیٹ بھر کر بریانی ہی کھاؤں گی لیکن۔"

ربیعہ رقت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اماں کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ بڑے بھیا نے ملامتی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا جو خفت سے ہونٹ کاٹتی خود کو کوس رہی تھیں۔ جہاں اتنا کچھ کر لیا وہاں بریانی بھی پکا لیتیں۔

"اگر بڑی بھابھی مصروف تھیں تو تم پکا لیتیں۔ بریانی پکانا کون سا مشکل کام ہے۔؟"

لگے ہاتھوں کاشف نے بھی بیوی کی خبر لینی چاہی۔ وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔ ان دنوں وہ امید سے تھی اور بڑی بھابھی نے اس کی طبیعت کے پیش نظر از خود شام کا کھانا پکانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔

"بیٹا! دسترخوان پر بیٹھ کر بدمزگی نہیں کرتے۔ باقی جو اتنی ساری نعمتیں سامنے رکھی ہیں۔ ان کی ناشکری مت کرو۔" دادی نے ماحول کا تناؤ محسوس کیا تو شفیق لہجے میں بولیں۔

"ہونہہ۔ اگر میرا کھلایا پلا کسی کو اچھا لگتا تو آج یہاں بریانی رکھی ہوئی ہوتی آپ سب ہی کھائیں یہ نعمتیں۔" ربیعہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ زوردار ٹھاہ کے ساتھ بند کیا۔ سب ہی جانتے تھے اب یہ دروازہ صبح ہی کھلے گا۔

"سارے دن کی بھوکی میری بچی بے چاری بھوکے پیٹ ہی سو جائے گی۔"

اماں کی بڑبڑاہٹ' چاروں بھائیوں کی پیشانی پر پڑے بل۔ بیویاں شرمندگی سے دوچار' عانیہ' آئمہ اپنی جگہ چور بنی بیٹھی تھیں۔

ربیعہ بنا کچھ کھائے اٹھ کر گئی تھی۔ سو سب ہی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے۔ دادی نے تاسف سے سر ہلایا۔ اچھا خاصا ماحول مکدر ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا یار! تم نے معمولی سی بریانی کے لیے گھر میں اتنا بڑا فساد کھڑا کر دیا دس از ناٹ فیئر ربیعہ!"

اس نے حسب عادت رات والا واقعہ صبح کالج میں اپنی بیسٹ فرینڈ صبا کے گوش گزار کیا تھا۔ کاٹن کے سفید شلوار قمیص میں ہلکے گلابی رنگ کے دوپٹے سینے پر پھیلائے دونوں ایک ساتھ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔

پوری بات سننے کے بعد صبا نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

"بات بریانی کی نہیں ہے' اہمیت کی ہے۔ انہوں نے میری پسند پر اپنی بیٹیوں کی فرمائش کو ترجیح دی اور یہ چیز میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

ربیعہ کا انداز ایسا تھا جو کیا بالکل ٹھیک کیا۔ اسے اپنے رویے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔

"ان کی بیٹیاں تمہاری "بھتیجیاں" ہوتی ہیں۔" صبا نے زور دیتے ہوئے گویا اسے یاد دہانی کروائی تھی۔

"واٹ ایور۔" ربیعہ نے سر جھٹکا۔

"تمہاری بھابھی کے دل میں تمہارے خلاف میل آ گیا ہو گا۔ سب کے سامنے تمہاری وجہ سے ان کی اچھی خاصی انسلٹ ہوئی۔"

"تو غلطی بھی تو ان ہی کی تھی۔"

صبا نچ ہو اٹھی۔ "تو کیا لازمی ہے ہر غلطی کرنے والے کو سب کے سامنے ذلیل کروایا جائے۔؟"

"تم کیوں اتنی سائیڈ لے رہی ہو ان کی؟ وہ میری بھابھی ہیں تمہاری نہیں۔ حد ہو گئی۔" ربیعہ الٹا اسی پر چڑھ دوڑی تھی۔

"میں سائیڈ نہیں لے رہی۔ حق کی بات کر رہی ہوں۔ معمولی باتوں پر ایشو کھڑا کرنا کون سا درست عمل ہے؟ تھوڑی سی کمی بیشی ہو بھی جائے۔ تو کمپرومائز کر لینا چاہیے۔" صبا کا سمجھاتا ہوا لہجہ رسانیت لیے ہوئے تھا۔ ربیعہ نے طنزیہ سر جھٹکا۔

"ہونہہ! کمپرومائز وہ کرتے ہیں صبا ڈیئر! جنہیں زندگی میں بہت سی محرومیاں ملی ہوں۔ میرے پاس بھلا کس چیز کی کمی ہے جو میں معمولی باتوں کے لیے اپنا دل مار کے کمپرومائز کرتی پھروں؟" تفاخرانہ لہجہ، زعم بھرا انداز۔

صبا نے سفیدے کے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے، قدرے غور سے اس کا خوب صورت چہرہ دیکھا۔ بے نیازی اور خود اعتمادی جس کے ایک ایک انداز سے جھلکتی تھی۔

"تمہیں زندگی میں سب کچھ ملا اس کے لیے تمہیں شکر گزار "رہنا" چاہیے لیکن زندگی حادثات کا مجموعہ ہے آنے والا کل ہمیشہ گزرے کل سے مختلف ہوتا ہے۔" صبا اسے جو سمجھانا چاہ رہی تھی ربیعہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سو دونوں خاموشی سے کلاس روم کی جانب چل دیں۔

☆ ☆ ☆

چھوٹی بھابھی کے ہاں تیسری بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی۔ ساری رات زندگی و موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد صبح صادق کے وقت انہوں نے صحت مند بچی کو جنم دیا تھا۔

گھر اس وقت افراد خانہ سے بھرا ہوا تھا۔ ربیعہ نے تھوڑا سا جھک کر کمبل میں لپٹی گلابی گڑیا کو دیکھا اور بنا پیار کیے سیدھی ہو گئی۔ انسانی جسم کا سب سے نرم حصہ دل اگر بے حس ہو جائے تو سب سے سخت حصہ بن جاتا ہے۔

"پھپھو! گڑیا بہت پیاری ہے ناں؟" تانیہ اور مہک چھوٹی بہن کی پیدائش پر بہت پرجوش ہو رہی تھیں۔

"آپ ایک بار پھر پھپھو بن گئی ہیں۔"

"ہاں بھئی! کون سا پہلی بار بنی ہوں۔ گھر میں ویسے ہی بھتیجیوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ بھتیجے کی پھپھو بنتی تو کوئی بات بھی تھی۔"

تانیہ اور مہک چپ سی ہو کر اس کا منہ تکنے لگی تھیں۔ چھوٹی بھابھی نے بے ساختہ لب کاٹے۔

"لیکن بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں پھپھو!" بڑی بھابھی کی عانیہ نے آہستگی سے کہا۔ وہ بچیوں میں سب سے بڑی تھی۔ سمجھ دار اور سنجیدہ!

ربیعہ ہنسی۔ "رحمت اگر حد سے زیادہ ہو جائے تو زحمت بن جاتی ہے۔ جیسے بن مانگی بارش۔"

دادی کو پڑھی لکھی پوتی کی ناعاقبت اندیشی پر افسوس ہوا تھا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر بند کر دیا کہ بخوبی جانتی تھیں، دونوں ماں بیٹی ان کی باتوں کو اکثر ردی کے مول رول دیتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ناعمہ بھابھی کے بھائی کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔

وہ آج کل بری وغیرہ کی شاپنگ کے سلسلے میں بری طرح مصروف تھیں اور اپنی بہنوں کے ساتھ بازار نکل جاتیں، واپسی شام ڈھلے ڈھیر سارے شاپنگ بیگز کے ہمراہ ہوتی۔

آج انہوں نے بطور خاص اپنی اور بچیوں کی شاپنگ کی تھی۔ اس وقت لاؤنج میں شاپنگ بیگز کھولے وہ سب کو اپنی شاپنگ دکھا رہی تھیں۔

"یہ مہندی پر پہنوں گی، یہ مایوں پر اور یہ والا بارات کے لیے ٹھیک رہے گا نا بڑی بھابھی؟" کپڑے کھول

کھول کر دکھاتے ہوئے وہ سب سے مشورے بھی لے رہی تھیں۔

ربیعہ کشن گود میں رکھے چینل سرچنگ میں مصروف تھی۔ لیکن جب انہوں نے ولیمہ میں پہننے کے لیے گہرا سبز سوٹ نکالا جس پر سلور نفیس کا کام تھا' ربیعہ بے ساختہ نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوگئی۔

"واؤ!" بے ساختہ اس کے منہ سے پھسلا تھا۔

"پیارا ہے ناں؟" انہوں نے قدرے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں بہت۔" ناعمہ بھابھی مسکرائی تھیں۔

"مجھے کب سے ایسے ہی سوٹ کی تلاش تھی۔" مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ربیعہ اس سوٹ پر ستائشی انداز میں ہاتھ پھیرتی ہنوز گود میں لیے بیٹھی تھی۔

"اگر اتنا ہی اس پر تمہارا دل آگیا ہے تو تم رکھ لو ربیعہ!" چائے کی چسکیاں لیتے رضا کی فراخدلانہ آفر پر ناعمہ بھابھی کا دل تھمنے لگا تھا۔

"کیا واقعی؟" ربیعہ نے ابرو اچکائے۔

"ہاں ہاں' بھائی خود تو کہہ رہا ہے تمہیں' ناعمہ پھر اور لے لے گی اپنے لیے۔ تمہیں تو ویسے بھی بہت کم کچھ پسند آتا ہے۔" اماں نے فوراً "ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

بڑی بھابھی نے ناعمہ کا چہرہ دیکھا۔ جو ضبط کی نجانے کون سی منزل سے گزر رہی تھی۔ وہ تنگ دل نہیں تھی۔

آنکھوں کے کناروں سے ٹپکنے کو بے تاب قطرے اندر ہی کہیں بہت خاموشی سے گرے تھے۔ کسی نے رسمی طور پر بھی اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

بعض اوقات بظاہر معمولی باتیں بہت دل دکھاتی ہیں!

☼ ☼ ☼

ان دنوں وہ سالانہ امتحانات کے بعد فارغ تھی۔ رات گئے کتب بینی کرتی' دن چڑھے سوئی رہتی۔ کسی کو اس کے روز و شب پر اگر کوئی اعتراض تھا بھی تو کہنے کی جرات نہیں رکھتا تھا کہ وہ ماں کی لاڈلی' بھائیوں کی دلاری تھی۔

اماں آج کل سنجیدگی سے اس کے رشتے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ اسی سلسلے میں شکیلہ خالہ کے گھر ان کے آج کل باقاعدگی سے چکر لگ رہے تھے۔ اور یہ اماں اور شکیلہ خالہ کی مشترکہ کاوشوں کا ہی نتیجہ تھا کچھ عرصہ میں ایک متمول گھرانے سے اس کے لیے رشتہ آگیا۔ اسجد اکلوتا تھا۔ خوبرو' برسر روزگار' دو شادی شدہ بہنیں اسی شہر میں اپنے اپنے گھر خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ ریاض احمد عمر کے اس حصے میں تھے جہاں سارے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد فارغ البالی کے احساس سے سرشار زیادہ تر وقت دوستوں کے ساتھ "بیٹھک" میں ہی گزارتے رہ گئیں ممتاز بیگم' تنہائی و اکتاہٹ کا شکار دل میں چاند سی بہو لانے کی تمنا شدت سے جاگ اٹھی تھی۔ سعادت مند بیٹے نے ماں کی خواہش پر فرمانبرداری سے سر جھکا دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہیں "ربیعہ" کی صورت اپنا گوہر مقصود مل گیا۔

ربیعہ کے لیے اتنی خوبیوں کا حامل رشتہ پا کر اماں کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹک پا رہے تھے۔

"کچھ لوگ ہمیشہ سے ہی قسمت کے بہت دھنی ہوتے ہیں۔" بڑی بھابھی کا تبصرہ۔

"شکر خورے کو خدا شکر دے ہی دیتا ہے۔" چھوٹی بھابھی کی طویل ٹھنڈی سانس۔

"خس کم جہاں پاک۔" ناعمہ بھابھی نے دونوں ہاتھ جھاڑے تھے۔

ربیعہ کی "نازک مزاجی" کا زیادہ تر عتاب وہی بنتی تھیں۔ اب اس کا یوں جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ دیکھ کر انہوں نے خاصا سکون کا سانس لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈیکو پینٹ کا بیش قیمت فرنیچر' بہترین کراکری'

الیکٹرانک کی چھوٹی بڑی اشیاء' جدید تراش خراش کے ملبوسات' برانڈڈ جوتے' کاسمیٹکس' سب کچھ پرفیکٹ! بڑے بھیا لسٹ پر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔

"بظاہر تو سب کچھ پرفیکٹ ہے ربیعہ! تمہیں اگر کوئی کمی بیشی لگے تو بتانا پھر مجھے۔"

"مجھے بھی سب کچھ پرفیکٹ ہی چاہیے بڑے بھیا! ذرا سی بھی "کمی" نہیں چلے گی۔"

صوفے پر آلتی پالتی مارے' کشن گود میں رکھے ناخن فائل کرتی ربیعہ نے انگوٹھے اور انگلی کو ملا کر "ذرا سا" اشارہ کرتے ہوئے ٹھنک کر کہا۔ بڑے بھیا ہنسے تھے۔

"تو اور کیا! میری ربیعہ کا جہیز ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ دیکھیں تو بس دیکھتے ہی رہ جائیں' کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے چار بھائیوں کی اکلوتی بہن کا جہیز بس یونہی سا ہے۔"

اماں کی بات پر دادی ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔ "چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں بہو! خدا ہماری بچی کا نصیب اچھا کرے۔ یہ مادی چیزیں سچی خوشیوں کی ضامن نہیں ہیں۔" گو کہ ان کا لہجہ نرم تھا لیکن اماں کو بے حد برا لگا۔ سچی بات جتنے بھی شیریں لہجے میں کہی جائے کڑوی ہی لگتی ہے۔

"ارے واہ دادی! آپ کو کیا پتا سسرال میں ان ہی چیزوں کی وجہ سے کتنی ویلیو بڑھتی ہے۔" ربیعہ نے دادی کے "پرانے خیالات" کو ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑا دیا۔

"اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔" دادی گہری سانس کھینچ کر چپ ہو گئیں۔

انہیں پوتی کا یوں بڑوں کی موجودگی میں اپنی شادی اور جہیز وغیرہ کے معاملے میں بولنا ناگوار لگا تھا۔

"اچھا تم فکر مت کرو۔ ہم تمہاری شادی میں کسی قسم کی کمی نہیں چھوڑیں گے چاہے کسی سے ادھار ہی کیوں نہ پکڑنا پڑے۔ آخر کو ایک ہی تو بہن ہو ہماری۔" جواد بھیا کی بات پر ربیعہ کی گردن احساس تفاخر سے کچھ اور اکڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچھ لوگوں کے لیے شادی بور کا لڈو ہوتی ہے لیکن ربیعہ کے لیے پھولوں کی سیج ثابت ہوئی تھی۔ اسے سسرال میں مان' مقام' آرام سب کچھ ملا تھا۔ وہ شکم سیر تھی مزاج کی نازکی عروج پر کیونکر نہ پہنچتی۔

"بھابھی! ادھر بائیں طرف دیوار کے ساتھ دو اسٹیپ بنے ہوئے ہیں۔ جب بھی بور ہوں تو اس پر چڑھ کر ہمسائیوں کے گھر "جھاتی" مار لینا۔ سچ میں ساری بوریت دور ہو جائے گی۔ شادی سے پہلے میرا اور شمسہ کا زیادہ تر وقت انہی اسٹیپ پر چڑھ کر دیوار پار ہمسائیوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں گزر جاتا تھا۔ اب بھی میں تو جب بھی امی کے ہاں آؤں ٹائم نکال کر لازمی ادھر چڑھتی ہوں۔" اس کی نند فضہ چائے کے کپ میں چینی ملاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"سچ مفت کی انٹرٹینمنٹ ہے۔" شمسہ ہنسی تھی۔ پھر اپنا چائے کا کپ اٹھا کر دوسرا اس کی جانب بڑھا دیا۔

ربیعہ نے یونہی سر ہلایا۔

(ہونہہ! دیوار پار کون سا پرنس ولیم اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے میں اتنی مشقت کروں؟) نفاست سے چائے کا کپ تھامے ربیعہ نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ رئیلی؟" اسجد کا ردعمل توقع کے عین مطابق تھا۔ ربیعہ نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔

"مطلب میں باپ بننے جا رہا ہوں؟" اسجد کے پر مسرت بے یقین سے لہجے پر اس نے مصنوعی خفگی سے ابرو چڑھائے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"ارے نہیں یار! تم نے اچانک اتنی بڑی گڈ نیوز سنادی' سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کیسے اپنی فیلنگز ایکسپریس کروں۔" اسجد محبت پاش لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ دن اور اس سے آگے طلوع ہونے والا ہر دن ربیعہ کے لیے اپنے دامن میں بہت کچھ لے کر آتا۔

محبت' توجہ' مان وہ مغرور سی ان نوازشات کو حق سمجھ کر وصول کرتی رہی۔

چھوٹی بھابھی پھر امید سے تھیں۔ "بھابھی! الٹرا ساؤنڈ کروایا؟ اس بار بھی بیٹی تو نہیں؟" نیل پالش پر پھونکیں مارتی بظاہر وہ ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔

کپڑے استری کرتے چھوٹی بھابھی کے ہاتھ لحہ بھر کے لیے تھمے۔ پھر آہستگی سے کہا "جو خدا کو منظور۔"

"ہا! جو خدا کو منظور۔" ربیعہ نے طنزیہ ہنکارہ بھرا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں اسجد کی آفس میں مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ مہناز بیگم کی اپنی مصروفیات تھیں۔ ربیعہ جو سز لی کر' ریسٹ کرکے اور اپنے لیے رکھی کل وقتی ملازمہ کو ہمہ وقت اپنے سر پر سوار دیکھ کر بری طرح اکتا گئی۔

بعض اوقات بہت زیادہ آرام بھی تھکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔ یونہی بیٹھے بیٹھائے ایک دن نجانے اسے کیا سوجھی۔ بائیں جانب دیوار کے ساتھ بنے اسٹیپ پر چڑھ کر دیوار پر دونوں ہاتھ جمائے' دوسرے ہی لمحے اسے اپنا دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ تو کوئی اور ہی دنیا تھی۔ موٹے نقوش کی حامل سانولی عورتیں ستاروں سے جھلملاتے ریشمی کپڑے' نقلی زیورات پہنے دبلی پتلی لڑکیاں اور نیکر بنیان میں ملبوس ہڑبونگ مچاتے کچے صحن میں بھاگتے دوڑتے لوٹنیاں لگاتے ہر عمر و سائز کے بچے!

ہر کوئی متحرک کاموں میں باتوں میں!

ربیعہ پر نگاہ پڑی تو سب کچھ دیر کے لیے تھم سے گئے۔ "دھنوار (دلہن)؟" سیاہ شلوار پر جامنی قمیص پہنے دوپٹا دیساتی اسٹائل میں سر پر لپیٹے برتن مانجھتی عورت کے لبوں سے نکلا تھا۔ سب کی نگاہوں میں حیرت انگیز حسرت کی جگہ اشتیاق امڈ امڈ آیا۔

ربیعہ تیزی سے نیچے اتری۔ سامنے کا ماحول اور منظر دیکھ کر اسے بے اختیار ابکائی آئی تھی۔

مصیبت کبھی بتا کر نہیں آتی۔

اس دن ٹائلز والے واش روم میں اس کا پاؤں بری طرح رپٹ گیا تھا۔

وہ اماں کے گھر ایک پرتکلف دن گزار کر عصر کے وقت واپس لوٹی تھی۔ چونکہ ڈلیوری کے دن قریب تھے سو اماں کے ہاں چکر کئی روز بعد ہی لگائی۔

اسے اس سے ہفت اقلیم اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتے محسوس ہوئے۔ درد اتنا شدید تھا کہ ناقابل بیان... کئی گھنٹے موت و زیست کی جنگ لڑتے اس نے مردہ بیٹے کو جنم دیا تھا۔ مہناز بیگم بے دم ہو کر صوفے پر گر گئیں۔ اسجد کی آنکھیں شدت غم سے سرخ ہو رہی تھیں۔ مزید روح فرسا خبر "وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔" ربیعہ نے آنکھیں کھولیں تو اپنی خالی گود' خالی کوکھ کا احساس وحشت بن کر چھا گیا۔ وہ روئی' چیخی' تڑپی' گالیاں دیں اور چپ سادھ لی۔ ایسی چپ جس میں موت کا سناٹا تھا۔ کیا یوں بھی ہوتا ہے؟ اذیت ہی اذیت تھی۔

☆ ☆ ☆

وقت تھمتا نہیں ہے اپنی مخصوص رفتار چلتا آگے بڑھ جاتا ہے' بہت کچھ اپنے پیچھے چھوڑ کر نجانے کتنے عرصے بعد وہ اماں کے گھر جانے کے لیے خود کو تیار کرپائی تھی۔ موقع ہی ایسا تھا۔ چھوٹی بھابھی نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

یہ خبر سن کر وہ کئی ثانیوں تک یوں ہی خالی الذہنی کی کیفیت میں چپ سی بیٹھی رہی۔ پھر اٹھی ہلکے نیلے رنگ کا کاٹن کا کڑھائی والا سوٹ زیب تن کیا' شفون کا باریک ہم رنگ دوپٹہ سینے پر پھیلایا' نیچرل کلر کی لپ اسٹک لگا کر بال سمیٹتے ہوئے چوٹی بنائی۔ خود کو سمجھنے کا فن انسان کسی اور سے نہیں سیکھتا یہ اس کو خود ہی سیکھنا پڑتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے خوشگوار سی چہل پہل کا احساس ہوا۔ سبز گرل والے برآمدے کی دائیں جانب سے کچن میں عانیہ گھن چکنی ہوئی تھی۔ وہ یونہی قدم قدم چلتی دروازے پر آکھڑی ہوئی۔

"عانیہ آپی! مجھے کباب چاہئیں۔" تانیہ لاڈ سے فرمائش کر رہی تھی۔

"اور مجھے فنگر چپس!" اچک کر اسٹول پر بیٹھتی آئمہ یاددہانی کروا رہی تھی۔

"اوکے بابا۔" بالوں کو تھوڑا سا اوپر کر کے کیچر میں جکڑتے اس نے آستینیں اوپر چڑھائی تھیں۔ چولہا جلایا، ساس پین رکھا اور فرج سے مطلوبہ لوازمات نکال نکال کر سلیب پر رکھتی گئی۔

"میں صرف نوڈلز کھاؤں گی۔" گول مٹول سی مہک گھنگریالے بالوں والا سر ہلاتی کوئی تیسری بار کہہ رہی تھی۔

"عانیہ آپی! میں صرف نو۔"

"اوکے میڈم! سن لیا۔" مصروف سی عانیہ نے چٹ پٹ اسے پیار کیا تھا۔

ربیعہ مسمرائزسی کچن کے ادھ کھلے دروازے پر کھڑی رہی۔ اس نے دبلی پتلی عانیہ کو دیکھا۔ وہ بھی تو اسی گھر کی بیٹی تھی۔

جس میں خود اعتمادی اور خودداری تو تھی لیکن زعم اور احساس برتری و تفاخر ناپید۔ اسے بڑی بھابھی کی تربیت پر رشک آیا تھا۔

"کاش! اماں اگر آپ بھی میرے نازو نعم اٹھاتے وقت توازن رکھتیں تو شاید آج میں یوں اس طرح۔" اس کی پلکوں میں لرزش سی اتری تھی۔

"پھپھو آگئیں۔" کسی بھتیجی کی اس پر نظر پڑی تو نعرہ بلند کیا۔

بے اختیار اس کا دل چاہا اپنی بھتیجیوں کو بانہوں میں بھرلے۔

اس کی آمد پر سب نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا تھا۔ جھک کر گلابی کمبل میں لپٹے بھتیجے کو دیکھا اور بہت نرمی سے اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔

"آپ ایک عدد بھتیجے کی پھپھو بن ہی گئیں آخر۔" عانیہ نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ جتا نہیں رہی تھی، ربیعہ جانتی تھی۔

"پھپھو! بھیا پیارا ہے ناں؟" گڑیا بہت اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

"پیاری تو تم ہو گڑیا! بھیا سے بھی زیادہ۔" اس نے گڑیا کو اپنی بانہوں میں بھر کے زور سے بھینچ لیا تھا۔ اسے گڑیا کی پیدائش پر اپنے کہے الفاظ یاد آ گئے تھے۔

"اگر وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو آج تم بھی۔" چھوٹی بھابھی نے دکھ سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جو اللہ کو منظور۔" ربیعہ نے آہستگی سے کہا۔ بعض اوقات اپنے ہی کہے الفاظ منہ پر طمانچے کی طرح آکر لگتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

آج بھی وہ اپنے قدموں کو کسی معمول کی طرح بائیں دیوار کے ساتھ بنے اسٹیپ پر چڑھنے سے روک نہیں پائی تھی۔ منظر وہی تھا، اس کے دیکھنے کا انداز بدل گیا تھا۔

برتن مانجھتی صغریٰ کوئی خوشگوار سا تذکرہ چھیڑے ہوئے تھی۔ اس کی مدد کے خیال سے دھلے ہوئے برتنوں کے ٹوکرے اٹھا کر بان کی چارپائی پر رکھتی صفورہ ہمہ تن گوش تھی۔ دبلی پتلی صدیقہ موبائل پر گانے لگائے، دوپٹہ کمر پر کسے کچے صحن میں پانی کے چھڑکاؤ کے بعد جھاڑو لگا رہی تھی۔ قریب ہی چارپائی پر زبیدہ اپنے دو سالہ بیٹے کو نہلا کر اس کی گردن پر ڈھیر سارا خوشبودار پاؤڈر ڈالنے کے بعد آنکھوں میں سلائیاں بھر بھر سرمہ ڈال رہی تھی۔ کچھ منظر بہت مکمل ہوتے ہیں۔ مکمل اور بھرپور۔ وہ بے اختیار سوچتی۔

☆ ☆ ☆

گو کہ اس نے کافی حد تک خود کو سنبھال لیا تھا۔ پھر بھی اس کی کمی اماں کو کھٹکتی ان کی تسلیاں، دلاسے وہ خاموشی سے سنتی اور بچہ اڈاپٹ کرنے کا مشورہ نرمی سے رد کر دیتی اسے ایسی "محرومی" کے سہارے ساری زندگی گزارنی تھی تاکہ یہ "کمی" اسے احساس دلاتی رہے کہ ہم بشر ہیں اور ہمیں اپنی اوقات میں ہی رہنا چاہیے۔

☆

ایمل رضا

"شٹ اپ ۔" سکوت بھری فضا میں بید مجنوں کو زور سے گھمایا گیا تھا۔

"وہ وہاں ۔۔" ننھی زویا نے ہاتھ آگے بڑھا کر اشارہ کیا "سورج کے پار" اور مضبوطی سے پکڑے گلے کو سینے سے لگالیا۔ وہ تپتی سلاخ جیسے نانی کے پورے وجود کے آر پار ہو گئی۔ پہلے تو جان و جسم ساکت رہا۔ پھر پلکیں لرز کر بھیگ گئیں۔

"شٹ اپ۔" بید مجنوں کے ساتھ بندھا باریک چمڑا بھی لہرایا تھا۔ کھریرا کیے گھوڑے کے نرم بالوں پر ہلکی ضرب پڑی تھی۔ سم اٹھے تھے۔ کنوتیاں ہلی تھیں۔ بانک گھومی تھی۔ پہیہ حرکت میں آیا تھا۔

کتنا کچھ ہو گیا تھا۔۔ تو کیا اس لمحے میں پوری صدی قید تھی۔ گھوڑے نے اس طرف کا سفر شروع کر دیا جہاں نانی کبھی گئی ہی نہیں تھیں۔

"شٹ۔۔" کوچوان چمڑے کی طرح خود بھی جھوما۔۔ پہیے کا دائرہ مکمل ہوا تو گھوڑے نے رفتار پکڑ لی۔ نانی نے گدی اور اہنگل کو مضبوطی سے تھام لیا۔ جیسے انہیں اپنے بکھر جانے کا خوف لاحق ہو گیا ہو۔ بند آنکھوں سے وہ جامد ہو کر بیٹھ گئیں جیسے تانگے میں نہیں بلکہ کبھی آسمانی پنڈولے میں بیٹھ گئی ہوں۔ بٹھا دی گئی ہوں۔

وہ آسمان ہنڈولا ہی تو تھا۔ سلیمان کا رتھ۔۔ سورج کے پار لے کر جانے والا۔۔ سورج کے پاس سے گزرنے والا۔۔ سورج سمیت حقیقتوں کو بھی سامنے لانے والا۔۔ کیسی حقیقت تھی یہ کہ نانی کی آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں "آنسو گالوں پر لکیر پر لکیر کھینچتے چلے جا رہے تھے۔

گھر میں طیبہ انتظار کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ زویا اور اماں کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

انتظار کی دہلیز پر تو وہ ویسے بھی سالوں سے کھڑی تھی سالوں سے ہی تو اماں لاپتہ تھیں لیکن نجانے کیوں آج اس کے دل کی ممیزیں جھنجھنائے ہی جا رہی تھیں اور اس جھنجھناہٹ میں آنسوؤں کے نمکین پانی کی دھمک بھی شامل تھی۔۔ پانی سے بھرے کنویں کو جب صدیوں تک صحراؤں کی ریت اپنے اندر دفن رکھے اور انسان پیاسا ہونے کے باوجود بھی سیراب نہ ہو سکے تو بے سہارا، بے یارا، بے کنارہ اور بے آب رہ جانے کا غم بپھرے دریا کی روانی کی طرح ہی انسان کو اندر تک بھگو دیتا ہے۔

اماں نے بھلا ساری زندگی اس کے گھر قیام ہی کب کیا تھا کبھی ایک ہفتے کا کہہ کر جاتیں تو پانچ چھ ہفتے لگا کر آتیں۔ کبھی مہینوں غیر حاضر رہنے کا سندیسہ دیتیں اور اگلے ہی ہفتے کسی کے ساتھ واپس آ رہی ہوتیں۔ ویسے ایسا بھی کم کم ہی ہوا تھا کہ وہ طیبہ [illegible]طر میں لاتیں کہ اسے کچھ بتا کر جانے کی ذمہ داری کو سمجھتیں.. بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ابھی سامنے بیٹھی ہیں۔ غائب ہوتیں تو لگتا غسل خانے میں ہوں گی۔۔۔ وہاں بھی نہ ہوتیں تو پتا چلتا فیصل آباد کی گاڑی بھی پکڑ چکی ہیں۔ بعض دفعہ کے غائب ہونے پر تمام رشتے دار بھی لاعلمی کا اظہار کر دیتے طیبہ پریشان ہو جاتی۔۔ تلاش کرنے پر معلوم ہوتا کہ میاں جی کی قبر پر گزار رہی ہیں تب سے اتنے دن۔۔ قبرستان کے گورکن کا

لڑکا بھی ان کا منہ بولا بیٹا بنا ہوا تھا۔

بس ایسی ہی تھیں۔۔۔ طیبہ کی اماں اور سب کی نانی۔۔ چھریرے بدن۔۔۔ سنولائی جلد۔۔۔ سفید بال اور موٹی سونے کی لونگ کو ہمہ وقت پہنے رکھنے والی۔۔۔ جو کبھی اپنے سگے ماں باپ کو خاطر میں نہ لائیں۔۔۔ پھر خود کی کوکھ کی جنی طیبہ کیا چیز تھی ان کے آگے۔

طیبہ بھی نا کے لگی بانسری کی طرح تھی۔ نہ کبھی کسی نے ہونٹوں سے لگایا نہ ہی طیبہ نے اپنے سر سنگیت نکالے۔۔۔ مطلب۔۔۔ نہ کبھی اسے پیار ملا نہ اسے پیار دینے کا طریقہ آیا کہ کچھ دھونس ماں پر اپنے پیار کی ہی بٹھا سکتی۔

کچھ بہت پہلے۔۔۔ سالوں ادھر۔۔۔ اوروں کی طرح اس نے بھی سنا تھا (اور پھر اس بات پر یقین بھی کر لیا تھا) کہ نانی اپنی جوانی میں کسی لڑکے سے بہت محبت کرتی تھیں۔۔۔ اور سگی بڑی بہن نے چالاکی سے اس لڑکے سے اپنی شادی رچالی تھی۔ بس وہ دن اور آج کا دن۔۔۔ نانی کو رہتی دنیا تک عورت ذات کا نام اور ہر رشتے سے جیسے نفرت سی ہو گئی۔ تب کی ہی باتوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ نانی دنوں مہینوں، زہریلی **کھمبیاں** بھی اکٹھی کرتی رہی تھیں۔۔۔ پھر نجانے کیا ہوا۔۔۔ نہ تو وہ

زہریلی کھمبیاں خود کھا سکیں۔۔۔ اور نہ ہی بہن کو کھلا سکیں۔۔۔ لیکن جھولی بھر بھر زہریلی کھمبیاں اکٹھی کرنے کا یہ نقصان ضرور ہوا کہ کڑواہٹ نانی کے اندر ایسے رچ بس گئی جیسے پودے کے اندر کھار اور جسے پھر تناور بنے درخت میں سے جدا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔

مرحومہ ماں کو یاد کرتے تو کبھی کسی نے انہیں دیکھا نہ سنا۔۔۔ بہن، بیٹی، سہیلی، بھاوج، چاچی، تائی، خالہ، ماموں کے الفاظ تک ان کے لیے حروف ممنوعہ ہو گئے۔

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ نانی نے جوگ لے لیا تھا۔ بیراگ اوڑھ لیا تھا۔ بس مورپنکھ گردش جاناں کے باعث تھور میں بدل گئے تھے۔ پھر یہ تھور بھی ایسا تھا کہ میلوں دور سے ہی نظر آجاتا تھا۔ بہنوں سے لڑنے کا کوئی موقع تو وہ ویسے بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ہمسایوں اور ان کی بیٹیوں کے بھی سر کے بال ہوتے اور نانی کے ہاتھ۔۔۔ کچھ چھوٹی ہونے کا لحاظ کرتیں۔۔۔ کچھ دیوانی ہونے کا۔۔۔ لیکن آخر کب تک؟ نئے پتوں نے بمشکل دوبار ہی پرانے پتوں کی جگہ لی ہوگی کہ نانی آہستہ آہستہ تنہا ہو گئیں۔۔۔ بالکل ایسے ہی جیسے برفانی علاقوں سے کوچ کر جانے والے پرندوں کے پیچھے رہ جانے والے بڑے بوڑھے ہوتے ہیں۔۔۔ لیکن نانی کو کسی بات کا قلق نہیں تھا۔۔۔ وہ ایسا ہی چاہتی تھیں۔۔۔ عورت ذات سے نفرت ہی بہت ہو گئی تھی انہیں۔۔۔ ایک جو انہیں یہ آج کل کے ڈاکٹروں، سرجنوں کا علم ہوتا جو جنس بدل دیتے ہیں تو وہ کب کی اپنی جنس تبدیل کروا کر لڑکا بن چکی ہوتیں، مرحوم شوہر بھی اکثر کہا کرتا تھا۔

"عید تہوار پر بھی گھر نہیں جاتی۔۔۔ ایسی بھی کیا بے رخی۔"

"کیا کرنا ہے گھر جا کر۔۔۔ ماں باپ تو قبروں میں دفن ہیں۔" نانی ہمہ وقت کی اداسی کو مزید گہرا کر لیتیں۔۔۔

"بہنوں کے گھر چلی جا۔" شروع شروع میں شوہر چڑاتا تھا۔ بعد میں واقعی ہمدردی سے کہنے لگا۔ پر یہ پتا نہیں چل سکا کہ یہ ہمدردی کس پلڑے کی ہوتی تھی۔ بیوی کی طرف کی یا سالیوں کی طرف کی۔۔۔

"ان چنڈالوں کی صورت دیکھ کر میں نے اپنی عید خراب کرنی ہے۔" بہنوں کے نام پر تو وہ ویسے بھی ایسے اچھلتی تھیں گویا ٹھنڈے پانی کے چھینٹے کوئی گرم توے پر دے مارے۔۔۔

"خدا نے سات بہنیں دیں۔۔۔ سات چنڈالیں۔۔۔ سات ڈائنیں۔۔۔ سات پچھل پیریاں۔۔۔ سات بھائی دے دیتا تو خدا کا کیا جاتا تھا۔" وہ جھولی اٹھا اٹھا کر خدا سے شکوے کرتیں۔ شوہر نے رفتہ رفتہ کہنا ہی بند کر دیا۔

یوں بھی نہیں تھا کہ وہ بہنوں سے بالکل ہی لاتعلق تھیں۔ کس کی بیٹی کہاں بیاہی جانے لگی ہے۔ کس کی لڑکی کا آج کل کہاں چکر چل رہا ہے۔ انہیں ساری خبریں ہوتی تھیں۔ اور ان ساری خبروں کو پھیلانا ان کا اولین فریضہ ہوتا۔۔۔ سننے والے فوراً "یقین کر لیتے کہ سگی خالہ کہہ رہی ہے پھر تو لڑکی واقعی ہی چالو ہوگی۔۔۔ بہنوں کو سب پتا چل جاتا تھا۔ لیکن نانی کے معاملے میں وہ ہمیشہ خاموش رہتیں۔۔۔ پتا نہیں وہ کونسا کفارہ تھا جو وہ یوں خاموش رہ کر ادا کر رہی تھیں۔

کسی کے گھر شادی ہوتی تو وہ نانی کے پاؤں تک پکڑنے کو تیار ہو جاتی۔۔۔ ساتھ لے کر جانے کے لیے۔ شادی لڑکے کی ہوتی تو نانی چلی بھی جاتیں۔ لیکن اگر وہ عورت۔۔۔ صنف مونث۔۔۔ وہی ازلی کمینی ذات کی ہوتی تو پھر تو چاہے سالوں دہلیزوں پر بیٹھے رہو نانی کے گھر کی۔۔۔ نانی نہ اٹھنے کی۔

کچھ ایک دو بہنوں کے بیٹوں دامادوں کو ہی انہوں نے اپنا منہ بولا بیٹا بھی بنا رکھا تھا اور ان منہ بولے بیٹوں کی تعداد حد سے زیادہ تھی۔ ان منہ بولے بیٹوں کا پھیلاؤ پورے ملک کی حدود پر پھیلا تھا۔

کہنے والے کہتے تھے جب اپنے سگے بیٹے ہو جائیں گے تب یہ کچے رشتے خود ہی بھر بھرا جائیں گے۔۔۔ کچھ دعا بھی کرتے تھے کہ اسے کبھی بیٹا نہ ہو یا تو پھر وہ بیٹا

ساری زندگی کنوارہ رہ جائے گا اور اگر کہیں سے کوئی امری بیاہ بھی لایا تو لڑکی چار دن بعد ہی مرجائے گی زہریلی کھمبیاں کھا کر۔ اپنے ہاتھوں سے یا نانی کے ہاتھوں سے۔

کچھ نانی کے ہاتھوں بدنام ہوئی لڑکیوں کے ماں باپ باقاعدہ بددعا کرتے تھے۔

"خدا کرے اس کی بھی سات لڑکیاں ہوں۔ جو اٹھتے بیٹھتے اس کا منہ کالا کریں۔ تب پوچھیں گے اس سے کہ دوسروں کی عزت اچھالنے کا تجربہ کیسا ہوتا ہے!"

لیکن ایسا ویسا کچھ بھی نہ ہوا۔

نہ اپنے سگے بیٹے ہوئے... نہ کچے منہ بولے رشتے بھر بھرائے... لے دے کے وہی ایک رحمت جو نانی کو ہمیشہ زحمت لگی۔ طیبہ... نہ اس سے پہلے کچھ ہوا نہ ہی بعد میں۔

طیبہ پیدا ہوئی تو نانی کو جیسے کوئی بہت بڑا پکا غم لگ گیا۔ جیسے کومڑ زیادہ پک جائے تو اپنے آپ ہی پھٹ پڑتا ہے۔ ویسے ہی سالوں کی پکتی نانی بھی پھٹ پڑیں۔

طیبہ کی پیدائش کے دن سے انہیں طیبہ اور خدا... دونوں سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا۔ خدا سے تو یوں کہ جیسے خدا نے ان سے کوئی پچھلا بدلہ لیا ہے... عورت ذات سے نفرت کے باوجود خدا نے انہیں بیٹی دے کر کوئی پرانی دشمنی نکالی ہے... اور طیبہ سے اس طرح کہ یہ منحوس پیٹ کے اندر ہی مر کیوں نہ گئی۔

حالانکہ تب علاقے کی دائی نے ان سے کہا تھا۔

"تیرا رنگ روپ نکھر رہا ہے خدیجہ... تیری زبان بھی خشک نہیں... تیرے پیٹ میں بیٹی ہے۔"

لیکن نانی نے اس کی بات پر کان نہ دھرے۔ دائی کے تجربے سے کہیں زیادہ انہیں اپنی دعاؤں پر یقین تھا۔ لیکن دعائیں قبول نہ ہوئیں اور لوگوں کے جملے کہ "اپنی بیٹی ہوگی تو دیکھیں گے کیسے کرتی ہے عورت ذات سے نفرت؟" ان باتوں نے نانی کا دل طیبہ کی پیدائش سے بہت پہلے ہی چٹان کی طرح سخت کر دیا۔ اتنا کہ مہینے بھر بعد جب شوہر بیٹی کے لیے نام پوچھ پوچھ کر تھک گیا تو اس نے خود ہی لڑکی کا نام طیبہ رکھ لیا۔

بڑتے سال تو نانی اپنی ہی بیٹی کو وہ اسے یہ کہہ کر بلاتی

رہیں۔ نہ اپنا دودھ پلایا نہ ہی کچھ اور بنا کر کھلایا۔ بس اٹھتے بیٹھتے خدا کو رو رو کر دکھایا۔

"تو نے سات بھائی نہ دیے... ایک بیٹا ہی دے دیتا تو تیرا کیا جاتا؟" نانی کا غم بے انت ہو گیا۔

طیبہ خود رو جڑی بوٹی کی طرح اگی تھی۔ خود ہی پلتی بڑھتی رہی۔ جیسے کیاری اگی بیلا درخت کو سہارا بنائے پروان چڑھتی چلی جائے۔ باپ نے جب تک جان ماری جب تک زندہ رہا۔ مرتے وقت وہ یوں بھی مطمئن تھا کہ چلو طیبہ اپنے گھر کی تو ہوئی۔

رشتے داروں کو طیبہ کی رخصتی سے زیادہ نانی کے رویے کی جانچ کا شوق و انتظار تھا۔ اور سب منتظروں کو اپنے منہ اپنے ہی گریبانوں میں چھپانے پڑے۔ ممتا کی آنکھوں سے نمی تو کیا جھلکنی تھی نانی تو اگلے ہی دن سامان پیک کر کے کسی منہ بولے بیٹے کے گھر روانہ ہو گئیں۔

یہ وطیرہ نانی نے اسی دن سے اختیار کیا ہوا تھا۔ جب دل گھبرایا۔ کسی منہ بولے بیٹے کے گھر روانہ ہو گئیں۔ اور نانی کا دل مانوں سارا سال گھبراتا ہی رہتا تھا۔ کسی بیٹے کے گھر ان کا قیام زیادہ لمبا نہ ہوتا بھی سننے میں آتا کہ آج کل فیصل آباد میں ہیں۔ وہاں طیبہ نے کوئی ضروری کام بھجوانا ہوتا تو خبر ملتی کہ اب تو وہ "سمندری" بھی نکل گئی ہیں۔ سمندری جا کر پتا چلتا کہ کل ہی ملتان روانہ ہو گئی ہیں۔

ان کے ان مختصر قیام کی وجہ بھی وہ خود ہی تھیں۔

منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کو تو وہ کسی طور بھاتی ہی نہ تھیں۔ ان کے گھروں کے دائیں بائیں کی تتلیوں کی آنکھوں میں بھی نانی سنگریزے کی طرح چبھتی تھیں۔

"حاجرہ بھابھی... آپ کی خالہ ساس کیا بچپن سے ہی نیم کے پتے کھاتی آرہی ہیں... قسم سے منہ سے کچھ نہ بھی بولیں تو آنکھوں سے ہی ایسی گھوری ڈالتی ہیں کہ بندہ بنا تیل، بنا مرچ کے ہی بھسم ہو جاتا ہے۔"

"ہماری جانے بلا... پتا نہیں کہاں سے یہ سوغات ہر دوسرے تیسرے مہینے منہ اٹھا کر چلی آتی ہے..."

"کوئی اپنا سگا نہیں ہے ان کا؟"

"ہے ایک بیٹی... پر پتا نہیں وہاں کیوں نہیں ٹکتیں۔ جھگڑوں کی طرح دربدر ہوئی پھرتی ہیں۔"

چند ایک دو نیک سیرت بہوؤں نے بڑی کوشش بھی کی کہ خالہ ساس کے اندر کے دہکتے لاوے کو کسی طور ٹھنڈا کر سکیں اور عورت جاتی کے خلاف ان کی نفرت کو کم کر سکیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ دھوئیں اور دھند کی طرح تھا۔ جب کچھ نظر آنے لگتا تو جلتی لکڑیوں کی کاٹ میں آنکھیں کھولنے کی ہمت ہی نہ رہتی اوپر سے جب نیک سیرت بہوؤں کے شوہروں کو بھی دوسرے منہ بولے بیٹوں کی طرح بھڑکایا جاتا تو نیک سیرت بہوؤں کا بھی سارا ادب و لحاظ چنے کے کھیت کی طرح رنگ بدل لیتا اور نیک سیرت بہوئیں زبان درازی میں چالاک بہوؤں کو بھی مات دے جاتیں۔

خیر نانی نے کبھی اس چیز کی پروا نہیں کی۔ بچپن سے ہی انہوں نے اپنے لیے جو مقصد طے کر لیا تھا وہ اس پر بڑی سختی سے عمل پیرا رہا کرتی تھیں' یہ سارے واقعے ان کے لیے مسالا لگی کیری سے کم چٹخارے دار نہ تھے۔

"اے جمیل... تیری بیوی کیا ہر وقت سر پر پٹی باندھ پلنگ پر لیٹی رہتی ہے... ہمارے وقتوں میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا... نو نو بچوں کو بھی جنوں اور گنے کی طرح سیدھے اور میٹھے بھی رہو۔"

"عابد بیٹا... ہوش کے ناخن لے... یہ جو تیری بیوی بڑی صفائی پسندی رہنے کے چکر میں ہر دوسرے تیسرے دن کپڑے دھو دھو کر اوپر ڈالنے جاتی ہے نا تو یہ کسی دن اوپر سے اوپر ہی بھاگ جائے گی... تیرا منہ کالا کر کے... دیکھ لیے ہیں میں نے اس کے لچھن۔"

"تیری بیوی کی آواز بہت سریلی ہے زاہد... کسی کوٹھے والی کا خون لگتی ہے۔"

بیٹے ان کی باتوں پر کان کم ہی دھرتے تھے۔ ان کی عادت خصلت کا پتا جو تھا انہیں... پھر بھی کسی ایک آدھ بہو کے کان میں اپنی ہی شان میں بولے جانے والے جملے کی بھنک بھی پڑ جاتی تو گھر بھر میں چھوٹی سی قیامت آجاتی۔

"صبح کا سورج یہ بڑھیا اس گھر میں دیکھے گی یا میں۔"

لڑکے بے چارے کیا کرتے... نانی کا سامان پیک کر کے کبھی دوسرے لڑکے کے گھر روانہ کر دیتے... یوں پورے پاکستان کا چکر لگاتی نانی کبھی کبھی طیبہ کے گھر بھی آجاتیں... آجاتیں نہیں بلکہ بھجوا دی جاتیں۔

"تمہاری سگی بیٹی بھی تو رہتی ہے اس ہی شہر میں.. پھر اس کے گھر کیوں نہیں رہتیں تم...؟"

"اس کے گھر جاؤں... چور' ڈاکو' لٹیرن' بھوکی نظروں والی... میری دولت کی لالچی..." نانی نخوت سے بولتیں۔

"تمہارے پاس دولت ہے ہی کتنی؟"

"کیوں پانچ تولہ سونا کیا کم ہوتا ہے...

دس تولہ ہو چاہے سو تولہ... انسان کو ہمیشہ مزید کی ہوس رہتی ہے۔"

"تو دے دو نہ اسے... اور کسے دے کر جاؤ گی۔"

"مسجد میں دے دوں گی... مگر اس چنڈال کو نہیں دوں گی۔"

"کیوں؟... ایسی کیا خطا کر دی اس نے۔"

"ارے بھئی... سمجھو نا... وہ بھی عورت ہے... یہ کیا کم خطا ہے اس کی۔" نانی کے بجائے کوئی تیسرا نانی کے دل کی بات کرتا۔

"کبھی خبر ہی نہ لی کہ ماں کہاں ہے... ماں دربدر اور بیٹی کے ہنی مون ہی تھمنے میں نہیں آتے۔"

"اس کا شوہر آرمی میں ہے... بار بار پوسٹنگ ہوتی ہے اس کی... جسے تم ہنی مون کہہ رہی ہو نا وہ ان کی مجبوری ہے... اور تم کون سا ماں بن گئی جو وہ بیٹی بنے۔"

"گھر جاؤ تو نہ کبھی پانی کو پوچھے نہ روٹی کو۔"

"کیا نواسیاں بھی ایسی ہی ہیں۔"

"وہ تو اپنی ماں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں... ان کی نظریں تو میری چابیاں تولتی ہیں... کہ کب نانی مرے

اور کب یہ ان کے قبضے میں آئیں ۔۔۔ مگر میں بھی دیکھوں گی کہ کیسے ہاتھ لگاتی ہیں وہ ان کو ۔۔۔ کنویں میں پھینک ۔۔۔“

”چھوڑو نانی ۔۔۔ میں نے خود دیکھا ہے ان کو تمہاری خدمت کرتے ۔۔۔ کوئی پاؤں داب رہی ہوتی ہے ۔۔۔ کوئی پنکھا جھل رہی ہوتی ہے۔“

”سب دکھاوا ہے ۔۔۔ ڈرامے بازیاں ۔۔۔ جو وہ آنے جانے والوں کے سامنے کرتی ہیں۔ جوں ہی میں اکیلی ہوتی ہوں ۔۔۔ فقیرنیوں کی طرح گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں۔“

نانی کی باتوں میں کچھ حقیقت بس یہاں تک ہی تھی کہ منہ بولے بیٹے رخصت کرتے وقت جو دو چار چیزیں ساتھ کرتے تھے ۔۔۔ نواسیاں انہیں للچائی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں ۔۔۔ کسی سوٹ یا کسی جوتی کو ۔۔۔ ملا تو انہیں کبھی کچھ نہ ۔۔۔ اس لیے جوں جوں بڑی ہوتی گئیں ان کی یہ عادت خود بخود ہی ختم ہو گئی۔ ویسے بھی اب ان لینے دینے والے کپڑا ڈیزائن کے سوٹوں کو پوچھتا ہی کون تھا۔ آج کل تو بازاروں میں یک رنگی عربی لان ہی چھائی ہوئی تھی۔

ہفتے دو ہفتے طیبہ کے گھر رہنے کے بعد جب نانی ذرا ذرا سی بات پر بڑا بڑا بھونچال اکٹھا کرنے لگتیں تو طیبہ کو علم ہو جاتا کہ اب اماں پھر سے ہجرت کرنے کے لیے پر تول رہی ہیں۔ طیبہ کی اتنی حیثیت بھلا کب تھی کہ وہ اپنی سگی ماں کو کہیں جانے سے روک ہی پاتی۔

ایسے ہی وقتوں میں قریہ قریہ گھومتیں نانی کی طبیعت اچانک ایک دن خراب ہو گئی۔ گردوں میں کوئی خرابی ہو گئی۔ رشتے داروں نے سکون کا سانس لیا کہ اب تو طیبہ کے گھر ہی قیام کریں گی۔ لیکن نانی کے پیروں پر تو ٹرین کے پہیے نصب ہو چکے تھے۔ دوائیوں کے بنڈل باندھے بانگ درا بجاتیں نانی نے اپنے پھیرے تورے جاری رکھے۔

پہلے جو صرف ناک بھوں چڑھائی جاتی تھی۔ اب باقاعدہ کھری کھری سنائی جانے لگیں۔

”کچھ خیال کرو اپنی بیماری کا ۔۔۔ اور کچھ رحم کرو ہماری حالتوں پر ۔۔۔ بچوں کو جراثیم لگ گئے تو اتنے امیر نہیں ہیں ہم کہ مہنگے ڈاکٹروں کو دکھاتے پھریں۔“

بہویں الگ آتے جاتے بے عزتی کرتیں ۔۔۔ ادھر وہ بے چاریاں صفائی کرتیں۔ ادھر نانی بلغم زدہ کھانسی کھانس دیتیں یا پان کی پچکاری ہی سڑک دیتیں۔

”اپنی بیٹی کے گھر کیوں نہیں جاتیں تم ۔۔۔ وہ صاف کرے تمہارا یہ گند موت ۔۔۔ ہم سے تو نہیں ہوتا یہ سب ۔۔۔“ پھر جیسے ماں باپ تھے۔ بچے بھی ویسے ہی تھے۔

”اتنے فارغ نہیں ہیں ہم نانی ۔۔۔ کہ ہسپتالوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں۔“

طیبہ کے پاس ان ساری باتوں کی کترنیں پہنچیں تو ماں کو لینے ساہیوال پہنچ گئی ۔۔۔ وہاں سے پتا چلا میانوالی میں ہیں ۔۔۔ خیر سرگودھے سے مل گئیں ۔۔۔ پھر آخر ۔۔۔ حال و بے حال ۔۔۔ پاؤں پکڑ پکڑ کر کھاریاں کے لیے راضی کیا ۔۔۔ گاڑی تیار کروائی ۔۔۔ خاندان والوں نے ایک طرح سے کہہ دیا کہ اب دوبارہ نہ آنا ۔۔۔ ہمارے گھروں میں ۔۔۔ اپنی بیٹی کے گھر ہی رہنا۔

ستر سال کی عمر میں اب تو نصیب بھی ایسے ٹھنڈے ہو چکے تھے کہ بہنیں بھی ایک ایک کر کے فوت ہو چکی تھیں۔ جس کے لیے زہریلی کھمبیاں اکٹھی کیں۔ وہ آخر وقت تک نانی کو یاد کرتی رہی ۔۔۔ لیکن نانی نہیں گئیں ۔۔۔ روپوش ہی ہو گئیں ان دنوں ۔۔۔ نہ کشمیر سے ملیں نہ کراچی سے ۔۔۔ یہ وہ بدلہ تھا جسے انہوں نے شاید مدتوں سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

خیر کھاریاں آکر کہیں ان کے ناتواں جسم میں جان آئی۔ طیبہ کا شوہر فراز روز گھر میں پھل لانے لگا۔ یخنی، دودھ، میوے، پھر طاقت کی گولیاں الگ ۔۔۔ خیر دنوں میں ہشاش بشاش ہو گئیں نانی ۔۔۔ تاہم بیماری میں بھی ان کی زبان بیمار نحیف ہوئی تھی ۔۔۔ نواسیاں خدمت بھی کرتی رہیں ۔۔۔ اور پھٹکاریں بھی سنتی رہیں۔

مہینوں ایک ہی گھر میں پڑے رہنے نے نانی کو اداس بھی کر دیا ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ مری بہنوں کی تو وہ شکلیں بھی بھول گئی تھیں۔ کچھ تو یوں بھی کہتے تھے کہ مرے

خاوند کا نام لے لے کر بڑی کے شوہر کو روتی ہے خدیجہ۔۔
لیکن یہ حقیقت کچھ نانی کا دل ہی جانتا تھا کہ انہیں اپنے مرحوم شوہر سے کتنی محبت تھی۔
اکثر۔۔۔ خواب و خیال میں تو وہ اپنے شوہر سے ہم کلام ہوا ہی کرتی تھیں۔ لیکن جب کہیں انہیں "آک کی ڈوڈی" مل جاتی تو پھر تو وہ گھنٹوں اس سے باتوں میں مصروف رہتیں۔ یہاں تک کے ہاتھ پر آئے پسینے کے باعث آک کی ڈوڈی کے سارے پنکھ بھیگ کر ایک دوجے کے ساتھ چپک جاتے تھے اور اڑانے پر بھی پھر اڑتے نہ تھے۔ لیکن نانی کا پیغام نامہ تھمنے میں نہ آتا تھا۔
سلام دعا سے بات شروع کر کے اپنی موجودہ حالت کے رونے دھونے پر کہیں جا کر بات ختم ہوتی۔
ایسے ہی بس ایک دن ننھی زویا نے نانی کو ہاتھ اپنے منہ کے آگے کیے کچھ بڑبڑاتے دیکھ لیا۔
"کیا کر رہی ہو نانی؟"
"زویا نے پکارا تو نانی نے ناگواری سے یوں دیکھا جیسے ان کا کوئی وظیفہ ٹوٹ گیا ہو۔
"پیغام بھجوا رہی ہوں۔" اپنے محبت نامے کے لیے جھوٹ بولنا انہوں نے مناسب نہ سمجھا۔
"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟"
"مائی بھونڈی۔" (آک کی ڈوڈی)
"یہ لے کر جائے گی پیغام؟" زویا ہنسی۔" کس کو بھجوا رہی ہو پیغام؟"
"تیرے نانا کو۔" نانی اداس ہو گئیں تو زویا کی ہنسی بھی تھم گئی۔
"کہاں رہتے ہیں نانا؟"
"بہت دور۔"
"کتنی دور؟" نانی آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔
"بہت دور۔۔۔ آسمان سے پرے۔۔۔ سورج کے پار۔"

یہ ہی وہ واقعہ ہے، جو ہماری کہانی کی پہلی لائنوں کا سبب بنا۔
نانی صحت مند ہو گئیں۔ لیکن کہیں جا نہ سکیں۔۔۔
ایک تو اس وجہ سے کہ خاندان والوں کا ان سے بائیکاٹ ختم نہ ہوا تھا۔۔۔ دوسرا طیبہ کے شوہر فراز کی وجہ سے۔۔
جس نے بڑی رعب دار آواز میں نانی کو گھر سے باہر جانے سے سختی سے منع کیا تھا۔ ویسے جو بھی تھا۔ نانی کو اپنا یہ سگا داماد دل ہی دل میں بہت پسند تھا۔۔۔ آرمی کا اونچا لمبا۔۔۔ چوڑی چھاتی کا جوان۔۔۔ عام سی بات بھی اتنے ڈبنگ اور رعب دار انداز میں کرتا کہ بندہ سوچ میں پڑ جاتا کہ بات سنے کہ اس پر وقار جوان کو دیکھے۔
تیسری وجہ طیبہ تھی۔۔۔ جس نے روتے ہوئے منت کی تھی۔
"سارے دیس کے لڑکوں کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا ہے۔۔۔ ایک میرے خاوند سے ہی بیر ہے۔۔۔ اسے بھی منہ بولا بیٹا بنا کر ہی اس کے گھر میں رہ لو۔"
لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے ہی سہی نانی کا دل پسیجا ضرور تھا۔ اور پھر ان ہی بھانجھ دنوں میں وہ واقعہ ہو گیا جو شاید نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ننھی زویا کو آخر نانی سے اتنی ہمدردی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔
وہ بھی ویسا ہی برسات کا ایک حبس زدہ دن تھا۔
چھریرے بدن کی نانی چارپائی پر بیٹھی خود کو ہاتھ کا پنکھا جھل رہی تھیں۔ جب زویا ان کے پاس آگئی۔
"اداس لگ رہی ہو نانی۔۔۔ نانا ابو یاد آ رہے ہیں کیا؟"
نانی نے پیچھے سے اپنی قمیص اٹھا کر کندھے پر رکھی۔
"ہاں۔۔۔ پھر۔"
تو آؤ چلتے ہیں پھر ان کے پاس۔"
"اوہ پاگل۔۔۔ توبہ استغفار کر۔۔۔ بہت دور رہتے ہیں وہ۔۔۔"
"میرے پاس کرائے کے پیسے ہیں۔"

اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے انہوں نے آک کی ڈوڈی کو فضا کی سپرد کر دیا۔
زویا نے تیزی سے چھت پر جا کر دیکھا۔۔۔ وہ آک کی ڈوڈی واقعی میں سورج کے پار جا رہی تھیں۔

"جا جا۔۔۔ میرا دماغ نہ کھا۔"
نانی نے غصے سے کہا۔ لیکن زویا نے کوئی اثر نہ لیا۔
بھاگ کر اندر سے اپنا تین بہنوں کا مشترکہ گلا اٹھا لائی۔
"اٹھو نانی" اور ہاتھ پکڑ کر نانی کو کھینچنے لگی۔

ایک تو ویسے ہی حبس سے نانی کا دل گھبرا رہا تھا۔ سوچا باہر نکل کر ذرا چہل قدمی ہی کر لوں۔۔۔ لیکن زوہا نے تو باہر نکل کر عجیب ہی کام کیا۔ تانگے کو روک لیا۔

"اے زوہا۔۔۔" نانی چلائی۔

"سورج کے پار۔۔۔" اس نے تانگے والے سے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟" بوڑھا کوچوان عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سیدھا۔۔۔ بالکل سیدھا۔" زوہا نے سمجھایا اور نانی کو اوپر کھینچنے لگی۔

"اے زوہا۔۔۔ سن میری بات۔۔۔" نانی کی چیخ بھی کہیں دب سی گئی۔

"وہ جو سامنے دیکھ رہے ہو نا۔۔۔ چمکتا ہوا بڑا سا بلب.. بس اس کے پار۔" زوہا نے مزید سمجھایا۔

"اے زوہا سن۔"

"گھبراؤ نہیں نانی۔۔۔ ہم پہنچ جائیں گے، یقین رکھو مجھ پر۔" زوہا نے اپنا ننھا ہاتھ نانی کے جھریوں بھرے ہاتھ پر رکھا۔

اور دور و نزدیک میں جیسے کوئی دھماکا سا ہوا۔ اس دھماکے کی آواز زلزلے سے مشابہ تھی نہ آتش فشاں کے پھٹنے سے۔۔۔ بلکہ اس دھماکے کی آواز میں سوکھے دہکتے صحراؤں میں پھرنے والی لُو کا شور تھا اور یہ شور اس قدر زیادہ تھا کہ لمحوں میں ہی نانی جیسے بہری ہو گئیں۔ دنیا ان کی نظروں میں گھوم سی گئی۔ اندھے کنویں کی سی صورت لیے نانی نے زوہا کو دیکھا۔ جیسے کسی یقین و بے یقینی کے گرداب میں پھنسی ہوں۔ نجانے وہ لمحہ کیا تھا۔ نانی نے اپنے حلق میں بچپن کی اکٹھی کی ہوئی زہریلی کھمبیوں کا تلخ ذائقہ محسوس کیا۔

"اداس مت ہو نانی۔۔۔ تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے۔۔۔"

زوہا نے پیار سے ایسے کہا جیسے اندھیرے میں آکاش شالیں کھنچ گئیں۔ مدتوں کے بند غار۔ روشن ہو گئیں۔۔۔ اور کپھاڑوں کی سطح نے بالآخر سورج کو جا ہی لیا۔

"شٹ۔۔۔ اپ۔"

سکوت بھری فضا میں بید مجنوں کو زور سے گھمایا گیا۔

"سورج کے پار۔۔۔" زوہا خود سے مسکرائی اور اس نے مضبوطی سے پکڑے گلے کو سینے سے لگا لیا۔ بت بنی نانی کی آنکھوں میں جنبش ہوئی۔ ہیرے کی مانند تراشا ہوا جیسے صدیوں کا رکا ہوا کوئی آنسو نانی کی آنکھ سے نکل کر زوہا کی ہتھیلی پر آ کر جم گیا۔

"شٹ۔۔۔ اپ۔"

بید مجنوں کے ساتھ بندھا باریک چمڑا بھی لہرایا تھا۔ کھریرا کیے گھوڑے کے نرم بالوں پر ہلکی ضرب پڑی تھی۔ سم اٹھے تھے۔ کنوتیاں ہلی تھیں۔ ہانک گھومی تھی۔ پہیہ حرکت میں آیا تھا۔

کتنا کچھ ہو گیا تھا تو کیا اس لمحے میں پوری صدی قید تھی۔۔۔ گھوڑے نے اس طرف کا سفر شروع کیا جہاں نانی کبھی گئی ہی نہیں تھیں۔

نانی جیسے واقعی ہی سورج کے پار جا رہی تھیں۔ کیسی روشنی تھی یہ کہ نانی کی آنکھیں چندھیائی ہی جا رہی تھیں۔ آنسو گالوں پر لکیر پر لکیر کھینچتے ہی چلے جا رہے تھے۔

"شٹ۔۔۔"

کوچوان چمڑے کی طرح خود بھی جھوما۔۔۔ پہیے کا دائرہ مکمل ہوا تو گھوڑے نے رفتار پکڑ لی۔۔۔ نانی نے گدی اور اہنگل کو مضبوطی سے تھام لیا۔ جیسے انہیں اپنے بکھر جانے کا خوف لاحق ہو گیا ہو۔

کوچوان ہنسنے لگا کہ نہ بھاؤ کیا نہ تاؤ منزل پر پہنچا کر خوب لوٹوں گا' وہی کوچوان دو گھنٹے بعد نیچے اتر کر ہاتھ جوڑنے لگا۔

"اے بڑی بی۔۔۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔۔۔ دو گھنٹے سے یہ بچی مجھے سڑکوں پر نچا رہی ہے۔"

لیکن نانی کیسے بولتیں۔ وہ کچھ بولنے کے بھلا قابل ہی کب رہی تھیں۔ زوہا بھی مایوسی سے بوجھل ہو گئی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی تھی نانی۔۔۔" زوہا اداسی سے بولی۔

"سفر واقعی بہت لمبا ہے۔۔۔ ایسا کریں گے کل صبح جلدی نکل آئیں گے۔" زویا نے نیا خیال دیا اور نانی کی آنکھوں کے آنسو مزید تیز ہو گئے۔

اور اس دن گھر والوں نے بھی عجیب منظر دیکھا۔ نانی گھر کے اندر داخل ہوئیں زویا کو گود میں اٹھا کر۔۔۔ کل وار گڑیا کی طرح چلتے ہوئے۔۔۔ آج تک انہوں نے کسی لڑکی ذات کو چھوا تک نہ تھا۔۔۔ گود میں اٹھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"اماں کہاں گئی تھیں؟" ہوائی اڑاتے چہرے کے ساتھ طیبہ نے پوچھا۔

"تلاش کر کر کے ہم تو ہلکان ہو گئے۔ زویا کہاں گئے تھے تم لوگ؟" نانی کرسی پر ایسے بیٹھیں۔ جیسے مدتوں سے جمے پہاڑوں کا ٹوٹنا دیکھ چکی ہوں۔

"بول زویا۔۔۔" طیبہ نے زویا پر زور ڈالا۔۔۔ اور زویا نے الجھن زدہ نظروں سے نانی کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی۔ ایک آواز نے سب کے اوسان خطا کر دیے۔ یہ رونے کی آواز تھی۔ نانی کے رونے کی۔ جو پھر لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی گئی۔

"اماں کیا ہوا؟۔۔۔ کیوں رو رہی ہو؟" طیبہ پریشان ہو گئی۔

"زویا۔۔۔ تو نے کچھ کہا؟" بڑی بہن نے پوچھا۔۔۔ پھر خود ہی خاموش ہو گئی۔۔۔ اتنی سی بچی بھلا ایسا کیا کہہ سکتی ہے۔

"اماں کیا ہوا بات تو بتاؤ۔۔۔ خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے۔۔۔" لیکن نانی کیسے خاموش ہوتیں اور کیا بتاتیں۔۔۔ وہ اپنا سینہ پیٹتی رہیں۔

جو بات روئی کے گالوں میں دبی پڑی تھی۔ اب بھسم کر دینے والی آگ کی صورت آشکار ہوئی تھی۔۔۔ طیبہ کیسے سمجھتی کہ نانی تو سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھ آئی تھیں۔۔۔ وہ سورج جو سالوں سے چڑھا ہوا تھا اور اب یہ کیا کسوف تھا جو سرکتا تھا۔۔۔ نہ ٹلتا تھا۔

"زویا تو کچھ بول۔۔۔ کیا ہوا اماں کو۔"

ننھی زویا بھلا اتنے بڑے بڑے سوالوں کے کیا جواب دیتی۔۔۔ ایک تو ویسے ہی وہ سہم گئی تھی۔ دوسرا بڑوں کی ڈانٹ کا بھی خوف تھا۔۔۔ اور نانی کا رونا تھا کہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ آواز کی شدت کے ساتھ ساتھ آنسوؤں کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

اگلے دن صبح نانی کی میت اٹھ جانے کے بعد۔۔۔ طیبہ نے پھر زویا کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"خدا کے لیے کچھ تو بتا کہ کل کیا بات ہوئی تھی۔۔۔ کوئی تجھے کچھ نہیں کہے گا۔"

کسی نے کچھ کہنا بھی کیا تھا۔۔۔ اب کہنے کو بھلا رہ ہی کیا گیا تھا۔ پھر بھی زویا کا ماتھا اور ہونٹ کا اوپری حصہ پسینے کے ننھے ننھے قطروں سے بھیگ گیا۔ ان قطروں میں خجالت تھی' شرمندگی' مایوسی یا نامرادی' کوئی سمجھ نہ سکا۔ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ ہلا کر زویا نے آک کی ڈوڈی اور سورج کے پار جانے والا سارا قصہ جوں کا توں سنا دیا۔

"پھر ہم اگلے دن جانے کا پروگرام بنا کر واپس گھر آ گئے۔" زویا رونے لگی۔ طیبہ نے زور سے زویا کو گلے سے لگا لیا اور خود بھی بے آواز روتی رہی۔

"کیا ہوا امی؟۔۔۔ کیا کہہ رہی ہے زویا؟" بڑی لڑکیوں نے روتی طیبہ کا کندھا جھنجھوڑا۔

طیبہ ان کو کیا بتاتی۔۔۔ وہ تو خود کچھ نہ سمجھ سکی تھی۔ یہ راز نانی کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا کہ ان کی موت کی اصل وجہ کیا بنی ہے؟ کیا وجہ یہ تھی کہ ساری زندگی تو نانی کو عورت جاتی کی محبت کا یقین نہ آیا۔ ساری زندگی وہ عورت ذات سے شدید نفرت کرتی رہیں۔۔۔ اور جب محبت پر یقین آیا بھی تو اتنی شدت سے آیا کہ وہ خود اسے برداشت نہ کر سکیں؟؟؟

یا نانی اس خوشی کی وجہ سے مر گئی تھیں کہ اچانک ایک دم سے انہیں ایک ننھی لڑکی سے بے پایاں محبت مل گئی تھی؟؟؟

یا انہیں یہ غم کھا گیا تھا کہ ایک کی سزا ساری عورت برادری کو دیتیں وہ اصل میں خود کوئی سزا بھگت رہی ہیں؟

ایسی باتیں بھلا کچے ذہنوں کو کیسے سمجھ میں آ سکتی ہیں؟؟۔۔۔ کیسے سمجھ میں آ سکتی ہیں؟؟؟

صدف آصف

تم کو چاہا

وہ جیسے ہی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے، اشتہا انگیز خوشبوؤں نے استقبال کیا، گلاس ٹاپ ڈائننگ ٹیبل پر چکن بریانی، مٹن قورمہ، بروسٹ کباب، بھاپ اگلتا گرم سوپ، سلاد، رائتہ اور میٹھے میں فیرنی بڑی نفاست سے سجائی گئی تھی۔

"کیا یہ لوگ سادہ کھانا نہیں کھلا سکتے تھے؟ سچ میں میرا پیٹ تو اب دعوتیں کھا کھا کر دہائیاں دینے لگا ہے۔" سرفراز نے پیٹ پر اذیت بھرے انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ماں کی جانب جھک کر سرگوشی کی۔

"ششش..." ساجدہ نے بیٹے کو کہنی مار کر خاموش کرایا۔

فیرنی پر سجی کاجو، بادام اور پستے کی ہوائیاں دیکھتے ہی ان کا دل کھانے کو للچایا، ویسے بھی وہ نمکین کھانوں سے اتنا شغف نہیں رکھتی تھیں، شروع سے میٹھے کی شیدائی تھیں۔ پیٹ کتنا ہی بھرا ہوا کیوں نہ ہو، کہیں مٹھائی کی جھلک دکھائی دے جاتی تو بھلے ہی چھوٹا سا ٹکڑا ہی منہ میں رکھیں، مگر کھاتی ضرور تھیں۔

"امی... پلیز... اگر یونہی چلتا رہا تو میں کل ہی واپس چلا جاؤں گا۔" سرفراز نے دھیرے سے احتجاج کیا۔

"صبر کرو۔ رازی! اس پر بعد میں بات کرتے ہیں۔" ساجدہ نے گھبرا کر بیٹے سے کہا، پھر مڑ کر منجھلے بھائی، بھابھی کو دیکھا جو ان کے پیچھے ہی ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تھے۔

"معاف کرنا ساجدہ... تمہارے شایان شان دعوت کا انتظام نہ کر سکی۔" درخشاں نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے ٹیبل پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔

"ارے، منجھلی بھابھی، ہم کوئی مہمان تھوڑی ہیں۔ آپ نے اس قدر اہتمام تو کیا ہے۔ سادہ دال دلیہ بھی پکا لیتیں تو کوئی حرج نہ تھا۔" ساجدہ نے طریقے سے اپنی بات سمجھانا چاہی اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ساجدہ تم نے یہ کیا بات کر دی؟" درخشاں عادت کے مطابق فوراً ہی برا مان گئیں۔

"نہیں... میں تو یہ..." ساجدہ نے بھابھی کے تیور دیکھ کر گھبرا کر صفائی دینے کی کوشش کی۔

"بھئی مانا کہ تم بڑی آدمی ہو... مگر ہمارے خلوص کو ایسے تو نہ ٹھکراؤ۔" درخشاں نے مصنوعی ناراضی دکھاتے ہوئے، بات کاٹ کر ان کی پلیٹ کو بروسٹ سے لبالب بھر دیا۔

"اللہ نہ کرے جو میں ایسا سوچوں، نہ ہی میرا یہ مطلب تھا۔" ساجدہ فطرتاً سادہ مزاج تھیں، نرمی سے بولتے ہوئے، اپنی پلیٹ میں ایک لیگ پیس رکھا اور باقی واپس ڈش میں رکھ دیا۔

"چلو... چھوڑو ان باتوں کو اور کھانا شروع کرو۔" ناصر نے بہن سے کہا اور بیوی کو تنبیہی نگاہوں سے گھورا۔

"بھئی تم لوگوں کا اتنے سالوں بعد تو یہاں آنا ہوا ہے۔ ہمارا بس نہیں چل رہا کہ کیا کچھ کر ڈالیں۔" درخشاں نے کھل کر دکھاوا کیا۔

"سرفراز بیٹا... تم کس سوچ میں ہو، چلو بسم اللہ کرو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" ناصر محمود نے سوچ میں

گم بھانجے کو ٹھوکا دیا۔

''جی ماموں' آخر میری پیاری منجھلی مامی نے اتنی محنت اور محبت سے سب کچھ پکایا ہے۔ اب کھانا تو پڑے گا۔'' سرفراز نے ہنستے ہوئے کباب اپنی پلیٹ میں رکھا اور رائتہ ڈال کر کھانا شروع کیا۔

''اے بیٹا! اب میرے ہاتھ پیروں میں اتنی جان کہاں رہ گئی ہے۔ یہ سب تو ''روز'' نے پکایا ہے۔'' درخشاں نے جلدی سے بیٹی کے نمبر بڑھائے' جس کا نام تو افروز تھا' مگر وہ خود کو روز کہلانا پسند کرتی تھی۔

''ہاں بھئی ہماری بیٹی کہاں رہ گئی' اسے بھی کھانے کے لیے بلائیں نا؟'' ساجدہ نے فیرنی کھاتے ہوئے چونک کر پوچھا۔

''وہ.... وہ اصل میں صبح سے کچن میں لگی ہوئی تھی' اب تھک کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئی ہے۔'' درخشاں نے بات بنائی۔

''کھوں.... کھوں۔'' ان کے سفید جھوٹ پر ناصر محمود کو ٹھسکا لگا۔ ساجدہ گھبرا کر بھائی کی پیٹھ سہلانے اٹھ گئیں۔

''اوہ.... تو یہ بات ہے۔'' سرفراز نے معنی خیز نظروں سے مامی کے چہرے کے اڑتے رنگ دیکھے اور اپنا سر کھجایا' جس میں لگا سرسوں کا تیل بہہ کر ماتھے کو چمکا رہا تھا۔

درخشاں اور ناصر کے اصرار کے باوجود ان دونوں نے جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے' اصل میں برسوں بعد سابدہ اپنے میکے آئیں تو ' ان کی بھابھیاں بڑھ چڑھ کر خاطر مدارات میں مصروف ہو گئیں' ان سب کا خلوص اپنی جگہ مگر یہ لوگ جہاں بھی کھانے پر جاتے' وہاں بے حد اعلا درجے کا اہتمام کیا ہوا ہوتا۔ دو دن میں ہی ایسے ثقیل کھانے کھا کھا کر جہاں ان کی طبیعت اوبنے لگی' وہیں پیٹ میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

محمود علی اور رافعہ کے چار بچے تھے۔ تین لڑکے' ساجد' ناصر' عابد اور ایک بیٹی ساجدہ۔ محمود علی نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے' بڑا سا گھر ''محمود ولا'' بنوایا۔ جس کے تین پورشن اس طرح بنوائے گئے کہ وہ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک ہی عمارت کا حصہ تھے۔ رافعہ نے آج کل کے حالات دیکھتے ہوئے' سب سے پہلے اپنی اکلوتی بیٹی ساجدہ کی شادی کر کے' اسے سسرال روانہ کیا' اس کے بعد گھر میں بہوویں لے کر آئیں۔ اب ان کے تینوں بیٹے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ''محمود ولا'' میں سکون کے ساتھ رہ رہے تھے۔

سب سے بڑے ساجد اور سلمیٰ کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا آفاق' جو پڑھائی مکمل کرنے لندن گیا ہوا تھا۔ اس کے بعد دو بیٹیاں' ایشال اور راجیہ' اس کے بعد ناصر اور درخشاں جن کی بڑی بیٹی افروز اور چھوٹا بیٹا سفیر تھا۔ سب سے چھوٹے عابد اور ممتاز' جن کے دو بیٹے عارب اور شارب تھے۔ ان سب کا تعلق مڈل کلاس سے تھا۔ تینوں بھائی نوکری پیشہ انسان تھے۔ اس نفسا نفسی کے دور میں بھی یہ سب مل جل کر رہ رہے تھے' شاید اسی لیے اس گھر پر اللہ کی رحمتیں برس رہی تھیں۔ بچے جوان ہو گئے تو رافعہ بیگم نے بہوؤں کی سہولت کے لیے سب کے کچن بھی الگ الگ کر دیے۔ اسی لیے ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی بھائیوں میں محبت اور یگانگت قائم تھی۔ اگر کوئی بھائی کسی معاملے میں کمزور ہوتا تو دوسرا بھائی بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ یوں زندگی کی کٹھنائیاں کم ہوتی چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

''مما! آپ کی نند صاحبہ اور ان کا وہ نمونہ بیٹا کھانا کھا کر گیا؟'' افروز نے سیل فون پر گیم کھیلتے ہوئے' لاؤنج میں داخل ہوتی ماں سے بے زار لہجے میں پوچھا۔

''ہاں.... تھوڑی دیر پہلے' وہ لوگ کھانا کھا کر عابد کی طرف گئے ہیں۔'' درخشاں نے صوفے پر براجمان ہو کر بیٹی کو ٹیڑھی نظروں سے گھورا مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

''ویسے جب سے پھوپھو آئی ہیں' ان کے سامنے

بلاوجہ مسکرا مسکرا کر میرا منہ تھک گیا ہے۔" افروز نے کھلکھلا کر ماں کو دیکھا مگر ان کا موڈ آف رہا۔
"تم سے تو بس فضول مذاق کروالو' قسم سے میں صبح سے کام کرتے کرتے تھک کر چور ہو گئی مگر مجال ہے جو ماں کا ذرا بھی احساس ہو۔" درخشاں نے ہاتھوں سے پاؤں دباتے ہوئے بیٹی کو سنایا۔
"ویسے... مما ایک بات تو بتائیں... یہ پھوپھو کا اکلوتا بیٹا کس پر چلا گیا' اس کی کوئی کل سیدھی بھی ہے؟"
افروز نے ان کی بات کا جواب دینے کی جگہ سرفراز کا مذاق اڑایا۔ سفیر نے جو پاس ہی بیٹھا نوٹس بنا رہا تھا' ان کی باتوں پر منہ بنایا۔
"سوچ سمجھ کر بات کرو۔ کہیں کوئی غلط بات باپ کے سامنے نکل گئی تو وہ جان نکال دیں گے۔" درخشاں نے اسے ڈرایا۔
"روز آپا پلیز! رازی بھائی بہت اچھے ہیں۔ ان کے بارے میں ایسے بات نہ کریں۔" سفیر بہن کی بات کا برا مان گیا' فوراً اپنے پھوپھی زاد کی حمایت میں بولا۔
"تم بیچ میں بیٹھے کیا ہماری باتیں سن رہے ہو؟ چلو اندر جا کر پڑھو۔" افروز نے سفیر کو غصے میں انگلی سے اندر جانے کا اشارہ کیا' وہ انٹر کا اسٹوڈنٹ تھا۔
"اونہہ..." سفیر نے منہ بنا کر ماں اور بہن کو دیکھا اور اپنی کتابیں سمیٹ کر وہاں سے اٹھ گیا۔
"مما آپ بلاوجہ پھوپھو اور ان کے پینڈو بیٹے کے آگے پیچھے یوں نہ پھرا کریں۔ اچھا نہیں لگتا۔" افروز نے بھائی کے جانے کا انتظار کیا پھر نخوت سے ماں کو تاکید کی۔ سرفراز جو لاؤنج میں قدم رکھ رہا تھا' اپنی تعریفیں سن کر حیران رہ گیا' فوری طور پر پلو کی آڑ میں ہو کر اندر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔
"مجھے کونسا یہ خدمتیں کرنا اچھا لگتا ہے... مگر مجبوری کا نام شکریہ۔" درخشاں نے بیٹی کی بدلحاظی کو بڑھاوا دیا۔
"اب... ایسی کون سی مجبوری آن پڑی؟" اس نے سیل فون سے نگاہ اٹھا کر ماں کو بغور دیکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔
"میں تو یہ ہی سوچ کر سارا بکھیڑا پھیلاتی ہوں کہ اگر تمہاری شادی رازی سے ہو گئی تو سمجھو زندگی سنور جائے گی۔ مگر تمہاری موٹی عقل میں یہ بات سمائے تب نا۔" انہوں نے بیٹی کو غصے سے گھورا۔
"لگتا ہے آپ نے اسے ٹھیک سے دیکھا نہیں' ایسا کریں عابد چاچا کے پورشن میں ابھی جا کر ذرا غور فرمائیں... ایک دم بونگا لگتا ہے۔ ہر بات پر تو اس کے دانت نکل آتے ہیں' اس پر عجیب انداز میں کاندھے جھکا کر چلتا ہے۔ اچھی خاصی شخصیت کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے' اس پر کڑوے تیل کی مہک آخ تو بہ۔" افروز ابکائی لیتے ہوئے' سرفراز کی دھجیاں بکھیرتی چلی گئی۔
"اب... اتنا بھی برا نہیں۔" درخشاں نے ایک بار سمجھانا چاہا۔
"ایک منٹ... میں پہلے بھی بتا چکی ہوں اور ایک بار پھر واضح کر رہی ہوں۔ یہ بات پتھر پر لکیر ہے کہ... میں بالکل بھی اس پینڈو پروڈکشن سے شادی نہیں کروں گی۔" افروز ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"پینڈو پروڈکشن' واہ بھئی۔" سرفراز نے اس کی بات دہراتے ہوئے مزہ لیا۔

"اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو جا کر کھانا کھالو۔" درخشاں نے تھک ہار کر بات ختم کی۔

"نہیں مما! میں ان دنوں اپنا ویٹ لوز کر رہی ہوں۔ آپ نے جو اتنی ہیوی ڈشز بنائی ہیں' وہ تو میں آج کل بالکل افورڈ نہیں کر سکتی۔" افروز نے اٹھتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"انکشافات پہ انکشافات یعنی کھانا بھی محترمہ نے نہیں بنایا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"کم بخت ڈائٹنگ کے چکر میں کاہے کو بھوکی رہ رہ کر اپنی صورت بگاڑنا چاہتی ہو' کچھ تو کھالو۔" درخشاں نے فکرمندی سے کہا۔

"مما ٹینشن نہ لیں' میں نے تھوڑی دیر پہلے ایک پلیٹ بھر کر سلاد کھایا ہے اب سونے جا رہی ہوں۔ پلیز شام سے پہلے نہیں اٹھایئے گا" افروز ایک دم کھڑی ہوئی اور جمائی لیتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"میں... اس کے اچھے مستقبل کے لیے اتنا کچھ کر رہی ہوں۔ مگر یہ ایک بات نہیں سنتی۔" درخشاں سر پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے بڑبڑ کرتی ہوئی خود بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

"بیچاری مامی ہم لوگوں کے سامنے بیٹی کے نمبر بڑھانے کے لیے کتنی محنت کر رہی ہیں مگر۔" اس نے تیل بھرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں ماتھے پر چپکاتے ہوئے سوچا اور الٹے پیروں واپس لوٹ گیا۔

اصل میں سرفراز کا سیل فون کھانے کے دوران یہاں ڈائننگ ٹیبل پر رہ گیا تھا' وہ واپس لینے آیا تو مامی اور ان کی بیٹی کی گل افشانیاں سننے کو ملیں' اس کی تو آنکھیں پوری طرح سے کھل گئیں۔

☆ ☆ ☆
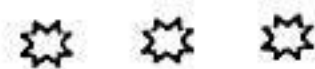
رافعہ نے اپنی اکلوتی بیٹی ساجدہ کی شادی محمود علی کے جگری دوست چوہدری اثر علی کے بیٹے چوہدری احمد علی سے بہت کم عمری میں کر دی تھی۔ انور علی نہ صرف بہت بڑے زمیندار تھے بلکہ اپنے علاقے کی ایک با اثر سیاسی شخصیت بھی تھے۔ روایت پسند گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انور علی نے ساری عمر کسی کو اپنے خاندانی رسوم و رواج سے بغاوت کرنے کی اجازت نہیں دی اور یہ چیز ان کے بیٹے احمد علی کی بھی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسی لیے شادی سے قبل ہی یہ بات طے کر لی گئی کہ ساجدہ کو بیاہ کے بعد شہر چھوڑ کر گاؤں میں رہنا پڑے گا۔ کیوں کہ احمد علی ایک پڑھے لکھے خوبرو نوجوان تھے' اس لیے رافعہ نے دل پر پتھر رکھ کر بیٹی کو گاؤں بھیجنے کی ہامی بھر لی۔

ساجدہ رخصت ہو کر پنجاب کے ایک گاؤں چلی گئیں' جہاں ان کے شوہر چوہدری احمد علی کی زمینیں تھیں' زمینوں کے علاوہ ان کے اپنے آلوچے اور امرود کے باغات بھی تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی' کوئی پریشانی نہیں تھی۔ بس ان کے سسرال والوں کو بہو کا بار بار میکے جانا پسند نہیں تھا' اسی لیے وہ بھائیوں کی شادی یا کسی خاص موقع پر چند دنوں کے لیے ہی شہر آسکیں۔ اتنی دوری کی وجہ سے شاید میکہ سے وابستہ ہر شے سے ان کی والہانہ محبت میں اضافہ کر ہو گیا تھا۔

برسوں بعد جب ساجدہ کے ساس سسر اس دنیا میں نہ رہے اور گھر کی باگ ڈور پوری طرح ان کے ہاتھوں میں چلی آئی تو' دل میں میکے والوں کی محبت ایک دم سے امڈ آئی۔ اکلوتے بیٹے چوہدری سرفراز احمد کی شادی کا ذکر گھر میں چھڑا تو ساجدہ نے ڈرتے ڈرتے شریک حیات کا ہاتھ تھام کر اپنی ایک خواہش ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ بیٹے کی شادی اپنے دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کی بیٹی سے کرنا چاہتی تھیں۔ احمد علی نے ٹھنڈی سانس بھر کر پیار بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ جس نے اپنی ہستی مٹا کر تا عمر ان کا مان سمان بنائے رکھا۔ وہ ہار گئے اور مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ساجدہ خوشی سے پاگل ہو گئیں۔ ڈھیر ساری سوغاتیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ بھائیوں کے لیے قیمتی گرم شالیں' بھابیوں کے لیے بغیر سلے جوڑے منگوائے' لڑکیوں کے لیے چاندی کی چوڑیاں' لڑکوں

کے لیے چاندی کے بٹن، دس کلو مختلف قسم کے میوہ جات اور دیسی گھی کی مٹھائیوں کے ساتھ لدی پھندی ساجدہ "محمود ولا" جا پہنچیں۔ سرفراز جوان ہونے کے بعد شاید پہلی بار ننھیال آیا تھا، وہ اپنے کزنز سے ملنے کے لیے بہت ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔ سب نے ان دونوں کا بڑے والہانہ انداز میں استقبال کیا۔ ساجدہ بھائی اور بھابھیوں کی محبتوں پر نہال ہو گئیں۔ ان کے چہرے پر سرشاری سی پھیل گئی، سرفراز بھی سب سے مل کر خوش ہوا۔ ماموں، ممانیاں اور ان کے بچے، ان سب کی محبت کی جڑیں اس کے اندر دور تک پھیلتی چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں... کیا جانا نہیں ہے؟" افروز نے حیران ہو کر ایشال کو دیکھا جو صوفے پر بیٹھی، اپنے ناخنوں پر ڈیپ ریڈ کلر کا نیل انیمل لگانے میں مصروف تھی۔

"تیاری... ؟ وہ کس خوشی میں بھئی۔" اس نے چھوٹی انگلی کو بغور دیکھتے ہوئے لاپروائی دکھائی۔

"افوہ لڑکی! بھول گئی ہو کیا... آج تمہارے فیضان ماموں نے پھوپھو کے ساتھ ساتھ محمود ولا کے سارے مکینوں کو ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے۔" افروز نے اس سے چپک کر بیٹھنے کے بعد پاؤں ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس میں ایسی تیاری کی کیا ضرورت... ؟" ایشال نے چڑ کر اپنی کزن کو آنکھیں دکھائیں۔

"یہ تو ہے۔ ایش تم ہر حال میں پیاری لگتی ہو۔" افروز کی ستائش بھری نگاہیں اس پر جم گئیں۔ سیاہ لباس میں اس کی گوری رنگت پر سنہری بالوں کا عکس پورے وجود کو جھلملا رہا تھا۔

"تم جتنی بھی میری جھوٹی تعریفیں کر لو، مجھے کہیں نہیں جانا۔" ایشال نے سستی سے اپنے گورے گورے نازک سے پیر پھیلاتے ہوئے ناز سے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی... کیوں نہیں جانا... چلو اٹھو فوراً۔" افروز نے اس کا ہاتھ تھام کر زبردستی اٹھایا۔

"اف روز... کیا مصیبت ہے یار... بالکل موڈ نہیں۔" ایشال نے گلابی لب سکیڑ کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور دوبارہ صوفے پر دراز ہو گئی۔

"میں سب جانتی ہوں تم اس پینڈو پروڈکشن کی وجہ سے نہیں جا رہی ہو۔" افروز نے دانت پیس کر سچ بیان کیا۔

"پلیز... بور نہیں کرو۔ کیا میں اس سے ڈرتی ہوں؟" ایشال نے نظریں چرائیں۔

"تم کتنا بھی چھپالو... میں سب جانتی ہوں... جب سے پھوپھو نے محمود ولا کی کسی لڑکی کو اپنی بہو بنانے کا اشارہ دیا ہے، تم ہر اس جگہ سے بھاگتی ہو جہاں سرفراز کی موجودگی کا ذرا سا بھی شبہ ہو۔" افروز کا انداز مذاق اڑانے والا تھا، وہ بھنا گئی۔

"ہاں... ہاں وہ مجھے زہر لگتا ہے اس کا حلیہ دیکھا ہے؟ ایک دم جاہل گنوار۔" ایشال تپ کر بولتی چلی گئی۔

"سو واٹ... یار وہاں جانے سے اس کے حلیے کا کیا کنکشن؟" افروز نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"یار...! سوچو، مجھے مامی اور اپنے کزنز کے سامنے کتنی شرمندگی ہو گی، تم جانتی ہو وہ لوگ کتنے ویل ڈریس اور اسمارٹ ہیں۔ ان کی نشست و برخاست سے نفاست ٹپکتی ہے۔ وہاں یہ صاحب کتنے بھوندو دکھائی دیں گے۔ اور ایک بار پھر عائشہ مامی کو امی کو نیچا دکھانے کا موقع مل جائے گا۔" ایشال نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"ہاہاہا تم سب کو کیوں لپیٹ رہی ہو میڈم!" افروز نے زبان چڑا کر اونچا سا قہقہہ لگایا۔

"کیا مطلب... ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بھائی... سیدھے سیدھے سنی بھائی کا نام لو تم نہیں چاہتیں کہ ان کے سامنے تمہاری فیملی کا کسی طرح سے بھی امپریشن خراب ہو۔" افروز نے معنی خیز انداز میں اپنی آنکھوں کے ڈیلے گھمائے تو وہ جھینپ کر بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ اتنے میں زور دار آواز سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ دونوں لمحے بھر کو خاموش

ہوئیں۔

"ایلش اور روز آئی۔۔۔ ابو نے مجھے وارننگ دے کر بھیجا ہے کہ۔۔۔ آپ لوگ پانچ منٹ میں نیچے اُتر آئیں ورنہ وہ اوپر آرہے ہیں۔" اجیہ نے جلدی سے باپ کا پیغام پہنچایا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔ ایشال نے بہن کو دیکھا' وہ موو کلر کے کرتے اور آڑے پاجامے' پرشفون کا پرنٹڈ دوپٹہ اوڑھے' بہت معصوم اور کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

"اوکے۔۔۔ ہم آرہے ہیں" ایشال نے ٹھنڈی سانس بھری اور پیروں میں کولہاپوری چپل پہن کر ہار مانتے ہوئے افروز کے ساتھ اسی حلیہ میں نیچے اتر گئی۔

☆ ☆ ☆

درخشاں اپنی چھوٹی دیورانی ممتاز کو کافی دنوں سے کرید رہی تھیں کہ نند صاحبہ بیٹے کے رشتے کے سلسلے میں کیا سوچے بیٹھی ہیں؟ آخر آج بڑی مشکلوں سے اس نے دبے لفظوں میں یہ بات واضح کی کہ "شاید ساجدہ باجی کا ارادہ ایشال کو اپنی بہو بنانے کا ہے۔" یہ بات سن کر درخشاں کا دماغ خراب ہو گیا مگر وہ بظاہر مسکرا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ اب جو ہانپتی کانپتی بیٹی کے کمرے میں داخل ہوئیں تو افروز کو چہرے کا مساج کرتے ہوئے' ٹی وی دیکھنے میں مصروف پایا۔ ان کی مزید جان جل گئی۔

"گھر میں مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔۔۔ اور تم یہاں تھکی بیٹھی چینل پر چینل بدل رہی ہو" ان کی سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا تو افروز پر چلائیں۔

"وہ لوگ تو کافی دن سے آئے ہوئے ہیں۔ آج کیا نیا ہو گیا ہے جو آپ ایسے گرم ہو رہی ہیں۔" افروز نے اپنا پسندیدہ میوزک چینل لگایا اور جھومنے لگی۔

"سب مل کر ساجدہ کو گھیرے رہتے ہیں تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ جا کر دو گھڑی پھوپھو کے پاس۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔" وہ ایک دم سے آپے سے باہر ہوئیں اور بیٹی سے ریموٹ چھین کر ٹی وی بند کر دیا۔

"مما۔۔۔ پلیز مجھ سے نہیں ہوتی یہ فضول قسم کی مسکہ بازیاں۔" وہ بھی چڑ گئی۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ بعض کام انسان مصلحتاً بھی کرتا ہے۔" درخشاں بیٹی کے بالکل سامنے آکر بولیں۔

"چھوڑیں نا مما! لوگوں نے منافقت کا نام بدل کر مصلحت رکھ دیا ہے۔ اور مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا۔" افروز عادت کے مطابق اپنی منطق لے آئی۔

"کیا تمہارا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے؟" انہوں نے بیٹی کو چیلنج کیا تو وہ ماں کی گرم نگاہوں سے گھبرائی۔

"آپ۔۔۔ یہ بتائیں کہ اتنا غصہ کس بات پر آرہا ہے؟" افروز سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"میں کہتی تھی نا۔ عقل پکڑ لو۔۔۔ مگر تم نے ایک نہ سنی۔ اب دیکھو وہ بڑی بھابھی کی ایشال تم پر سبقت لے گئی۔" درخشاں نے چڑ کر بیٹی کے سامنے اپنی بھڑاس نکالی۔

"میں سمجھی نہیں ایلش کس بات پر جیت گئی۔" وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"ارے۔۔۔ وہ تمہاری پھوپھو صاحبہ' ایشال کو اپنی بہو بنانے کی بات منہ میں دبائے بیٹھی ہیں۔" انہوں نے چبا چبا کر اپنے حساب سے انکشاف کیا۔

"او میری پیاری مما! جہاں تک ایلش کی بات ہے' اس کی نگاہ تو ستاروں پر ہے' وہ زمین کی طرف نہیں دیکھنے والی۔" افروز نے پہلے زور سے قہقہہ مارا پھر معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمائیں۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک گئیں۔

"کچھ نہیں بس آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" افروز نے ماں کے گلے لگ کر انہیں تھپتھپایا۔

☆ ☆ ☆

میکے میں پندرہ دن گزارنے کے بعد' ساجدہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ سرفراز کے لیے کس کا رشتہ مانگیں؟ ویسے تو ساجد ان کا بڑا بھائی تھا تو اسی نسبت سے انہیں لگا کہ پہلا حق اس کی بیٹی کا ہے۔ ایشال حسن کی مورت تھی۔ جو اسے ایک بار دیکھتا'

دیکھتا رہ جاتا۔ حسن تو خیر تھا سو تھا مگر اسے دو آتشہ بنانے کے لیے ہمیشہ سارے ہتھیاروں سے لیس رہتی، اسی لیے دیکھنے والی آنکھ فوراً ہی متاثر ہو جاتی۔ شاید اسی وجہ سے جانے انجانے میں وہ سرفراز کو بھی اچھی لگی۔ ساجدہ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر بیچ میں ایک مشکل یہ آ پڑی کہ جس انداز میں درخشاں ساجدہ کے آگے پیچھے گھومتی اور بیٹی کی تعریفیں کرتیں تو وہ منجھلی بھابھی کے دل میں پلنے والی خواہش کے بارے میں بھی جان گئیں، اسی لیے ابھی تک کشمکش و پنج میں مبتلا تھیں۔ آخر انہوں نے بیٹے سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

سرفراز کا دل درخشاں اور افروز کی اس دن کی باتیں سن کر اتنا کھٹا ہو گیا تھا کہ اس نے ماں سے ایشال کے لیے حامی بھرلی اور صاف لفظوں میں افروز کے لیے انکار کر دیا۔ بیٹے کا جھکاؤ محسوس کرتے ہوئے ساجدہ نے بڑی بھابھی کو رشتے کا اشارہ دے دیا۔

"السلام علیکم پھوپھو! کیسی ہیں آپ؟" اجیہ نے ساجدہ کو اپنے پورشن میں داخل ہوتے دیکھا تو مسکرا کر استقبال کیا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ کیا کر رہی تھی میری گڑیا؟" انہوں نے محبت سے بھتیجی کا ماتھا چوما اور پاس رکھے موڑھے پر بیٹھ گئیں۔

"جی میں... آج ابو کے کچھ کپڑوں کی مرمت کر رہی تھی۔" اجیہ باپ کا ململ کا سفید کرتا اور سوئی دھاگہ ہاتھ میں لے کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"بڑی بھابھی کیا کہیں گئی ہوئی ہیں؟" ساجدہ نے سراہتی نگاہوں سے بھتیجی کو دیکھتے ہوئے پوچھا، جو بڑی مہارت سے بٹن ٹانک رہی تھی۔

"امی ذرا نہا رہی ہیں... آپ بتایئے، چائے پئیں گی یا کچھ ٹھنڈا بنا دوں۔" اجیہ کو تو اب میزبانی یاد آئے تو اس نے حد درجہ لگاوٹ سے پوچھا۔

"بس... ابھی تھوڑی دیر پہلے مہناز نے بہت مزے کا ناشتہ کرایا ہے، اب کسی چیز کی خواہش نہیں۔" ساجدہ نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

"ایشال... کہاں ہے؟" ساجدہ نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا، وہ جب بھی بڑے بھائی کی طرف آتیں سب ان سے بہت محبت سے ملتے مگر ایشال یا تو چپ چاپ بیٹھی رہتی یا پھر اٹھ کر اندر چلی جاتی۔ دو تین بار جب لگاتار ایسا ہی ہوا تو ان کو تھوڑا سا عجیب لگا پھر انہوں نے اس کے رویے کو شرم و حیا پر محمول کرتے ہوئے خود کو تسلی دی۔

"اصل میں، آج ایش آپی کا بہت اہم ٹیسٹ تھا اسی لیے وہ یونیورسٹی چلی گئیں۔" اجیہ نے سادگی سے جواب دیا۔

"بیٹی... تمہیں پڑھائی کا شوق نہیں ہے؟" ساجدہ نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں پھوپھو یہ بات نہیں... مجھے بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے، لیکن امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی... ایسی حالت میں میں ان سے تو کام نہیں کروا سکتی ہوں نا۔" اجیہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور بٹن میں آخری ٹانکا لگا کر کس کے گرہ باندھی۔

"اچھا تو کیا ایشال کو گھر کے کاموں میں دلچسپی نہیں ہے؟" ساجدہ نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں مگر آپی کو ماسٹرز کرنے کا جنون ہے، اس لیے ان کا روزانہ یونیورسٹی جانا ضروری ہے۔ ان حالات میں مجھے بہترین حل ایک ہی نظر آیا کہ کالج چھوڑ کر پرائیوٹ بی اے کر لیا جائے۔ بس آج کل فائنل ایئر کی تیاری کر رہی ہوں۔" اجیہ نے مسکراتے ہوئے بہن کی پردہ داری کی اور تفصیل سے بتایا۔

"ماشاء اللہ... تم تو بہت سمجھ دار بیٹی ہو۔" انہوں نے پیار سے کہا اور ایک ہی نگاہ میں گھر کے کونے کونے کا جائزہ لے ڈالا۔ صاف ستھرا چھوٹا سا پورشن ہر شے میں ترتیب اور حسن، ان کا دل کھل اٹھا۔

"ایک بات کہوں بیٹی بھابھی نے تمہاری بہت اچھی تربیت کی ہے۔" انہوں نے اجیہ کی کمر کو سہلاتے ہوئے تعریف کی، جو باپ کا کرتا تہ کر کے سائیڈ میں رکھ رہی تھی۔

"شکریہ پھوپھو۔" وہ ایک دم جا کر ساجدہ سے لپٹ گئی' اس کا انداز ہمیشہ ہی تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتا۔

"مگر ایشال۔" وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گئیں۔ سامنے سے نہا کر بالوں میں تولیہ لپیٹے ہوئے اندر آتی سلمیٰ کے کان میں نند کی بات پڑی تو وہ گم صم رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ لان میں چہل قدمی کی نیت سے داخل ہوا تو جی خوش ہو گیا۔ بوٹے بوٹے پر رعنائی چھائی ہوئی تھی' گلوں کا حسن' تازگی فراہم کر رہا تھا۔ نتھنوں میں ایک دم گیلی مٹی اور سبزے کی باس سمائی تو اسے زمینیں یاد آ گئیں۔ اٹھتے قدم کچھ دور جا کر ٹھٹک گئے' سامنے ہی ایشال نیلگوں لباس میں' بڑی من موہنی لگ رہی تھی سرفراز نے اس کی رعنائی کو ایک نظر دیکھا۔ پھر اس جانب بڑھ گیا۔ جہاں وہ پودوں کو پانی سے سیراب کر رہی تھی۔

"کیا حال ہے ایشال صاحبہ۔" سرفراز نزدیک پہنچ کر چہکا۔

"آپ۔" وہ ایک دم چونک کر مڑی' پائپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کیاری میں جا گرا۔

"جی۔ ہم۔" سینے پر ہاتھ باندھے' محویت سے خود کو تکتے' سرفراز کے انداز پر وہ جل بھن گئی۔

"آپ کے پاس کوئی اور کام نہیں؟" ایشال کی چمکتی پیشانی پر ناگواری کی لہریں جگمگائیں۔

"آج کل تو واقعی بس آپ کو دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں' ہاں جب آپ ہمارے گاؤں میں جا کر رہیں گی تو کاموں کا بھی پتا چل جائے گا۔" سرفراز نے اسے چھیڑا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کے گاؤں جاؤں گی؟" اسے یہ بات سنتے ہی ایک دم جھٹکا لگا۔

"ہمارے بڑوں کا کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ خیر ان کی وہ جانیں' فی الحال یہ آپ کے لیے۔" سرفراز نے لاپروائی سے کہا اور مسکرا کر کیاری میں لگا پھول توڑ کر پیش کیا۔

"دیکھیں۔ مجھے فضول قسم کی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔" ایشال نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے جھاڑا۔

"ویسے آپ کو کس قسم کی باتیں پسند ہیں وہ بتا دیں' میں وہ ہی کر لیتا ہوں۔" اس نے جان بوجھ کر دانت نکال کر ایشال کے صبر کا امتحان لیا۔

"پلیز یہاں کھڑے ہو کر مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔" ایشال نے سنہری بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے خاصا روکھا انداز اپنایا۔

"چلیں کوئی بات نہیں' میں یہاں بیٹھ کر آپ کو ڈسٹرب کرتا ہوں۔" وہ ڈھیٹ بنا' ایک دم لان کی کرسی پر جا کر دھم سے گر گیا۔

"اوکے' آپ یہاں رہیں۔ میں خود اندر چلی جاتی ہوں۔" ایشال نے تپ کر کہا اور پائپ گھاس پر زور سے پٹخ کر اندر جانے کو مڑی۔

"بات سنو! آخر تم مجھ سے اتنا چڑتی کیوں ہو؟" ایک عجیب سے احساس کے تحت اس نے ایشال کے مقابل کھڑے ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

"اس لیے کہ مجھے شروع سے ویل ڈریس اور ڈیسنٹ لڑکے پسند ہیں اور آپ۔" ایشال لمحہ بھر کو گڑبڑائی پھر اس کا مذاق اڑاتا انداز' وہ لب بھینچ کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

"آئی ایم سوری سرفراز۔ آپ میرے کزن ہیں مگر جو پھوپھو سوچ رہی ہیں ویسا ہونا بالکل بھی ممکن نہیں۔ شادی کے حوالے سے میرا اپنا بھی ایک معیار ہے۔ آپ میری سوچ کے خانے میں کہیں بھی فٹ نہیں ہوتے۔" ایشال نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے صاف صاف اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اوہ۔ تو تم بھی ظاہری شکل و صورت کی شیدائی نکلیں۔" یہ سب سن کر سرفراز کا چہرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ یہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی' دکھ نے اسے آگھیرا۔ دل کی

اتنی سخت نہیں تھی۔ سرفراز اگر کزن رہتا تو ٹھیک تھا مگر جب سب لوگ مل کر اسے ایشال کا سجن بنانے پر تل گئے تو وہ بری طرح سے چڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

"ا.... یشال۔" سلمیٰ بیٹی کو غصے میں آواز دیتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"توبہ ہے' یہ لڑکی ناشتہ کر کے دوبارہ سو گئی۔" وہ کمبل میں لپٹی ہوئے مزے سے سو رہی تھی۔ سلمیٰ جل کر بولیں۔

"کیا ہوا امی.... آپی سے کوئی کام تھا؟" اپنی وارڈ روب درست کرتی ہوئی اجیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں نے اس بے ڈھنگی کو صبح ہی کہہ دیا تھا کہ آج دوپہر کا کھانا تم بناؤ گی۔ مگر دیکھو تو لاڈو پری کو' کتنے مزے سے دوبارہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہے۔" انہوں نے دانت کچکچا کر کہا۔ ایشال کی آنکھ ماں کے شور شرابے سے کھل گئی مگر وہ ڈر کے مارے سوتی بن کر پڑی رہی۔

"اچھا.... اب تو گیارہ بجنے والے ہیں۔ ایک بجے کھانا ٹیبل پر لگانا ہوتا ہے۔" اجیہ نے گھڑی دیکھی اور سر ہلا کر کہا۔

"تو اور کیا.... ویسے بھی آج ساجدہ اور سرفراز نے لنچ ہمارے ساتھ کرنا ہے' اب کیا میں ان کو اپنا کلیجہ کھلاؤں گی؟" سلمیٰ نے ماتھا پیٹ لیا۔

"پریشان نہ ہوں' میں کچن میں جا کر جلدی سے کچھ کرتی ہوں" اجیہ نے عادت کے مطابق یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل کرنا چاہا۔

"ہر دفعہ تم ہی کیوں بہن کے حصے کی بلا اپنے سر لے لیتی ہو۔ اسے بھی کل کو گھرداری سنبھالنی ہے یا نہیں؟" سلمیٰ نے بھنا کر اجیہ کو بھی جھاڑ پلا دی۔

"نکمی سب سن رہی ہے۔ مگر دیکھو تو ذرا کیسی ڈھیٹ بن کر آنکھیں بند کیے پڑی ہے۔" سلمیٰ نے جھک کر اس کا کمبل کھینچا اور پھٹ پڑیں۔

"امی! آپ ٹینشن نہ لیں' رات کو جو لوکی گوشت کا سالن کافی بچ گیا تھا' میں اس میں چنے کی دال ڈال کر ککر میں چڑھا دیتی ہوں دس منٹ میں تیار ہو جائے گی' ساتھ میں بگھارے ہوئے چاول' ہری چٹنی اور سلاد بنا لوں گی.... پھوپھو ویسے بھی دالیں شوق سے کھاتی ہیں۔" اجیہ کچھ سوچ کر بولی اور پھرتی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"جب سے ساجدہ یہاں ٹھہری ہے' اس لڑکی نے ناک میں دم کر رکھا ہے' یا تو صبح تیار ہو کر یونیورسٹی نکل جاتی ہے اور جو چھٹی ہو تو دن چڑھے تک سوتی رہتی ہے۔ بتاؤ بھلا' بیاہ کر جس گھر جانا ہے وہاں سب منہ اندھیرے اٹھ کر کاموں پر لگ جانے والے لوگ ہیں۔ پھر اس کا گزارا کیسے ہو گا؟" سلمیٰ کمرہ سمیٹتے ہوئے خود سے مخاطب ہوئیں۔

"میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی کہ سرفراز میں کون سے ایسے سرخاب کے پر لگے ہیں جو میں ہاتھ باندھ کر ان کی جی حضوری میں لگی رہوں۔" ایشال جھنجلا کر سنہری بالوں کی آبشار سمیٹتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"اس لیے کہ تمہاری پھپھو بڑے چاؤ سے تمہیں بہو بنانے کی خواہش دل میں دبائے بیٹھی ہیں۔ پر یہ جو تمہارے رنگ ڈھنگ ہیں نا' دیکھنا وہ تو کانوں کو ہاتھ لگاتی یہاں سے بھاگے گی۔" سلمیٰ نے کمبل تہ کرتے ہوئے اسے سخت لہجے میں سنایا۔

"امی آپ جانتی ہیں نا کہ میں یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" ایشال نے کمر پر ہاتھ رکھ کر احتجاج کیا۔

"تم کہاں شادی کرنا چاہتی ہو.... میں یہ بھی اچھی طرح سے جانتی ہوں۔" انہوں نے دانت پیس کر بیٹی کو گھورا۔

"امی! پلیز۔" ایشال کی آواز میں نمی گھل گئی۔

"بیٹا میری بات کو سمجھو۔ سنی میرا خون ہے۔ مجھے اس سے بڑھ کر بھلا کون عزیز ہو گا۔ مگر تم ابھی بچی ہو عائشہ بھابھی کو جانتی نہیں ہو وہ عورت گنوں کی پوری ہے۔ کبھی تمہیں اپنی بہو بنانے پر راضی نہیں ہوں گی۔ اور اگر مارے باندھے راضی ہو بھی گئیں' تو ساری عمر تمہیں ناک میں کوڑی پہنا کر رکھیں گی۔" وہ

جہاں دیدہ تھیں بیٹی کو سمجھایا۔
"چھوڑیں امی' عائشہ مامی جو بھی کرلیں مگر سنی میرے علاوہ کسی دوسری لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔" اس کے لہجے میں محبت کا غرور بول اٹھا۔
"ایشی! رشتے ہمیشہ وہیں جوڑنے چاہئیں جہاں محبت کے ساتھ عزت بھی ملے۔ زندگی تو بہت سادہ ہوتی ہے' مگر ہماری خواہشیں اسے پیچیدہ بنادیتی ہے۔ اب بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے' میرا کہا مان لو.... رازی بہت اچھا لڑکا ہے۔ تمہیں خوش رکھے گا۔" سلمٰی نے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا۔
"نہیں.... کبھی نہیں۔" ایشال نفی میں سرہلاتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼
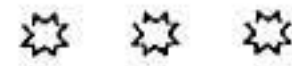
ساجدہ مصلحتاً اپنے سے چھوٹے بھائی عابد کے پورشن میں ٹھہری تھیں' عابد کی تو کوئی بیٹی تھی نہیں' اس لیے یہاں رہتے ہوئے وہ غیر جانبداری سے کوئی فیصلہ کرسکتی تھیں۔ دوسرے سرفراز بھی ان لڑکوں میں رہتے ہوئے ایزی فیل کررہا تھا' روزانہ سب شارب کے کمرے میں جمع ہوجاتے اور اکیلے میں خوب ہلا گلا کرتے۔ وہ سب آفاق کو بھی یاد کرتے جو پڑھائی کے سلسلے میں پچھلے سال ہی یو کے گیا تھا۔
سرفراز بہت پرسکون انداز میں شارب کے کمرے میں لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک دم سے دروازہ کھلا' پہلے عارب اس کے پیچھے شارب اور سفیر کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔
"یہ لیں' رازی بھائی.... میرے ہاتھوں کی مزدار کافی۔" عارب دونوں ہاتھوں میں مگ تھامے اس کے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔
"واہ یار! اس وقت تم نے یہ بڑا نیکی کا کام کیا ہے۔" سرفراز نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنا مگ تھام لیا۔
"کیا کررہے تھے۔ ہم نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" سفیر نے پوچھا۔ ایسا لگا جیسے وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہو۔
"لگتا ہے تم تینوں نے کسی خاص بات کے لیے مل کر دھاوا بولا ہے۔" وہ کائیاں پن سے ہنستے ہوئے بولا۔
"ہاں.... جی۔" عارب نے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے پر سر کھجایا' سفیر کھلکھلایا اور شارب کافی کا گھونٹ بھرنا بھول کر' سرفراز کو دیکھنے لگا۔
"ایک بات کہنی ہے.... رازی بھائی؟" شارب تھوڑی دیر بعد ہچکچاتے ہوئے بولا۔
"ہاں.... ہاں ضرور۔" اس نے جواب دینے کے بعد جھاگ دار کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور آنکھیں موند کر منہ میں گھلنے والے ذائقہ کا مزہ لیا۔
"آپ اتنے اچھے' محبت کرنے والے پُرخلوص انسان ہیں اگر.... " شارب فراز کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کچھ جھجکا۔
"ہوں.... کیا "اگر۔" سرفراز نے پیار سے شارب کو گھورا۔
"اگر اپنا حلیہ تھوڑا سا بہتر کرلیں تو آپ 'لاکھوں میں ایک' دکھائی دیں گے۔" عارب نے جلدی سے اپنی بات کہنے کے بعد صوفے کے کشن میں منہ چھپالیا' اسے ڈر ہوا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔
"ہی ہی ہی۔" سرفراز کی ہنسی کان میں پڑی تو اس کی جان میں جان واپس آئی۔
"اچھا تو بھائی میرے ذرا یہ تو بتاؤ.... میرے حلیے سے کسی کو کیا تکلیف ہے۔" سرفراز نے اس کے چہرے پر کچھ تلاشا۔
"وہ.... یہ جو آپ سر میں پاؤ بھر تیل ڈال کر' تیز رنگوں کے کڑھائی والے کرتا شلوار زیب تن کیے' پیروں میں موزے' اس پر پشاوری چپل چڑھا کر اس قدر جھک کر چلتے ہیں.... بالکل اچھے نہیں لگتے۔" شارب نے اس کے نزدیک ہوکر نرم لہجے میں سمجھایا۔
"ایک.... بات اور.... " سفیر نے انگلی اٹھا کر اجازت طلب کی۔
"چھوٹے! چلو تم بھی تھوڑی انسلٹ کرلو۔" سرفراز نے شرارتی انداز میں اٹھ کر سفیر کی کمر ٹھونکی۔
"یہ جو آپ کی خوفناک سی گھنی مونچھیں' ہونٹوں کو

چبا رہی ہیں۔ یہ ڈاکوؤں والا لک دیتی ہیں۔" سفیر نے ہنستے ہوئے اس کے لبوں پر لٹکی ہوئی مونچھ کو چھوا۔

"اس لیے ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ آپ کا تھوڑا میک اوور ہونا چاہیے۔" ان تینوں نے ایک ساتھ ہاتھ پھیلا کر کہا اور زور سے ہنس دیے۔

"ہوں' تو بھائیو! آپ لوگوں کو میرے حلیہ پر اعتراض ہے۔ مگر میرا فلسفہ حیات تھوڑا مختلف ہے۔ شاید اسی لیے خود پر اتنی توجہ نہیں دی۔" سرفراز ٹھہر ٹھہر کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا... آپ بھی اپنی سنا دیں۔" عارب نے پر تجسس لہجے میں کہا۔

"دیکھو بھئی' انسان ترقی کی راہوں پر چلتے ہوئے چاہے کتنا ہی آگے نکل گیا ہو' مگر اچھا لگنے کے چکر میں ابھی تک ویسے ہی الجھا ہوا ہے۔" سرفراز نے ایک دم بدلے ہوئے لہجے میں کہا' اس کے چہرے پر چھائی رہنے والی خود ساختہ حماقت کی جگہ بردباری نے لے لی۔

"کیا مطلب۔" شارب نے چونک کر اسے دیکھا مگر وہ اپنے اوپر دوبارہ نقاب ڈال چکا تھا۔

"بھائی ہم لوگ ظاہر پر کتنا غور کرتے ہو مگر ایمانداری سے کہو' کبھی کسی کے اندر جھانک کر روح کی سچائی کو جانچنے کی کوشش کی... نہیں نا' انسان چاہے من کا کتنا ہی کالا ہو مگر تن پر سجا قیمتی لباس اس کی لوگوں میں عزت کرواتا ہے۔" سرفراز نے خلا میں گھورتے ہوئے عجیب سا لہجہ اختیار کیا۔

"یہ بات تو آپ نے بالکل سچ... کہی۔" سفیر نے سرہلا کر تائید کی۔

عارب نے مونگ پھلی کی پلیٹ بیچ میں لا کر رکھی' سب نے ایک ساتھ مٹھی بھرنے کی کوشش کی' پلیٹ الٹ گئی۔ ایک دم ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

"ایک مزے کا قصہ سنو' میرے چھوٹے چچا بڑے مزاحیہ انسان ہیں۔ وہ خاندان میں ہونے والی کسی بھی تقریب میں بوسکی کا کرتا' جس کے گریبان اور کف پر سونے کے بٹن' سفید کلف لگی کڑکڑاتی شلوار کے ساتھ پیروں میں تلے والا ناگرا پہن کر کھڑے ہو جاتے اور اپنے بیٹوں کا باقاعدہ یہ کہہ کر ریکارڈ لگاتے کہ میں قیمتی سے قیمتی لباس اپنی خوشی کے لیے پہنتا ہوں' اس لیے اچھا لگتا ہوں اور میری یہ پاگل اولادیں' لوگوں کو دکھانے کے لیے کپڑوں پر ہزاروں روپے پھونک دیتے ہیں' پھر بھی اسی غم میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ دوسروں سے مقابلے میں پیچھے نہ رہ جائیں... یہ جو کھاوا کرتے ہیں نا... اسی وجہ سے باندر لگتے ہیں۔" سرفراز کی قصہ گوئی عروج پر تھی۔ وہ تینوں اس کی باتوں سے لطف کشید کرتے رہے۔

"ہاں مگر کیا کریں۔ ہم سب ایک ہی فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ دنیا کیا کہے گی۔" شارب نے سرہلاتے ہوئے تائید کی۔

"چھوٹی سی زندگی کا کتنا قیمتی وقت کونسا فیشن' ان اور کون سا آؤٹ جیسی بے مقصد باتوں میں الجھ کر ضائع کیا جاتا ہے۔" سرفراز نے تھوڑی دیر بعد سوچ کر بات دوبارہ شروع کی۔

"واہ! ہماری فیملی کا دوسرا انقلابی۔" عارب نے محفل کے اختتام پر سرفراز کا کاندھا تھپک کر شاباش دی۔

"ایں' یہ پہلا کون ہے بھائی؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اجیہ آپی' وہ بھی لوگوں کو ان کی صورت سے نہیں بلکہ سیرت سے جانچنے کی حامی ہیں۔" شارب نے مسکرا کر بتایا اور سرفراز کے ذہن میں سوچ کا ایک نیا دریچہ کھل گیا۔

☆ ☆ ☆

ان کا آخری پیریڈ فری تھا۔ اسی لیے وہ دونوں چاٹ کھانے کینٹین میں جا بیٹھیں۔

"ایش کوئی خاص بات ہے۔ کیا تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟" افروز نے اپنی کزن کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آں..." ایشال نے کچھ کہنے میں ہچکچاہٹ

محسوس کی۔

"بتاؤ نا کیا ہوا؟" افروز نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ہاں..... کہنا تو ہے مگر میں تذبذب کا شکار ہوں کہ پتا نہیں تم میری بات کا کوئی اور مطلب نہ نکال لو۔" افروز نے مسکرا کر اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"روز..... آج کل امی نے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے' وہ چاہتی ہیں کہ میں پھوپھو کی خدمت میں جت جاؤں۔ ان کی تو بس ایک ہی رٹ ہے کہ رازی خاندان کا دیکھا بھالا بچہ ہے' اپنا خون ہے' سب سے بڑھ کر اتنی وسیع جاگیر کا اکلوتا وارث ہے۔ مگر تم خود ہی بتاؤ' جس شخص کو میں دو منٹ برداشت نہیں کر سکتی' اس کے ساتھ ساری عمر زندگی کیسے گزاروں گی۔" ایشال نے نظریں جھکائے' پلیٹ میں چمچ چلاتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔

"تمہاری یہ بات تو کسی حد تک ٹھیک ہے..... واقعی مزاجوں کا فرق زندگی کو عذاب بنا دیتا ہے۔ پہلے مما کو بھی پھوپھو کی دولت کا بخار چڑھا تھا' انہوں نے مجھے سرفراز سے شادی کے لیے راضی کرنا چاہا مگر میں نے تو ہری جھنڈی دکھا دی۔" افروز نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے نخوت سے کہا۔

"بہت اچھا کیا۔" ایشال کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ چھائی۔

"ہاں..... مگر تم نے ابھی تک اصل بات نہیں بتائی؟" افروز نے تجسس سے پوچھا۔

"دیکھو سوئٹ! میں چاہتی ہوں کہ تم چچی جان سے اپنے طور پر کہو کہ وہ امی کو سمجھائیں کہ میں رازی سے شادی کر کے کبھی بھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ تم تو جانتی ہو کہ میں اور سنی شروع سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" ایشال نے التجائیہ انداز میں اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا۔

"اوہ..... مگر تم یہ بات تائی اماں کو خود کیوں نہیں سمجھاتیں۔" افروز نے اس کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا' جہاں پریشانی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

"یہ ہی تو مصیبت ہے۔ امی اس بارے میں کچھ سننے کو تیار ہی نہیں۔ اصل میں ممانی کا رویہ ہم لوگوں کے ساتھ شروع سے کافی خراب رہا ہے' فیضان ماموں بھی ان کے ہاتھوں میں ہمیشہ کٹھ پتلی بنے رہے..... وہ کہتی ہیں کہ بھابھی کبھی تمہیں اپنی بہو کے روپ میں قبول نہیں کریں گی۔" ایشال نے گلابی ہونٹوں کو بے دردی سے کچلا۔

"ہوں..... میں تائی اماں کے جذبات سمجھ سکتی ہوں ..... وہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ مگر ان حالات میں سنی بھائی کو ہی ہمت دکھانی پڑے گی۔ وہ اپنی ماما کو منا کر تمہارا رشتہ لے آئیں تو سرفراز والی بات خود بخود دب جائے گی۔" افروز نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی کزن کے سامنے ایک حل پیش کیا۔

"یہ ہی تو مسئلہ ہے..... میں نے جب سے سنی کو رازی کے رشتے والی بات بتائی ہے' اس کی روزانہ ممانی سے جھڑپ ہو رہی ہے مگر وہ ہنوز اکڑی ہوئی ہیں۔" ایشال نے پریشان ہو کر اپنے ہاتھ مسلے۔

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔ خیر..... میری دعا ہے کہ تم دونوں کی نیا بیچ منجدھار سے نکل کر ساحل کی جانب چل پڑے۔" افروز نے چاٹ میں مسالا ڈالتے ہوئے دعا دی۔

اونچا لمبا ماشاء اللہ مردانہ وجاہت کا حامل ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ وہ سلمٰی کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا' انتہائی بااخلاق' ہائی کوالیفائیڈ۔ ویل مینوڈ اور بلا کا پُر اعتماد بات۔ کرتا تو سامنے والے کو منٹوں میں قائل کر لیتا' بچپن سے ہی اس کی ایشال سے بہت بنتی تھی' جوان ہونے پر نہ جانے کب ان دونوں کی دھڑکنوں میں ایک مسحور کن ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ وہ ایشال سے شادی کرنے کا خواہاں تھا مگر اس کی ماں اور سلمٰی کی بھاوج نازک اندام سی عائشہ فیضان' ان دونوں کے بیچ سماج کی موٹی سی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سرفراز پہلے افروز اور پھر ایشال کو آزمانے کے بعد

بہت دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ وہ آج ماں سے فائنل بات کرنے کے موڈ میں تھا مگر ڈر رہا تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والا انکار کا لفظ سن کر کہیں ان کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ وہ ماں کو ڈھونڈتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں ساجدہ کو ٹھہرایا گیا تھا۔

"امی... کیا ہوا... اتنی چپ چاپ کیوں لیٹی ہیں؟"

ساجدہ جو صوفے پر آرام کرنے کے ارادے سے لیٹی تھیں، بیٹے کی آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھیں۔

"کچھ نہیں... بیٹا میں سوچ رہی تھی بہت دن رہ لیے اب کیوں نہ واپسی کی تیاری کی جائے، ویسے بھی دو مہینے بعد تمہاری بارات لے کر دوبارہ یہاں آنا ہے۔" ساجدہ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"امی... یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ ... افروز یا ایشال جیسے مزاج کی لڑکیاں، شادی کے بعد ہمارے گاؤں میں جا کر خوش رہ پائیں گی؟" سرفراز نے چونک کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے تمہید باندھی۔

"نہیں ان دونوں کے لیے تو وہاں ایک لمحہ گزارنا بھی مشکل ہو گا۔" ساجدہ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تو پھر بارات... میرا مطلب ہے... وہ" سرفراز ایک دم گڑبڑا گیا۔

"میں تمہاری شادی... ان دونوں سے نہیں بلکہ اجیہ سے کرنے کا سوچ رہی ہوں۔" ساجدہ نے ایک دھماکا کر ڈالا۔

"وہ! وہ تو سب سے چھوٹی ہے۔" سرفراز نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ اس نے اجیہ کے حوالے سے اس انداز میں سوچا نہیں تھا، اس لیے حیران رہ گیا۔

"چھوٹی ہے تو کیا ہوا، نا سمجھ اور کمزور نہیں ہے، اس بچی نے پورے گھر کا بوجھ اپنے نازک کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ اتنے دنوں تک میں نے اس گھر کی تینوں لڑکیوں کا خاموشی سے مشاہدہ کیا ہے اور مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا ہے کہ، تمہارے ددھیال والوں کی تیزی کا مقابلہ کرنے کے لیے میری بہو میں جتنی سمجھداری، صبر و برداشت کا ہونا ضروری ہے، وہ صلاحیت نہ تو ایشال میں ہے اور نہ ہی افروز میں، مگر اجیہ ہر فن مولا لڑکی ہے، وہ اپنی جگہ بنانا جانتی ہے۔" ساجدہ نے بڑے مطمئن لہجے میں بیٹے کو اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

"نہیں امی، میرا دل نہیں مانتا۔ کیا خبر ماموں، مامی نے ابھی اس کی شادی کا نہ سوچا ہو، وہ راضی نہ ہوں؟" اس کا دل سب سے خراب ہو چکا تھا، اس لیے صاف انکار کر دیا۔

"اجیہ تو ماشاء اللہ سے بیس سال کی ہو چکی ہے جبکہ اماں نے تو میری شادی اٹھارہ سال کی عمر میں کر دی تھی۔ مجھے اپنے بھائی پر پورا اعتماد ہے، وہ انکار نہیں کریں گے۔" ساجدہ نے بیٹے کی پیٹھ تھپتھپا کر پیار سے منانا چاہا۔

"اچھا... تو آپ اس بات کا بدلہ اپنی بھتیجی سے لے رہی ہیں۔ اجیہ تو بہت سیدھی ہے۔ ایشال کے بارے میں کیا خیال ہے؟" سرفراز نے ہنستے ہوئے ماں کو چھیڑا۔

"اس کا بندوبست بھی ہو رہا ہے، بھائی کے سالے فیضان نے ایشال کے لیے اپنے بڑے بیٹے سنی کا رشتہ ڈال دیا ہے۔" ساجدہ نے بیٹے کے سامنے ایک اور انکشاف کیا۔

"اوہ ایسی تو یہ بات ہے۔" اس نے ہونٹ گھمائے، یہ سن کر اس کے دل کو ذرا سا بھی دھکا نہیں پہنچا، سرفراز نے ایشال کا باب تو اپنی زندگی کی کتاب سے اسی دن نکال دیا تھا، جس دن اس نے منہ پر بے زاری کا اظہار کیا تھا۔

"چلیں پھر ٹھیک ہے۔" وہ مسکرایا، ماں کے چہرے پر پھیلا ہوا اطمینان اسے سکون دے گیا۔

"بیٹا... میں جانتی ہوں۔ اجیہ شکل و صورت میں باقی لڑکیوں سے کمتر ہے۔ شاید تم اس وجہ سے انکار کر رہے ہو، مگر ایک بات کہوں، کسی آئینے میں انسان کا ظاہر تو دیکھا جا سکتا ہے، مگر باطن کا پتا اس کی بات چیت سے چلتا ہے۔" انہوں نے پرسوچ نگاہیں بیٹے پر گاڑ کر

کہا۔

"آپ نے شکل و صورت کی کیا بات کردی۔ یہ حسین چہرے ہی سب سے زیادہ دھوکا دیتے ہیں۔" وہ شرارتی ہوا۔

"میں نے اجیہ کو اچھی طرح سے پرکھا ہے' وہ صورت اور سیرت دونوں میں یکتا ہے۔ دیکھنا اس کے ساتھ تمہاری زندگی مزے میں بسر ہوگی۔" ساجدہ نے بڑی آس سے بیٹے کے سامنے اپنے تجربے کا نچوڑ رکھا۔

"مجھے کیا پریشانی... میں تو ویسے ہی پینڈو ہوں۔" وہ زور زور سے ہنستے ہوئے بولا۔

"تم اب یہ سارا ڈرامہ بند کردو... بہت ہوگیا۔" انہوں نے بیٹے کے کان پکڑے۔

"آں... امی... کان تو چھوڑیں۔" سرفراز نے شرارتی انداز میں ماں کو گدگدی کی۔

"سدھر جاؤ۔" ساجدہ بیٹے کا کان چھوڑتے ہوئے ہنس دیں۔

"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب' تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔" وہ گنگناتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

☆ ☆ ☆

"بھابھی۔ یہ لیجئے حلوہ' آج صبح ہی گاجریں کش کر کے دودھ میں چڑھادی تھیں' کافی دیر گھی میں بھونا پھر جا کر تیار ہوا ہے۔" ممتاز نے مسکرا کر سلمٰی کو ایک پیالہ تھمایا۔

"واہ ممتاز' یہ تو تم نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے' تمہارے بھائی جان کئی دنوں سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ بازار میں سرخ اور تازہ گاجریں دست یاب ہیں' تم کب حلوہ پکاؤ گی۔" سلمٰی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چاچی... یہ تو ابو کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرے والی مثال ہوگی۔" اجیہ جو پاس بیٹھی ہفتے بھر کے کپڑے استری کررہی تھی' شوخی سے پیالے کی طرف اشارہ کرکے بولی۔

"ہاں... تو کیا کریں۔ ہم سارے بہن بھائی میٹھے کے دیوانے جو ہیں۔" ساجدہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے گفتگو میں حصہ ڈالا۔

"یہ بات تو بالکل ٹھیک کہی... باؤجی' اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے' شام ہوتے ہی چائے کے ساتھ کھانے کے لیے تھوڑا سا میٹھا کھوجتے تھے' ان ہی کی عادت تم سب میں آئی ہے۔" سلمٰی نے حال میں ہوتے ہوئے ماضی کو یاد کیا۔ بڑی بہو ہونے کے ناطے انہوں نے سب سے زیادہ ٹائم ساس سسر کے ساتھ گزارا تھا' اسی لیے بات بے بات ان کا ذکر ضرور کرتیں۔

"حق ہاہ' وقت کیسے بیت جاتا ہے۔ کل کی ہی تو بات لگتی ہے جب میں اس گھر میں ماں جی اور باؤجی سے اپنے لاڈ اٹھواتی پھرتی تھی۔" ساجدہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اک ویرانی سی دل میں اترتی چلی گئی۔

"پھوپھو... پلیز آپ اس طرح اداس نہ ہوں۔ دادا دادی نہیں رہے' مگر ہم سب تو آپ کے پاس ہیں نا۔" اجیہ نے ایک دم استری چھوڑی اور ساجدہ کو خود سے لپٹا لیا۔

"پتا ہے اجیہ! اماں جی شام کو یہاں پلنگ بچھا کر اس پر بیٹھی سبزیاں کاٹتیں' اور بار بار بھائیوں سے پوچھتی "کیا بات ہے' تمہارے باؤجی نے مسجد میں بہت وقت لگادیا۔" پھر کوئی بھائی دوڑ کر جاتا اور واپس آکر خبر دیتا' "باؤجی' کچھ نمازیوں کو قرآن پاک کی تفسیر سمجھا رہے ہیں۔" ساجدہ نے ایک کونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا اور آنکھیں پونچھیں۔

"سچ بات ہے... وہ دونوں کیا گئے' مانو اس گھر کی رونق ہی چلی گئی۔" سلمٰی کا گیلا ہوتا لہجہ' ماحول ایک دم سوگوار سا ہوگیا۔

"چلیں! آپا ذرا میرے ساتھ اوپر چل کر حلوہ چکھ کر بتائیں کہیں میٹھا کم تو نہیں۔" ممتاز نند کا ذہن ہٹانے کے لیے ان کا ہاتھ تھام کر زبردستی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔ اجیہ نے ان کو جاتا دیکھا تو دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

جاڑے کا موسم شروع ہو چکا تھا' سردی کی موجودہ لہر اپنے اندر' خوشگوار سی ٹھنڈک چھپائے ہوئے تھی۔

سرفراز موسم کی دلکشی سے متاثر ہو کر ٹیرس پر چلا آیا۔ سورج کی نرم گرم شعاعیں اسے جیسے گدگدانے لگیں۔

"محمود ولا" کی زرد پتھروں والی عمارت سے نیچے جھانکا۔ سامنے سڑک پر ایک قطار میں بہت سارے درخت کھڑے دکھائی دیے۔

"رازی بھائی۔۔۔ جلدی سے یہ گرما گرم چائے پی لیں۔ اس کے بعد میرا ایک کام کرنا ہے۔" فریش سی ہنستی مسکراتی اجیہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے اس کے برابر میں آکر کھڑی ہوئی تو وہ چونک گیا۔

"میرے لیے۔۔۔ اتنی تکلیف اٹھانے کا شکریہ' مگر اس وقت سچ مچ میں میرا چائے پینے کا بہت موڈ ہو رہا تھا۔" اس نے تھوڑا تکلف سے کام لیا اور گرم کپ کے گرد ہاتھ لپیٹے۔

"اچھا۔۔۔ ایک بات تو بتائیں۔ کیا آپ کو ڈرائیونگ آتی ہے؟" اجیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مانا کہ میں پینڈو ہوں مگر اتنا بھی نہیں کہ کار ڈرائیو نہ کرسکوں۔" سرفراز نے ہنستے ہوئے اپنا مذاق اڑایا۔

"آپ نے یہ کیسی بات کردی۔ اور کون آپ کو پینڈو کہتا ہے؟" اجیہ نے حیرت سے اور کچھ خفا ہو کر پوچھا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ۔۔۔ سب کا یہی خیال ہے۔ شاید آپ کی بڑی بہن کا بھی؟" سرفراز نے نگاہیں چرائیں۔

"اوہ۔۔۔ اچھا سمجھ گئی۔ خیر میں کسی کے ذاتی نظریات کو تو نہیں بدل سکتی مگر یہ ضرور ہے کہ ہر علاقے کا اپنا کلچر اور لائف اسٹائل ہوتا ہے' مگر اس لیے کوئی پینڈو نہیں ہو جاتا۔ کیا پتا آپ کو بھی یہاں کے کچھ فیشن اچھے نہ لگتے ہوں۔" اجیہ نے بڑی سمجھ داری سے وضاحت پیش کی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ایشال کا انکار اس کے کانوں تک پہنچ گیا ہے۔

"یہ بات تو ہے۔۔۔ ویسے میرے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟" سرفراز نے اب اجیہ کو چھیڑا۔

"دیکھیے۔۔۔ میں شخصی آزادی کی قائل ہوں۔ اگر آپ کو ایسے اچھا لگتا ہے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے' لیکن اگر آپ کزن کی حیثیت سے مجھ سے پوچھیں تو تھوڑی سی تبدیلی لانا ضروری ہے۔" اجیہ نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں اسے قائل کرنا چاہا اور اپنی جیکٹ کی زپ اوپر کرلی' اسے شاید ٹھنڈ زیادہ لگتی تھی۔

"چائے بہت مزے کی تھی۔" سرفراز نے بات بدل دی۔

"جی۔۔۔ شکریہ۔" اجیہ بھی مسکرا کر محتاط ہو گئی' وہ ویسے بھی لوگوں کے معاملات میں کم سے کم دخل اندازی کرتی تھی۔

"اچھا وہ کام کیا تھا؟" دونوں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو کر باہر کا نظارہ کرنے لگے۔ سرفراز کو ایک دم خیال آیا تو پوچھ لیا۔

"پانچ منٹ بعد نیچے آجائیں۔۔۔ مجھے آپ کے ساتھ کہیں جانا ہے۔" اجیہ نے خالی کپ اٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"میں کتنی خوش قسمت ہوں جو تم نے مجھے چنا۔ خاندان کی ساری لڑکیاں تمہارے خواب دیکھا کرتی ہیں مگر تم میرے بننے جا رہے ہو۔" ایشال نے کافی شاپ کی گلاس وال سے ثناء اللہ کو اندر آتا دیکھا تو اسے دل ہی دل میں مخاطب کر کے بولی' گردن فخر سے تھوڑی اکڑ گئی۔ ثناء اللہ بلیک ہائی نیک پر فان کلر کی جیکٹ پہنے' بلیک جینز کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے دوسرے میں آئی فون سکس تھامے' آنکھوں پر مہنگے گلاسز چڑھائے' کافی شاپ میں داخل ہوا تو لمحہ بھر کو ہال میں بیٹھے تمام لوگوں کی نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔

"ہائے۔۔۔ کیسی ہو ایش؟" سنی نے اس کے قریب

پہنچ کر سامنے والی سیٹ سنبھالی تو وہ جیسے کسی سحر سے باہر آئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کیا نئی تازی خبر ہے۔" ایشال نے اپنی خوب صورت آنکھیں اس پر مرکوز کیں۔ وہ بھی سرخ لباس میں دہکتا گلاب لگ رہی تھی۔

"نئی تازی خبر یہ ہے کہ... میں نے بڑی مشکل کے بعد ماما کو منالیا ہے' پاپا نے پھوپھو سے رشتے کی بات بھی کرلی ہے۔ اس معاملے میں اگر پاپا کا ووٹ ہمارے حق میں نہیں ہوتا تو سمجھو بات کبھی نہیں بن پاتی۔" سنی نے صاف لفظوں میں جتایا۔

"اگر... میں مامی کو اتنی ہی بری لگتی ہوں... تو تم اس بات کو یہیں ختم کردو...." ایشال کو اپنی ناقدری بالکل نہیں بھائی' منہ بگاڑ کر بولی۔

"کم آن یار... یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم پہلے سے سب کچھ جانتی ہو۔ اس لیے پلیز ٹریجڈی کوئین بننے کی جگہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔" شاء اللہ عادت کے مطابق فوراً" ہی بدلحاظ ہوا' ہاتھ اٹھا کر اسے جھاڑ دیا۔

"اوکے... بولو" ایشال کو جامے میں واپس آنا پڑا' اس کا انداز ہی تو ہمیشہ گھائل کردیتا تھا۔

"ماما... اس رشتے پر صرف ایک شرط پر رضامند ہوئی ہیں کہ شادی کے بعد ہم فیضان ہاؤس میں نہیں بلکہ کسی فلیٹ میں شفٹ ہو کر اپنی نئی لائف شروع کریں گے۔ دوسرے مجھے پاپا کی جانب سے دی جانے والی ساری مالی مراعات بند کردی جائیں گی۔" سنی نے اسے گھورتے ہوئے دھماکا کیا۔

"کیا ماموں کے اتنے بڑے سارے گھر میں میرے لیے چھوٹی سی بھی جگہ نہیں۔ سنی ہم الگ کیسے رہ سکتے ہیں؟" ایشال نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"ڈارلنگ... گھر میں تو جگہ ہی جگہ ہے... مگر مسئلہ یہ ہے کہ دلوں میں گنجائش کم ہوگئی ہے۔" سنی کا لہجہ ٹوٹا پھوٹا تھا' اسے ماں کے فیصلے سے بہت دکھ پہنچا تھا' مگر وہ ایشال کو اتنی شدت سے چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ زندگی' زندگی لگتی تھی۔ اس لیے یہ کڑی شرط بھی مان گیا۔

مامی نے اچھا نہیں کیا۔ وہ نم آنکھوں سے سامنے بیٹھے سنی کو دیکھ کر ایک ہی بات سوچنے لگی۔

"ایش... سوچ لو۔ تمہیں صرف میری تنخواہ میں گزارا کرنا ہوگا۔" اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

"اوکے... میں ہر مقام پر تمہارے ساتھ ہوں۔" ایشال جو لحہ بھر کو ڈانوا ڈول ہوئی تو سنی کی آنکھوں سے ٹپکتے جذبوں نے اسے پھر قید کرلیا۔

☼ ☼ ☼

"کہاں رہ گئی یہ لڑکی...؟" سرفراز جو کار پورچ میں ساجد ماموں کی گاڑی کے پاس کھڑا اجیہ کا انتظار کررہا تھا' جھنجلا گیا۔ شور کی آواز پر مڑ کر دیکھا اجیہ اپنے نازک سے ہاتھوں سے دو بڑے بڑے شاپرز گھسیٹنے میں ہلکان ہوئی جارہی تھی' وہ تیزی سے اس کی مدد کو پہنچا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے ان شاپرز کو بہ آسانی اٹھالیا...

"کہاں رکھنے ہیں؟" اس نے پوچھا تو اجیہ نے بڑھ کر گاڑی کی ڈکی کھولی اور تھیلے ان میں رکھوا کر چابی اسے تھما دی۔ سرفراز نے گاڑی کا لاک کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

"کہاں چلنا ہے۔" اجیہ سن گلاسز لگا کر فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھی تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ گندمی رنگت اور پرکشش نین نقش والی نازک سی اجیہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا۔

"آں... وہ ہمارے گھر سے تھوڑی دور ایک کچی بستی ہے' بس... وہاں تک جانا ہے۔" تیز ہوا سے بکھرتی اپنی ریشمی زلفوں کو سمیٹتی ہوئی وہ ایک دم رازی کی نگاہوں کی زد پر آگئی' اس نے گاڑی کا شیشہ اوپر کیا تو تھوڑا سکون ہوا۔

"کتنے لمبے اور خوب صورت بال ہیں۔" سرفراز نے مڑ کر اسے دوبارہ دیکھا اور پہلی بار نئے انداز سے سوچا۔

"کیا ہو گیا رازی بھائی! جلدی چلیں، ہمیں جا کر واپس بھی آنا ہے۔" اجیہ نے جیسے اسے جگایا۔
"یہ ہرگز ایسی تو نہیں کہ اتنی آسانی سے مسترد کر دیا جائے۔" وہ نگاہیں چراتے ہوئے ماں کی آفر کو سوچنے لگا۔
"وہاں کوئی خاص کام ہے؟" سرفراز نے کار اسٹارٹ کی اور گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔
"جی... اصل میں سردیاں شروع ہو گئی ہیں، میں ہر سال تینوں پورشنز سے پرانے گرم کپڑے جمع کرتی ہوں پھر جیسے جیسے وقت ملتا ہے، ان کی مرمت کرتی جاتی ہوں۔ اس کے بعد موسم سرما شروع ہوتے ہی، غریب لوگوں میں تقسیم کر دیتی ہوں۔" اجیہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔
"اوہ... تم تو کمال کی لڑکی ہو۔" سرفراز نے اسے حیرت سے دیکھا تو اس کا بھولا بھالا چہرہ گلابی ہو گیا۔
"ہاہا بھول گئے، میں تو آپ کے ماموں ساجد محمود کی لڑکی ہوں۔" اجیہ نے گھسا پٹا لطیفہ دہرایا تو سرفراز کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔
نہ اپنی تعریف، نہ بڑائی، نہ ہی کوئی دکھاوا... امی اس کی تعریف ٹھیک ہی کرتی ہیں۔ سرفراز نے مسکرا کر سوچا اور گاڑی اس کے بتائے ہوئے راستے کی جانب موڑ لی۔

✿ ✿ ✿

رات بھر وہ اجیہ کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ خلاف معمول صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ کوئی اس طرف اٹھانے بھی نہیں آیا۔ وہ تو بھلا ہو کھڑکی سے آنے والی سورج کی نرم شعاعوں کا، جنہوں نے اس کے گال تھپتھپائے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی، دن کے دس بج رہے تھے۔ اس کی ساری سستی ہوا ہو گئی۔ فوراً" واش روم بھاگا پھر عارب کے کمرے کی جانب دوڑ لگائی۔ شکر ہے آج وہ یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ اب، پچھلے آدھے گھنٹے سے مسلسل اس کا انتظار کر رہا تھا، مگر عارب پتا نہیں کتنے سالوں بعد نہانے گھسا تھا جو نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر سرفراز کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے جا کر واش روم کا دروازہ زور زور سے دھڑا دھڑایا۔ پانچ منٹ بعد ہی عارب بالوں کو تولیہ سے پونچھتا ہوا گھبرا کر باہر نکل آیا۔
"ک... کیا ہوا رازی بھائی؟" اس نے سرفراز کو کمر پر ہاتھ رکھے خود کو گھورتے پایا تو پریشانی سے پوچھا۔
"میرے بھائی روز نہا لیا کر۔" سرفراز نے طنز سے کہا تو وہ ہنس پڑا۔
"اچھا بات کیا ہے، وہ بتایئے؟" عارب نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرتے ہوئے پوچھا۔
"یار... ایک مشورہ کرنا ہے۔" وہ تھوڑا ہچکچایا پھر بولا۔
"ایک منٹ... اب شروع ہو جائیں۔" وہ اس کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ گیا۔
"میں اصل میں اجیہ کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔ تم بتاؤ کہ وہ کیسی لڑکی ہے؟" سرفراز نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔
"کیسی لڑکی؟" اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے... رازی بھائی۔" عارب کا انداز ایک دم خشک ہو گیا، آنکھوں میں تشکیک کے شعلے لپکے۔
"اوہ... عارب تم نے میری بات کا غلط مطلب نکالا ہے۔ اصل میں امی نے اسے میرے لیے پسند کیا ہے تو..." سرفراز نے جلدی سے وضاحت پیش کی تو عارب نے سکون کا سانس لیا۔
"میرا مشورہ مانیں تو آنکھ بند کر کے ہاں کر دیں۔ سمجھیں آپ کی لاٹری نکل آئی ہے۔ اجیہ آپی بہت ڈیسنٹ اور سلجھے مزاج کی لڑکی ہیں۔ ان کی عادتیں اتنی اچھی ہیں کہ کوئی بھی ان کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتا۔" عارب نے جوش میں ٹہلتے ہوئے اپنی کزن کی مکمل وکالت کی۔
"ہوں... مگر۔" وہ ایک دم سوچ میں پڑ گیا۔
"اگر... مگر کی تکرار میں یہ نہ ہو کہ بات آپ کے ہاتھ سے نکل جائے۔ ہمیشہ آپ ہم لوگوں کو

نصیحتیں کرتے ہیں۔ آج میری بات غور سے سنیں' اچھی صورت آنکھوں کو تسکین دیتی ہے' مگر اچھی سیرت انسان کی روح خوش کردیتی ہے اور اجیہ آپی میں تو دونوں کوالیٹیز موجود ہیں۔" عارب کی بات اس کے دل میں جا اُتری۔

سرفراز نے وہاں سے اٹھنے کے بعد دیر نہیں کی' ماں کے پاس گیا اور اجیہ سے شادی کی حامی بھرلی۔ ساجدہ خوشی خوشی بڑے بھائی کے سامنے دامن پھیلانے پہنچ گئیں۔ انہیں کیا اعتراض ہوناتھا' ایشال کی شادی تو ویسے بھی اس کی ضد پر سنی سے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے جاکر بیوی سے مشورہ کیا۔ اجیہ سے بھی پوچھا گیا۔ اس نے اپنی شادی کا فیصلہ والدین پر چھوڑدیا' یوں ہاں کردی گئی۔

☼ ☼ ☼

"چلو.... بھائی اندر چلو۔" عارب اور شارب نے گاڑی ایک مشہور مردانہ سیلون کے سامنے لے جاکر روکی اور سرفراز کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی گاڑی سے نکالنا چاہا۔

"او بھائی! کہاں لیے چلے جارہے ہو۔" سرفراز نے باہر نکلتے ہوئے حیرت سے بڑی سی شاپ کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"شام کو آپ کی منگنی ہے نا.... اور ہمارے یہاں دلہا بالکل نہیں بولتے' اس لیے خاموشی سے ہم جو کہتے ہیں' وہ ہی کرتے جائیں۔" عارب نے ذرا رعب دکھایا۔

"کیوں.... میرا مطلب ہے کیا؟" سرفراز نے گھبرا کران دونوں کو دیکھا' جو اسے گھر سے باقاعدہ طور پر اغوا کرکے اپنی گاڑی میں ڈال کر یہاں لائے تھے۔

"مطلب یہ رازی بھائی کہ.... یہاں آپ کا نیا ہیئر کٹ ہوگا۔" شارب نے اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے موٹی آواز بنائی۔

"اور.... آپ کی ان گھنی مونچھوں کا صفایا کروایا جائے گا۔" عارب نے مصنوعی قہقہہ لگا کر مونچھوں کو ہاتھ لگایا۔

"یار.... تم دونوں تو غدار نکلے۔" سرفراز ان کی حرکتوں پر ہنستا چلا گیا۔ پھران کو پھٹکارنا چاہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں' ہمیں اجیہ آپی کے لیے سب کچھ قبول ہے۔" عارب نے جوش سے جواب دیا۔

"دیکھیے گا۔ شام کو منگنی میں وہ آپ کو دیکھ کر دیکھتی رہ جائیں گی۔" ان دونوں نے سیلون میں قدم رکھتے ہوئے سرفراز کو تسلی دی۔

☼ ☼ ☼

اکتیس دسمبر 2015ء کا سورج غروب ہوا چاہتا تھا "محمود ولا" میں جہاں نئے سال کی آمد کے جوش و خروش نے دلوں کو معمور کیا' وہیں ان کے ملن پر سب کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس پر موسم کی رعنائی' گلابی جاڑے میں چلنے والی' دھیمی دھیمی خنک ہواؤں نے ماحول کا حسن بڑھادیا تھا۔ ایشال ثناء اللہ اور سرفراز اور اجیہ کی منگنی کی تقریب کا انتظام ایک سبزہ زار میں خاصی دھوم دھام سے کیا گیا۔ دو الگ الگ اسٹیج بنوائے گئے' جن کی سجاوٹ اصلی پھولوں سے کی گئی۔ ہال کی چھت سے لٹکتے ان گنت برقی قمقموں سے پھوٹتی روشنی نے رات میں دن کا سا سماں پیدا کردیا تھا' رنگین آنچل' ہنستے مسکراتے حسین چہرے اور خوشبوؤں نے سبزہ زار کے ماحول کو پُرکیف بنادیا تھا۔

سلمٰی نے دور قریب کے تمام رشتے داروں کو مدعو کیا تھا۔ ساجد محمود نے یہاں کا سارا انتظام چھوٹے بھائی عابد کے سپرد کردیا اور خود بے فکری سے مہمانوں کے بیچ میں جاکر بیٹھ گئے۔ ناصر محمود نے کھانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ چوہدری احمد علی خاص طور پر تقریب میں شریک ہونے کے لیے ایک دن پہلے سسرال پہنچے تھے۔ اب سالوں کے جھرمٹ میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

پہلے ایش اور سنی کی منگنی کی رسم ادا کی گئی۔ ایشال ریڈ اور پیچ میکسی میں فل میک اپ اور زیورات سے سجی آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ سنی

بھی بلیک شیروانی اور وائٹ پائجامے میں بہت منفرد دکھائی دے رہا تھا' اس نے نگاہ اٹھا کر ایشال کی جانب دیکھا اور جیسے ایک طلسم میں جکڑتا چلا گیا۔ آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔

عائشہ بڑی قیمتی ساڑھی زیب تن کیے 'سوئس رول بنائے' اکڑی گردن کے ساتھ الگ تھلگ سی رہیں۔ رسم کے وقت بڑے روکھے انداز میں بیٹے کو سونے کی ہلکی سی انگوٹھی تھمائی اور خود دور کھڑی ہو گئیں۔ فیضان اور مانی نے ان کی بدمزاجی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی اور ایشال کے ساتھ بیٹھ کر تصاویر بنوائیں' مانی نے ہونے والی بھابھی سے تھوڑی چھیڑ چھاڑ بھی کی' مگر پھر بھی دیکھنے والے اندھے تھوڑی تھے' باتیں بننا شروع ہو گئیں۔ سلمیٰ نے بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ افروز نے دکھ سے ایشال کی اتری ہوئی صورت دیکھی تو اسے حوصلہ دینے کے لیے اسٹیج پر جا پہنچی' سفیر ثناء اللہ کو کمپنی دینے میں لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ رازی کہاں رہ گیا۔ تم لوگ بھی اپنی رسم شروع کرو۔ مہمانوں کو بھوک لگ رہی ہو گی۔ اس کے بعد ہی ڈنر شروع ہو گا۔" سلمیٰ نے ساجدہ کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

"پتا نہیں بھابھی۔۔۔ عارب' شارب کے ساتھ دوپہر سے کہیں نکلا ہوا ہے' ابھی تک نہیں آیا۔ مجھے تو خود فکر ہو رہی ہے۔" ساجدہ سفید پیور شفون کے بھاری سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھیں' پریشانی سے بولیں۔

"اچھا۔۔۔ ذرا۔۔۔ ان لڑکوں کو فون تو ملاؤ۔ پتا تو چلے کہ ہیں کہاں؟" سلمیٰ یہ سن کر گھبرا گئیں' جلدی سے مشورہ دیا۔ ساجدہ نے اپنے لیدر کے بیگ میں سے سیل فون نکال کر بیٹے کا نمبر ملایا۔ ایک بیل کے بعد لائن کاٹ دی گئی۔ اچانک ڈھول بجانے والوں نے زوردار تھاپ ماری' شور کی آواز پر ان دونوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو سامنے سے سرفراز' عارب اور شارب کے جلو میں' بڑے طمطراق سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ مہمان دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگ گئے۔ گھر والوں تک کہ منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

قیمتی لائٹ براؤن کرتا' جس پر ڈائمنڈ کے بٹن اور کف لنکس لگے ہوئے تھے' فان کلر کی شلوار پیروں میں ناگرہ' ہاتھ میں قیمتی موبائل کا پاؤچ' شیمپو سے دھلے براؤن سلکی گھنے بالوں کا نیا کٹ۔ سرخ و سفید رنگت کے حامل سرفراز احمد کی وجاہت آج ابھر کر سب کے سامنے آ گئی۔ سیدھا چلنے کی وجہ سے وہ اونچا لمبا مردانہ وجاہت کا حامل نوجوان مزید اسمارٹ دکھائی دے رہا تھا' چہرے پر حماقت کی جگہ چھائی بردباری نے اس کی شخصیت کی دلکشی کو جیسے ابھار دیا۔ محفل میں موجود ہر شخص نے اجیہ کے منگیتر کو سراہا۔ افروز بھی دل تھام کر دیکھتی رہ گئی۔ دلہن بنی ایشال بھی ہکا بکا سی رہ گئی۔ سارے کزنز نے سرفراز کو لے جا کر اسٹیج پر بٹھایا اور ہنسی مذاق میں لگ گئے۔

افروز نے تائی کی ایما پر تھوڑی دیر بعد ہی اجیہ کو اس کے برابر میں لا کر بٹھا دیا' سرفراز کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وائن ریڈ میکسی میں اجیہ کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ مہارت سے کیے گئے ہلکے میک اپ نے اس کو آج ایک منفرد روپ بخشا تھا۔ چہرے پر پھیلا نور اسے سب میں ممتاز بنا رہا تھا۔ سرفراز کی نگاہیں' اس کے رخ مہتاب پر جم کر رہ گئیں۔ اجیہ نے لمحے بھر کو نگاہ اٹھا کر سرفراز کو دیکھا تو پزل ہو گئی' یہ وہ سرفراز تو نہیں تھا۔ جسے وہ جانتی تھی' یہ تو کوئی شہزادہ تھا' جسے لا کر اس کے برابر میں بٹھا دیا گیا' سرفراز کے شفاف ملائم چہرے پر چھایا سکون اس کی وجاہت میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ نگاہیں جھکانا بھول گئی۔

"کیا ہوا میری ہیر؟" سرفراز نے مسکرا کر اجیہ کی حیرت کو انجوائے کرتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔ چوہدری احمد علی نے جیب سے سرخ مخملی باکس نکالا اور ہیرے کی انتہائی بیش قیمت انگوٹھی نے مہمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ "یہ لو چوہدرانی۔۔۔ اپنی بہو کو پہناؤ۔" انہوں نے رنگ مسکرا کر بیوی کو تھماتے

ہوئے بیٹے کو چھیڑتی نگاہوں سے دیکھا۔
"میں کیوں؟ اپنی دلہن کو یہ سرفراز پہنائے گا نا۔"
ساجدہ نے بھولے پن سے کہا تو سب ہنس دیے۔
"نہیں امی! میری خواہش ہے کہ آپ ہی یہ رسم ادا کریں۔" سرفراز نے فرمانبرداری سے کہا۔
ساجدہ نے بیٹے کی سعادت مندی پر سر ہلایا اور بسم اللہ پڑھ کر اجیہ کی نازک سی انگلی میں رنگ پہنادی۔ سارے کزنز نے ایک دم سے تالیاں بجائیں۔ سارے بھائیوں نے بہن کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ اس مقام تک آنے کے لیے انہوں نے کتنی قربانیاں دی تھیں۔
"اجیہ.... اب سچ مچ میری بیٹی بننے والی ہے۔" ساجدہ نے بڑھ کر اسے خود سے چمٹا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ سرفراز نے مسکرا کر یہ نظارہ دیکھا' ماں کے چہرے پر کھلتے ہوئے مسکراہٹوں کے پھول اور لہجے سے جھلکتی طمانیت نے احساس دلا دیا کہ اس کا فیصلہ بالکل درست ہے۔

☼ ☼ ☼

ساجد دونوں بیٹیوں کی بات طے پا جانے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ رسم کے دوسرے دن ہی' انہوں نے اپنے بھائی بھابھیوں سمیت دونوں سمدھیانوں کو رات کے کھانے پر مدعو کر لیا' چوہدری احمد علی نے پہلے سے ہی واپسی کی بکنگ کروا رکھی تھی' کیوں کہ وہ اپنے پیچھے بہت سارے جھمیلے چھوڑ کر آئے تھے۔ اس لیے ان کا جلدی واپس جانا ضروری تھا۔ یوں سارے کام فاسٹ موشن میں کیے جا رہے تھے۔ ساجدہ نے اسی دن شادی کی تاریخ بھی طے کر دی اور تیس کلو اصلی گھی کے لڈو منگوا کر خاندان کے بچے بچے کا منہ میٹھا کروایا۔ صبح ان لوگوں کی واپسی تھی۔ ایشال بھی اپنے بڑے بولوں پر شرمندہ شرمندہ سی ہونے والے بہنوئی اور پھوپھی پھوپھا کی خاطر داری میں بچھی جا رہی تھی۔ افروز کو بھی اپنی بے وقوفی پر اب پچھتاوا ہو رہا تھا۔ درخشاں اندر ہی اندر کلس رہی تھیں۔
سلمٰی کے بلاوے پر دونوں دیورانیاں صبح سے نیچے کے فلور پر جمع ہو کر دعوت کے انتظامات میں مشغول ہو گئیں۔ دوسرے پکوانوں کے ساتھ چوہدری احمد علی کی فرمائش پر خاص طور پائے پکائے گئے۔ اجیہ ساجدہ کے دیے ہوئے اوپل بلیو جارجٹ کے ڈریس میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ آج اس کو پورا خاندان ہاتھوں ہاتھ لے رہا تھا۔ ساجدہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بہو کو دل میں چھپا کر ساتھ لے جائیں۔ اجیہ کی آنکھوں سے اٹھتی ایک خاص چمک اور چہرے پر پھیلی حیا کی لالی' اس کے من کی شانتی کا پتا دے رہی تھی۔ شاید والدین کی فرمانبرداری کے صلے میں' ہی خوشیوں سے اس کا دامن بھر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جنہیں ہم دل میں رکھتے ہیں' وہ ذرا سا دل بھی نہیں رکھتے۔" ماں کے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے سنی کو کہیں پڑھی ہوئی یہ بات یاد آئی تو اس کا دل بھر آیا۔ عائشہ اور فیضان کا صبح سے کئی بار بحث و مباحثہ ہو چکا تھا مگر نتیجہ وہ ہی ڈھاک تین پات۔ وہ اپنے کمرے میں معمول کے حلیے میں لیٹی رہیں۔
"پلیز.... ماما چلیں نا۔" مانی نے ماں کا ہاتھ تھام کر التجا کی۔
"میرے سر میں درد ہے۔ تنگ نہیں کرو۔" وہ کمبل کو سینے تک اوڑھ کر لیٹ گئیں۔
"منگنی کے بعد ساجد نے ہم سب کی یہ پہلی بڑی دعوت رکھی ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لیے ہی شریک ہو جاؤ۔" فیضان نے آخری کوشش کی' مگر انہوں نے جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئے۔
"اجیہ کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے۔ آپ نہیں جائیں گی تو کتنا برا لگے گا۔" سنی نے گھر سے نکلتے نکلتے ہاتھ پکڑ کر ماں کی منت کی۔

"کہہ دیا نا مجھے نہیں جانا... تم سب جا رہے ہو نا یہ ہی کافی ہے۔" عائشہ نے نروٹھے پن سے جواب دیا اور آئی کور پہن کر کروٹ بدل لی۔ اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بھی باپ بھائی کے پیچھے چل دیا۔

"چھوڑو بیٹا! ان تلوں میں تیل نہیں۔ تمہاری ماں شروع سے ہی ایسی خشک ہے۔ خاص طور پر میرے گھر والے اسے کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں۔" فیضان نے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دکھی لہجے میں کہا۔ سنی نے افسردگی سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

✳ ✳ ✳

اجیہ کچھ شرمائی کچھ گھبرائی سی سرفراز احمد سے چھپتی پھر رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنے رب کا شکر کیسے ادا کرے، اسے تو بن مانگے ہی سب کچھ مل گیا تھا۔ شاید کسی نیکی کا صلہ مجھے رازی کی شکل میں مل گیا۔ اس نے عارب کے ساتھ اوپر جاتے ہوئے سرفراز کو دیکھ کر سوچا۔

سرفراز واپس جانے سے پہلے اجیہ سے ایک بار مل کر ساری باتیں کلیئر کرنا چاہتا تھا، مگر وہ ہتھے ہی نہیں چڑھ رہی تھی۔ جہاں جاتا، وہ وہاں سے رفوچکر ہو جاتی۔ آخر اس سلسلے میں اس نے عارب کی خدمات حاصل کیں۔

"او آئی سی۔" وہ گول گول آنکھیں گھماتا ہوا ہنس پڑا۔

"بھائی نہیں ہے۔" سرفراز کے ہاتھ پیر جوڑنے کا یہ اثر ہوا کہ عارب نے ان دونوں کی چند سیکنڈ کی ملاقات کا پلان ترتیب دیا۔

"رازی بھائی... یہاں سے ہلنا نہیں۔ میں کرتا ہوں کچھ۔" اس نے سرفراز کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور خود، نیچے کے پورشن میں اجیہ کو ڈھونڈتا چلا آیا۔

"میاں مٹھو چوری کھاؤ گے۔" وہ سامنے کھڑی اپنے طوطے سے باتیں کرتی ہوئی بہت معصوم لگ رہی تھی۔

"اجیہ آپی نے ہمیشہ لوگوں میں سکھ بانٹے، جو دوگنا ہو کر ڈھیروں کے حساب سے واپس ان ہی کی طرف لوٹ آئے۔" عارب اس کی جانب بڑھتا ہوا فقط یہ ہی بات سوچ رہا تھا۔

✳ ✳ ✳

وہ تینوں محمود ولا میں ہونے والے ہلے گلے میں شرکت کرنے قدرے تاخیر سے پہنچے۔ وہاں کی رونقیں عروج پر جا پہنچی تھیں۔ ان لوگوں کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ فیضان، لاؤنج میں جمائی گئی بڑوں کی محفل کی طرف چلے آئے۔

"بھابھی نہیں آئیں؟" سلمیٰ نے فیضان کا سواگت خوش دلی سے کیا اور برابر میں بیٹھ کر دھیرے سے بھاوج کے متعلق پوچھا۔

"اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تو میں نے خود ہی گھر پر رکنے کا کہہ دیا۔" انہوں نے بہن سے نگاہیں چرائیں۔

"اچھا..." سلمیٰ بے دلی سے اٹھ گئیں۔

"بعض دفعہ اپنوں سے جھوٹ بولنا بھی کتنا مشکل کام ہو جاتا ہے۔" فیضان شرمندگی سے سوچنے لگے، انہیں بہن کی اُتری صورت دکھ دے رہی تھی۔

سلمیٰ منگنی والے دن بھابھی کے تیور دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ عائشہ ہر قدم پر ایشال کو "ان وانٹڈ" بہو ہونے کا احساس دلاتی رہے گی، انہیں بھابھی پر تو جو غصہ آیا سو آیا، مگر بیٹی کی ضد پر بھی جی کلس گیا جس کی وجہ سے یہ دن دیکھنے پڑ رہے تھے۔ "کل سے ایش کتنی چپ چپ ہے۔" ماں کا دل تھا نا، بے قرار ہوا، نگاہوں نے اسے ڈھونڈا۔ وہ مانی کے ساتھ بیٹھی مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ منگنی سے اب تک عائشہ نے جس... جس طرح اس کی عزت افزائی کی تھی، وہ بھولنے والی نہیں تھی۔ مستقبل کے اندیشے، ایش کے چہرے پر پھیلی یاسیت۔ سلمیٰ کا دل دکھا گئی، مگر یہ راستہ تو اس نے خود چنا تھا۔ وہ تو اب دعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ایک منٹ کزن! ذرا ادھر تو آیئے۔" عارب نے اجیہ کے قریب پہنچ کر پیار سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا ہوا۔ بتاؤ تو کہاں لے جا رہے ہو؟" وہ اس کے کھینچنے پر اپنی جگہ پر جم گئی، مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس آپ کے چند قیمتی لمحے درکار ہیں۔" عارب نے شرارتی انداز میں اسے دیکھا اور گھسیٹتا ہوا اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

"ارے چھوڑو۔ مجھے ابھی نیچے بہت کام کرنے ہیں۔ امی ڈھونڈ رہی ہوں گی۔" اجیہ بھونچکی رہ گئی اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"بس ... چند سیکنڈ کی بات ہے۔" اس نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔

"عارب کے بچے! میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ بہت پٹائی لگاؤں گی۔" اجیہ نے دھمکی دینے کے ساتھ اس کی پیٹھ پر ایک زوردار دھپ لگائی، وہ کچھ کچھ سمجھ گئی تھی۔

"آ... اوہ... اف" آپ کے نازک ہاتھوں میں بڑی طاقت ہے، قسم سے جان نکل گئی۔" عارب نے مڑ کر اسے دیکھا اور پیٹھ سہلانے کی کوشش کی۔

"شرافت سے میرا ہاتھ چھوڑ دو... یا مزید طاقت کا مظاہرہ کروں۔" اجیہ ایک دم کھلکھلائی۔

"آپی ... پلیز بعد میں مار لیجیے گا۔ ابھی ذرا اندر جائیں، کوئی بہت اہم ہستی آپ کا انتظار کر رہی ہے" عارب اسے اپنے کمرے کے سامنے لیے آیا اور اجیہ کے شور مچانے کی پروا کیے بنا ہنستے ہوئے اسے اندر دھکیل دیا۔

☆ ☆ ☆

"اجیہ ایک بات تو بتاؤ۔ تم اس نئے رشتے سے خوش تو ہو؟" سرفراز کا گمبھیر لہجہ، اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا۔ اجیہ کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی، سرفراز کی آنکھوں سے وارفتگی کے جذبے لٹاتا سمندر، وہ حیا سے سرخ پڑ گئی۔

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" اس کا نپا تلا مدہم انداز بھی اجیہ کی چپ نہ توڑ سکا۔

"اگر تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو تو ہمارے یہاں سے جانے کے بعد بھلے ہی انکار کر دینا۔" اس نے مظلوم بننے کی ایکٹنگ کی، اجیہ نے تیکھی نظروں سے سرفراز کو گھورا، مگر اس بار بھی جواب ندارد۔

"میں گاؤں کا رہنے والا ہوں تم جیسی شہری لڑکی کا آئیڈیل کہاں بن سکتا ہوں؟" اس کی خاموشی کا غلط مقصد اخذ کر کے، وہ کچھ مایوس، کچھ بددل ہو کر بولا۔

"رازی بھا۔ آپ اپنی بات کہہ چکے۔" وہ عادت کے مطابق بھائی کہتے کہتے رک گئی۔ سرفراز کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ویسے تو آپ سارے زمانے کو قصے کہانیاں سنا سنا کر سبق دیتے رہتے ہیں۔ مگر اپنے معاملے میں ایک دم کورے ہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ لڑکی کبھی اپنے منہ سے اقرار نہیں کرتی، اس کی خاموشی میں ہی ہاں چھپی ہوتی ہے۔" اجیہ نے برہم ہو کر لب کھولے تو گویا اسے زندگی کی نوید مل گئی۔

"زندگی لوٹانے کا ... شکریہ۔" وہ بہت مسرور دکھائی دیا۔

"بس ... یہی بات تھی ... اب میں جاؤں۔" اجیہ نے جانے کے لیے پر تولے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی بڑے کی نگاہ ان دونوں پر پڑ جائے اور بلاوجہ کی شرمندگی ہو۔

"ایک منٹ ... اصل بات تو رہ ہی گئی جس کی وجہ سے عارب سے کہہ کر یہ ملاقات ارینج کروائی ہے۔" سرفراز نے اسے روکا تو اجیہ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے کچھ اہم باتیں شیئر کرنی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، شادی سے پہلے تمہیں ان سب باتوں کا پتا ہونا ضروری ہے۔" وہ تھوڑا شش و پنج میں مبتلا ہوا پھر دھیرے دھیرے بولا۔

"جی بولیں ایسی کیا بات ہے؟" اجیہ نے استعجاب سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"جس وقت ہم یہاں آ رہے تھے تو میرے ددھیال والوں کو امی کی خواہش کا پتا چل گیا کہ وہ شہر سے اپنی بھتیجی بیاہ کر لانا چاہتی ہیں' بس ان سب نے حویلی پر ایک ساتھ دھاوا بول دیا اور بابا پر زور دینے لگے کہ کسی چچا یا پھوپھی کی بیٹی سے میری نسبت ابھی طے کر دی جائے' بقول ان کے شہری لڑکی گاؤں کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو پائے گی' اور بلاوجہ حویلی کا ماحول خراب ہو گا۔ یہ سب سن کر امی ہول اٹھیں مگر بابا نے ان کا ساتھ دینے کی ٹھانی اور بہن بھائیوں کا کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کیا۔" سرفراز کا گمبھیر لہجہ' اسے خاصا متاثر کر رہا تھا' ورنہ اس سے قبل تو وہ جس طرح دانت نکال کر بات کرتا تھا' بلاوجہ ہی ہنسی آجاتی تھی۔

"اچھا... پھوپھا جان نے کیا کہا؟" اجیہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بابا نے سب کو اپنی شادی کا حوالہ دیا اور امی کی تعریف کی۔ بابا نے کہا۔ "جو اچھی لڑکیاں ہوتی ہیں' وہ ہر قسم کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لیتی ہیں' ساجدہ کی مثال سامنے ہے۔ یہ بھی تو بیاہ کر شہر سے آئی تھی مگر اس نے بھی' ناکافی سہولیات کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزارا کیا نا' اب تو گاؤں... گاؤں نہیں رہا' یہاں شہر جیسی مکمل نہ سہی' مگر کافی سہولیات موجود ہیں۔ اس لیے رازی کی دلہن کا گزارا بھی ہو جائے گا۔"" سرفراز لمحے بھر سانس لینے کو رکا' اجیہ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟" اس نے تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔

"بس۔ ان لوگوں کو بابا کی حمایت پسند نہیں آئی۔ باتیں بناتے' امی پر طنز کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد امی پوری رات نہیں سوئیں۔ من میں خوف و اندیشے جاگ اٹھے کہ کہیں' ان کی معصوم سی خواہش برسوں کا بنایا ہوا بھرم نہ توڑ دے' میری بیوی انہیں پوری برادری کے سامنے تماشہ بنا کر نہ رکھ دے۔ وہ میرے سامنے اپنے دل کا حال بیان کرتی چلی گئیں۔ ان کے خدشات پر' میں سوچ میں پڑ گیا' پھر سب کو آزمانے کا سوچا۔ اسی لیے یہاں پینڈو اسٹائل میں آیا تاکہ جھوٹ کی آنکھ سے سچ کا پتا لگا سکوں۔ آہستہ آہستہ سب کی اصلیت کھل کر میرے سامنے آگئی۔" وہ پل بھر کو دکھی ہوا۔

"پھر..." اجیہ نے اس کی جانب ایک خاص انداز میں دیکھا۔

"پھر..." سرفراز نے بڑے اسٹائل سے بھرپور زور دے کر اس کی نگاہوں میں جھانکا' محبت کے جگنو ایک ساتھ جگمگ جگمگ کرنے لگے' بیچ میں در آنے والی لمحہ بھر کی خاموشی' بہت حسین تھی' اس کی صدائے دل بن کے اجیہ تک پہنچ گئی اور جیسے خوشیوں بھری برسات ہونے لگی۔

"پھر... دیکھا، پرکھا اور اس قیمتی ہیرے کو چن لیا۔" سرفراز نے اس کے نزدیک ہو کر ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر اجیہ کا جھکا چہرہ اٹھایا اور ماتھے پر آئی لٹ کو پیار سے چھو کر سرگوشی کی تو وہ گلابی پڑتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ سرفراز ابھی اس کی شرم کو انجوائے کر رہا تھا کہ اچانک زور سے دستک ہوئی اور دھڑ سے دروازہ کھلا، وہ دونوں چونک کر سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔

✵ ✵ ✵

"ٹائم از اپ..." عارب نے انگوٹھا دکھایا، اس کے پیچھے سارے کزنز شور مچاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"آج نئے سال کا پہلا دن ہے اور آپ دونوں کی شادی کی تاریخ بھی ابھی طے پائی ہے۔ اسی خوشی میں ہم سب کی طرف سے یہ کیک۔" شارب نے بیچ والی ٹیبل پر لا کر بڑا سا ڈبہ رکھا۔ افروز اس کے پیچھے پلیٹ اور چمچے کانٹے لے کر داخل ہوئی۔ ان سب نے زوردار تالیوں کی گونج میں اجیہ اور سرفراز سے کیک کٹوایا۔ اس کے بعد افروز نے مزیدار کافی کرنچ کیک سب کو سرو کیا۔

"چلیں بھئی، یہ جگہ آپ کے لیے رکھی گئی ہے۔" سارے لڑکوں نے اجیہ اور ایشال کو پکڑ کر زبردستی صوفے پر بٹھادیا۔

"آپ دونوں الگ تھلگ کھڑے کیا دیکھ رہے ہیں؟ جائیں، اپنی ہونے والیوں کے برابر میں جا کر بیٹھیں تاکہ یادگار تصویریں ہوں۔" افروز نے سنی اور سرفراز کو بھی اشارہ کیا۔ سفیر اپنے کیمرے میں ان خوشگوار لمحات کو قید کرتا چلا گیا۔

ایک بار پھر زور سے دستک ہوئی اور دروازہ دھڑ سے کھلا، ساجدہ پھولوں کے گجرے کی تھالی ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئیں، درخشاں کے ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ تھی۔ ان کے پیچھے فیضان اور بقایا بزرگ پارٹی بھی مسکراتی ہوئی چلی آئی۔ سارے کزن بڑوں کے اس سرپرائز پر نثار ہونے لگے۔

"لاؤ... بیٹی اپنا ہاتھ دکھاؤ۔" ساجدہ نے مسکرا کر اجیہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"رک جائیے آپا!" مہناز نے ایک دم بیچ میں کھڑے ہو کر ولن اسٹائل میں انہیں پھول پہنانے سے روکا۔

"مہناز کیا ہو گیا؟" ساجدہ نے حیرت سے پوچھا، ان کے ہاتھ خلا میں معلق رہ گئے۔

"کیا کرتی ہیں آپا! پہلے انگیج منٹ رنگ بھی خود پہنادی۔ اب یہ بھی۔ ارے بھئی کچھ کام تو رازی کو بھی کرنے دیں؟" ان کی بات پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

"چھوٹی چاچی زندہ باد۔" کے نعرے کمرے میں گونج اٹھے۔

"جیو چھوٹی مامی!" مذاق ہی مذاق میں سرفراز کے من کی مراد پوری ہو گئی، اس نے مہناز کے کان میں سرگوشی کی، پھر بڑے پیار اور نرمی سے گلاب اور گیندے کے موٹے موٹے گجرے اجیہ کو پہنادیے، اس کے بعد سیٹی اور تالیوں کا طوفان برپا ہو گیا۔ تصاویر بنائی گئیں۔ ساجدہ نے پہلے بہو کا منہ میٹھا کرایا، پھر بھائی اور بھاوج کو مٹھائی کھلائی، سلمیٰ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایشال بڑی حسرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

"کول ڈاؤن ڈیئر..." سنی نے اس کا ہاتھ دبا کر پیار سے تسلی دی۔ وہ ایشال کے دلی جذبات سمجھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش نے اس کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھیر دیے۔

"میری بہو بھی کسی سے کم ہے کیا؟" فیضان نے بڑھ کر بھانجی کا ماتھا چومتے ہوئے پیار سے کہا پھر منہ میٹھا کرایا۔ اتنے میں ہانی دوڑ کر گیا اور ایک اور تھالی میں خوشبودار گجرے رکھ کر لے آیا۔ سنی نے بھائی کی محبت کو سراہتے ہوئے، ایشال کے ہاتھوں میں اپنی محبت کے پھول پہنادیے جس میں سے پھوٹتی خوشبو نے اسے تاعمر کے لیے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔

✵

"یہ کیا بکواس ہے...؟" انتہائی درشتی سے ادا ہوئے جملے پر رمعل ساری کی ساری کانپ گئی۔

"کک... کیا...؟"

"یہ...!" چند کاغذوں کا لہراتا پلندہ اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

"بابا کو مجھ سے بہت شکایات ہیں' میں بہت نالائق ہوں' میرا ہر رزلٹ شرمندہ کر دیتا ہے' اور ان کی بہو۔" اس نے بہو خاصا کھینچ کر کہا تھا۔

"دن رات پڑھنے والی لڑکی' شاید دنیا کی پہلی اور آخری ذہین ترین لڑکی' راتوں کو جاگ جاگ کر خاندان کا نام پوری دنیا میں روشن کر دے گی' وہ محترمہ یہ فرما رہی ہیں۔" وہ ایک ایک صفحے کو بے دردی سے پلٹتے ہوئے اسے کینہ توز نگاہوں سے نواز رہا تھا۔

"پلیز شجاع! ایسے نہیں کریں' یہ مجھے دے دیں پلیز...!" وہ بہت ہمت پیدا کر کے آگے بڑھی۔

"جی نہیں' یہ تو اب بابا ہی پڑھیں گے' اپنی لاڈلی کا ٹیلنٹ۔"

"شجاع پلیز..." اس کا ہاتھ کاغذوں کی طرف بڑھا تھا مگر شجاع نے آنکھیں نکال کر اسے تنبیہہ کی۔

"ہاتھ مت لگانا' ورنہ۔"

☆ ☆ ☆

وہ بہت دیر سے اسٹور کے کونے میں کھڑی چھوٹی کے ساتھ سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ماحول میں حبس' بجلی بند' پسینے سے شرابور دونوں بہنیں۔ اس کے اندر کی لگن ہر موسم پر حاوی تھی۔ وہ بہت محتاط انداز سے اسے سمجھا رہی تھی۔

"دیکھو ہادیہ! بہت احتیاط سے جانا اور اسے دوپٹے میں چھپا کر رکھنا۔"

"ہاں، ہاں باجی! میں اتنی بیوقوف تھوڑی ہوں' جتنی شکل سے لگتی ہوں۔" چھوٹی نے مدبرانہ انداز میں پلکیں پٹپٹائیں "اگر کسی نے پوچھ بھی لیا تو بالکل نہیں بتاؤں گی' اس لفافے میں کیا ہے۔۔۔؟"

"ٹھیک۔۔۔ اور یاد ہے ناں' میں نے کیا کہا تھا؟"

جویریہ نے اس کا دوپٹہ پھیلا کر درست کرتے ہوئے کوئی چھٹی مرتبہ یاد دہانی کروائی تھی۔

"جیسے ہی رحیم چاچا آئیں' پہلے سلام کرنا' پھر اسے ارسال کرنے کی جگہ اور طریقہ پوچھنا اور غلطی سے بھی۔۔۔"

"اور غلطی سے بھی سرخ ڈبے میں نہیں ڈالنا' پھنس جائے گا اور رحیم چاچا کو لالچ دینا ہے کہ مہربانی فرما کر یہ آپ ارسال کردیں' ہم روپیہ' اٹھنی آپ کو فالتو دے دیں گے۔۔۔" ہادیہ خاصی ہوشیار تھی اپنی انگلی پر گنتے ہوئے سبق کی طرح سنانے لگی تھی۔

"باجی صحیح سنایا ہے ناں میں نے' کل رات سے تو آپ یاد کروا رہی ہیں۔" جویریہ اس کے استہزائیہ انداز پر مسکرا دی۔

"ہاں! جاؤ اب اماں سے دہی کے پیسے لو۔۔۔" ہادیہ تیرہ چودہ سال کی تھی۔ چھوٹی ہونے کے بنا پر گھر کے چھوٹے موٹے کام با آسانی کردیتی تھی۔ اب بھی اماں کے پاس گئی قصہ سنایا۔

"باجی کے پیٹ میں درد ہے' دہی اسپغول کھانا ہے' دہی کے لیے پیسے دے دو۔" اماں نے پان دان سے روپیہ نکالا' ساتھ ہدایت بھی کی۔

"تازہ اور میٹھا کہہ کر لانا۔۔۔ اگر چونی بچ جائے تو نکڑ والے سے چند پان کے پتے پکڑ لینا' کم بخت گرمیوں میں جلدی باسی ہوجاتا ہے۔" وہ سروتے سے چھالیہ کترتے نیا پان تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

سرنگ نما گلی پار کرکے کھلی سڑک آگئی۔ کن انکھیوں سے دیکھا کالا سا موچی' سامنے دواؤں کی چھوٹی سی دکان سجائے ڈسپنسر اور قدرے آگے کریانے کی دکان پر سوچی تو لتا عباس چاچا۔ آج سب ہی کی نظریں اسے مشکوک لگ رہی تھیں۔ جیسے وہ سب جانتے ہوں کہ اس کے دوپٹے کے اندر کیا ہے۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"ہائے اللہ! یہ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں' کیا انہیں شک پڑ گیا ہے۔ باجی کوئی گناہ تھوڑی کررہی ہیں' آخر باقی سب بھی تو ایسے ہی چوری چوری کرواتی ہوں گی' پھر مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں کوئی بھائی جان کو نہ بتادے بھائی کی دکان کا رستہ بھی یہی ہے' اگر پتا چل بھی گیا تو میں صاف مکر جاؤں گی کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

وہ سوچوں میں گھری سرخ ڈبے کے پاس جا کھڑی ہوئی اور رحیم چاچا کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے کئی دن ڈیوٹی دے کر رحیم چاچا کے اوقات یاد کیے تھے۔ کبھی وہ دوپٹے کے پلو سے پسینہ خشک کرتی' کبھی ہاتھ ہلا کر ہوا جھلتی۔ جولائی کا مہینہ' آگ برساتا سورج' تندور بنی زمین۔ رحیم چاچا کی سائیکل کا پہیہ اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ابھی تو ٹھیک سے اطمینان محسوس بھی نہ ہوا تھا کہ کندھے پر رکھے جانے والے ہاتھ نے ساری جان ٹانگوں کے رستے نکال دی۔ وہ پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ اسے تو یہ تک یاد نہیں تھا وہ گھر تک کیسے پہنچی۔ پیکٹ کپکپی کے دوران بغل سے گرا تھا یا پشت سے جھانک رہا تھا۔ وہ تو یہ سوچتی دہلیز تک پہنچی تھی کہ اب باجی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور پھر اس کی سوچوں سے بہت آگے تک ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

بھائی جان کا چہرہ غضب ناک حد تک سرخ تانبے جیسا ہو رہا تھا۔ وہ قہر آلود نگاہوں سے باجی کو گھور رہے تھے۔ اماں پان سروتا تو بھولیں سو بھولیں منہ بند کرنا بھی بھول گئیں۔ پیکٹ اماں کے قدموں میں پٹخنے کے ساتھ اک چنگھاڑ بھی نکلی تھی۔

"بس یہ کالک ملنی رہ گئی تھی ہمارے چہروں پر۔"

ہادیہ کو تب تک کالک کا مطلب بھی معلوم نہ تھا۔ بہت سوچنے پر یاد آیا کہ خوف سے اچھلی، بغل کھلی، پیکٹ گرا، بھائی جان نے گھورتے ہوئے اٹھایا۔ ایڈریس پڑھا۔ بے دردی سے لفافہ پھاڑ کر چند صفحے الٹ پلٹ کر دیکھے اور ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتا گیا۔ شاید اسے ہی کالک ملنا کہتے ہوں۔ وہ سوچ رہی تھی جب دوسرا جملہ سماعت کو چیرنے لگا۔

"بکواس کرتا تھا ناں، دھیان رکھا کریں ان کا، اتنا ریڈیو کیوں سنتی ہیں، چادریں منہ پر اوڑھ، اوڑھ کر کیوں لیٹتی ہیں۔ وہ جو آپ سمجھتی ہیں ناں، حدیثوں اور کھانا پکانے کی کتابیں پڑھ رہی ہیں، ان کا نتیجہ نکلا ہے یہ۔"

وہ کف اڑاتے سیمنٹ کے بنے برآمدے تک آئے اور سبز فرش سے جھک کر پیکٹ اٹھالیا۔

"پتا ہے اس کے اندر کتنی فحش باتیں لکھی ہیں آپ کی صاحبزادی نے۔" صفحے پلٹ کر ورق گردانی شروع ہو چکی تھی۔

"معصوم بھولی صورت والی غزل کی زندگی پر اپنے نام کی طرح رات سسکتی اتر رہی تھی، اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ اس کی والدہ نے ماموں جان سے جائیداد میں اپنا حصہ مانگ لیا تھا، کیا اپنا حق مانگ لینے پر بچپن کی نسبت بے دردی سے ٹوٹ سکتی ہے، نسبت بھی وہ، جو اس کی سانسوں کے ساتھ کھیل کر جوان ہوئی ہو۔"

بھائی جان نے زہر میں بجھی نگاہ جویریہ پر اٹھائی اور چند ورق پھاڑنے کے انداز میں پلٹے۔

"نغمہ، غزل کی عم زاد کسی کے نام کی چادر اوڑھے گنگنا رہی تھی، اس کی سازش ناکام نہیں رہی بلکہ ماموں کی لالچی فطرت کو جتنا بھڑکا سکتی تھی اتنا کرم ضرور کیا، غالباً" وہ امروز کی شخصیت کے سحر میں اتنی گرفتار تھی کہ کسی بھی حد کو پار کر سکتی تھی۔ اور امروز وہ کتنا لالچی اور بے وفا۔" بھائی جان نے غصے میں صفحہ پھاڑ دیا۔

"بے حیا۔" وہ نفرت سے لمبے سانس لینے لگے، پھر آخری صفحات کھولے۔

"شرم و حیا کی پیکر غزل آج اتنی بدل گئی کہ نیم برہنہ لباس میں جان محفل بنی بیٹھی تھی، اس کی آنکھوں سے چھلکتے انتقام نے اس میں اتنی جاذبیت بھر دی تھی کہ اس کے گرد جمع پروانوں کے دلوں کی دھڑکن تیز۔۔۔" اس سے آگے وہ مزید نہیں پڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے تمام صفحات کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ یہ دیکھے بنا کہ جویریہ کی سانسیں بھی لیرو لیر ہو رہی تھیں۔

"سن لیا اس کی سوچ کا انداز، یہ سیکھنے جاتی ہے مدرسے، اگر اکبر کو پتا چل گیا تو۔۔۔" اب ان کی گولہ باری کا رخ اماں کی طرف تھا۔ وہ پہلے ہی سکتے کے عالم میں ایسے بیٹھی تھیں جیسے ابھی ابھی منکر نکیر نے قبر میں اٹھا کر بٹھایا ہو۔ اوپر سے برابر میں بسنے والے سمدھیانے کا خطرہ۔

"اس سے پہلے کہ یہ غزل اور نغمہ کی سوچوں کا رنگ پہن لے، چلتا کریں اس گھر سے۔۔۔ شام کو کریں ابا سے بات کہ وہ جلد ہی تایا جان سے تاریخ طے کریں، اور فارغ ہوں اس۔۔۔؟"

بھائی جان نے شدید لفظ ہونٹوں میں روک لیا تھا۔ ان کے غصے کو جویریہ کی آنکھوں سے بہتا پانی بھی کم نہ کر سکا تھا۔ بلکہ دہکانے کے لیے بھابھی جان ان کے پیچھے آن کھڑی ہوئیں۔ وہ ادا سے ہادیہ، جویریہ اور اماں کو مجرم بنا دیکھ رہی تھیں۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی، بہت تیز ہیں یہ، اپنی شکلوں کی طرح۔" انہوں نے ہاتھ نچاتے ہوئے بات شروع کی۔ "دس منٹوں میں اینٹوں والا صحن چمکا، صفائی ستھرائی، گھر، باورچی خانہ سمیت سماٹ گھس جاتی ہے اسٹور میں، اتنی گرمی میں میرا تو صحن میں دل الٹتا ہے اور یہ۔۔۔" انہوں نے پورا ہاتھ کھول کر اشارہ کیا۔

"اسٹور میں بنا چھت پنکھے کے سارا دن گزار دیتی ہے، ہر وقت ریڈیو بجتا ہے، عجیب و غریب رسالے پڑھتی ہے، پھر یہ نتیجہ تو نکلنا تھا۔" انہوں نے اپنا رنگین

پرانده جھلا کر پشت پر پھینکا اور تقریر کی ٹون بدلی۔

"آپ ہی کہتے تھے معصوم بچیاں ہیں میری بہنیں' دیکھ لیا بچپنا ان کا۔" بھائی جان غصے سے ہانپنے لگے مگر بھابھی کی جانے بلا' وہ حظ اٹھاتی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

"چند کاغذ پھاڑ دینے سے کیا ہوتا ہے۔ اسٹور میں جو پورا کتب خانہ تیار ہوگا' ایک پکڑا گیا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے' یہ چھوٹی کہاں کہاں پہنچا کر آتی ہوگی' ہر وقت باہر کے چکر لگتے رہتے ہیں۔"

"کیا مطلب...؟" بھائی جان کی آنکھیں اور آواز پھر سے پھٹ گئی۔ "اور بھی کچھ بکواس لکھ رکھی ہے اس نے۔" اس بار بھابھی نے زبان استعمال نہیں کی بلکہ گھٹنا اور گردن مٹکاتی رہیں۔

"اندر جاؤ' جا کر دیکھو اس کی چیزوں میں کیا کیا رکھا ہے۔" بھائی جان کے حکم نامے پر جویریہ ہونٹ کاٹتی نفی میں سرہلاتی رہی۔ جیسے بھابھی کو روکنا چاہتی ہو۔

اماں کی جانب بھی حمایت طلب نگاہ اٹھی مگر وہاں موت کا سناٹا تھا۔ یعنی اپنی جنگ خود ہی لڑنا تھی ہتھیار ناپید' گواہیاں خلاف' واحد بے ساکھی ہادیہ' جو خود بھی خوف سے کانپ رہی تھی۔ بہت ہمت مجتمع کرکے جویریہ کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

"نہیں' نہیں بھائی' اندر کچھ نہیں ہے۔ بس یہی لکھا تھا۔ معافی چاہتی ہوں۔"

"اوہو! دیکھنے میں کیا حرج ہے۔" بھابھی اسے کندھا مار دروازے سے ہٹاتی اندر چلی گئیں۔ وہ الٹے پاؤں ان کے پیچھے لپکی تھی مگر بھابھی رکنے والی تھیں بھلا! چادریں' تھیلیں' تکیے الٹ پلٹ' چند صندوقوں کے درمیانی درزوں سے بہت سے رسالے نکلے۔ دری کے نیچے سرہانے کی جگہ رجسٹر بمع قلم دھرا تھا۔

"ارے واہ۔" وہ لہرا کر بولیں۔ "یہاں تو پوری عاشقہ تیار ہے۔"

"بھابھی جان! مہربانی کرکے یہ مجھے دے دیں' خدا کے لیے رحم کریں۔" وہ منمناتی پیچھے پیچھے آئی تھی۔

اب کے سبق سنانے کی باری بھابھی کی تھی اور سنایا بھی خوب لہجے کے اتار چڑھاؤ سے تھا۔

"وہ اس کے تخیل کی پیداوار تھا' پھر اٹھتے بیٹھتے' جاگتے سوتے ہر چہرے میں نظر آنے لگا اور جب وہ چہرہ شاہانہ وجاہت کا روپ دھار کر سامنے آن موجود ہوا تو اس نے اسے پوجنا شروع کردیا' کیا ایک انسانی وجود کو دیوتا مان کر پرستش شروع کردینی چاہیے؟"

"لو میاں! آپ کی بہن نے سوال پوچھا ہے' دو جواب۔ بھائی جان کو جتا کر' پھر آخر سے پڑھنے لگیں۔

"حسن تو خدا کی عطا سے تھا' مگر تراش خراش اور اداؤں سے خدوخال میں جاذبیت اس نے خود بھر لی تھی' کتنی عجیب بات ہے کہ وہ گھر اجاڑنے چلی بھی تھی تو کس کا' اپنی معصوم نوبیاہتا سگی بہن کا۔"

"ارے واہ!" انہوں نے رجسٹر پر الٹا ہاتھ مارا۔

"یہ ارادے ہیں اس کے۔" بھابھی کے طنز' بھائی جان کی برداشت سے باہر تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر رجسٹر کھینچا اور دو حصوں میں پھاڑ دیا۔ وہ غراتے رہے پھر رسالے' رجسٹر اور کاغذ صحن کے بیچ ڈھیر کیے اور بھابھی سے ماچس مانگی۔

"نہیں بھائی جان! نہیں' خدا کے لیے۔" وہ گھٹنوں کے بل ان کے سامنے بیٹھی۔

"میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں' آئندہ کبھی کچھ نہیں لکھوں گی' آج سے پہلے کبھی ارسال نہیں کیا' خدا کے واسطے میرا یقین کریں۔ یہ مت جلائیں بھائی میں مرجاؤں گی انہیں مت جلائیں۔"

جلتی ہوئی چنگاری جیسے ہی کاغذوں پر گری وہ بھڑ بھڑ جلنے لگے۔ بھائی اور بھابھی اسے گھورتے گردن مارتے جاچکے تھے۔ مگر وہ ہذیانی کیفیت میں چلاتی "نہیں نہیں" کرتی جلتے کاغذوں پر ہاتھ مارتی انہیں بجھانے کی کوشش میں لگی رہی۔

احساسات!

خواب!

دھوئیں میں بدل رہے تھے۔ اک سیل رواں اس کے سرخ اناری رخسار بھگونے لگا۔ اس کیفیت میں اسے اپنی پشت پر برستے اماں کے دھمو کے 'اور دبوچی گردن دبوچنے تک کا احساس نہ تھا۔

"بے شرم' بے حیا' بھائی بھاوج کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیا تو نے مجھے' مر کیوں نہ گئی کم بخت۔"

اماں کی مورتی میں جب جان پڑی تو اس پر برستی چلی گئیں آخر تھک ہار کر اسے کوستی' رونے دھونے کے لیے چھوڑ گئیں۔ وہ اردگرد سے بے خبر صرف اپنے خیالات' اپنے لفظوں کی قبر بنانے میں لگی تھی۔ اس نے اس راکھ کو چھونا شروع کیا جس میں کچھ جلے بجھے' بھورے اکڑے سے پرزے تھے۔ کچھ سرمئی راکھ بننے کو تیار بے دم کاغذ' اس نے سب کو سمیٹ کر اک لفافے میں بھر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جویریہ شروع سے ہی اپنے تمام بہن بھائیوں میں مختلف تھی۔ سنتی زیادہ' بولتی کم۔ شادی شدہ بہن آتی تو بہت شوق سے آگے پیچھے پھرتی' بچوں کے آگے' بچھ بچھ جاتی۔ گھر کے تمام کام بہت پھرتی سے نمٹا دیتی۔ چھوٹی سی عمر میں لپٹ سمٹ کر خاصی باشعور سی دکھتی۔ اٹھارہ سالہ لڑکی' اس عمر میں لڑکیاں شوخ و چنچل ہوتی ہیں مگر وہ دھلا دھلایا اجلا چہرہ' لمبے گھنے بال سمیٹے۔ اپنی سوچوں میں گم۔ اس کی سوچوں نے اچانک لفظوں کا روپ دھار لیا اور کب وہ کاغذ سجانے لگی اس کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ ہاں البتہ اس کی بہت پسندیدہ مصنفہ بشریٰ رحمن کے ایک ناول "لازوال" پر اس کا شدت سے تبصرہ کرنے کو جی چاہا۔ اس نے چند سطریں کھینچ کر لفافے میں بند کیں اور چھوٹی کو سرخ ڈبے میں ڈال کر آنے کو کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے مدرسے کی استانی کے بیگ میں اکثر کوئی نہ کوئی رسالہ ہوتا تھا جس میں سے وہ اچھی اچھی باتیں اپنی شاگردوں کو سمجھاتی رہتی تھیں۔ اسی سبب استانی صاحبہ سے دوستی ہوئی۔ بات رسالہ مانگ کر پڑھنے تک پہنچ گئی۔ ایک' دو' تین۔ اس میں تو بہت سی اچھی باتیں تھیں جو آنے والے وقت میں بہت کام آسکتی تھیں۔ ان کو باقاعدہ پڑھنے سے سوچ نکھرتی چلی گئی۔

اماں نے پوچھا "بیٹی کیا پڑھ رہی ہو۔" اس نے حدیثوں کے مفہوم نکالے اور سنا دیے۔ اماں گرویدہ ہو گئیں۔ ایک بار کھانے کی ترکیب پڑھ کر ایسی لذیذ ڈش بنائی' ابا' بھائی انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ اکبر کو بھجوائی وہاں بھی تعریف ہوئی۔ بھابھی کو جمائیاں دور کرنے کا نسخہ اتار کر دیا' وہ خوش ہو گئیں۔ سوچ سمجھ کر چلنے کے وہ طریقے جو اماں شرم و لحاظ کے مارے کان میں پڑنے بھی نہ دیتی تھیں' وہ جویریہ کی شخصیت میں انہی پرچوں کی بدولت جھلکنے لگے۔ وقت گزرتا گیا۔ ہمت کر کے پہلی بار ادارے کی تعریف میں خط لکھا' بشریٰ رحمن پر رائے بھیجی۔ فریدہ کے لیے اس کا طرز تحریر حیران کن تھا اور ان ہی کا مشورہ تھا۔

"بی بی! ایسے ذہن بہت کم ہوتے ہیں' جو مختصر سے پیرائے میں مکمل خیالات کا اظہار کر سکیں" آپ کوشش ضرور کیجیے گا' ہمیں آپ کی تحریر کا انتظار ہو گا۔" ان لفظوں نے اسے جھنجوڑا اور احساسات لفظوں کی شال اوڑھ کر کہانی کی صورت لپٹتے چلے گئے۔ ہاں اس کے لیے ایک مسئلہ ضرور تھا اس پلندے کو ارسال کرنا۔ گھر سے مدرسہ' مدرسے سے گھر' زیادہ سے زیادہ اکبر سے ڈھکی چھپی ملاقات۔ اس سے ذکر نئے رشتے کے لحاظ میں نہ کیا۔ ہادیہ مشورہ دیتی۔

"باجی سرخ ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ خط بھی تو پہنچ جاتے ہیں' یہ بھی پہنچ جائے گا۔"

"نہیں گڑیا' سرخ ڈبے کی درز تنگ ہوتی ہے' یہ بنڈل اس میں پھنس جائے گا۔"

"پھر باجی کیا کریں' اب کراچی جا کر کون دے کر آئے۔" یہاں آکر دونوں کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔ حالانکہ اچھا بڑا شہر تھا۔ ڈاک خانہ بھی موجود تھا مگر جگہ

معلوم نہ تھی۔ ابا بھائی پوچھنے پر جان نکال لیتے' اکبر محبت کا دعوے دار ضرور تھا۔ مگر تھا من موجی رحیم چاچا (ڈاکیا) کا مشورہ ہادیہ کا تھا۔

"باجی میں نے خود دیکھا ہے' رحیم چاچا کا تھیلا خاصا بڑا ہے' وہ اس میں یہ بھی تو لے جا سکتے ہیں۔"

"بات تو تمہاری دل کو لگی ہے۔" جویریہ نے اس کی کف کے بٹن بند کیے۔ اگلے بال سمیٹ کر کان کے پیچھے اڑستے ہوئے سمجھایا۔

"ایسا کرنا تم احتیاط سے جانا اور رحیم چاچا سے کہنا کہ وہ خود ہی ڈاک دفتر سے ارسال کر دیں' ہم زیادہ پیسے دے دیں گے' مگر کسی کو بتائیں مت۔" چھوٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ارے ہاں! اگر وہ ساتھ چلنے کا کہیں تو ہرگز نہ جانا' بھلے وہ انکار کر دیں۔" ہادیہ پیکٹ چھپاتی چلتی بنی۔ یہ گمان تک نہ تھا کہ رحیم چاچا کے اوقات میں وہاں بھائی جان کا گزر بھی ہو سکتا ہے۔ اور نتیجہ اتنا گمبھیر نکل سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ گیس کے چولہے کے سامنے بیٹھی خاموشی سے ہنڈیا بھون رہی تھی۔ کم گو پہلے ہی تھی مگر اب چہرے پر کرب اور یاسیت کے سائے لہراتے رہتے تھے۔ گم صم خاموش۔۔۔ جانے کیسے اڑتی خبر تایا ابا کے گھر پہنچی اور تایا ابا سے زیادہ تائی اماں انگشت بدنداں تھیں۔

"نہ بابا! جو لڑکی ابا کے گھر بیٹھی عشق معاشقے کی پینگیں بڑھانے کے درس دے' وہ شادی کے بعد کیا کیا گل نہ کھلائے گی اور میرا بیٹا بھولا بھالا' سیدھا سادا۔"

انہوں نے انگوٹھی بمع سامان گھر بھجوادی۔ اماں' ابا نے بھائی بھاوج کی بہت منتیں کیں مگر رشتہ ختم۔ اکبر برہان کی نحیف سی کڑی تھی۔ بہت رسک لے کر جویریہ نے چھوٹی کے ہاتھ پیغام بھیجا۔

"معاف کر دیجیے' وعدہ کرتی ہوں یہ زندگی کی پہلی اور آخری غلطی ہو گی۔ میرے ماں' باپ کو پریشانی سے بچالیں۔ ہم لکھے بغیر تو شاید جی پائیں مگر آپ کی اور ماں باپ کی ناراضگی کے ساتھ ناممکن۔" جیسی صاف التجا تھی ویسا ہی کورا جواب آیا۔

"معافی تو تب ہو' جب ہم کوئی گناہ سمجھیں۔ آپ کے ہاتھ' آپ کی مرضی' مگر اس وعدے کا کیا کریں' جو اماں سے کر بیٹھے ہیں کہ ان کی سیدھی سادی بھانجی گھر بار اچھا سنبھال سکتی ہے۔۔۔ مگر للہ آپ وعدے پر قائم نہ رہیے گا۔" ہر تعلق لمحے میں کچی ڈور کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اسے غزل نہیں بننا تھا کہ بدلے کی آگ میں اپنے سمیت پورے خاندان کو سولی پر لٹکاتی۔ اس نے قسمت کا لکھا سمجھ کر اٹھتی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔

☼ ☼ ☼

ہر نئے دن معافی اور وعدے مانگ لینے کے بعد بھی اماں کو اس دن کی بھول نہ پڑتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی کمینی سوچ کو طعنے دیتیں۔

"پورے کنبے کے سامنے رسوا کر دیا' کیا بتاؤں کم بخت تین سالہ منگنی ٹوٹی بھی تو کس بات پر بھائی کے سامنے الگ نظر اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ کیا خیال کرتا ہو گا' شادی سے پہلے ہی بہن عشق معشوقی کی باتیں سوچتی ہے۔۔۔ کم از کم بہو کا ہی لحاظ کر لیا ہوتا تم نے۔۔۔" وہ گھورتے ہوئے دانت پیسنے لگیں۔

"دیکھا اس دن سے اس کی چال اور گردن میں کیسا سریا آ گیا ہے' میرا سارا بھرم توڑ دیا۔ اسی نے تیرے تائے کو خبر دے کر کلیجہ ٹھنڈا کیا ہو گا۔ میں جو بڑے رعب سے اسے ڈانٹتی تھی' رات کو بالٹی بھر کر سویا کر' صبح سویرے نل چلنے کی آواز بچیوں کے کان میں نہ پڑے' سوتے پل چوڑیاں اتار دیا کر' چھنکنے سے میری معصوم بچیوں کی سوچ خراب ہو گی' حق ہا۔۔۔! میں تو کچی بیری سمجھی تجھے' پر کیا خبر تھی یہ سیکھے پات ہیں' اس چھوٹی کو جانے کیا کیا بتا رکھا ہو گا تو نے کم بخت۔"

پان لگانے کے ساتھ ساتھ سینہ ملتیں اسے کوسنے دیتیں۔ مدرسہ' کتاب' کاغذ' ریڈیو ہر چیز پر پابندی لگ گئی تھی۔

برے لمحے کا پتا نہیں ہوتا' کب' کیسے' کسی وقت بھی آ جائے اور یہ اس کی زندگی کا سب سے برا وقت تھا۔ وہ اپنوں کی نظروں میں گر کر رہ گئی تھی۔ اور جسے

دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں' کیسے سانسیں ہی کھینچ کر لے گیا تھا۔ اپنے خیالات کو زبان دینا' دنیا کی آنکھوں میں گھٹتی' بڑھتی چمک کاغذ پر سجا دینا' جو سپنے دیکھ نہیں سکتی وہ صفحوں پر بکھیر دینا اس کا جرم' ناقابل معافی گناہ بن کر رہ گیا۔ ابا کو الگ چپ لگ گئی تھی جیسے بیٹی بھرے بازار میں سر ننگا کیے نکلی ہو۔

وہ سارا دن بے حس بنی بھابھی کی استہزائیہ مسکراہٹ' اماں کی دزدیدہ مشکوک نگاہیں برداشت کرتی اور رات کے سناٹے میں گرم سیال کنپٹی پر بہتا تکیے میں جذب ہوتا رہتا۔ ہادیہ کو اس کے آنسوؤں سے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ پیار سے سمجھاتی۔

"باجی اتنا مت رویا کرو' اگر کچھ ہو گیا تو....."

"ہم لڑکیوں کو کچھ نہیں ہوتا ہادیہ' ہماری فطرت میں گھٹ گھٹ کر جینا لکھا ہے۔"

"ہائے اللہ باجی! گھٹ گھٹ کر تو مر جاتے ہیں۔"

"پگلی!" اس نے ہادیہ کے چپت لگائی "ہم لڑکیاں مرتی کب ہیں' بس دفن ہو جاتی ہیں اور میں بھی دفن ہو گئی ہوں..... آہ!" اس نے توقف کے بعد سرد آہ بھری۔

"پتا ہے ہادیہ' مجھے اپنا آپ بالکل خالی برتن جیسا لگ رہا ہے' جیسے سب ختم ہو گیا ہو' میری زندگی' میری سوچ' خیال' خواب ہر چیز..... بھائی جان نے کتنی بے رحمی سے سب جلا کر خاکستر کر دیا..... مجھے لگتا ہے میں بھی اسی دن جل گئی تھی' اسی راکھ میں دفن ہو گئی ہوں اور وہ۔" اس نے دبی سسکاری لی۔

"وہ کیسا بے اعتبار نکلا..... اس نے تو مڑ کر میری راکھ بھی نہ دیکھی۔" اس کے آنسوؤں میں روانی آنے لگی تھی۔

"باجی پلیز ایسے مت روئیں۔" ہادیہ پسیجنے لگی "ایک بار پھر اکبر بھائی سے بات کرتے ہیں' ہو سکتا ہے وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔"

"نہیں!" اس نے بے دردی سے آنسو صاف کرتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ "محبت اور عزت بھیک میں نہیں ملتی ہادیہ! غزل نے بھیس بدل بدل کر محبت کی بھیک ہی تو چاہی تھی' پھر کیا سے کیا ہو گیا اس کے ساتھ۔"

"پھر لعنت بھیجو اکبر بھائی اور ان کی محبت پر۔" چھوٹی غصے سے بھڑک گئی۔ "اور باجی تم پھر سے لکھو' اب کی بار میں بہت ہوشیاری سے جاؤں گی بلکہ جس دن بھائی جان' بھابھی کے میکے ٹھہر جائیں گے اس دن کہانی ارسال کریں گے۔ جب کوئی تمہاری پروا نہیں کر رہا تو تم بھی نہ کرو۔"

"نہیں چھوٹی! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں اب کبھی نہیں لکھوں گی' میں نے اماں' بھائی جان اور۔" وہ چند پل سکتے کی طرح چپ رہی۔ "اور اکبر سے کبھی نہ لکھنے کا وعدہ کیا ہے..... تمہیں پتا ہے' وعدہ خلافی سے لفظوں کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے' پھر کیا فائدہ کاغذ کالے کرنے کا....."

"لو باجی! یہ کیا بات ہوئی۔ اکبر بھائی نے بھی تو ساتھ نبھانے کا وعدہ توڑا ہے....." ہادیہ کی بات پر وہ نگاہوں کی پتلیاں گھماتی رہ گئی۔ موٹے سے دو آنسو تیر رہے تھے۔

"ہاں توڑا تو ہے" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ "اس کی محبت کی تاثیر بھی تو آہستہ آہستہ میرے دل سے زائل ہونے لگی ہے۔" ہادیہ کے لیے باجی کی باتیں حیران کن تھیں۔

"باجی....." اس نے پھر مخاطب کیا تھا۔ "باجی پھر کیا تم انہیں سوچنا بھی چھوڑ دو گی۔"

"سوچیں ہمارے اختیار میں کب ہوتی ہیں ہادیہ۔" وہ پیڈسٹل فین کے آہستہ آہستہ گھومتے پروں کو دیکھے گئی۔ "یہ تو خود بخود گردش کرتی ہیں۔ کسی خواب کی پاداش میں آپ کی آنکھیں نکالی جا سکتی ہیں' ہاتھ' زبان کاٹے جا سکتے ہیں' مگر جب تک دماغ زندہ ہے اور دل دھڑکتا ہے کوئی سوچوں پر پابندی نہیں لگا سکتا..... البتہ میں اپنی سوچوں کو اپنی ضد' انا نہیں بننے دوں گی' میں جی کرتاؤں گی کہ غزل کو کیا کرنا چاہیے تھا۔" اس کی آواز نمی میں گھل کر گلے سی چپک گئی تھی۔

ہادیہ کو باجی پر جی بھر کر ترس آیا۔ ان کے تکیے میں چھپی راکھ بھری تھیلی اور بھابھی کی عقابی نظروں سے بچے وہ خط اور عید کارڈز جو اکبر بھائی نے باجی کو لکھے تھے۔

ہادیہ نے اس تکیے کو حسرت سے دیکھا۔

✵ ✵ ✵
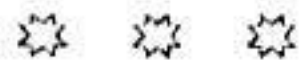
منگنی ٹوٹنے کے بعد ابا اور بھائی جان کوئی بھی رشتہ ڈھونڈنے میں لگے تھے خواہ کوئی بھی، کہیں بھی ہو مگر خاندان میں عزت کا بھرم رہ جائے..... گھر میں مچی ہلچل اور صفائی ستھرائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ خاص الخاص مہمانوں کی آمد ہے۔ ان خاص مہمانوں کو خوب صورت، سلیقہ مند جویریہ بہت پسند آئی۔ ان کے بیچ بیٹھی تو وہ مہارانی کی صورت لگ رہی تھی۔ انہوں نے فوراً" شادی کی جلدی مچادی اور ابا قطعاً" دیر لگانا نہیں چاہتے تھے۔

وہ صدق دل سے بھیگی پلکوں پر خوابوں کے جگنو سجائے سرخ مخملیں لباس میں اپنے شوہر کے آنگن اتری تھی۔ وہ شہر سے دور ایک پسماندہ گاؤں تھا۔ دیہاتی ماحول، مٹی کا چولہا، لکڑ کا بالن، کچا صحن اور صحن کے ایک جانب انار، جامن، لسوڑے کے درختوں سے جھڑتے خشک پتے، تین چار مرغیاں ان کے پیچھے بھاگتے بہت سے چوزے اور بکریوں کا شور، اس کے میکے کا ماحول اس ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ اس کی تخلیقی سوچ سے میکہ بھی میل نہ کھاتا تھا اور سسرال تو مزید کئی گنا پیچھے تھا۔

"اک چھوٹی سی غلطی کی بہت بڑی سزا دی ہے تم نے اکبر....." اس نے آخری بار اکبر کو سوچا تھا۔ شاید وہ سمجھوتے اور شکر سے گندھی تھی بہت جلد اس ماحول کا حصہ بننے لگی تھی۔ بھائی جان کو اس کے قلم سے خدشہ تھا، کردار سے نہیں جب کہ کھرے سانولے، سوکھے لمبے شکی مزاج میاں کو اس کے حسن، تہذیب، بناؤ سنگھار سے دھڑکا لگا رہتا۔ آئے دن نیا شک۔ جویریہ نے اپنی صفائی میں لڑائی جھگڑے، زبان درازی سے کام نہ لیا بلکہ جیسے کاغذ، قلم سے رشتہ توڑ لیا، اکبر کو بھلا دیا ویسے ہی سرخی، کریم، پاؤڈر کو خیرباد کہہ دیا۔

وہ ایک مکمل دیہاتی خاتون خانہ لگنے لگی تھی۔ وقت کا گردباد کب، کیسے، کہاں کہاں گھماتا رہا، چار بچے پالے پوسے، بہترین تربیت کی، شادیاں کردیں۔ اس دن کا قصہ بچپن کی غلطی سمجھ کر بہت پہلے ہی اماں، بھابھی، بھائی جان بھلا چکے تھے۔ البتہ ہادیہ کبھی کبھار کرید لیتی۔

"باجی! نغمہ نے کیسے غزل کا دل اجاڑا، اور غزل امروز کے پیچھے کیسے برباد ہوگئی تھی، مجھے خوشی ہوتی ہے کہ تم نے خود کو غزل بننے نہیں دیا۔"

"کون غزل، کون نغمہ؟ کس امروز کی بات کر رہی ہو؟" جویریہ نے کھسیانی ہو کر اس کے چپت لگائی "مجھے نہیں یاد کس کا ذکر چھیڑ رہی ہو....."

"باجی! وہ حیران ہوئی "کیا واقعی تمہیں کچھ یاد نہیں، اپنے شوہر کے تابع ہو کر سب بھول گئیں، وہ کچی محبت، پکی تحریریں؟"

"چلو ہو بھی...." جویریہ نے اسے گھرکا "میرے سارے خواب، ساری محبت میرا شوہر، میرے بچے، میرا گھر ہے....." اس نے سرگوشی کرتے ہی بات بدل دی تھی۔

اس کے چاروں بچوں نے سوائے اس کے رنگ و نقوش چرانے کے اور کچھ بھی اس جیسا نہ اپنایا تھا۔ وہ سب وقت اور ماحول کے دائروں میں گھومتے رہے۔ شادیاں ہوئیں، بچے ہوئے۔ ماحول بدل گیا۔ سوچ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق گئی۔

جویریہ اب بوڑھی ہوگئی تھی۔ تقریباً" ستر کی دہائی کے قریب۔ اس کا بہت سارا وقت جوان ہوتے نواسے، نواسیوں، پوتے پوتیوں کی شوخ و چنچل باتیں سننے میں گزرتا یا پھر ان کے کاغذ قلم پر نگاہ پڑتی تو بہت دیر گڑھی رہ جاتی۔ بہت سے کردار نگاہوں کے سامنے جلتے بجھتے۔ سانسیں گیلی ہونے لگتیں۔

وہ عشاء کی نماز میں مصروف تھی جب بڑی پوتی رمل کے کمرے سے اچانک ڈانٹ ڈپٹ کی آواز آئی۔ اس نے سلام پھیرا، گھٹنے سہلاتی، اندر آگئی۔

شجاع کی آواز میں بی درشتی رمل کے لیے اجنبی تھی۔ تایا ابا کا یہ بیٹا شوخ تو بہت تھا مگر آج کیا ہوگیا اسے، رمل کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ شجاع کے ہاتھوں میں کاغذوں کا پلندہ لہراتا دیکھ کر پہلے

رمل حیران ہوئی پھر بانگنے کے لیے منتیں کرنے لگی۔
اس نے شجاع کو سختی سے کہتے سنا۔

"ہاتھ مت لگانا ورنہ۔"

"ورنہ۔۔۔ کیا ورنہ۔" جویریہ نے بڑھاپے کے باوجود پیچھے سے ہی دستہ کھینچ لیا۔

"ورنہ کیا؟ کیا کرلو گے تم؟"

"دادو آپ۔۔۔!" وہ اچانک حملے سے اچھل ہی پڑا۔

"اسی ٹون میں بات کرو شجاع۔۔۔" اس نے عینک اتارتے ہوئے اسے گھورا۔ "ورنہ کیا کرلو گے تم، تم مرد کر بھی کیا سکتے ہو، جب اپنی مردانگی، اپنی حاکمیت، اپنی محدود سوچ خطرے میں پڑتی دکھے تو چیخ چلا کر، عورتوں کو دبا لیتے ہو۔ ہونہہ! آکر کیا سکتے ہو تم صرف اتنا کہ اس پر پڑھائی کے دروازے بند کرو گے گھر بیٹھا لو گے، اس سے منگنی توڑ لو گے، اجڈ گنوار سسرال میں دھکیل دو گے اور اس سے زیادہ کیا کرلو گے۔ اس کی سوچ اس کے خواب نہیں چھین سکتے، وہ روز اس کے ساتھ جئیں گے، رنگ بدل بدل کر پر ہلائیں گے، ٹمٹمائیں گے، یہ خواب، خیال، ویسے تو ہر لڑکی کے ساتھ پل کر جوان ہوتے ہیں اور وہ بہت باہمت ہوتی ہیں جو انہیں لفظوں میں اتار دیں، اور بہت خوش نصیب ہوتی ہیں جو اپنے لفظوں سے معاشرے کی سوچ پر اثر انداز ہوتی ہیں، اس میں اتنا ان کا کمال نہیں جتنا ان کی قسمت کو داد ہے، اور تم۔۔۔ تم مرد اسی داد سے ڈرتے ہو، کہیں یہ عورت کے ماتھے کا جھومر بن کر تمہیں نیچا نہ دکھادے۔"

وہ منہ وا کیے کھڑا تھا۔ اتنی حلیم مزاج دادو میں اتنا غصہ، اتنی کڑک آواز، چیرتا لہجہ۔

"اب جاؤ، دفع ہو جاؤ اور جسے بتانا ہے بتاؤ۔ بے شک اپنے باپ کو، بے شک پورے خاندان کو۔۔۔ رمل محبت کی بھیک نہیں مانگے گی تم سے۔" وہ پھر رمل کی جانب مڑیں۔ معصوم چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تمہیں ڈرنے، شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے کمزور مرد بہادر عورت کے قائل ہوتے ہی نہیں، تم جو لکھنا چاہتی لکھو۔ جویریہ تو تنہا تھی، اور بیساکھی بہت کمزور مگر تمہارے ساتھ میں کھڑی ہوں۔ بے شک بیساکھی بوڑھی ہے مگر مردہ نہیں ہوگی۔" انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ رمل کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑا۔

"او! ڈرامے باز، ابھی تو تمہارے چند ہی افسانے چھپے ہیں اور تم نے ڈرامے بھی کرنے شروع کر دیے۔" شجاع دانت پیستا آگے بڑھا اور دادو کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"دادو، اس ڈرامے باز پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا۔ کسی نے منع نہیں کیا یہ دو سال سے لکھ رہی ہے اور مابدولت، ظالم، جابر، قلم سلب کرنے کی آواز، یہی سوچ رہی ہوں گی ناں آپ میرے بارے میں، میں ہی پوسٹ کر کے آتا ہوں۔"

اس نے دھیرے سے دادو کو اپنی جانب موڑا اب کے حیران ہونے کی باری جویریہ کی تھی۔

"وہ تو میں اسے چڑانے کے لیے شو خا بنا ایکٹنگ کر رہا تھا، یہ چڑیل۔" اس نے دانت رمل کو دکھائے۔

"اپنا ایک صفحہ بھی مجھے پڑھنے نہیں دیتی، خاموشی سے پوسٹ کر آتا ہوں، بجائے میری احسان مند ہونے کے مظلوم بی نیر بہا رہی ہے۔" رمل کی کھسیاہٹ اور شجاع کے احتجاج پر جویریہ نے دونوں کو باری باری دیکھا تھا۔

"پلیز دادو! یہ منگنی توڑنے کی دھمکی واپس لے لیں، بڑی مشکل سے تو یہ رمل بی بی راضی ہوئی تھیں۔" وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا، اس کی حالت پر جویریہ کو ہنسی آ گئی۔

"واقعی۔۔۔!" بہت دیر بعد ان کی حیرت ٹوٹی تھی۔

"آج خوش کر دیا تم نے۔ اس نے دونوں کو بانہوں میں بھر لیا۔ "جویریہ دفن نہیں ہوئی بلکہ اس کی راکھ سے نئی کونپل پھوٹ گئی ہے۔" اس کی سرگوشی پر پہلے دونوں چونکے پھر سمجھ آنے پر اونچا سا سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیٹر کے اور لبوں کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنا کے۔

"اوہ ہو۔۔۔!" نعرہ لگایا۔

✡

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔
عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔
عبداللہ پابند صوم و صلوۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی

ناولٹ

ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔
عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔
اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔
شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو

کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔
آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔
اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔
ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔
ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔
مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کرلے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔
عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔
شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔
ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔
ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔
عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

دسویں قسط

"ارے آؤ نا' تم دروازے میں کیوں کھڑی ہو۔۔۔؟" عدینہ کے چہرے پر پھیلی پرخلوص مسکراہٹ اور گرم جوش انداز اوریدا کو اچھا لگا۔
"بیٹھو یہاں' سامان مجھے پکڑاؤ' میں سائڈ پر رکھ دوں' رات میں مل کر سیٹ کریں گے۔" عدینہ کے بے تکلف انداز پر اوریدا ہلکا سا چونکی' اسے لگا جیسے اس لڑکی کے ساتھ اس کی بہت عرصے کی شناسائی ہو۔ وہ اسے مخاطب بھی تو کچھ اسی طرح کر رہی تھی۔
"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں کرلوں گی۔" اوریدا نے مروت کا مظاہرہ کیا۔
"تم سے کہاں ہو گا یار! شکل ہی سے لگ رہا ہے کہ تمہارا ہوسٹل میں رہنے کا پہلا تجربہ ہے۔" عدینہ کی بات پر وہ حیران ہوئی۔
"تمہیں کیسے پتا چلا؟"
"ساری زندگی تو ہوسٹلز میں ہی گزر گئی ہے میری' بھانت بھانت کی لڑکیوں سے واسطہ رہا ہے۔ اب تو شکل دیکھتے ہی پہچان جاتی ہوں۔" عدینہ نے اپنے سنگل بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے مسکرا کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"ٹھیک کہتی ہو' میرا یہ فرسٹ ایکسپیرینس ہے۔" اوریدا نے افسردگی سے جواب دیا۔
"خبردار۔۔۔ اداس ہونے کی ضرورت نہیں اور کسی ٹریجڈی فلم کا سین یہاں پر کری ایٹ نہیں کرنا۔" عدینہ نے اپنے تکیے پر غلاف چڑھاتے ہوئے اسے

دارننگ دی تو اوریدا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کہاں سے آئی ہو تم۔۔۔؟" عدینہ نے لاپروائی سے پوچھا۔

"اسلام آباد سے۔۔۔"

"اور تم۔۔؟" اوریدا نے بھی اظہار مروتاً دریافت کیا۔ ورنہ اسے ان چیزوں میں ذرا کم ہی دلچسپی ہوتی تھی۔

"حسن ابدال کے ایک گاؤں سے۔۔۔" عدینہ نے خود ہی اس کا سامان ٹھکانے لگانا شروع کر دیا۔

"تم رہنے دیتیں، میں کل کرلوں گی۔" اوریدا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"ارے نہیں یار۔۔! مجھ سے بے ترتیبی برداشت نہیں ہوتی۔" عدینہ نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ بھی ڈھیٹ بن کر بیٹھ گئی۔

آنے والے دنوں میں اوریدا کو اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پر خلوص، سمجھ دار اور دوسروں کا خیال رکھنے والی لڑکی ہے۔ وہ اوریدا کا دانستہ اور غیر دانستہ انداز میں خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتی اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ ایک ہی ہفتے میں دونوں کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ صدیوں سے ایک دوسرے کی واقف ہیں۔

"تم نماز کیوں نہیں پڑھتی ہو اوریدا۔۔۔" اس دن عشاء کی نماز پڑھ کر عدینہ نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

"بس یار۔۔۔ ایسے ہی سستی ہو جاتی ہے۔" اوریدا نے خفت زدہ انداز میں وضاحت دی۔

"پڑھ لیا کرو، صرف پانچ منٹ تو لگتے ہیں، اپنے پیارے رب کے لیے بندہ اتنا بھی ٹائم نہ نکالے تو پھر کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔" عدینہ نے بالکل ہلکے پھلکے سے انداز میں سمجھایا۔

"ہاں یار! کوشش کروں گی۔" اوریدا نے شرمندگی سے وعدہ کیا تو وہ بھی سنجیدگی سے سرہلا کر الماری کے اوپر والے خانے میں رکھا قرآن حکیم نکال کر بیٹھ گئی اور غیر شعوری طور پر تلاوت کرتے ہوئے اس کی آواز کچھ بلند ہوئی تو اوریدا کو اندازہ ہوا کہ اس کی آواز میں خاصا سوز تھا۔

"عدینہ! بلند آواز میں تلاوت کرو نا، تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔" اوریدا نے کھلے دل سے اسے سراہا تو اس دفعہ اس نے دانستہ اپنی آواز بلند کرلی، اوریدا نے غور کیا، وہ قرآن پاک دیکھ کر نہیں پڑھ رہی تھی۔

"تمہیں اتنی ساری آیتیں زبانی یاد ہیں کیا؟" اس نے جیسے ہی تلاوت ختم کی، اوریدا نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"الحمدللہ۔۔۔ مجھے سارا قرآن ہی یاد ہے، ابھی پچھلے ماہ ہی حفظ کیا ہے نا۔" وہ عام سے لہجے میں کہتی اسے حیران کر گئی۔ اوریدا نے بغور اس کے صاف شفاف چہرے کی طرف دیکھا اور اسی لمحے اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔

"کاش ماہیر بھائی کی شادی اس سے ہو جائے۔" اس سوچ کے آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی جو عدینہ کی نظروں سے بھی اوجھل نہ رہی۔

"کیا ہوا؟ مسکرا کیوں رہی ہو؟" وہ لوشن اٹھا کر بیٹھ گئی۔

"ویسے ہی۔" اوریدا اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے کتاب پر جھک گئی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اسے بڑی اماں سے "فوراً" بات کرلینی چاہیے۔ جب کہ عدینہ اس کی سوچوں سے بے نیاز اپنی ڈائری اٹھا کر بیٹھ گئی۔ جہاں اسے عبداللہ کے نام پر جدائی کی ایک اور نظم لکھنی تھی۔

☼ ☼ ☼

"قسم سے بھائی۔۔۔ وہ اتنی لائق لڑکی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔" اوریدا نے چلغوزوں کی پلیٹ گود میں رکھتے ہوئے ماہیر کو اطلاع دی۔ وہ ویک اینڈ گزارنے گھر آئی ہوئی تھی اور پچھلے دو دن سے "عدینہ

نامہ" اسٹارٹ تھا۔ اس وقت ارضم بھی اس سے ملنے آیا ہوا تھا اور لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا اوریدا کی روم میٹ کی خصوصیات غیردلچسپی سے سن رہا تھا جبکہ بڑی اماں اپنے دوپٹے پر کروشیے سے بیل بنا رہی تھیں لیکن ان کا سارا دھیان بھی اپنی پوتی کی باتوں کی طرف تھا' جو اپنی روم میٹ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔

"کیا واقعی وہ بہت لائق لڑکی ہے۔" ماہیر نے انگلش میگزین سائڈ پر رکھ کر اس سے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں نا بھائی۔۔۔ اس نے پہلے میٹرک میں اور پھر ایف ایس سی میں ۔ ٹاپ کیا تھا۔" اوریدا نے فخریہ لہجے میں اطلاع دی۔

"پھر تمہارے ساتھ تو اس کا گزارا نہیں۔" ماہیر نے اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ کیوں۔۔۔؟" اوریدا واقعی نہیں سمجھ سکی تھی۔

"بھئی ایک لائق فائق لڑکی کا ایک ست اور نالائق لڑکی کے ساتھ کیا جوڑ' مجھے لگتا ہے وہ جلد ہی اپنا روم تبدیل کروالے گی' کیوں ارضم۔؟" ماہیر نے اپنی شرارت میں ارضم کو بھی شامل کیا اور اس کی سنجیدگی پر ایک لمحے کو تو اوریدا کی بھی روح فنا ہوئی۔

"ایسے ہی۔۔۔ میں نے اسے کیا کہا ہے۔" وہ پریشان ہوئی۔

"کل کلاں کو اس بے چاری کو تمہارا تعارف کسی سے کروانا پڑ جائے تو کتنی شرمندگی ہوگی اسے جب۔۔۔" ماہیر نے شرارت سے بات ادھوری چھوڑی۔

"جب کیا۔۔؟" وہ بے تابی سے گویا ہوئی۔

"جب خدانخواستہ میڈیکل کے پہلے سال میں تمہاری کوئی ایک آدھ سپلی آگئی تو۔" ماہیر نے مصنوعی تفکر کا مظاہرہ کیا۔

"اللہ نہ کرے' کیسی خوف ناک باتیں کر رہے ہیں آپ۔۔۔" وہ حد درجہ برا مان گئی۔

"جب تم پڑھوگی نہیں تو ایسا ہی ہوگا نا۔" ارضم نے آہستگی سے لقمہ دیا۔

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں پڑھتی نہیں ہوں۔" اوریدا کو غصہ آگیا۔ "جاکر پوچھ لو میری روم میٹ سے۔"

"ارضم! پھر کیا خیال ہے' پوچھنے چلیں؟" ماہیر نے ایک آنکھ دبا کر ارضم کو شوخ سا اشارہ کیا اور ساتھ ہی اوریدا کو ان کی ساری شرارت سمجھ آگئی۔

"آپ لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" اوریدا کی بات پر دونوں نے بے ساختگی سے اپنا سر نفی میں ہلایا' یہ اور بات تھی کہ ان کی آنکھوں سے ٹپکتی شوخی اس بات کی صاف تصدیق کر رہی تھی۔

"کس خاندان سے تعلق ہے اس کا۔۔۔؟" بڑی اماں نے اپنے مطلب کا سوال خاصی تاخیر سے پوچھا۔

"آپ کو پتا تو ہے بی اماں! میں کسی ذاتیات میں نہیں گھستی' اب کتنا برا لگے اگر میں اس سے اس کے خاندان کا حدود اربعہ پوچھنے بیٹھ جاؤں۔" اوریدا کی بات پر ماہیر کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"ارضم یار! ذرا چیک کرو اوریدا کی اردو۔۔۔" ماہر نے پھر اسے چھیڑا۔

"اوریدا! تمہیں لفظ "حدود اربعہ" کا مطلب پتا ہے؟" ارضم کے مسکرانے پر وہ تپ اٹھی۔

"آپ لوگ تو میری ہر بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔" اس نے ناراضی سے منہ پھلا لیا۔

"بھائی ہیں تمہارے' چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں تم سے۔۔۔" بڑی اماں کی بات پر ارضم نے بے چینی سے پہلو بدلا تو اوریدا کو اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"تو اب کس بات پر ہنس رہی ہو؟ کون سا زعفران کا کھیت دیکھ لیا ہے تم نے۔۔۔" بڑی اماں نے گھور کر اپنی پوتی کا لال سرخ چہرہ دیکھا۔ جو اپنی مزید ہنسی کو چھپانے کے لیے کچن کی طرف چل پڑی' کچھ لمحوں کے بعد

ارصم بھی اس کے پیچھے تھا۔
"بڑی اماں بھی بھی کمال ہی کر دیتی ہیں۔" وہ فریج کھول کر اندر جھانک رہا تھا۔
"بھائی....." اوریدا کی ایک دفعہ پھر ہنسی چھوٹ گئی۔
"خبردار..... مجھے بھائی کہا تو حشر نشر کردوں گا تمہارا۔" ارصم نے جھنجلا کر فریج کا دروزاہ زور سے بند کیا۔
"اچھا..... اچھا نہیں کہتی کافی پیو گے۔" اوریدا نے مسکرا کر کیبنٹ کھول کر کافی کا ڈبا نکالا۔
"ہاں، پہلے بڑی اماں کی بات نے دل جلایا ہے اور اب تم کافی پلا کر معدہ جلاؤ گی، مرضی ہے تمہاری....." وہ اس کے بالکل قریب آکھڑا ہوا، اس کے پاس سے آتی چینل فائیو کی خوشبو..... اوریدا کے حواسوں پر چھانے لگی، وہ دانستہ طور پر اس سے تھوڑا ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔
"ہوسٹل میں سب سے زیادہ کسے مس کیا تھا....." وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اپنی ہی دھن میں کھڑا تھا۔
"ماہیر کو....." اوریدا کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والے اس نام نے ارصم کو مایوس کیا۔
"اور مجھے؟" اس نے ڈھیٹ بن کر پوچھ ہی لیا۔
"تمہیں بھی کیا تھا۔" اس نے چولہے کا برنر جلاتے ہوئے لاپروائی سے ارصم کا دل بھی جلایا۔
"کیا ضرورت تھی، رہنے دیتیں۔" وہ برا مان چکا تھا۔ اوریدا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اسے کچھ غلط ہوجانے کا احساس ہوا۔
"لو اس میں مائنڈ کرنے والی کیا بات ہے، پتا تو ہے تمہیں، میں نے کتنا مس کیا ہوگا تمہیں۔" اوریدا نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔
"سب سے زیادہ تو نہیں کیا نا....." وہ سنجیدگی سے کہہ کر بڑی تیزی سے کچن سے نکل گیا اور اوریدا اس کے اس رد عمل پر ہکا بکا رہ گئی۔

وہ جب سے ہوسٹل سے آئی تھی، آپا صالحہ اس سے کرید کرید کر چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھ رہی تھیں، جبکہ عدینہ کا سارا دھیان فزیالوجی کے ٹیسٹ کی طرف تھا۔ اس لیے وہ آپا صالحہ کے سوالوں کے جواب صرف ہوں ہاں میں دے رہی تھی۔ آپا صالحہ اکتا کر اپنی ساس کے کمرے میں آن بیٹھیں۔ انہوں نے ٹی وی سے نظر ہٹا کر ان کی جانب دیکھا اور فوراً ہی بھانپ لیا کہ وہ کچھ بے چین سی دکھائی دے رہی ہیں۔
"کیوں پریشان ہو رہی ہو صالحہ....." بے بے نے بہو سے پوچھا۔
"عدینہ کی وجہ سے....." انہوں نے بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔
"عدینہ تو ماشاء اللہ اب کافی سمجھ دار ہوگئی ہے پتر،

اس کی فکر کرنا چھوڑ دے۔ اللہ سوہنا ہے نا۔" انہوں نے نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ کو نہیں پتا بے۔جی! یہ عمر کتنی خطرناک ہوتی ہے۔" انہوں نے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنا شروع کردیا۔

"غلطیاں کرنے کی کوئی خاص عمر تھوڑا ہوتی ہے پتر' انسان کا کیا بھروسا' کب کہاں' کس عمر میں اس کی مت ماری جائے۔" انہوں نے ٹی وی بند کرکے اپنی بہو کی طرف دیکھا' جس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔

"لیکن ہمارا معاشرہ عورت کی غلطی کو کبھی معاف نہیں کرتا ہے۔" انہوں نے افسردگی سے جواب دیا۔

"تو مرد کو کون سا سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ ساری عمر اس چیز کا طعنہ تو اسے بھی سننے کو ملتا ہے۔" بے جی نے جواباً کہا۔

"رہنے دیں بے بے! ہم جس معاشرے میں سانس لیتے ہیں وہاں مرد سو گناہ کرکے بھی دودھ سے دھلا ہی رہتا ہے اور عورت کی ذرا سی لغزش پر اسے زندہ درگور کردیا جاتا ہے۔" آپا صالحہ کی آنکھوں سے ایک ان کہا دکھ چھلکا۔

"اچھا یہ بتا تجھے عدینہ کی کس بات کی ٹینشن ہے۔" بے بے نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے اور اپنی ماں کی طرح کوئی جذباتی قدم نہ اٹھائے۔" انہوں نے اس دفعہ صاف گوئی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ ان کی پریشانی پر مبہم سے انداز میں مسکرائیں۔

"تجھے پتا ہے پتر! جب عورت ذات اپنے دل کے فریم میں ایک تصویر سجالیتی ہے تو پھر باہر کی دنیا کا کوئی نقش اس کو نہیں بھاتا۔ عدینہ کی فکر نہ کر' اسے عبداللہ کو بھلانے میں ابھی کئی سال لگیں گے' تب تک اس کی ڈاکٹری مکمل ہوجائے گی۔" بے بے کی بات آپا صالحہ کے دل کو لگی۔ عدینہ جو کہ کسی کام سے بے جی کے کمرے کی طرف آرہی تھی۔ اس نے لپنے لیے بے جی کا یہ جملہ سنا اور وہ وہیں کھڑے سوچنے لگی۔

"کچھ دکھ بھی انسان کو بھٹکنے نہیں دیتے۔ اسے اپنی ذات کے حصار میں قید کرلیتے ہیں اور کبھی کبھی انسان ساری زندگی اس مدار سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔" وہ دل گرفتہ سے انداز سے اپنے کمرے کی طرف پلٹ آئی' جہاں مونا بیٹھی اپنے کالج کی کوئی اسائنمنٹ بنارہی تھی۔

"آپ کا دل لگ گیا ہوسٹل میں۔۔۔" مونا نے اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر یوں ہی پوچھا۔

"جب انسان کا دل کہیں اٹک جائے تو اس کے بعد وہ شخص صرف وقت گزارتا ہے' چاہے وہ اچھا ہو یا برا' اسے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عدینہ نے سنجیدگی سے اپنی ڈائری کھولی' بہت عرصے سے اس نے اس میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ اس نے قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔

"دنیا کا سب سے مشکل کام اس شخص کی یاد کو اپنے دل سے اکھاڑنا ہوتا ہے' جس کی محبت ایک تن آور درخت کی صورت آپ کے اندر کہیں اگ چکی ہوتی ہے۔ درد کی شاخوں سے لپٹے دکھ پتوں کی صورت میں ٹوٹ کر بکھر بھی جائیں تو تب بھی یاد کی کونپلوں سے پھوٹتے غموں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جدائی کے موسم' ہر رت پر حاوی ہوجائیں تو ایسے عالم میں انسان نہ جیتا ہے اور نہ مرتا ہے' بس عمر کے نقشے میں صرف وقت بھرتا چلا جاتا ہے۔"

"عدینہ آپی! کیا لکھ رہی ہیں؟" مونا نے اسے مخاطب کیا تو وہ ایک دم حقیقت کی دنیا میں آئی۔

"کچھ نہیں۔۔۔" بے بسی میں لپٹی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا۔

"پھر بھی۔۔۔؟" مونا نے اصرار کیا۔

"جب محبت بچھڑ جائے تو انسان ساری زندگی جدائی اور ہجر کے نوحے ہی لکھتا رہتا ہے۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔

"اچھا چھوڑیں۔۔۔ یہ بتائیں۔۔۔ آپ کی نئی روم میٹ کیسی ہے۔" مونا نے اسے اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی۔ آپا' صالحہ جو ان دونوں کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں' ٹھٹک کر دروازے میں ہی رک گئیں۔

"بہت اچھی اور معصوم سی لڑکی ہے۔" عدینہ نے کھلے دل سے اوریدا کی تعریف کی۔

"آپ کی طرح لائق فائق اور ذہین ہے کیا؟" مونا کو تجسس ہوا۔

"اس کا تو پتا نہیں لیکن اس کا سارا خاندان ہی ڈاکٹر ہے۔ دادا' پھپھو' کزن اور کافی رشتے دار۔۔۔" عدینہ نے مسکراتے ہوئے مونا کو حیران کیا۔

"اتنے ڈاکٹرز کیا کر رہے ہیں' ان کے خاندان میں۔۔۔؟"

"اپنا پرائیویٹ ہاسپٹل چلا رہے ہیں اور دھڑا دھڑا پیسہ کما رہے ہیں۔" عدینہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے اس کے دادا کا۔۔۔" آپا صالحہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے یوں ہی پوچھا تو عدینہ لمحے بھر کو کوفت کا شکار ہوئی' آپا کی اس طرح کی تفتیش کے پیچھے چھپی حد سے زیادہ فکرمندی اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔

"پتا نہیں آپا! میں نے پوچھا نہیں' ہاں اس کے فادر ملک سے باہر رہتے ہیں اور مدر کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" عدینہ کی بات پر آپا صالحہ کے حلق سے ایک پرسکون سی سانس خارج ہوئی۔

"بہرحال' تمہیں زیادہ دوستیاں پالنے کی ضرورت نہیں' جس مقصد کے لیے وہاں گئی ہو' اسی پر اپنی توجہ مرکوز رکھو۔" آپا صالحہ کی نصیحت کو اس نے بے توجہی سے سنا اور اس پر تبصرہ نہیں کیا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آپا کے ساتھ ہونے والی ایسی بحث کا نتیجہ کسی نہ کسی ایک کی دل آزاری کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔ اس لیے وہ آج کل خاموشی سے ان کی ہر بات کو پی جاتی تھی۔

✡ ✡ ✡

"بس کرو بختاور! رو' رو کر تم نے اپنا حشر خراب کر لیا ہے۔" ہاشم پچھلے ایک گھنٹے سے اسے چپ کروا رہا تھا جو اس کے دوست سرفراز کی والدہ کی باتوں پر حد درجہ دکھی تھی۔ بختاور کو ان کی باتیں سوچ کر بار بار رونا آ رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا' میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے آخر۔۔۔" بختاور نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا۔

"کچھ لوگوں کو ایسے ہی دوسروں کو نصیحتیں کرنے کا شوق ہوتا ہے اور وہ تو ویسے بھی بزرگ خاتون ہیں۔" ہاشم ہر ممکن اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو اپنی بہو کو نصیحتیں کریں نا' میرے ساتھ ان کا کیا لینا دینا۔" بختاور کو غصہ آیا۔

"فائزہ بھابھی تو ویسے ہی بہت شرمندہ ہو رہی تھیں' دیکھا نہیں تھا' بار بار سوری کر رہی تھیں تم سے۔۔۔" ہاشم نے اسے یاد دلایا۔

"تو میں ان کو تھوڑا کچھ کہہ رہی ہوں۔" بختاور کے آنسو بالآخر تھم ہی گئے۔

"بہتر ہے' تم سرفراز کی والدہ کو بھی کچھ نہ کہو' بس درگزر کرو ان کی باتوں کو۔" ہاشم نے نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"کسی کے دل دکھاتے جملے اور زہر آلود نگاہوں کو بھولنا آسان نہیں ہوتا' انسان کو جب بھی وہ باتیں یاد آتی ہیں وہ ہر دفعہ اذیت کے پل صراط سے گزرتا ہے۔"

بختاور کے لہجے میں چھپی تکلیف کا احساس کر کے ہاشم بھی کچھ اداس ہوا۔ دونوں کے درمیان ایک کرب انگیز خاموشی کے چند لمحے ٹھہر سے گئے۔ ہاشم نے تاسف بھرے انداز سے بختاور کو دیکھا' وہ جتنا اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا' کوئی نہ کوئی بات ہو ہی جاتی تھی۔

"تمہیں ایک اچھی نیوز سناؤں۔۔۔؟" ہاشم نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے وہ خبر سنانے کا فیصلہ کر ہی لیا جو اس نے سرپرائز کے طور پر چھپا رکھی تھی۔ بختاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی سرخ تھیں۔ ہاشم مضطرب ہوا۔

"مجھے اپنے فلیٹ کی چابیاں مل گئی ہیں۔" ہاشم کی بات پر بختاور کو خوش گوار سا جھٹکا لگا۔

"کیا واقعی۔۔۔؟" بختاور کے لہجے سے بے یقینی چھلکی۔ "ہم کب جائیں گے اپنے گھر۔"

"اگلے ہفتے۔۔۔" ہاشم کے جواب پر وہ ہلکا سا مایوس ہوئی۔

"دراصل میں سرفراز کہتا ہے کہ تم وائٹ واش کروا کر جاؤ گھر میں' ذرا نیا لگے گا۔" ہاشم کی بات پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرادی اور اسی لمحے ہاشم کو ادراک ہوا کہ وہ یہاں ایک لمحہ بھی رکنا نہیں چاہ رہی تھی' شاید اس کی وجہ سرفراز کی والدہ کا تلخ رویہ تھا۔

"تم کوشش کرو' اگلے چار دن اپنے کمرے سے نہ نکلو۔" ہاشم نے اپنی طرف سے اسے آسان حل بتایا۔

"پہلے بھی' میں کون سا باہر گئی تھی' وہ خود میرے کمرے میں آئی تھیں۔" بختاور نے افسردہ انداز میں اسے جواب دیا۔

"چلو کوئی بات نہیں' زندگی میں بہت سی چیزوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔" ہاشم نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو سہلایا۔ "میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"

"تم ٹینشن مت لو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بختاور نے زبردستی مسکرا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"تم پریشان ہوتی ہو تو یقین مانو' میرا بس نہیں چلتا کہ میں ایسا کیا کروں جو تمہارے ہونٹوں کی ہنسی کو واپس لے آئے۔" ہاشم کی بے تحاشا محبت پر اس کا دل احساس تشکر سے لبریز ہوا۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین شوہر تھا۔

"میں جان بوجھ کر تھوڑی ایسا کرتی ہوں۔" بختاور نے بڑے مان سے اس کے کندھے سے سر ٹکایا۔

"کیا سوچ رہی ہو بختاور؟" ہاشم نے محسوس کیا' وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔

"سوچ رہی ہوں پتا نہیں گھر میں کیا حالات ہوں گے۔ بابا نے سب کی زندگیاں کتنی مشکل بنادی ہوں گی۔" بختاور کو آج کل شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ہاشم نے غور سے اس کا معصوم چہرہ دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"دیکھو بختاور۔۔۔! اگر تم ماضی کے ان ہی دائروں میں گھومتی رہیں تو یقین مانو اپنے حال کی ساری خوشیاں گنوا دوگی۔" وہ محتاط انداز میں گویا ہوا۔

"میں انہیں نہیں بھلا سکتی۔" بختاور کی آنکھیں نم ہوئیں۔ "کچھ بھی ہو' وہ میرے والدین تھے اور میرے بہن بھائی۔"

"میں بھی تو اپنا سب کچھ چھوڑ آیا ہوں اور میں جسے چھوڑ دیتا ہوں' مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔" ہاشم کے لہجے میں کچھ تھا' بختاور چونک گئی۔

"آپ مجھ سے شادی سے پہلے ان سب کو چھوڑ چکے تھے۔" اس نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی اور جو اس وقت اسے خاصی مہنگی پڑی۔

"تو تم اس بات پر پچھتا رہی ہو کہ تمہیں شادی کی وجہ سے ان سب کو چھوڑنا پڑا۔" ہاشم کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی پر وہ بے چین ہوئی۔

"میں پچھتا نہیں رہی ہوں ہاشم۔۔۔!" اس نے جلدی سے اس کی بات کی تردید کی۔

"لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم بہت جلد ایسا کروگی۔" ہاشم کی بات پر وہ حیران ہو کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"میں ایسا کیوں کروں گی بھلا؟"

"میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔" ہاشم اپنے ہاتھوں کا تکیہ سا بنا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" وہ پراعتماد تھی۔

"دعوا مت کرو بختاور! بعض دفعہ زعم میں کہے گئے لفظوں اور جملوں کا تاوان انسان کو ساری زندگی بھرنا پڑتا ہے۔" ہاشم عجیب انداز میں مسکرایا۔

"اللہ نہ کرے کہ میرے ساتھ ایسا ہو۔" بختاور نے بڑی سرعت سے جواب دیا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے' جن لوگوں کے ساتھ برا ہوتا ہے' وہ اتنے ہی برے ہوتے ہیں؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں ایسا تو نہیں کہہ رہی لیکن انسان کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو اس کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔" بختاور نے ہلکا سا سنبھل کر جواب دیا۔

"انسان کے ساتھ جو ہوتا ہے اس کے اپنے کیے گئے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔" ہاشم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن کچھ چیزیں انسان کی قسمت میں لکھ دی جاتی ہیں۔" بختاور کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ گھر سے بھاگ کر شادی کرنا' کیا تمہاری قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔" ہاشم اچانک ہی بحث پر اتر آیا۔

"حالات ہی ایسے ہوگئے تھے' مجھے ایسا فیصلہ کرنا پڑا۔" بختاور نے برا سا منہ بنایا۔

"تو تم اس بات کو تسلیم کرو کہ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا' تمہیں اچھی طرح سے پتا تھا کہ اس کے کیا نقصان اور کیا فائدے ہوں گے' تم لوگ ہر بات میں مذہب کو بیچ میں کیوں لے آتے ہو۔" ہاشم کے انداز میں کچھ تھا کہ وہ ٹھٹک سی گئی۔

"تو کیا تم قسمت پر یقین نہیں رکھتے۔" بختاور حیران ہوئی۔

"اس بحث میں مت پڑو کہ میں کس چیز پر یقین کرتا ہوں اور کس پر نہیں' تم خود الجھ جاؤ گی۔" ہاشم نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"میں تمہاری بات سمجھی نہیں۔" بختاور نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

"دیکھو بختاور... کچھ معاملات میں میرے اپنے نظریات ہیں اور میں اس کا پرچار کرنا پسند نہیں کرتا' وقت کے ساتھ ساتھ تم ان کو جان جاؤ گی۔" ہاشم کے دوٹوک انداز پر وہ چپ سی ہوگئی۔

"ناراض ہوگئی ہو کیا۔" وہ اس کی خاموشی کو ناراضی سمجھ کر بے چین ہوا۔

"نہیں۔" بختاور نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"یہ تو اچھی بات ہے' چلو لائٹ بند کرو' مجھے نیند آرہی ہے۔" اس کے نرم انداز پر وہ اٹھی اور کمرے کی لائٹ بند کردی۔

☼ ☼ ☼

"اوہ مائی گاڈ..." شانزے اپنے دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر بے ساختہ انداز میں ہنسی۔ "یہ میں ہوں۔" وہ خوش گوار حیرت اور تعجب کے عالم میں کمپیوٹر اسکرین کو دیکھ رہی تھی' اس کا کمرشل تیار ہوچکا تھا۔

"یقین نہیں آرہا نا۔" ماہیر کو اس کی حیرانی لطف دے گئی۔

"یہ کب چلے گا ٹی وی پر..." شانزے بے چین ہوئی۔

"ان شاء اللہ اگلے پیر سے..." ماہیر نے اسے مزید حیران کیا۔

"آپ سوچ نہیں سکتے' میں کتنی زیادہ ایکسائٹڈ ہورہی ہوں۔" شانزے کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا' ماہیر مسکرادیا۔

"مجھے بہت اچھی طرح سے اندازہ ہے شانزے! لیکن تمہیں اپنی بات یاد ہے نا؟" ماہیر نے اُسے اس کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی۔

"کون سا...؟" شانزے کی معصومیت اس کا دل جلا گئی۔

"اٹس ناٹ فیئر..." ماہیر نے غصے سے اپنا لیپ ٹاپ بند کیا۔ "کیا تمہیں واقعی یاد نہیں کہ تم نے پرامس کیا تھا کہ یہ تمہارا پہلا اور آخری ایڈ ہوگا۔"

"اوہ یس... یاد ہے بابا۔" شانزے کو اس کا ناراض چہرہ دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"دوبارہ ایسی فضول ایکٹنگ کی تو مارگلہ کی پہاڑیوں سے دھکا دے دوں گا تمہیں۔" اس نے انگلی اٹھا کر مصنوعی ناراضی سے دھمکی دی۔

"اف کتنے ظالم انسان ہیں آپ۔" شانزے نے

مسکرا کر اس شخص کو دیکھا' جس کے ساتھ اس کا بہت پیارا تعلق بن گیا تھا۔

"اس معاملے میں' میں ہٹلرانہ مزاج رکھتا ہوں' یہ بات ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھنا۔" ماہیر نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں ڈالا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"اب کہاں.....؟" شانزے حیران ہوئی۔

"آج بڑے ابا کو چیک اپ کے لیے لے جانا تھا۔" ماہیر کی بات پر وہ ایک دم ہنسی۔

"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"بھلا..... ڈاکٹر بھی..... اپنا چیک اپ کروانے جاتے ہیں۔" شانزے نے اپنی ہنسی کی وضاحت کی۔

"کیوں ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے بھلا' ویسے بھی انہیں کارڈیالوجسٹ کے پاس جانا ہے اور وہ خود میڈیکل اسپیشلسٹ ہیں۔" ماہیر نے اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

"سرمد بھائی کہاں ہوتے ہیں آج کل.....؟" شانزے کو اچانک ہی یاد آیا کہ اس کی سرمد سے دو دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔

"ایک آؤٹ ڈور شوٹ میں مصروف ہے۔" ماہیر نے اپنی چابیاں اٹھائیں اور الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ "اوکے شانزے..... ٹیک کیئر۔"

وہ کچھ جلدی میں تھا۔ اس لیے شانزے نے بھی اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ گاڑی اڑاتا ہوا وہ جیسے ہی گھر پہنچا' سامنے بڑے ابا' بینش آنٹی کے ساتھ گھر سے باہر نکل رہے تھے۔ اسے ہلکی سی مایوسی ہوئی۔

"بڑے ابا.....! میں تو آپ کے لیے جلدی آیا تھا گھر.....۔" ماہیر نے انہیں دیکھتے ہی عجلت بھرے انداز میں بتایا۔

"تایا ابا..... ہمیشہ میرے ساتھ چیک اپ کے لیے جاتے ہیں۔" بینش نے جتاتے ہوئے انداز میں اسے اطلاع دی۔

"اچھا پچھلے پندرہ بیس دن سے تو یہ میرے ساتھ جا رہے تھے..... کیوں بڑے ابا۔" ماہیر نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انہیں یاد کرانے کی کوشش کی۔

"پچھلے دنوں میں کچھ مصروف تھی ارصم کے ساتھ....." ان کی تیوری کے بل گہرے ہوئے۔

"تایا ابا! چلیں..... خوامخواہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔" وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھیں اور پھر چونک کر رک گئیں۔ گاڑی کا پچھلا ٹائر پنکچر تھا۔ ماہیر نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں گاڑی کے ٹائر کو دیکھا اور فوراً" بات سمجھ گیا۔ وہ اب مزے سے کھڑا ان کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

"احمد بخش! ڈرائیور کہاں ہے؟" وہ ناراض انداز سے چوکیدار کی طرف مڑیں۔

"وہ تو اور یدالبی کو کچھ سامان دینے گیا ہے ہوسٹل' بڑی بیگم صاحبہ نے بھجوایا ہے۔" چوکیدار نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی۔

"دیکھ لیں تایا ابا! ان نوکروں کے کام' یہاں پورچ سے گاڑی نکال کر لے گیا ہے وہ اور دوسری گاڑی کا پنکچر ہوا ٹائر اسے نظر نہیں آیا۔" بینش کا مزاج برہم ہوا۔ ماہیر کے لبوں پر ایک لطف لیتی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"آپ کا ڈرائیور کہاں ہے؟" بڑے ابا نے رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔

"وہ ایک ہفتے کی چھٹیاں لے کر گاؤں گیا ہوا ہے اپنے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے۔" بینش نے بے زاری سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے بڑے ابا! آپ میری گاڑی میں بیٹھیں' میں لے چلتا ہوں آپ کو۔" ماہیر کی آنکھوں کی چمک بینش کا دل جلا گئی۔

"اور بینش پھپھو! آپ چھوڑیں' ریسٹ کریں' کہاں ماری ماری پھریں گی اسپتال میں' میں بڑے ابا کو لے چلتا ہوں۔" ماہیر کی بات پر بینش نے کھڑے کھڑے بے چینی سے پہلو بدلا' جبکہ بڑے ابا خود بھی شش و پنج کا شکار تھے۔

"تایا ابا! ڈاکٹر وسیم کو کال کر کے گھر پر نہ بلوا لیں۔" انہوں نے ماہیر کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے بڑے ابا

کو مخاطب کیا۔
"ڈاکٹر وسیم تو گھر آجائیں گے لیکن پوری لیبارٹری تو گھر نہیں منگوائی جاسکتی' بڑے ابا کے کچھ ٹیسٹ بھی ہونے ہیں۔" ماہیر نے مزے سے انہیں یاد دلایا۔
"ماہیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بیٹا! ویسے بھی وسیم صاحب کو گھر بلوانا مناسب نہیں لگتا' بہت سینئر کارڈیالوجسٹ ہیں وہ۔" بڑے ابا کی بات پر بینش کا چہرہ ہلکا سا تاریک ہوا۔
"بڑے ابا! آپ میری گاڑی میں بیٹھیں' ایسے ہی خوامخواہ کی باتوں میں ٹائم ویسٹ ہو رہا ہے۔" ماہیر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔
"میرا خیال ہے بینش بیٹا! آپ بھی ساتھ چلیں۔" بڑے ابا کی بات پر وہ تذبذب کا شکار ہوئیں۔
"بیٹھ جائیں بینش پھپھو! بس یوں سمجھیں میں نہیں آپ کا ڈرائیور بیٹھا ہے اگلی سیٹ پر۔" ماہیر کی شوخ طبیعت بینش کے اعصاب کے لیے امتحان بنتی جارہی تھی۔ وہ کچھ عرصے سے اس کے منہ لگنے سے دانستہ پرہیز کرتی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے بڑے غصے سے دروازہ بند کیا تھا۔ ماہیر نے مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی میں تین نفوس بیٹھے تھے لیکن مکمل خاموشی تھی۔ اسی خاموشی میں ماہیر کے سیل فون کی گھنٹی بجی' اس نے بڑے مزے سے ہینڈ فری لگا کر فون اٹینڈ کیا' دوسری طرف تیمور تھے۔ ماہیر نے بڑی گرم جوشی سے انہیں سلام کیا' گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے دونوں لوگوں نے کوفت بھری بے چینی سے پہلو بدلا۔
"پاپا۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟" ماہیر کو سلام دعا کرتے ہی ان کی آواز میں نقاہت کا احساس ہوا۔
"میں ٹھیک نہیں ہوں بیٹا۔" تیمور بمشکل بولے۔
"پاپا۔۔۔ کیا ہوا ہے؟" ماہیر نے ایک دم ہی بریک لگائی' بڑے ابا اور بینش دونوں نے ناگواری سے اسے دیکھا' جو تیمور کی بات کو غور سے سنتے ہوئے پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پوری توجہ سے تیمور کی بات سنی تھی۔ اس دوران گاڑی کو وہ ایک سائڈ پر کھڑا کر چکا تھا۔
"پاپا۔۔۔ میں پہلی فلائٹ سے واپس آرہا ہوں۔" ماہیر کا بوکھلایا ہوا انداز ان دونوں کو مضطرب کر گیا۔ وہ دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنے ٹریولنگ ایجنٹ کو کال ملا چکا تھا۔
"واثق صاحب! مجھے پہلی فلائٹ میں لندن کی ایک سیٹ چاہیے۔ میرے فادر اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔" بڑے ابا کے چہرے پر بڑی فطری سی پریشانی جھلکی تھی' جو کم از کم بینش کو اس سے اچھی نہیں لگی۔
"جی دبئی سے ہو یا کہیں اور سے' آپ پلیز فوراً کنفرم کروائیں' میں اپنا پاسپورٹ بھجوا رہا ہوں آپ کو۔" اس کی گفتگو بڑے ابا کو بے چین کر رہی تھی لیکن وہ دل پر جبر کر کے اس طرح بیٹھے تھے جیسے گفتگو ان کے اپنے بیٹے کے متعلق نہیں بلکہ کسی انجان شخص کے بارے میں ہو رہی ہو۔ ماہیر کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے یہ دونوں اتنے بے حس ہوسکتے ہیں کہ کسی کی خیریت دو لفظوں میں بھی نہ پوچھ سکیں۔ وہ حد درجہ اکتاہٹ کا شکار ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گاڑی پارکنگ میں لاکر کھڑی کردی اور خود باہر نہیں نکلا۔
"بڑے ابا! میں ڈرائیور کو فون کردوں گا' وہ واپسی پر پک کرلے گا' مجھے نکلنا ہوگا۔" ماہیر کے بے تابانہ انداز پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بینش کے چہرے پر ٹھہر گئی۔ بڑے ابا نے بھی اس کی بات پر صرف اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"چلیں تایا ابا۔۔۔" بینش نے آگے بڑھ کر بڑے ابا کی فائل اٹھائی اور گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے ایک لمحے کو ان کو چہرہ دیکھا تو ٹھٹک سی گئیں۔ بڑے ابا کے چہرے پر اچانک ہی زردی سی پھیل گئی تھی۔
"آپ ٹھیک ہیں نا؟" ماہیر نے اپنی گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے بینش کا یہ جملہ سنا اور بطور خاص بڑے ابا کے تھکے تھکے انداز کو دیکھا اور سر جھٹک کر اپنی گاڑی پارکنگ سے نکالی۔ وہ اب اڑتا ہوا اپنے

ٹریولنگ ایجنٹ کے پاس جارہا تھا۔ دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ دبئی سے لندن تک کا کنفرم ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ گھر واپس نکلتے ہوئے اس نے سرمد کو ضروری کاموں کی تفصیل بتائی اور بڑی اماں کو سرسری سے انداز میں تیمور کی خراب طبیعت کا بتا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اسے دبئی کے لیے نکلنا تھا۔

"کچھ بتاؤ تو سہی، ہوا کیا ہے تیمور کو۔" بڑی اماں بوکھلائی ہوئی ماہیر کے پیچھے پیچھے پھر رہی تھیں، جو عجلت بھرے انداز میں اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔

"بتایا نا، ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" ماہیر نے محتاط انداز میں انہیں بتایا۔

"اگر طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ فون پر بات تو کرتا نا مجھ سے، ماں ہوں میں اس کی۔" بڑی اماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ماہیر نے اپنا ہینڈ کیری گھسیٹا اور کمرے سے باہر نکلا۔ بڑی اماں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگیں۔ سامنے ہی بڑے ابا اپنا چیک اپ کروا کر واپس آرہے تھے۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔

"ہارٹ کی بائے پاس سرجری ہے، مجھے ان کے پاس ہونا چاہیے۔" اس نے بطور خاص بڑے ابا کو سنانے کے لیے بلند آواز میں کہا۔

بائے پاس سرجری کا سنتے ہی بڑی اماں کی جان نکل گئی۔ وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ کر بے اختیار رو پڑیں۔

"ان شاء اللہ ٹھیک ہوجائیں گے وہ، آپ حوصلہ رکھیں بڑی اماں۔" ماہیر نے انہیں اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔

"پتا نہیں کیوں، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کس حال میں ہوگا میرا بیٹا۔" بڑی اماں کے آنسوؤں میں تیزی آگئی۔ بڑے ابا نے چند لمحے بغور ان کو دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولے۔

"آپ چاہیں تو جاسکتی ہیں اپنے بیٹے کے پاس۔"

بڑی اماں کے ساتھ ساتھ ماہیر کو بھی ان کی بات پر جھٹکا سا لگا۔ وہ اپنے کمرے میں جاچکے تھے۔ جبکہ بڑی اماں اور ماہیر دونوں ہکا بکا انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، دونوں کو ہی یقین نہیں آرہا تھا کہ بڑے ابا کے منہ سے ایسا جملہ بھی نکل سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"ویسے ایک بات ہے بیا۔" بندیا نے طیبہ کی سالگرہ کی تصویریں کھولتے ہوئے بینش کو مخاطب کیا۔

دونوں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں تھیں۔ بینش کے سامنے میڈیکل کی کوئی کتاب کھلی ہوئی تھی جبکہ بندیا، طیبہ سے اس کی تصویروں کا البم مانگ لائی تھی اور اس وقت وہی دیکھنے میں مگن تھی۔

"کیا بات ہے۔۔۔؟" بینش کو اس کے ادھورے فقرے سے کوفت ہوئی۔

"ڈیزی باجی اور طیبہ دونوں ہی بہت خوب صورت ہیں۔۔۔" بندیا کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ انجانے میں بینش کو چڑا گئی تھی۔

"اور بڑی اماں تو اپنے زمانے میں قیامت ڈھاتی ہوں گی۔" بندیا کی نظریں ان سب کی تصویروں پر جمی ہوئی تھیں۔

"اب اتنی بھی خوب صورت نہیں ہیں وہ، جتنا تم متاثر ہو رہی ہو۔" بینش نے بے زاری سے ناک چڑھائی۔

"پتا نہیں کیوں، مجھے تو بہت لگتی ہیں وہ۔" بندیا اپنی ہی دھن میں تھی۔

"تو تم کون سا کسی سے کم ہو۔" بینش نے ہلکا سا چڑ کر اسے یاد دلایا تو وہ مسکرادی۔

"مجھے تمہاری یہ عادت زہر لگتی ہے۔" بینش کی بات پر اس نے حیرانی سے اس کا تپا تپا سا انداز نوٹ کیا۔

"کون سی؟" بندیا کا اب سارا دھیان اسی کی طرف تھا۔

"یہ ہی جو تم ہرا یرے غیرے سے متاثر ہوجاتی

ہو۔" بینش نے اپنی میڈیکل کی کتاب غصے سے بند کر دی۔

"اس میں متاثر ہونے والی کیا بات ہے' وہ لوگ واقعی بہت پیاری ہیں۔" وہ بھی اپنے موقف پر ڈٹ گئی۔

"لیکن میری طرح ذہین تو کوئی بھی نہیں ہے ان میں سے۔" بینش کی بات نے اسے حیران کیا۔

"لیکن میں آپ کے ساتھ تھوڑی مقابلہ کر رہی ہوں ان کا۔" اسے احساس ہوا کہ وہ غلط موضوع پر غلط بندے کے ساتھ بحث کر رہی ہے۔

"اچھا۔ مجھے تو ایسا ہی لگا تھا' جیسے تم مجھے سنا رہی ہو۔" بینش اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں گویا ہوئی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیا۔" وہ گھبرا سی گئی۔ "آپ سے زیادہ اچھا تو اس گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔" بندیا نے زبردستی مسکراتے ہوئے اس کی تعریف کی۔

"تایا ابا کے گھر میں ان کے علاوہ صرف ایک ہی بندہ اچھا ہے۔" بینش کا مزاج ہلکا سا بہتر ہوا۔

"وہ کون۔۔۔؟" بندیا کو تجسس ہوا۔

"تیمور۔۔۔" بینش کے سانولے چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی جھلکی۔

"وہ تو بہت بدتمیز اور منہ پھٹ ہیں' ہر دفعہ مجھے جان بوجھ کر بندریا کہتے ہیں۔" اس نے ذرا محتاط انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ارے نہیں یار۔۔۔" بینش ہنسی۔ "وہ بہت شرارتی اور زندہ دل انسان ہے' تمہیں اس کی نیچر کا اندازہ نہیں ہے' اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔" بینش نے اس کی طرف داری کی۔

اس کا اندازہ بندیا کو اگلے دو دن کے بعد ہی ہو گیا' وہ جو کالج میں کوئی کلاس نہ ہونے کی وجہ سے جلد گھر آ گئی تھی۔ اس نے تیمور کو بڑے پریشان انداز سے ان کے پورشن سے نکلتے دیکھا۔ وہ بہت عجلت میں تھا لیکن بندیا کو دیکھ کر رک گیا۔

"تمہیں کھچڑی بنانا آتی ہے۔" اس نے اچانک ہی سامنے آ کر پوچھا تو وہ ہڑبڑا سی گئی۔

"لوگوں کی نہیں' چاولوں کی۔" اس قدر پریشانی میں بھی اس کی حس مزاح عروج پر تھی۔

"کس نے کھانی ہے؟" بندیا نے سنبھل کر پوچھا۔

"اماں کی طبیعت بہت خراب ہے اور بوا رحمت دو دن کی چھٹی پر گاؤں گئی ہوئی ہیں۔" اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

"میں بنا کر دے جاتی ہوں۔" بندیا نے اپنا کالج بیگ وہیں سیڑھیوں پر رکھا۔

"ہرگز نہیں' تم میرے ساتھ چلو' ہمارے کچن میں چل کر بنا دینا۔" اس کی فرمائش پر وہ کوفت کا شکار ہوئی۔

"ہاں یخنی بھی بنانی ہے۔" اس نے اپنی مینو لسٹ میں ایک اور چیز کا اضافہ کیا۔ بندیا تذبذب میں مبتلا ہوئی۔

"کسی بیمار بندے کی خدمت کرنے سے اللہ ثواب دیتا ہے۔" تیمور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے لاپروائی سے گویا ہوا۔ ثواب کے چکر میں اس نے بھی مزید سوچنے کا ارادہ ملتوی کیا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ کچن میں پہنچتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سامنے سنک گندے برتنوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے پریشانی سے تیمور کی شکل دیکھی جو شرمندگی سے اپنا کان کھجا رہا تھا۔

"آج اتفاق سے سارے ہی ملازم چھٹی پر ہیں۔ تم کھچڑی بنا لو' میں اتنے میں کچھ کراکری واش کر لیتا ہوں۔" اس نے مشورہ دیا۔

"بہت شکریہ آپ کا' آپ جا کر اپنی اماں کے پاس بیٹھیں' میں سب سمیٹ لوں گی۔" بندیا نے سنجیدگی سے اسے منع کیا اور کیبنٹ کھول کھول کر چیزیں تلاش کرنے لگی' وہ آدھے گھنٹے کے بعد واپس آیا تو کھچڑی چولہے پر پک رہی تھی اور وہ پوری دل جمعی سے برتن دھو رہی تھی۔ تیمور نے اس کے گھنے بالوں کی چوٹی کو توصیفی نگاہوں سے دیکھا' وہ ابھی بھی کالج کے سفید

ڈیفارم میں تھی' اسے ہلکا سا افسوس ہوا۔ اسی کے ازالے کے لیے اس نے یخنی خود بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

"آپ کیا کرنے لگے ہیں؟" بندیا نے منہ بنا کر کہا۔

"اماں کہتی ہیں' کھچڑی کے ساتھ تھوڑی سی یخنی بھی پئیں گی۔" وہ معصومیت سے گویا ہوا۔

"جب میں نے کہہ دیا ہے کہ سب کچھ بن جائے گا تو کیا مسئلہ ہے۔" بندیا کو غصہ آگیا۔

"ان کو بھوک لگی ہوئی ہے اور مجھے مسلسل ڈانٹ پڑ رہی ہے۔" تیمور نے اپنا اصل مسئلہ بتایا تو بندیا کے لبوں پر مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ اس نے جلدی سے چکن اٹھایا اور دھو کر ایک دیگچی میں ڈالا۔ وہ ساتھ ساتھ کچن بھی سمیٹ رہی تھی۔

"ڈیزی باجی کب آئیں گی ہوسٹل سے...؟" بندیا نے یوں ہی پوچھا۔

"ظاہر ہے' چھٹیوں میں ہی آئے گی وہ' ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے اسے یونی ورسٹی گئے ہوئے۔" تیمور نے فریج سے جیم نکالا اور ڈبل روٹی پر لگا کر کھانے لگا۔

"اور طیبہ...؟" بندیا نے اس کی دوسری بہن کا پوچھا۔

"اس کا کالج ٹرپ تین دن کے لیے لاہور گیا ہوا ہے۔" تیمور کی بات پر اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ کچن کی حالت اس قدر ابتر کیوں ہے' کیونکہ گھر میں موجود واحد خاتون بیمار اور باقی لوگ گھر سے باہر تھے۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔" وہ بڑی اماں کے لیے کھانا ٹرے میں سجا کر لے کر گئی تو انہوں نے اسے دل سے دعا دی۔ بندیا نے انہیں بیٹھنے میں مدد دی اور کھانا کھلا کر کچھ دیر تک ان کا سر بھی دباتی رہی۔

"اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔" وہ مسلسل اسے دعائیں دے رہی تھیں۔ اسی دوران تیمور ایک ڈش میں کھچڑی ڈالے اندر داخل ہوا اور بڑی رغبت سے کھانے لگا۔ بندیا ایک دم شرمندہ ہوگئی۔

"میں ابھی کھانا بنا دیتی ہوں۔" اس نے جھٹ سے آفر کی۔

"اٹس اوکے' یہ بھی بڑے مزے کی ہے۔" وہ بڑی اماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کھانا کھانے اور سر دبانے سے بڑی اماں کی طبیعت کافی بہتر ہوگئی تھی اور اب ان پر غنودگی سی طاری تھی۔ بندیا خالی برتن اٹھا کر کچن میں آگئی۔ ایک گھنٹے کے بعد تیمور آیا تو پورا کچن لشکارے مار رہا تھا اور وہ چکن پلاؤ کے ساتھ مٹن قورمہ بھی بنا چکی تھی۔

"واؤ... بڑی مزے کی خوشبو آرہی ہے۔" اس نے ڈھکن اٹھا کر اشتہا انگیز خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ اسی دوران تیمور کے والد ڈاکٹر جلال بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت بندیا بڑی مہارت سے روٹیاں بنا رہی تھی' وہ ایک دم چونکے۔ بندیا نے جھٹ سے ان کو سلام کیا۔

"آپ غلام صابر کی بیٹی ہیں نا۔" انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"جی انکل کھانا لگاؤں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم ابا سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟" تیمور نے سبزیوں کی ٹوکری سے کھیرے نکال کر چھیلتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ مسکرا دی۔

"بینش بتاتی ہیں کہ وہ بہت غصے والے ہیں۔" بندیا اس کے سامنے والی چھوٹی کرسی پر آن بیٹھی۔ کھانا بن چکا تھا۔

"حالانکہ اسے تو وہ کچھ بھی نہیں کہتے۔" وہ بڑی مہارت سے کھیرا چھیل رہا تھا' بندیا نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"انگلینڈ میں اکیلے رہنے سے کافی کاموں کی پریکٹس ہوچکی ہے۔" وہ اس کی حیرانی بھانپ کر بولا۔

"آپ انگلینڈ میں رہتے ہیں کیا؟" بندیا کو حیرت ہوئی۔

"ہاں' اسٹڈیز کے سلسلے میں' آج کل چھٹیوں میں گھر آیا ہوا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

بندیا نے کھانا لگا دیا تھا' دونوں باپ بیٹے نے مل کر ڈائننگ روم میں کھانا کھایا تھا' جبکہ بندیا' اماں کے لیے دلیہ بنانے لگی۔

"تمہارے ہاتھ میں بہت ٹیسٹ ہے۔" تیمور نے کچن میں آکر کہا۔
"ہاں، مجھے کوکنگ کرنا بہت پسند ہے۔" وہ برتن اٹھا کر سنک میں رکھ رہی تھی جب ایک دم سے بینش اندر آئی۔
"تم یہاں ہو اور میں اپنے پورشن میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہی ہوں۔" وہ ناراضی سے اسے دیکھنے لگی، جو خاصی مصروف لگ رہی تھی۔
"تم یہ تفتیش کرنا چھوڑو اور مزے کا قورمہ 'پلاؤ' کھاؤ' بندیا نے بہت زبردست بنایا ہے۔"
تیمور کی آواز پر وہ چونکی۔ "تم بھی یہیں موجود ہو؟"
"ہاں نا... آج تو سارا دن اتنی ٹینشن رہی وہ تو شکر ہے، یہ بندیا ہاتھ لگ گئی، ورنہ ہم سب تو بھوکے مارے جاتے۔" وہ لاپروائی سے اسے بتانے لگا۔
"بھئی... بندیا! کھانا نکال کر دو نا بینش کو۔" تیمور کا اپنائیت بھرا انداز بینش کو اچھا نہیں لگا۔
"وہ کیوں نکال کر دے گی، میرا اپنا گھر ہے۔" اس کے جتاتے ہوئے لہجے پر بندیا نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ خفا خفا سی لگ رہی تھی۔ بندیا دل ہی دل میں الجھ گئی، اسے بالکل بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ بینش کب، کہاں، کس وقت ناراض ہو جائے۔ اس وقت بھی تیمور اس کو منا رہا تھا۔
"اب کیا تم اس گھر میں مجھے مہمانوں کی طرح ٹریٹ کرو گے۔" وہ منہ پھلائے کھڑی تھی۔
"اوہ بھئی... اس حقیقت سے کس کو انکار ہے، میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ تم تھکی ہوئی ہو گی۔"
تیمور نے گھبرا کر وضاحت دی تو اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ بندیا کی طرف دیکھا، جو ان دونوں سے بے نیاز برتن دھو رہی تھی۔
"بندیا! انسان، کم از کم کچن میں کام کرنے سے پہلے اپنا یونیفارم تو چینج کر لیتا ہے۔" بیا کے ناگوار انداز پر اس نے بوکھلا کر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا جس پر نمل کا ایک بڑا سا نشان لگ چکا تھا۔
"قسم سے بہت پھوہڑ ہو تم..." بینش نے برا سا منہ بنا کر ایک پلیٹ اٹھائی اور چکن پلاؤ ڈالنے لگی۔
"خیر، پھوہڑ تو یہ بالکل بھی نہیں ہے، بڑی زبردست کک ہے، آج تو ابا بھی کھانے کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔" تیمور نے کھلے دل سے سراہا۔ کچن میں رکھی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی بینش کا چہرہ لمحے بھر کو تاریک ہوا۔
"تایا ابا نے کھانا گھر پر کھایا ہے کیا؟"
"ہاں نا... بندیا کے ہاتھوں کی گول گول چپاتیوں کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔" تیمور بے خیالی میں بولتا جا رہا تھا۔ بندیا کو بینش کے چہرے پر پھیلی بے زاری سے ہلکا سا خوف محسوس ہوا، وہ گھبرا کر جلدی جلدی برتن دھونے لگی۔
"ہاں، اس کا دماغ بس ان ہی کاموں میں چلتا ہے، پڑھائی کے نام سے تو جان جاتی ہے اس کی۔" بینش نے استہزائیہ انداز سے اس کا مذاق اڑایا تو پہلی دفعہ بندیا کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے سامنے کسی کی ذرا سی تعریف بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا چہرہ تپ سا جاتا اور آنکھوں میں عجیب سا رنگ ٹھہر جاتا۔
"بہت شکریہ بیٹا! آج تم نے میری بڑی مدد کر دی۔" اماں نقاہت زدہ انداز میں چلتے ہوئے کچن میں داخل ہوئیں تو وہ تینوں ہی بوکھلا سے گئے۔
"آنٹی! کسی چیز کی ضرورت تھی تو آپ بلا لیتیں، خود کیوں اٹھ کر آئیں۔" بندیا بے اختیار انداز میں چل کر ان کے پاس آئی، جبکہ وہ پورے کچن کو توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں، یہ یقیناً" بندیا کا کارنامہ تھا جو ہر چیز صاف اور دھلی ہوئی اپنے ٹھکانے پر تھی۔
"ارے نہیں بیٹا! اب تو بخار اتر گیا ہے۔ بس تھوڑی سی کمزوری ہے۔" وہ بینش کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔
"چائے بنا دوں آپ کو...؟" بندیا نے ان کے پاس آکر فکرمندی سے پوچھا۔
"ہاں بیٹا! اسی کے لیے آئی تھی میں۔" وہ نقاہت زدہ انداز میں مسکرائیں۔
"میں نے آپ کے لیے دلیہ بھی بنا کر رکھ دیا ہے،"

رات کو لے لیجیے گا۔" بندیا نے چائے کا پانی ساس پین میں ڈالتے ہوئے اطلاع دی۔

"اللہ بھلا کرے تمہارا بیٹا۔" اماں نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا' جبکہ بینش اپنی پلیٹ اٹھا کر کچن سے نکل گئی۔ تیمور اس کے پیچھے لپکا۔ بندیا' بڑی اماں کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر ٹی وی لاؤنج کے پاس سے گزری تو تیمور کی خفا خفا سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"بیا' تمہیں اماں کا حال تو پوچھنا چاہیے تھا۔"

"وہ بھی تو مجھے نظر انداز کر کے بندیا کے گن گانے میں مصروف تھیں۔" بینش نے جل کر جواب دیا۔ بندیا پریشانی کے عالم میں وہیں ٹھہر گئی۔

"ظاہری سی بات ہے' وہ دوپہر سے ان کی خدمت کرنے میں مصروف ہے' گن تو گائیں گی ہی وہ۔" تیمور نے اس کی حمایت کی اور ساتھ ہی بینش کی کلاس لینے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ "لیکن تمہیں ان کی طبیعت پوچھنی چاہیے تھی۔"

"تو وہ کون سا کہیں چلی گئی ہیں' کھانا کھا کر پوچھ لوں گی۔" بینش کا مزاج برہم ہوا۔ بندیا پریشان سی کچن میں آکر سب کے لیے چائے کپوں میں ڈالنے لگی۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ بینش کے ہمراہ وہاں سے نکلی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب ہے۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی نوکروں کی طرح ان کے کام کرنے کی۔"

"تمہارے بابا' تمہیں چھوڑتے ہوئے اسپشلی کہہ کر گئے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کو گھر کے کاموں کے لیے نہیں پڑھنے کے لیے چھوڑ کر جا رہے ہیں' یاد ہے نا تمہیں۔" بینش کے انداز میں تلخی کا عنصر غالب ہوا۔

"لیکن وہ بیمار تھیں بیا۔" بندیا نے بوکھلا کر اسے یاد دلایا۔

"تمہیں اس گھر کا نوکر سمجھتی ہیں وہ۔" بینش کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ "بتاؤ' میں نے کبھی تمہیں ایسا سمجھا۔" وہ خفگی سے پوچھ رہی تھی' بندیا نے فوراً' نفی میں سر ہلایا۔

"میں ہمیشہ تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھتی رہی ہوں' خبردار دوبارہ خود کو ڈی گریڈ کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ پتا نہیں اسے کیا سمجھانے کی کوشش میں تھی۔

"اگر ان کے ملازم چھٹی پر چلے جائیں تو یہ ان کا مسئلہ ہے' ہمارا نہیں۔" وہ بے زاری سے سر جھٹک کر گویا ہوئی۔ بندیا سر جھکائے کھڑی اس کی ڈانٹ سن رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ساری دوپہر کی خواری کے بعد بھی اسے اتنی باتیں سننا پڑیں گی۔

"سارے یونیفارم کا بیڑہ غرق کر لیا ہے تم نے' اب اتار کر ماسی کو دو' وہ واش کر دے اسے اور خود بیٹھ کر اپنی اسٹڈی کرو۔" وہ نیا حکم صادر کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بندیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بازو کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑ رہی تھی کہ تیمور نے اندر داخل ہوتے ہوئے یہ منظر دیکھ لیا۔ اسے حقیقتاً" افسوس ہوا۔

"مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ وہ گھر جا کر سارا غصہ تم پر اتارے گی' اسی لیے پیچھے آیا تھا۔" تیمور تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" بندیا صاف مکر گئی۔

"پھر یہ آنسو کس خوشی میں بہائے جا رہے ہیں؟" تیمور کو اس کے جھوٹ بولنے پر غصہ آیا۔

"ویسے ہی۔" بندیا نے جلدی سے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ تیمور بغور اس کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا سرخ چہرہ دیکھنے لگا۔ بندیا کو اس کے اس ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے پر گھبراہٹ سی ہوئی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔" وہ بوکھلا کر گویا ہوئی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ جب معصوم لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو ان کے چہرے کا رنگ گلابی مائل ہو جاتا ہے۔"

وہ ایک دم غصے سے کھڑی ہوئی اور اتنی ہی تیزی سے تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔ اسے کرنٹ سا لگا اور وہ خوف زدہ انداز میں

تھوڑا سا پیچھے ہو کر بیٹھی اور غصے سے تیمور کو دیکھنے لگی' جو دلچسپ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے چھکے چھڑا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
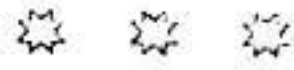
اوریدا کی باقاعدہ اسٹڈیز شروع ہو چکی تھیں' پہلے پہل تو وہ میڈیکل کی اتنی بھاری بھرکم کتابیں دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی۔ اکثر لیکچر اس کے سر پر سے گزر جاتے اور وہ رشک بھری نگاہوں سے اپنے ساتھ بیٹھی عدینہ کو دیکھتی رہتی جو نہ صرف لیکچر کے دوران سوال کرتی تھی بلکہ پروفیسرز کے مشکل ترین سوالات کے جوابات بھی آسانی سے دے جاتی تھی۔

"تم بہت لائق ہو عدینہ۔" اس دن لائبریری سے نکلتے ہوئے اوریدا نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم نے اتنی جلدی یہ سب ٹاپک کیسے پڑھ لیے۔" اوریدا چلتے چلتے رکی۔

"اس لیے کہ میں دو سال پہلے میڈیکل کے فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر میں نے کچھ مہینوں کے بعد چھوڑ دیا تھا۔" عدینہ کی بات پر اسے جھٹکا سا لگا۔ وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟ اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو؟" عدینہ خفت کا شکار ہوئی۔

"تم نے پہلے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

اس لیے کہ تم نے پہلے کبھی پوچھا ہی نہیں۔" اس نے بھی شرارت سے اسے لاجواب کیا۔

"میں تو یہ بات سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" اوریدا نے مسکرا کر کہا' وہ دونوں اسپورٹس گراؤنڈ کی طرف نکل آئی تھیں اور اب ایک اونچی سی جگہ پر بیٹھ کر موسم سرما کی دھوپ سینکنے لگیں۔

"تم نے اس وقت اسٹڈیز کیوں چھوڑ دی تھی۔" اوریدا کو اچانک ہی خیال آیا۔

"میں خود سے خفا ہو گئی تھی۔" عدینہ نے ایک دفعہ پھر اسے حیرت میں مبتلا کیا۔

"کیا انسان خود سے بھی ناراض ہو سکتا ہے؟"

اوریدا سادگی سے اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ ایک دم ہی افسردگی کا شکار ہوئی تھی۔

"ہاں جب انسان خود سے خفا ہوتا ہے تو ہر وہ کام کرنے لگتا ہے' جس سے اس کی ذات کو کسی نہ کسی حوالے سے کوئی تکلیف یا رنج پہنچتا ہو۔ ایسے عالم میں انسان اپنی ہر خوشی اور ہر خواہش سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ وہ دانستہ طور پر ایسے کام کرنے لگتا ہے' جس سے اسے اور اس کے پیاروں کو دکھ پہنچتا ہو۔" عدینہ کا انداز اسے بڑا فلسفیانہ لگا۔

"تم بعض دفعہ بہت مشکل باتیں کرنے لگتی ہو عدینہ۔" اس کے منہ بنانے پر عدینہ مسکرا دی۔

"اچھا چھوڑو' ان باتوں کو ذرا میرے ساتھ ایڈمن بلاک تک چلو' ایک ضروری کام ہے۔" وہ عدینہ کے کہنے پر خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ دونوں کے درمیان کافی دوستی ہو چکی تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ وہ دونوں عدینہ کا کام کروا کر ایڈمن بلاک سے نکل رہی تھیں' جب اوریدا نے ارصم کو بڑے ابا اور اپنے پروفیسر رضوی کے ساتھ اندر آتے دیکھا' وہ پرجوش انداز سے ان کی طرف بڑھی۔

"ہیلو اوریدا۔" ارصم نے اسے دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔ عدینہ کی آنکھوں میں بھی شناسائی کے رنگ ابھرے۔

"السلام علیکم بڑے ابا۔" اوریدا نے بڑے پرجوش لہجے میں ڈاکٹر جلال کو سلام کیا اور انہوں نے محض سر کے اشارے سے جواب دیا۔ ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ جب کہ ان کے ساتھ کھڑے پروفیسر رضوی دلچسپ نگاہوں سے اوریدا اور عدینہ کو دیکھ رہے تھے۔

"پروفیسر جلال یہ بچی آپ کی کیا لگتی ہے؟" پروفیسر ڈاکٹر رضوی نے حیرانی سے پوچھا' وہ اوریدا کی کلاس کو اناٹومی پڑھاتے تھے۔

"تیمور کی بیٹی ہے۔" بڑے ابا کے تعارف پر اوریدا کو ہلکی سی مایوسی ہوئی جبکہ ارصم اور عدینہ خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"تو ایسے کہیں ناں، آپ کی پوتی ہے۔" پروفیسر رضوی بے ساختہ مسکرائے۔

"جی۔" ڈاکٹر جلال نے لاپروا انداز میں کہتے ہوئے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور پھر ارصم کی طرف دیکھ کر بولے۔ "تم نے اگر اوریدا سے کوئی بات کرنی ہے تو کر لو' میں رضوی کے آفس میں ہوں۔"

"جی بڑے ابا۔" ارصم نے اثبات میں سر ہلایا۔ بڑے ابا' پروفیسر رضوی کے ساتھ ایڈمن بلاک کی جانب بڑھ گئے۔

"ہائے عدینہ! کیسی ہو؟" ارصم' اوریدا کو چھوڑ کر بڑے خوشگوار لہجے میں عدینہ سے مخاطب ہوا تو اوریدا کو جھٹکا لگا۔

"تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" وہ تعجب سے دونوں کو دیکھ رہی تھی' اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا وہ خود ہی اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر ہنس پڑی۔ "ارے ہاں ارصم تمہارا کلاس فیلو رہا ہوگا' تم نے بتایا تو تھا کہ تم نے پہلے بھی ایڈمیشن لیا تھا۔" اوریدا نے خود سے اندازہ لگایا اور ان دونوں نے اس کی تردید کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

"آپ اوریدا کے کیا لگتے ہیں؟" عدینہ مسکراتے ہوئے ارصم سے مخاطب ہوئی۔

"میری کزن ہے یہ' ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔" ارصم کی بات پر اس دفعہ حیران ہونے کی باری عدینہ کی تھی۔

"اوہ دیٹس گریٹ.... ہم دونوں کلاس فیلوز ہی نہیں روم میٹس بھی ہیں۔" عدینہ نے جھٹ سے اسے اطلاع دی۔

"اور بہت اچھے فرینڈز بھی...." اوریدا نے فوراً ہی اس کے جملے میں اضافہ کیا۔

"اچھا تو وہ تم ہو جس کے نام کی تسبیح آج کل اوریدا صبح و شام پڑھ رہی ہے۔" ارصم نے شرارت سے اوریدا کو چھیڑا تو عدینہ مسکرا دی۔ ارصم انہیں لے کر کیفے ٹیریا میں چلا آیا تھا۔ اوریدا اس اچانک ملاقات پر بہت خوش تھی۔

"تمہارا کزن بہت اچھا انسان ہے اوریدا۔" رات کو ہاسٹل کے کمرے میں عدینہ نے کتاب سے سر اٹھا کر اچانک کہا تو اپنے بیڈ پر بیٹھی اوریدا کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی دیے چمک اٹھے۔

"ہاں' اس میں تو کوئی شک نہیں' تمہیں پتا ہے' وہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے۔" اوریدا نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"ہاں.... وہ کسی کا بھی بہترین دوست ہو سکتا ہے۔" عدینہ کے لہجے میں افسردگی در آئی۔ وہ جلدی سے اپنی گود میں رکھی میڈیکل کی کتاب پر جھک گئی۔ کمرے میں خاموشی کا پردہ بڑی خوب صورتی سے حائل ہو گیا تھا۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے اوریدا....؟" عدینہ نے اپنی کتاب سے سر اٹھا کر اچانک پوچھا تو وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں کیا سوجھی' آدھی رات کو یہ سوال کرنے کی؟" اوریدا نے اپنا کمبل پھیلا لیا۔

"اس لیے کہ جو لوگ دنیا سے بے نیاز' اپنی ہی دھن میں رہتے ہیں' ان کے دل کی دنیا بڑی آباد اور روشن ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر ایسا ہی لگتا ہے۔" عدینہ کی وضاحت پر وہ مسکرا دی۔

"ہاں میں ہر کسی کے ساتھ فری نہیں ہوتی' مجھے انجان لوگوں سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔" اوریدا کے سنجیدہ انداز پر عدینہ نے لاپروائی سے سر ہلایا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" وہ اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ٹھیک کرنے لگی' موسم ایک دم ہی سرد ہو گیا تھا۔

"کون سا...." اوریدا کا دھیان بٹ چکا تھا۔

"یہ ہی کہ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" عدینہ نے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے سردی کی شدت کو کم کیا۔

"دانستہ طور پر تو کبھی محبت نہیں کی میں نے۔" اوریدا نے اس کی بات کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی۔

"چلو غیر دانستہ طور پر ہی سہی۔۔۔؟" وہ ابھی بھی اپنے سوال پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔" اوریدا نے سر جھکا کر کہا، جیسے کوئی اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہو۔ عدینہ مسکرادی۔

"اور تم نے۔۔۔" اوریدا نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"میں نے بھی اس شہر سے دور، بستے ہوئے ایک شخص کو چاہا تھا بہت۔۔۔" عدینہ نے کھل کر اعتراف کیا تو وہ حیران رہ گئی۔

"پھر۔۔۔؟" اوریدا نے بے تابی سے پوچھا اور کرب کا احساس عدینہ کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔

"پھر وہ مر گیا۔۔۔" عدینہ کی بات نے اوریدا کی قوت گویائی سلب کرلی۔ "جب کوئی محبت دنیا کے میلے میں بچھڑ جائے تو وہ انسانوں کی نگری میں تو مر جاتی ہے لیکن اس شخص کے دل میں ہر روز زندہ ہوتی ہے اور اس انسان کو جیتے جی ہر روز ہی مارتی ہے۔ محبتوں کی قسمت میں لکھی دائمی جدائیوں کو کبھی زوال نہیں آتا۔" عدینہ افسردگی کی انتہا پر تھی۔

"عدینہ کون تھا وہ۔۔۔؟" اوریدا نے اس کے رنجیدہ چہرے سے نظریں چرا کر پوچھا۔

"محبت کا کوئی نام نہیں ہوتا ہے، وہ تو کسی بھی روپ میں ہو، کسی بھی نام سے ہو، بس روح کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" عدینہ کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اوریدا کو ایسے لگا جیسے وہ بھی کسی کرب کے صحرا میں اتر آئی ہو۔

"تم ٹھیک کہتی ہو، محبت کا کوئی ایک نام نہیں ہوتا۔" اوریدا کا دل ایک دم ہی اچاٹ ہو گیا۔ ارصم کا ہنستا مسکراتا چہرہ اس کے سامنے روشن ہوا تو آنکھوں نے کچھ اور پڑھنے سے انکار کردیا۔ ایک دلفریب سی مسکراہٹ اوریدا کے لبوں پر ٹھہر گئی۔

"تم ارصم جاوید سے محبت کرتی ہو نا؟" کمرے کے سناٹے میں عدینہ کی آواز گونجی۔ اوریدا کو جھٹکا لگا، وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے عدینہ کو دیکھنے لگی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" وہ پریشان ہوئی۔

"تم نے۔ اس لیے کہ اسے دیکھتے ہی تمہاری آنکھوں میں جگنوؤں کے قافلے ٹھہر گئے تھے اور تمہارے لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ نے ڈیرہ جمالیا تھا، تم اس کے ساتھ تھیں اور تمہیں دنیا کی پروا نہیں تھی۔" عدینہ کی بات پر اوریدا خفت میں مبتلا ہوئی۔

"کیا واقعی ایسا تھا؟" اوریدا کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ ورنہ مجھے الہام تو ہونے سے رہا۔" عدینہ نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑا۔ "ویسے لڑکا اچھا ہے اور تم دونوں کا کپل بہت کیوٹ لگے گا۔"

"لیکن مجھے معلوم ہے، یہ کپل کبھی بھی نہیں بن سکتا۔" اوریدا اداس ہوئی۔

"وہ کیوں۔۔۔؟" عدینہ الجھن بھرے لہجے میں بولی۔

"ارصم کی والدہ مجھ سے شدید نفرت کرتی ہیں اور وہ اپنی مدر سے بہت محبت کرتا ہے، مجھے معلوم ہے، وقت کے ترازو میں جب بھی ہم دونوں کی محبتوں کو تولا جائے گا، ارصم کی مدر کا پلڑا بھاری رہے گا۔" اوریدا نے رنجیدہ لہجے میں کہا اور کمبل اوڑھ لیا۔ عدینہ نے اس کے دکھ کو اپنے دل کے اندر اترتا ہوا محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

"ماہیر مجھے بتائے بغیر انگلینڈ کیسے جا سکتا ہے؟" شانزے کو سرمد کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا اور وہ پچھلے بیس منٹ سے آفس میں اس کا سر کھا رہی تھی، جبکہ سرمد اس وقت اپنا لیپ ٹاپ کھولے ایک ضروری ای میل کرنے میں مصروف تھا۔

"بتایا نا۔ اس کے فادر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔" سرمد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اتنا تو اسے بھی علم تھا کہ وہ جب تک سر پر سوار رہے گی، وہ کوئی بھی کام دلجمعی سے نہیں کرپائے گا۔

"لیکن اسے بتا کر جانا چاہیے تھا مجھے۔" شانزے جھنجلا سی گئی۔

"یار بہت ایمرجنسی میں گیا ہے وہ۔" سرمد اس کی ضد پر کوفت کا شکار ہوا۔

"بندہ کم از کم ایک فون کال تو کر سکتا ہے۔" وہ خفگی

سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اب اس کی کال آئے گی تو تمہارا شکوہ پہنچادوں گا اس تک۔ وہ تمہیں کال کرلے گا۔" سرمد نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہرگز اس سے بات نہیں کروں گی۔" شانزے کے ناراض لہجے پر سرمد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا پرابلم ہے شانزے؟ انسان کے ساتھ کوئی ایمرجنسی بھی تو ہوسکتی ہے۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"وہ جب آپ کو کال کرسکتا ہے تو مجھے کیوں نہیں۔" وہ ہٹ دھرمی سے گویا ہوئی۔

"مجھے کال کرنا تو اس کی مجبوری تھی' کیونکہ آفس کے اہم معاملات کو میرے علاوہ اور کون دیکھ سکتا تھا بھلا۔" سرمد نے اپنے مخصوص نرم انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کی جو اس وقت منہ پھلائے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"میرا کمرشل کب آن ایر ہوگا۔" اس نے ناراض لہجے میں بات بدلی۔

"تمہیں بتایا نہیں تھا ماہیر نے۔" سرمد نے حیرانی سے پوچھا۔

"بتایا تو تھا لیکن وہ خود تو انگلینڈ چلا گیا ہے۔" شانزے نے اسے یاد دلایا۔

"سو واٹ۔ وہ کہیں بھی چلا جائے جو کام جس ڈیٹ کو آن ایر ہونا ہے وہ تو ہوگا نا۔" سرمد کی بات پر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

"بہرحال۔ آپ اپنا کام کریں' میں چلتی ہوں۔" شانزے نے اپنا بیگ اٹھایا تو سرمد نے ایک دفعہ پھر لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"آفس کے ڈرائیور کو کہو' وہ چھوڑ آئے گا تمہیں۔" سرمد کو اس کی ہر چیز کا دھیان رہتا تھا۔

"تو تھینکس۔" وہ منہ بناتے ہوئے بے زاری سے کمرے سے نکل گئی' سرمد کو حیرانی تو ہوئی لیکن اس وقت اس کے لیے وہ ای میل اہم تھی' اس لیے وہ سر جھٹک کر اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوگیا اور

شانزے جیسے ہی بلڈنگ سے باہر نکلی سامنے سے آتے یاور صاحب سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"ارے شانزے' کیسی ہیں آپ۔؟" یاور صاحب کا چہرا اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

"فائن۔" شانزے کا موڈ کچھ خراب تھا' اس لیے اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کے لیے ایک شان دار آفر ہے میرے پاس۔" یاور صاحب نے مسکراتے ہوئے شانزے کا خفا خفا سا چہرہ غور سے دیکھا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ مجھے لان کا ایڈ نہیں کرنا۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"یہ ایڈ نہیں۔ ایک میگا سیریل پروجیکٹ ہے۔ بہت اچھی پے منٹ کرواؤں گا آپ کو۔" یاور صاحب نے فوراً ہی اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

"اچھا۔ کتنی اچھی پے منٹ کروائیں گے آپ۔؟" شانزے نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ اس کا ان کے سیریل میں کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"ویسے نئے چہروں کو کم ہی پے کرتے ہیں لیکن میں اپنے اچھے کانٹیکٹ استعمال کرواکے آپ کو آٹھ لاکھ تک پے منٹ دلوا سکتا ہوں۔" یاور صاحب کی بات پر اسے جھٹکا لگا۔

"آٹھ لاکھ۔" شانزے کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ بہرحال یہ کوئی کم رقم نہیں تھی۔

"اور نیکسٹ پروجیکٹ اس سے بھی اچھا کرواؤں گا۔" یاور نے اسے مزید گھیرا۔

"تھینکس جی۔" شانزے نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ ماہیر سے وعدہ کرچکی تھی اور اسے ہر حال میں اسے نبھانا تھا۔

"یہ میرا وزٹنگ کارڈ ہے' آپ سوچ کر جواب دیجیے گا مجھے۔" انہوں نے ایک کارڈ اس کی جانب بڑھایا' جسے کچھ سوچ کر شانزے نے تھام لیا۔

"ویسے میں آپ کو بتادوں کہ میں کوئی زیادہ انٹرسٹڈ نہیں ہوں آپ کے پروجیکٹ میں۔" شانزے نے انہیں اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اب

اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈال کر دائیں بائیں ٹیکسی کی تلاش میں دیکھنے لگی۔ یاور کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہے۔

"مس شانزے! ایک بات کہوں' اگر آپ برا نہ مانیں تو۔" وہ محتاط انداز میں گویا ہوا۔

"جی فرمایئے....." شانزے نے شان بے نیازی سے کہا۔

"کم از کم ایک دو پروجیکٹس کر کے اچھی سی گاڑی تو لے لیں' اس طرح لوکل ٹرانسپورٹ پر سفر کرنا مناسب نہیں لگتا۔" یاور صاحب نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ شانزے کا چہرہ احساس توہین سے لمحے بھر کے لیے سرخ ہوا۔

"الو کا پٹھا۔" اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ کے مشورے کا شکریہ' گاڑی میں ویسے بھی لے سکتی ہوں اور آفس کی طرف سے بھی گاڑی ملی ہوئی ہے مجھے' اس وقت ڈرائیور کسی کام سے نکلا ہوا ہے۔ اینی ہاؤ' آپ کا بہت بہت شکریہ۔" شانزے نے جھوٹ بولتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

"ماہیر ٹھیک کہتا ہے' یہ ہے ہی کمینہ انسان۔" وہ ایک ٹیکسی کو روکتے ہوئے دل میں سوچ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک گاڑی لینے کا پختہ ارادہ بھی کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆
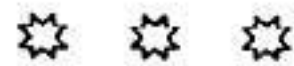
بڑی اماں کی شوگر کنٹرول میں نہیں آ رہی تھی اور بلڈ پریشر ___ کا مسئلہ بھی آج کل زوروں پر تھا۔ اس وقت بھی وہ دوا کھا کر بیڈ پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبا رہی تھیں۔ ڈاکٹر جلال ان کے سامنے راکنگ چیئر پر آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے اور ان کی گود میں میڈیکل کا ایک انٹرنیشنل میگزین رکھا ہوا تھا۔ بوا رحمت ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئیں' انہوں نے چھوٹی ٹرے میں ایک کپ چائے کا رکھا ہوا تھا جو وہ بڑی اماں کے لیے لائی تھیں۔

"درد کچھ کم ہوا بیگم صاحبہ....؟" بوا رحمت نے فکر مندی سے پوچھا۔

"یہ درد تو لگتا ہے اب مرنے کے بعد ہی جان چھوڑے گا۔" وہ بے زاری سے بڑبڑائیں۔ جلال صاحب نے آنکھیں کھول کر اپنی زوجہ محترمہ کو دیکھا۔ جو پچھلے تین دن سے حد درجہ پریشان تھیں اور وہ ان کی پریشانی کی اصل وجہ سے بخوبی واقف تھے۔

"آپ نے خوامخواہ سے اوریدانی بی کو ہوسٹل بھجوا دیا۔ گھر میں تو آج کل الو ہی بولنے لگے ہیں۔" بوا رحمت اکتاہٹ بھرے انداز میں بولیں۔

"میں نے کہاں بھجوایا ہے۔ باپ بیٹے کی کارستانی ہے' اب خود باہر جا کر بیٹھ گئے ہیں اور پورے گھر میں ہول اٹھتے رہتے ہیں مجھے۔" بڑی اماں ان سے بھی زیادہ بے زاری کا شکار تھیں۔

"تیمور میاں کی کیسی طبیعت ہے اب....." بوا رحمت نے جلال صاحب کے ڈر سے سرگوشی میں پوچھا' یہ اور بات کہ ان کی سرگوشی' کمرے کی خاموشی میں انہوں نے بڑے آرام سے سن لی تھی۔

"مجھ سے تو بات چھپانے کی بیماری ہے انہیں۔ اب بھی وہ ماہیر کا بچہ کہاں بات کرواتا ہے میری۔" وہ جھنجلا کر بولیں۔

"اتنی ہی زیادہ ٹینشن ہے تو خود کیوں نہیں چلی جاتیں باہر۔" جلال صاحب سکون سے گویا ہوئے۔

"چلی جاؤں گی جب جانا ہوگا۔" نقاہت زدہ آواز میں بھی ان کا چڑچڑا پن نمایاں تھا۔ وہ آج کل بات بات پر لڑنے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں۔

"طیبہ بیٹا کو فون کر دوں کیا؟" بوا رحمت نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے مشورہ دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" انہوں نے بے زاری سے ٹوکا۔ "جب مر جاؤں گی تو ایک دفعہ ہی اکٹھا کر لینا سب کو۔ جیتے جی تو حسرت ہی رہے گی مجھے کہ سب مل کر بیٹھیں۔" وہ ناراضی سے چائے کی پیالی ایک طرف رکھ کر لیٹ گئیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

جلال صاحب نے اس دفعہ غور سے ان کا چہرہ

دیکھا ______ ان کی آنکھوں سے ایک پتلی سی آنسوؤں کی لکیر بہتی ہوئی آرہی تھی۔ ان کا اپنا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ انہوں نے جلدی سے سیل فون نکالا اور سرمد کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف وہ ان کی کال پر حیران پریشان تھا۔

"گھر آکر اپنی نانو کا پاسپورٹ لے جاؤ اور ویزے کے لیے اپلائی کردو۔" ان کی اس بات پر بھی بڑی اماں نے آنکھیں نہیں کھولیں' وہ اپنے مجازی خدا کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں۔

"جی بڑے ابا' میں آکر لے جاتا ہوں۔" سرمد نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"مجھے نہیں جانا کہیں پر بھی..." انہوں نے بھیگے ہوئے لہجے کے ساتھ کہا۔

"جانے یا نہ جانے کا فیصلہ بعد میں کرلیجئے گا' فی الحال اپنا پاسپورٹ نکال کر رکھیں' سرمد آرہا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر کمرے سے نکل گئے بوا رحمت نے خوش گوار حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"بیگم صاحب! یہ انقلاب کیسے آگیا آخر... برف پگھل کیسے گئی..." بوا رحمت ابھی تک حیرانی کا شکار تھیں۔

"کہاں پگھلی ہے برف؟ ورنہ بچہ اتنا بیمار ہے' بندہ ایک کال کرکے تو پوچھ سکتا ہے۔" بڑی اماں کو آج کل اپنے میاں سے شکایتیں ایک دم ہی بڑھ گئی تھیں۔

"یہ بھی تو کوئی چھوٹی بات نہیں' جو آپ کو جانے کی اجازت دے دی ہے انہوں نے' ورنہ تو اس بات پر بھی نہیں آتے تھے۔" بوا رحمت نے انہیں یاد دلایا۔

"ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو بوا' خیر میری وارڈروب کی دراز میں رکھا بیگ پکڑاؤ مجھے' پاسپورٹ نکال کر رکھوں' ورنہ سرمد شور مچائے گا۔" بڑی اماں کی بات پر وہ خوش گوار حیرت کا شکار ہوئیں۔ "کیا واقعی... آپ تیمور میاں کے پاس جارہی ہیں؟"

"سوچ رہی ہوں ایک چکر لگا ہی آؤں' زمانے گزر گئے اپنے بچے کی شکل دیکھے ہوئے۔" وہ اداس ہوئیں۔

"اوریدا کو بتایا ہے آپ نے اس کے باپ کی بیماری کا..." بوا کو اچانک یاد آیا۔

"توبہ کرو بوا' بھول کر بھی نام نہ لینا اس کے سامنے۔ ایسا آنسوؤں کا طوفان آئے گا کہ سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔" بڑی اماں کی بات پر بوا رحمت نے فوراً" کانوں کو ہاتھ لگائے اور وارڈروب کھول کر ان کا پاسپورٹ نکالا۔ ایک گھنٹے کے بعد سرمد وہاں پہنچ چکا تھا اور اس کے جانے کے دو گھنٹے کے بعد طیبہ ہانپتی کانپتی وہاں پہنچیں۔

"اماں... یہ میں کیا سن رہی ہوں؟" طیبہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"سچ مانو تو مجھے بھی یقین نہیں آرہا۔" بڑی اماں اپنے بیٹے سے ملنے کی خوشی میں ایک دم ہی ہشاش بشاش ہوگئی تھیں۔

"تیمور بھائی کی طبیعت خاصی بہتر ہے' میری آج بات ہوئی ہے ماہیر سے۔" انہوں نے اپنی بادامی رنگ کی شال اتارتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔

"اتنی ہی بہتر ہے طبیعت تو وہ بات کیوں نہیں کرواتا مجھ سے..." بڑی اماں کو ان کی بات کا بالکل یقین نہیں آیا۔

"آپ کو پتا تو ہے باہر کے ملکوں میں مریضوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اسپتال میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی نا۔" طیبہ نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"رہنے دو بھئی' میں سب جانتی ہوں' میں کون سا پہلی دفعہ جارہی ہوں باہر۔" بڑی اماں آج کسی کو بھی لفٹ کروانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"اچھا اماں! اگر اب آپ جارہی ہیں تو موقع دیکھ کر تیمور بھائی سے بات کرلیجئے گا نا۔" طیبہ نے ساتھ ہی فرمائش کردی۔

"کون سی بات...؟" وہ حیران ہوئیں۔

"سرمد اور اوریدا کی شادی کی۔" کمرے میں داخل ہوتے سرمد نے اپنی ماں کی بات بقائمی ہوش و حواس سنی تھی' اور اس کے دل میں امیدوں کے کئی چراغ

ایک ساتھ جل اٹھے تھے۔ تب ہی تو وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

"ہاں ہاں دیکھوں گی۔" بڑی اماں نے اپنی بیٹی کو دلاسا دیا۔

"لو بھئی' سرمد آگیا۔" طیبہ نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو مسکرا کر دیکھا' جو مصروف انداز میں اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

"کیا بنا میرے پاسپورٹ کا؟" بڑی اماں کے انداز میں بے چینی کا عنصر غالب تھا۔

"ان شاء اللہ دو چار دن میں لگ جائے گا ویزا' میں نے اپنا ایک خاص سورس استعمال کیا ہے۔" سرمد نے انہیں تسلی دی۔

"چلو اچھا ہے۔ ہاں اوریدا کے لیے کچھ چیزیں بھجوانی تھیں میں نے ہوسٹل۔" انہیں اچانک یاد آیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں' میں جا کر دے آؤں گا۔" سرمد نے جھٹ سے آفر کی۔ طیبہ نے چونک کر بیٹے کو دیکھا' جس کے چہرے پر اوریدا کے نام پر چمک سی آجاتی تھی' اتنا تو انہیں بھی اندازہ تھا کہ وہ اوریدا کو پسند کرتا ہے اور انہیں بھی اس چیز پر کوئی اعتراض نہیں تھا' لیکن اس وقت وہ سر جھٹک کر دوبارہ اپنی والدہ سے گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

بینش بیگم بڑے مصروف انداز میں اپنے پورشن میں گھوم رہی تھیں' صبح ہی سے ملازموں کی شامت آئی تھی اور وہ بے چارے بوکھلائے ہوئے پورے گھر میں گھوم رہے تھے۔

"وہ دیکھو ذرا ڈرائنگ روم کے کونے میں جالا لگا ہوا ہے۔ تم لوگوں کو آخر یہ سارا گند نظر کیوں نہیں آتا۔" وہ غصے سے چیخیں تو لاؤنج میں اخبار پڑھتے آغا جی کوفت کا شکار ہوئے۔ انہوں نے بےزاری سے اپنی اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا۔

"یہ سالانہ صفائی کس خوشی میں ہو رہی ہے آخر...؟" وہ منہ بنا کر بولے۔

"ارحم کی پھوپھو اور ان کی بیٹی آ رہی ہیں سان فرانسسکو سے۔" بینش نے انہیں اطلاع فراہم کی۔

"کون سی پھپھو۔" انہوں نے طنزاً پوچھا۔

"ایک ہی تو تھیں' عمیرہ نام تھا جن کا۔" بینش ان کا طنز نہیں سمجھیں۔

"اچھا... ان کو بھی یاد آگیا کہ ان کی ایک بیوہ بھابھی اور بھتیجا بھی ہے۔" ان کا لہجہ ہنوز طنزیہ تھا۔ انہیں اپنی بیٹی کی اکلوتی نند سے بڑا گلہ تھا' جو عید بقرعید پر ہی کبھی کبھار فون کرنے کی زحمت کرتی تھیں اور اب کافی سالوں کے بعد پاکستان آ رہی تھیں۔

"اب کیا کہہ سکتا ہے بندہ۔" وہ ہلکا سا شرمندہ ہوئیں۔

"اور آپ نے مجھے بتانا تک مناسب نہیں سمجھا۔" آغا جی کو اچانک ہی یاد آیا تو انہوں نے بھی خفگی کا اظہار کر دیا۔

"مجھے تو خود رات پتا چلا ہے کہ کل شام کی فلائٹ ہے ان کی...." وہ ناک پر دوپٹا رکھ کر لاؤنج میں ان کے پاس آن بیٹھیں۔ فضا میں ہلکی ہلکی سی گرد نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور انہیں ڈسٹ الرجی کی شکایت تھی۔

"کس سلسلے میں آ رہی ہیں وہ...." آغا جی نے ہاتھ میں پکڑا اخبار میز پر رکھا۔

"بیٹے کی شادی کے سلسلے میں...." بینش نے مختصراً بتایا۔

"اچھا تو پاکستانی لڑکی کی تلاش میں آ رہی ہیں وہ...." آغا جی نے اندازہ لگایا۔

"نہیں...." بینش فوراً بولیں۔ "لڑکی تو مل چکی ہے انہیں' شادی کی ڈیٹ فکس ہے اور اسی سلسلے میں آمد ہو رہی ہے ان کی۔"

"تو شادی کیا اس گھر میں آ کر کریں گی؟" آغا جی کو پریشانی لاحق ہوئی۔

"ظاہر سی بات ہے آغا جی! وہ ہی تو بہن بھائی تھے جاوید اس بے چاری کا ہمارے سوا کون ہے۔" بینش

نے اپنی نند کی طرف داری کرتے ہوئے جواب دیا۔ جو آغا جی کو بالکل بھی پسند نہیں آیا۔

"اپنے مطلب کے لیے انہیں۔ بھابھی کی یاد آگئی پاکستان میں، آگے پیچھے تو کبھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔" انہوں نے اپنی ناپسندیدگی برملا اظہار کیا۔

"کیا ہوگیا ہے آغا جی آپ کو۔۔۔ آپ کا دل اور ظرف اتنا چھوٹا تو نہیں تھا۔" بینش کوفت کا شکار ہوئیں۔

"میرا ظرف، کم از کم خود غرض اور مطلبی لوگوں کے لیے بڑا نہیں ہے۔" آغا جی نے بے نیازی سے وضاحت کی۔

"آپ کا مزاج کیوں برہم ہے آج؟" بینش حیران لہجے میں بولیں۔

"کچھ نہیں، طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔" وہ اخبار رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب کہاں جا رہے ہیں آپ؟" بینش ان کی خرابی طبیعت کا سن کر فطری پریشانی کا شکار ہوئیں۔

"جلال بھائی اور بھابھی کا حال پوچھنے جا رہا ہوں، سنا ہے بھابھی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

"ہاں تائی اماں۔۔۔ آج کل بڑی اکھڑی اکھڑی سی پھر رہی ہیں۔" انہوں نے ناک چڑھا کر اپنے مخصوص نیکھے انداز میں تبصرہ کیا۔

"سنا ہے تیمور کی طبیعت ٹھیک نہیں؟" انہوں نے لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے یوں ہی کہا۔ ان کی بات سنتے ہی بینش کی تیوری کے بل گہرے ہوئے۔

"آپ کو پتا ہے مجھے تیمور میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔ وہ بیمار ہو یا ٹھیک، یہ اس کا اور اس کی فیملی کا مسئلہ ہے، میرا نہیں۔" وہ ایک دم ہی چڑ گئیں اور آغا جی حیرانی سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھنے لگے جو اتنے سالوں کے بعد بھی اپنے دل میں چھپی نفرت اور بغض کو کم نہیں کرپائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ماہیر بھائی انگلینڈ چلے گئے؟" ویک اینڈ پر گھر جاتے ہوئے اوریدا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ بے یقینی سے ارصم کو دیکھنے لگی، جو بڑے سکون سے گاڑی چلا رہا تھا، وہ دونوں اب اکثر ہی ویک اینڈ پر اکٹھے آتے تھے۔

"تو اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے۔" ارصم مسکرایا۔

"وہ اس طرح اچانک۔۔۔ مجھے بتائے بغیر کیسے جاسکتے ہیں؟" اوریدا الجھن بھرے لہجے میں بولی۔

"کوئی ایمرجنسی تھی انہیں، دس پندرہ دن میں واپس آجائیں گے۔" ارصم نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"جتنی بھی ایمرجنسی ہو، انہیں بتانا چاہیے تھا، میں کم از کم پاپا کے لیے کچھ بھجوا دیتی۔" وہ مایوس ہوئی۔

"تو تم بڑی اماں کے ہاتھ بھجوا دو۔" ارصم نے مزے سے مشورہ دیا، یہ سنتے ہی اسے کرنٹ لگا۔

"بڑی اماں بھی جا رہی ہیں پاپا کے پاس۔۔۔" حیرت کے مارے اوریدا کی آواز بلند ہوئی۔ "لیکن کیوں؟"

"بھئی تیمور انکل ان کے بیٹے ہیں، بڑی اماں، کبھی بھی کسی بھی وقت ان کے پاس جاسکتی ہیں۔" ارصم نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"لیکن اس سے پہلے تو وہ کبھی بھی نہیں گئیں ان کے پاس۔۔۔" اوریدا کے پاس جواز تھا۔

"تو ضروری ہے، جو کام پہلے نہ کیا ہو، وہ ساری زندگی ہی نہ کیا جائے۔" ارصم ہر حال میں پرسکون رہتا تھا۔

"مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔" اوریدا کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔

"کم آن اوریدا، اب تم پریشان ہونے کے لیے کوئی بات مت ڈھونڈ لینا۔" ارصم نے ناگواری سے ٹوکا۔

"بڑی اماں کیسے جاسکتی ہیں بھلا اور بڑے ابا نے انہیں کیسے اجازت دے دی آخر۔" اوریدا کی سوئی اسی ایک بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

"وہ کیوں نہیں جاسکتیں بھلا۔۔۔" ارصم کو اس کی بحث اچھی نہیں لگی۔

"اس لیے کہ بڑے ابا' ان سے ناراض جو ہیں۔"
اوریدا نے ایک وجہ ڈھونڈ ہی نکالی جو ارصم نے فوراً" رد کردی۔
"بڑی اماں تو ناراض نہیں ہیں پا تیمور انکل سے' وہ تو ہر تیسرے دن ان سے بات کرتی ہیں۔" ارصم نے اسے لاجواب کیا۔ گاڑی ان کے سیکٹر میں داخل ہو رہی تھی' سامنے مارگلہ کی پہاڑیوں میں ڈوبتے سورج کا منظر بڑا بھلا لگ رہا تھا گاڑی جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی اوریدا کو لان میں چند اجنبی چہرے نظر آئے اس نے تعجب سے ارصم کی طرف دیکھا۔
"گھر میں کوئی گیسٹ آئے ہوئے ہیں کیا؟" اس کی سوالیہ نگاہیں' اس الٹرا ماڈ لڑکی پر جمی ہوئی تھیں جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ان کے لان میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے کانوں میں ہینڈ فری لگا رکھا تھا اور شاید سیل فون پر میوزک سن رہی تھی' تب ہی اس کا سر ہلکا ہلکا سا ہل رہا تھا۔
"عمیرہ پھپھو آئی ہیں سان فرانسسکو سے۔" ارصم نے گاڑی سے اترتے ہوئے اس کی پریشانی دور کی۔
"اور یہ لڑکی کون ہے؟" اوریدا نے ناگواری سے اس لڑکی کو دیکھا' جس کی ڈریسنگ یہاں کے ماحول کی مناسبت سے ذرا معیوب لگ رہی تھی' حالانکہ اوریدا گھر میں خود اکثر جینز اور شرٹ پہنے گھومتی تھی لیکن اس میں بھی وہ پورا خیال رکھتی تھی کہ اس کا لباس برا نہ لگے اور بڑی اماں کے بار بار ٹوکنے پر اس نے جینز کے ساتھ لمبا کرتا اور گلے میں اسکارف پہننا شروع کر دیا تھا۔
"یہ ارسلہ ہے میری پھپھو کی بیٹی۔" ارصم نے اپنی کزن کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہوئی۔
"تھینکس گاڈ ارصم۔ تم آگئے' ٹرسٹ می بہت بور ہو رہی تھی میں۔" وہ چیونگم چباتی ہوئی ارصم سے مخاطب ہوئی' اس نے اوریدا کو صاف نظر انداز کر دیا تھا۔
"میٹ مائی کزن اوریدا۔" ارصم نے اوریدا کے چہرے پر پھیلی ناپسندیدگی سے گھبرا کر خود ہی تعارف کی رسم نبھائی۔
"ہائے۔" ارسلہ نے بے نیازی سے ہلکا سا ہاتھ ہلایا اور پھر ارصم کی طرف متوجہ ہوگئی۔
"ممی اور بیا آنٹی کی تو شاپنگ ہی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی اور جونی کے فرینڈز ہی اسے نہیں چھوڑ رہے اور میں بوریت سے مرنے والی ہوں۔" وہ تیز تیز چیونگم چباتی ہوئی اوریدا کو زہر لگی۔
"جنید کے یہاں کون سے ایسے فرینڈز بن گئے۔" ارصم کو حیرانی ہوئی' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ارسلہ کے بڑے بھائی کی بھی ساری زندگی باہر ہی گزری تھی۔
"کوئی سوشل میڈیا کے فرینڈز ہیں۔ باہر جانے کے چکروں میں چپکے ہوئے ہیں اس کے ساتھ' پتا نہیں یہ پاکستانیوں کو ایسا کیا کمپلیکس ہے' جہاں کوئی فارن نیشنلٹی ہولڈر دیکھتے ہیں' فوراً" اس کی منتوں پر اتر آتے ہیں کہ بس کسی بیگ یا سوٹ کیس میں ہی سہی لیکن باہر لے جاؤ۔" ارسلہ کا مغرور لہجہ اوریدا کو بالکل اچھا نہیں لگا۔
"خیر۔ سب ایسے نہیں ہوتے۔" ارصم نے اس کی بات کی تردید کی۔
"لیکن میجورٹی ایسے ہی لوگوں کی ہے۔" وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔
"ارصم میری بات سنو تم۔" اوریدا نے ارسلہ کو نظر انداز کر کے ارصم کو مخاطب کیا۔
"ہاں بولو۔" ارصم کو اس کی شکل پر پھیلی بے زاری دیکھ کر ہنسی تو آئی لیکن وہ ضبط کر گیا۔
"ڈنر کے بعد ہماری طرف آنا' ایک ٹاپک سمجھنا ہے تم سے۔" اوریدا کی بے نیازی' ارسلہ کو خاصی بری لگی' تب ہی اس نے غصے سے تیز تیز چیونگم چبانی شروع کر دی۔
"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" ارصم نے فوراً" ہی سر ہلایا تو اوریدا اندر کی جانب بڑھ گئی۔

"لگتا ہے تمہاری کزن کو میری پاکستانیوں والی بات اچھی نہیں لگی، کہیں یہ بھی باہر جانے کی کوششوں میں تو نہیں ہے؟" ارسلہ کا طنزیہ انداز اوریدا کی سماعتوں تک پہنچا تو اس کے قدم خود بخود ست ہو گئے، وہ ارصم کا جواب سننا چاہتی تھی۔

"ارے نہیں یار! اسے کوئی ایسا کمپلیکس نہیں، وہ خود برٹش نیشنلٹی ہولڈر ہے، انگلینڈ میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہے۔" ارصم کی بات پر ارسلہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور کچھ لمحوں تک تو اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل سکی۔ اوریدا مسکراتی ہوئی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

"اللہ جانے کہاں سے اٹھ کر آ گئے ہیں یہ نمونے، بینش کی سسرال بھی اسی پر گئی ہے۔" وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی، بڑی اماں، بوا رحمت کے ساتھ یقیناً آنٹی بینش کے مہمانوں پر تبصرہ کر رہی تھیں، لگتا تھا کہ انہیں بھی یہ امریکی عوام کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔

"اس کی نند کا حال دیکھیں ذرا۔ بڈھی کھوسٹ ہو کر پینٹ پہنے گھومتی پھر رہی ہے۔ بندہ اپنی عمر کا ہی لحاظ کرتا ہے۔" بوا رحمت کی بات سن کر اوریدا کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"السلام علیکم بڑی اماں! بوا کیسی ہیں آپ؟" اوریدا نے اندر داخل ہوتے ہوئے بلند آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! شکر ہے تمہاری شکل دیکھنے کو ملی، ترس کر رہ گئی تھی میں۔" بڑی اماں نے بڑی محبت سے اس کا ماتھا چوما۔

"معصوم سی بچی کو اٹھا کر غیروں کے در پر پھینک دیا، اچھا خاصا گھر تھا اپنا۔" بوا رحمت کو بھی اس کا ہوسٹل جانا پسند نہیں آیا تھا اور اس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتی تھیں۔

"اچھا ہے بوا، کم از کم وہاں اسٹڈیز تو آرام سے ہو جاتی ہیں، یہاں تو دھیان ادھر ادھر لگا رہتا تھا۔" اوریدا نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"اچھا بھئی، مرضی ہے تمہاری، اب آ گئی ہو تو اپنی دادی کے ساتھ پیکنگ کروا دو ان کی۔ پرسوں کی فلائٹ ہے، تمہارے باوا کو ملنے جا رہی ہیں یہ۔" بوا رحمت نے لگے ہاتھوں اسے کاموں کی لسٹ بتائی۔

"بڑی اماں! آخر کیوں جا رہی ہیں آپ انگلینڈ..." اوریدا نے بے تابانہ پوچھا۔

"لو میرا بیٹا رہتا ہے وہاں، میرے جانے پر کوئی پابندی ہے کیا۔" انہوں نے ناک چڑھا کر اوریدا کی طرف دیکھا۔ جس کا سوال انہیں بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"پاپا تو ٹھیک ہیں نا۔" اس نے بے دھیانی میں اپنا سیل فون نکالتے ہوئے پوچھا۔ بڑی اماں نے بوکھلا کر بوا رحمت کی شکل دیکھی۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہیں، تم ہاتھ منہ دھو لو، میں کھانا لگوا رہی ہوں۔" بڑی اماں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

موسم سرما کا ایک سرد دن، صبح سے بارش تسلسل کے ساتھ ہو رہی تھی۔ شانزے نے آج آفس سے چھٹی کر لی تھی ویسے بھی اس کا زیادہ کام ماہیر کے ساتھ ہوتا تھا اور اس کے ملک سے باہر جانے پر کافی کام رک گیا تھا۔ اس وقت وہ شال اوڑھے کافی کا مگ ہاتھ میں پکڑے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی بارش کی بوندوں کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور رباب پُرجوش انداز میں داخل ہوئی۔

"سنا ہے بڑا معرکہ مارا ہے تم نے۔" رباب کے لہجے میں خوشی کا تاثر نمایاں تھا۔

"کیسا معرکہ...؟" وہ حیران ہوئی۔

"ابھی ٹی وی لاؤنج میں تمہارا ایڈ دیکھ کر آ رہی ہوں، پورے ہوسٹل میں تو شور مچا ہوا ہے۔" رباب کی بات پر شانزے کا دل بے ربط انداز میں دھڑکا۔

"ریئلی..." شانزے کو یقین نہیں آیا۔

"کیوں... تمہیں نہیں پتا تھا کیا؟" رباب کو اس کی لاعلمی پر حیرت ہوئی۔

"پتا تو تھا یار... لیکن وہ تو پیر سے چلنا تھا، لگتا ہے

سرمد بھائی نے پروگرام میں کچھ چینج کروادیا ہوگا۔" وہ جلدی سے کھڑی ہوئی۔ "آؤ نا ایک دفعہ مل کر دیکھتے ہیں۔" وہ رباب کے ساتھ اپنے کمرے سے نکل آئی۔

"شانزے... تم نے تو کمال کردیا' قسم سے آفت لگ رہی ہو اس کمرشل میں۔" ایم بی اے کی ماہین نے اس کی طرف دیکھتے ہی مبارک باد دی۔

"تھینکس..." شانزے کا دل تفاخر کے احساس سے بھر گیا۔

"ہمیں تو پہلی دفعہ پتا چلا کہ اسکرین بیوٹی تو بہت زیادہ ہے تم میں۔" ماہین بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑی۔ "اب کسی اچھے اور زبردست پروجیکٹ میں آنا اور میری مانو تو ماڈلنگ بھی ساتھ شروع کردو' بہت پیسہ ہے اس فیلڈ میں۔" ماہین نے اسے مفت مشورہ دیا۔

"ہاں دیکھوں گی..." ماہین کے مشورے پر اس کے قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ ماہیر سے کیا ہوا وعدہ اس کے دماغ کی اسکرین پر روشن ہوا اور اسے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ ٹی وی لاؤنج میں اس کی واقف کافی لڑکیاں موجود تھیں' جنہوں نے اسے دیکھتے ہی پُرجوش انداز میں سراہنا شروع کردیا تھا۔ شانزے کو پہلی دفعہ اپنی اہمیت کا کھل کا احساس ہوا تھا۔ اس کا دماغ شہرت اور پہچان کے ایک نئے سرور سے آشنا ہوا۔

"میں بہت بے وقوف اور جذباتی لڑکی ہوں۔" رات کو فراغت ملتے ہی اس نے رباب سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"آج کیوں اس بات کا اتنی شدت سے احساس ہورہا ہے تمہیں۔" رباب نے ہیٹر جلاتے ہوئے تعجب انگیز سے پوچھا۔

"مجھے ماہیر سے ایسا کوئی وعدہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ تکیہ گود میں رکھتے ہوئے افسردہ انداز میں بولی۔

"شوبز میں کام نہ کرنے کا..." رباب نے اندازہ لگایا۔

"ہاں نا... دیکھو تو مجھے ابھی تک کتنے مبارک باد کے فون آچکے ہیں اور مجھے یقین ہے اب بہت اچھی آفرز ملیں گی مجھے۔" شانزے کی بات پر رباب کا دل تاسف سے بھر گیا' اس نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا' جس کا دھیان کہیں اور تھا۔

"بہت بری بات ہے شانزے' وعدہ کرکے ایسے افسوس کا اظہار نہیں کرتے۔" وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"ہر انسان کو اپنا مستقبل بنانے کا حق حاصل ہے۔" شانزے کی ٹون بدلی ہوئی تھی۔

"لیکن تمہارا فیوچر ماہیر کے ساتھ بہت برائٹ ہوگا۔" رباب نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اس کا کیا پتا' اب بھی انگلینڈ میں جاکر بیٹھ گیا ہے اور صرف دو منٹ کی کال کی ہے مجھے۔" وہ ماہیر سے اچھی خاصی خفا تھی۔

"یار اس کے والد کی بائی پاس سرجری ہے اور وہ ان کے پاس اکیلا ہے' تم اس کی سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" رباب کو اس پر غصہ آیا۔

"رہنے دو' سرمد بھائی کو تو صبح و شام کالز کی جارہی ہیں۔" اس نے بدگمان لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے وہ اس کا سارا بزنس اور کام دیکھ رہے ہیں' بجائے اس کے کہ تم اس مشکل وقت میں اس کا ساتھ دو' الٹا منہ پھلا کر بیٹھ گئی ہو۔" رباب نے اس کی کلاس لی۔

"میرا بھی تو پہلا کمرشل تھا یہ' پہلی کامیابی' جو میں اس کے ساتھ سیلبریٹ کرنا چاہتی تھی۔" اس نے بچکانہ انداز میں یاد دلایا۔

"تو کرلینا سلیبریشن' تمہاری کامیابی کون سا بھاگی جارہی ہے۔" رباب کو ایک دم ہی غصہ آیا۔

"لیکن رباب' میں مزید کام کرنا چاہتی ہوں اس فیلڈ میں۔" شانزے کی بات پر رباب کو دھچکا لگا۔ اس نے تاسف سے اپنے پاس بیٹھی بے وقوف سی لڑکی کو دیکھا جو چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

"دیکھو شانزے' اگر تم نے اس کے ساتھ وعدہ کیا ہے تو ایسا مت کرو' کیونکہ وہ تم سے بہت محبت کرتا

ہے۔" رباب نے دانستہ اپنا لہجہ کچھ نرم کیا۔

"جن سے محبت ہو انہیں اس طرح شرطوں اور وعدوں کے پنجرے میں بند تھوڑا کیا جاتا ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"محبت کی خاطر تو انسان کسی ملک کی حکمرانی تک چھوڑ دیتا ہے اور تمہاری تو یہ صرف چھوٹی سی خواہش ہے جو تم اسے منا کر زندگی میں کبھی بھی پوری کر سکتی ہو۔" رباب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلایا۔

"لیکن کیا فائدہ۔ ساری اچھی اچھی آفرز کو تو میں ٹھکرا چکی ہوں گی۔" شانزے کوئی بھی بات سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟" رباب کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

"کچھ نہیں، ابھی تو میں خود کنفیوز ہوں، کچھ وقت گزر جائے تو پھر دیکھوں گی۔" شانزے نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھنے لگی، ماہیر کا کوئی بھی ٹیکسٹ نہیں آیا تھا۔ اس نے مایوس ہو کر سیل فون دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر کسی گہری سوچ کا تاثر تھا جو رباب کو پریشان کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہاشم اور بختاور دونوں اپنے فلیٹ میں شفٹ ہو چکے تھے۔ ہاشم نے کچھ پرانا اچھی حالت کا فرنیچر خرید لیا تھا اور ایک چھوٹا سا فریج اور ضروری چیزیں خریدنے کے بعد اس کا اکاؤنٹ بالکل خالی ہو گیا تھا اور اب انہیں دکان کے کرایے پر گزارا کرنا تھا لیکن دونوں بے تحاشا خوش تھے۔ ہاشم باقاعدگی سے اخبارات میں نوکریوں کے اشتہارات دیکھ رہا تھا اور اسی دوران بختاور کو جڑواں بچوں کی ماں بننے کی خوش خبری نے بوکھلا کر رکھ دیا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا ہاشم۔" وہ بہت خوش تھی۔

"اب اتنی بھی ناقابل یقین بات نہیں ہے یہ۔" ہاشم نے اسے چھیڑا۔

"میں حیران ہوں کہ اللہ اتنی جلدی مجھ پر مہربان ہو جائے گا اور ایک کی جگہ دو دو خوشی کی خبریں دے دے گا۔" بختاور کے لہجے میں خوشی چھلک رہی تھی۔

وہ دونوں آج ڈاکٹر کے پاس سے ہو کر آئے تھے اور آنے کے بعد ہاشم کے چہرے پر ہلکی سی فکرمندی کی جھلک تھی۔

"آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" بختاور نے بہت جلد بھانپ لیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" وہ زبردستی مسکرایا۔

"اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ بچوں کی پیدائش سے پہلے کسی اچھی جگہ پر نوکری ہو جائے میری۔" اس نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

"ٹینشن مت لیں، اللہ بہتر کرے گا۔" بختاور نے اپنی زندگی کے ساتھی کو دلاسا دیا۔

"ویسے تو ایک بچے کی ذمے داری ہی بہت ہوتی ہے، یہاں تو ایک ساتھ دو دو آرہے ہیں، اب پتا چلے گا تمہیں۔" ہاشم نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑا۔

"اچھا... اچھا... ایسے نہیں کہتے، یہ تو اللہ کی ناشکری ہے۔" بختاور کو اس کی بات اچھی نہیں لگی۔

"ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا، تم لوگ اپنے اللہ کو اتنا نازک مزاج کیوں سمجھتے ہو، جو ذرا ذرا سی بات پر اپنے بندوں سے خفا ہو جاتا ہو۔" ہاشم کا لہجہ، بختاور کو کچھ عجیب محسوس ہوا۔ وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ "اپنے" "اللہ" سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا آپ کا اللہ کوئی اور ہے؟" بختاور نے ناراض نگاہوں سے اپنے میاں کو دیکھا جو کیلکولیٹر پر کسی حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی بات کا جواب دیتا، دروازے پر دستک ہوئی۔

"اس وقت کون آگیا؟" بختاور پریشان ہوئی۔

"میں دیکھ کر آتا ہوں۔" ہاشم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈائری ایک طرف رکھی اور دروازہ کھولنے چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے پیچھے ہی لپکی اور پھر کچھ سوچ کر لاؤنج میں کھڑی ہو گئی۔ یہ چھوٹا سا فلیٹ دو بیڈ روم، ایک لاؤنج اور چھوٹے سے کچن پر مشتمل تھا۔ لاؤنج میں چھوٹا سا کوریڈور تھا جس کے اختتام پر فلیٹ کا داخلی

دروازہ تھا۔

"سہیل صاحب اتنی بھی جلدی کیا تھی، صبح دے دیتے۔" ہاشم کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ دو منٹ کے بعد اس کی واپسی ایک خاکی رنگ کے لفافے کے ساتھ ہوئی۔

"ہاشم۔۔۔ یہ کیا ہے؟" بختاور تجسس کے عالم میں اس کے پاس چلی آئی۔

"بڑے اسٹور کا کرایہ ہے، شکر ہے، سہیل صاحب دے گئے، ورنہ مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔" ہاشم کی بات پر وہ مسکرائی۔ "دیکھا نا' اللہ نے سبب پیدا کردیا' آپ خوامخواہ پریشان ہوتے ہیں، دیکھ لیجئے گا' اللہ دونوں بچوں کے ساتھ آپ کے رزق میں بھی اضافہ کردے گا۔" وہ اس کے ساتھ چلتی بیڈ روم میں آئی۔

"رزق میں اضافہ کام کرنے سے ہوتا ہے' گھر میں بیٹھنے سے نہیں۔" ہاشم نے دوبارہ اپنی ڈائری کھول لی۔

"لیکن اس میں اضافہ تو اللہ ہی کرتا ہے نا۔" بختاور کا عقیدہ بہت مضبوط ہے۔

"ہو سکتا ہے لیکن انسان کو ملتا وہی ہے' جتنی وہ کوشش کرتا ہے۔" وہ دوبارہ اپنے حساب کتاب میں مگن ہو گیا۔ بختاور کو اس بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا' اس لیے وہ مسکرا کر چپ کر گئی۔

"تمہیں نیلم کو ایک آدھ کال کرکے اپنی خیریت بتا دینی چاہیے تھی۔" ہاشم نے ڈائری سے سر اٹھا کر اچانک کہا تو وہ اس کی بات پر حیران رہ گئی۔

"نیلم کو۔۔" اس نے تصدیق کے لیے دوبارہ پوچھا۔

"ہاں نا' وہ تمہاری اتنی اچھی دوست تھی۔" ہاشم کی بات پر اس کا دل طمانیت کے احساس سے بھر گیا' وہ اس کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھتا تھا' حتیٰ کہ کھانے پینے کے معاملات پر بھی نظر رکھتا تھا اور کسی بھی معاملے میں اسے کوتاہی کرنے نہیں دیتا تھا۔

"لیکن فون کہاں سے کروں؟" اس نے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

"کل میرے ساتھ مارکیٹ چلنا' کسی پی سی او سے کرلیں گے۔" ہاشم نے اس کی مشکل آسان کی بختاور کو لگا تھا کہ وہ یہ بات بھول جائے گا لیکن اگلے دن شام کو وہ گھر واپس آیا تو اسے اپنے ساتھ لے کر قریبی پی سی او آ گیا۔ ملتان کے لیے ٹرنک کال کی بکنگ کروا کر وہ باہر بیٹھ گیا۔ بختاور دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور پکڑے بیٹھی تھی اور دوسری طرف نیلم کی بے تاب آواز سن کر وہ بھی جذباتی ہو گئی۔

"تم ٹھیک ہو نا' ہاشم بھائی تمہارا خیال تو رکھتے ہیں نا؟" وہ گلے شکوے بھلائے بے چینی سے اس کی خیریت پوچھ رہی تھی۔

"میں بہت خوش ہوں نیلم۔۔" بختاور نے بھیگے لہجے میں بالکل سچ بولا۔ "مجھے لگتا ہے میں نے زندگی میں کوئی بڑی نیکی کی تھی جس کے نتیجے میں اللہ نے مجھے ہاشم جیسے شخص سے نوازا ہے۔" بختاور کے ہر انداز سے خوشی چھلک رہی تھی۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" نیلم کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

"نیلم۔۔ میرے گھر والوں نے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا؟" بختاور نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"ارے نہیں یار۔۔ ان لوگوں کو تو لگتا ہے سانپ سونگھ گیا ہے۔ دوبارہ کسی نے مڑ کر پوچھا ہی نہیں۔" نیلم کی صاف گوئی اس کا دل دکھا گئی' اسے بابا سے اسی چیز کی توقع تھی۔

"بختاور۔۔ تم کس شہر سے بات کر رہی ہو۔" نیلم نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔ اس سے پہلے کہ بختاور اس کی بات کا جواب دیتی' کال کٹ گئی۔ تین منٹ کی کال تین سیکنڈ میں گزر گئی۔ نیلم کی اتنے عرصے کے بعد آواز سن کر وہ کچھ جذباتی ہو گئی۔ ہاشم کو افسوس ہوا کہ اس نے خوامخواہ بختاور کو ڈسٹرب کردیا۔

"پریشان مت ہو' میں اگلی دفعہ پورے پانچ منٹ کی بکنگ کرواؤں گا۔" ہاشم نے اسے خوش کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

"آپ کیوں ٹینس ہو رہے ہیں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بختاور چلتے چلتے رکی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر فٹ

پاتھ پر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں ہاشم کے لیے محبت بھری نرمی تھی' وہ جانتی تھی کہ سامنے کھڑا شخص اسے بے تحاشا چاہتا ہے۔

"تم کسی بات پر افسردہ ہوتی ہو تو مجھے زندگی اچھی نہیں لگتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں دنیا بھر کی آسائشیں تمہارے قدموں میں ڈھیر کردوں لیکن میں کیا کروں' میرے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔" ہاشم نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

"پلیز ہاشم! ایسی باتیں مت کیا کریں' میں نے دنیا کی تمام آسائشوں کا مزہ چکھا ہوا ہے۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"اسی بات کی تو پریشانی ہے۔" وہ افسردگی سے مسکرایا۔ "انسان نے جس چیز کا مزہ نہ چکھا ہو اس کے لیے اس کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور جو چیز آپ کی دسترس میں ہو اور پھر چھن جائے' اس کا افسوس ساری زندگی رہتا ہے۔"

"میں ایسی نہیں ہوں ہاشم..." اس نے جھٹ سے اس کا بازو پکڑا۔

"میں جانتا ہوں مائی ڈیئر..." وہ اس کی پریشانی محسوس کرکے مسکرایا' وہ ایسی ہی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھنٹوں کڑھنے والی وہ پوری کوشش کرتی تھی کہ ہاشم کو اس کی وجہ سے کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

"تم میرے ساتھ خوش ہونا..." ہاشم رات کے اندھیرے میں اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا رکا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے لگتا ہے اللہ نے مجھے دنیا میں ایک چھوٹی سی جنت سے نواز دیا ہے۔ میں اس کے لیے اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔" بختاور نے تشکر آمیز لہجے میں کہا تو ہاشم چلتے چلتے رکا۔

"تو تم میرے کیے اچھے کاموں کا کریڈٹ بھی اپنے اللہ کی جھولی میں ڈال دیتی ہو۔" وہ ہنسا۔

"تو اللہ ہی تو آپ کو نیک کام کرنے کی توفیق دیتا ہے' اس لیے اس کا شکر ادا کرتی ہوں۔" بختاور چلتے چلتے تھک کر فٹ پاتھ پر رکھی ایک بینچ پر بیٹھ گئی' لاہور کی سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک اسے اچھی لگ رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے اگر میں تمہارے ساتھ کچھ برا کروں گا تو تم اس کا ذمے دار بھی اپنے خدا کو ٹھہراؤ گی۔" وہ عجیب انداز میں گویا ہوا۔

"اللہ نہ کرے..." اسے دھچکا سا لگا۔ "میں آپ کے کیے گئے غلط کام کے لیے اللہ کو کیوں ذمے دار ٹھہراؤں گی؟"

"جس طرح تم میرے اچھے کاموں کا کریڈٹ دیتی ہو۔" وہ بینچ کے ساتھ ٹیک لگائے کسی اور دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔

"بعض دفعہ آپ بہت عجیب باتیں کرنے لگتے ہیں۔" بختاور الجھ سی گئی۔

"اس لیے تو کہتا ہوں کہ میرے ساتھ صرف اپنی بات کیا کرو اور درمیان میں کسی کو بھی نہ لایا کرو۔" ہاشم نے ایک دفعہ پھر اسے نصیحت کی۔

"اللہ کو بھی نہیں۔" بختاور کا پریشانی سے لہجہ بے ربط ہوا۔

"میں لاتا ہوں کبھی؟" ہاشم نے الٹا اس سے سوال کیا تو وہ الجھ گئی کہ وہ ہمیشہ انسانیت کا پرچار کرتا تھا اور مذہب کو اپنے معاملات میں نہیں لاتا تھا۔

"نہیں۔" بختاور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تم بھی نہ لایا کرو۔" اس نے مفت مشورہ دیا۔

"وہ کیوں؟"

"بس میرا دماغ الجھ سا جاتا ہے۔ میں اپنے اور تمہارے درمیان کسی کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔" ہاشم نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ دبایا تو اس کی محبت کی حدت نے اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سارے اندیشوں اور واہموں کو بھاپ بنا کر فضا میں تحلیل کردیا۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر سامنے سڑک پر موجود بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھنے لگی' لیکن اسی رات جب وہ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو وہ کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔

"ہاشم' آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟" بختاور کی

بات پر اس کا چہرہ متغیر ہوا۔

"ایسے ہی۔" اس نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"دیکھیں! نماز تو پڑھا کریں نا' ہر مسلمان کو اس کی عادت ڈالنی چاہیے۔" وہ جاء نماز کو تہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"اس سے کیا ہوگا؟" ہاشم نے کتاب بند کر کے سادہ سے انداز میں اپنی بیوی کا چہرہ دیکھا جو دوپٹا اچھی طرح اوڑھے اس کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی جیسے اس سے اس سوال کی توقع نہ ہو۔

"اللہ خوش ہوگا۔" وہ بولتی ہوئی اس کے پاس آن بیٹھی۔

"اللہ خوش ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟" اس کا اگلا سوال اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔

"اللہ خوش ہوگا تو وہ ہمیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نواز دے گا۔" بختاور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو وہ ان لوگوں کو اپنی نعمتیں کیوں دیتا ہے جو مسلمان نہیں ہیں۔" وہ اسے پریشان کر رہا تھا۔

"اس لیے کہ وہ سب کا رب ہے۔" وہ بوکھلا سی گئی۔

"تو ٹھیک ہے۔ وہ سب کو دے رہا ہے' جو اسے خوش کر رہے ہیں اور جو نہیں کر رہے تو پریشانی کی کیا بات ہے۔" اس نے سنجیدگی سے دوبارہ اپنی کتاب کھول لی۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے ہاشم۔" اس کی باتیں بختاور کا ذہن الجھا رہی تھیں۔

"دیکھو بختاور' میں کسی کو دھوکا نہیں دیتا' کسی کا دل دکھانے کی دانستہ کوشش نہیں کرتا' چوری' بددیانتی' ایسا کچھ نہیں کرتا تو جواباً" لوگ بھی میرے ساتھ ایسا نہیں کرتے' یہ زندگی کچھ دو اور کچھ لو کے اصولوں پر چل رہی ہے' میں بس اتنا جانتا ہوں۔" اس نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ سب تو آپ اللہ کے بندوں کے ساتھ کرتے ہیں' اگر بندوں کے ساتھ ساتھ اللہ کو بھی خوش رکھیں تو اچھی بات نہیں ہے۔" وہ محبت بھرے لہجے میں اس کے عقائد درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"فی الحال تو میں اپنی پیاری سی معصوم سی بیوی کو خوش رکھنا چاہتا ہوں' جس کے دم سے میری دنیا حسین ہوگئی ہے۔" ہاشم نے ہنستے ہوئے صاف اسے ٹالا تھا اور بختاور کی یہی خوبی تو ہاشم کو اچھی لگتی تھی کہ وہ کسی بات پر زیادہ دیر تک اصرار نہیں کرتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اوریدا بڑی اماں کے کمرے میں موجود تھی اور انہیں افسردگی کے ساتھ پیکنگ کرتی ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھی اپنا سامان پیک کرتی اور ان کے ساتھ چل پڑتی۔ بڑی اماں کے سارے کپڑے بیڈ پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ اسے سمیٹنے کے چکر میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

"ادھر دیں' آپ سے تو ساری رات لگا کر بھی پیکنگ نہیں ہوگی۔" اس نے برا سا منہ بنا کر ان کا اٹیچی کیس اپنی طرف کیا۔

"تو کردو ناں' تم بھی تو منہ اٹھا کر بڑھیا کو پریشان ہوتا دیکھ رہی ہو۔" انہوں نے بھی اس کی طبیعت صاف کی۔

"بڑی اماں پلیز' جلدی واپس آجایئے گا۔" اوریدا نے ان کی شال کو تہ کرتے ہوئے فرمائش کی۔

"ابھی جانے تو دو پھر آ بھی جاؤں گی۔" انہوں نے شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کو نہیں پتا' میں کتنی اداس ہو رہی ہوں۔" اوریدا نے جلدی جلدی ساری چیزیں ٹھکانے پر رکھیں۔

"تم تو خیر سے بڑی سگھڑ ہوگئی ہو ہاسٹل جاکر۔" بڑی اماں کو اس کے سلیقے پر حیرت ہوئی۔

"میری روم میٹ کو دیکھیں تو فدا ہو جائیں آپ' ہر چیز میں ایکسپرٹ ہے وہ' سارا دن میری بھی شامت آئی رہتی ہے۔" اوریدا کا دھیان دوسری طرف ہوا تو بڑی

اماں نے بھی سکون کا سانس لیا۔
"میری طرف سے شکریہ ادا کرنا اس بچی کا، جس نے تمہاری اندر انسانوں والی خوبیاں پیدا کرنا شروع کردی ہیں۔" بڑی اماں نے ہنس کر تکیے سے ٹیک لگائی۔ ان کی صبح سات بجے فلائٹ تھی۔
"اس کی والدہ تو پوری جلاد لگتی ہیں مجھے۔" اوریدا کا بے لاگ تبصرہ بڑی اماں کو ناگوار گزرا۔
"بری بات ہے اوریدا! اپنی دوست کی ماں کے لیے تم کیسا لفظ استعمال کررہی ہو۔" انہوں نے فوراً ٹوکا۔
"مذاق میں کہہ رہی ہوں بڑی اماں۔" اس نے گھبرا کر وضاحت کی۔
"مذاق میں بھی ایسی بات کرنا زیب نہیں دیتا۔" ان کو مطمئن کرنا کون سا آسان کام تھا۔
"آپ کی پیکنگ تو ہوگئی۔" اوریدا نے جلدی سے سوٹ کیس بند کیا۔
"چلو اب جاؤ یہاں سے مجھے سونا ہے اور بوا رحمت کو کہنا کہ صبح الارم لگا کر سوئیں، کہیں میرا جہاز ہی نہ نکل جائے۔" بڑی اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی سے جاکر ایئر پورٹ پر بیٹھ جائیں۔ اوریدا کو ان کی بات پر ہنسی آگئی۔
"اور تم کیوں ہنس رہی ہو بھلا؟" وہ برا مان گئیں۔
"کچھ نہیں بڑی اماں، کالج کی ایک بات یاد آگئی تھی، چلیں آپ سو جائیں پھر انشاء اللہ صبح آپ سے ملاقات ہوگی۔" اوریدا نے جھٹ سے انہیں آگے بڑھ کر پیار کیا تو وہ فوراً بولیں۔
"کوئی ضرورت نہیں صبح جلدی اٹھنے کی، مل تو لی ہو مجھ سے، آرام سے اپنی نیند پوری کرنا۔" انہوں نے لاپروائی سے اسے منع کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ صبح ان کو جاتا دیکھ کر ضرور رونا دھونا ڈالے گی۔
"تو کیا آپ مجھ سے ملے بغیر چلی جائیں گی؟" اوریدا کو صدمہ ہوا۔
"نہیں تو تمہارے آرام کے خیال سے کہہ رہی تھی۔" انہوں نے فوراً صفائی دی، ورنہ ایک اچھا خاصا جذباتی سین یہیں کری ایٹ ہوجاتا۔
"آپ سے زیادہ پیاری تو نہیں ہے مجھے اپنی نیند۔" اس نے آگے بڑھ کر بڑی اماں کے ماتھے کا بوسہ لیا تو وہ مسکرادیں۔
اوریدا اپنی شال اوڑھ کر لاؤنج کی طرف نکل آئی، دل میں عجیب سی پریشانی کا احساس پیدا ہوگیا تھا جو بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ وہ کچھ دیر تو لاؤنج میں ٹہلتی رہی اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ سرد رات کے اس پہر آسمان پر موجود چاند بھی اوریدا کو اپنی طرح تنہا محسوس ہوا۔ وہ لان میں چلی آئی اور سر اٹھا کر ارصم کے پورشن کی طرف دیکھا، وہ اپنے کمرے کے لان کی سائیڈ والے ٹیرس میں ارسلہ کے ساتھ کھڑا تھا، اوریدا کو عجیب سا احساس ہوا۔
پتا نہیں ساری محبتوں کا ظرف اتنا چھوٹا ہوتا ہے یا پھر میں ارصم کے معاملے میں بے بس ہوں کہ اس کی کہیں اور ذرا سی بھی توجہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم داخلی دروازے کی سیڑھیوں پر آن بیٹھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ارصم کب اس کے پاس پہنچا اور بیٹھ گیا۔
"کیا ہوا نیند نہیں آرہی کیا؟" اس کی نرم آواز پر وہ تھوڑا سا گڑبڑائی اور پھر سنبھل گئی۔
"ہوں۔" اس نے ہلکا سا ہنکارا بھرا۔
"اوریدا! اپ سیٹ کیوں ہو؟" وہ اس کے مزاج کے سب ہی موسموں کا ساتھی تھا بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کی پریشانی کو محسوس نہ کرپاتا۔
"ارسلہ کیا، کہہ رہی تھی تم سے؟" اوریدا نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔
"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے خفگی سے منہ بنایا۔
"کیا مطلب، تم اس کے پاس ہی تو کھڑے تھے۔" اوریدا چڑ کر بولی۔ اسے لگا جیسے وہ ارسلہ کے متعلق بات کرنا نہ چاہ رہا ہو۔
"تمہارے آنے سے پہلے وہ اپنے یو ایس اے کے قصے سنا رہی تھی اور جب میں نے تمہیں لان میں دیکھا تو اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں، اس نے مجھ سے کیا کہا۔" ارصم کی صاف گوئی اوریدا کو تعجب میں مبتلا

کر گئی۔ "کیا مطلب۔؟"

"جب تم میرے سامنے آتی ہو تو میں اپنے اردگرد کے ماحول سے کٹ جاتا ہوں۔" بے بس انداز میں کیا جانے والا یہ اعتراف اوریدا کو اگلے کئی دنوں تک خوش کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کی شوخ نظروں سے گھبرا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"ٹھنڈ بہت ہے ناں۔" اوریدا نے جان بوجھ کر اس کی بات پر تبصرہ نہیں کیا۔ ارصم نے کچھ لمحے اسے غور سے دیکھا اور اپنی لیدر کی جیکٹ اتار کر اس کی طرف بڑھادی۔

"اسے پہن لو۔" وہ چاند کی روشنی میں اس کا سادہ اور بے ریا سا چہرہ دیکھ کر مسکرایا۔

"نہیں، میں شال میں ٹھیک ہوں، تم پہن لو، سردی بہت ہے۔" وہ ہلکا سا رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے گال دہک رہے تھے، ارصم نے خوشگوار حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اوریدا اس سے شرما بھی سکتی ہے۔

"تم پہن لو، میں کل واپس لے لوں گا، کیونکہ پھر اس میں سے تمہارے فیورٹ پرفیوم کی خوشبو کئی دن تک آتی رہے گی۔" ارصم نے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو اوریدا نے اس کی جیکٹ پکڑ کر اپنے کندھوں پر ڈال لی۔

"ہاں، یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔" وہ اپنے پینٹ کی جیب سے اس کے پسندیدہ چاکلیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"تم تو مجھے ایسے ٹریٹ کرتے ہو جیسے میں بچی ہوں۔" وہ برا منا گئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں محبتوں میں کی جانے والی یہ بچکانہ حرکتیں ہی تو زندگی کو خوب صورت بناتی ہیں۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر ایک دفعہ پھر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور اپنے پینٹ کی جیب سے بال پوائنٹ نکال کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اوریدا نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھادیا، وہ بال پوائنٹ سے اس کے ہاتھ پر اپنا اور اس کا نام لکھنے لگا۔ اچانک گھر کا داخلی دروازہ کھلا اور بڑے ابا اپنا سگار لیے ایک دم ہی سامنے آئے، وہ دونوں بوکھلا کر اس طرح کھڑے ہوئے کہ جلال صاحب کو یہ منظر خاصا ناگوار گزرا۔ اوریدا نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ پیچھے چھپالیا۔

"بڑے ابا، کیسے ہیں آپ؟" ارصم خود کو سنبھال چکا تھا۔

"ٹھیک ہوں، تم اپنے پورشن میں جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور لان کی طرف نکل گئے۔ اوریدا اور ارصم، دونوں ہی بے حد خفت کا شکار ہوئے۔ ارصم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خاموش دلاسا دیا۔

☼ ☼ ☼

بندیا، چائے کا کپ اٹھائے بینش کے کمرے میں داخل ہوئی، جو آتش دان کے قریب کرسی رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھی، اس کے چہرے پر کسی خاص سوچ کا تاثر نمایاں تھا۔ آج صبح سے اس کا موڈ خراب تھا، اس لیے بندیا نے بھی اسے زیادہ مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"تمہیں پتا ہے بندیا، آج تائی اماں اتنی پریشان کیوں تھیں۔" وہ عجیب اسٹائل میں مسکراتے ہوئے بندیا سے مخاطب ہوئی۔

"پریشان؟" وہ حیران ہو کر مزید بولی۔ "وہ تو بیمار تھیں، کو ریدا بخار تھا انہیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے مائی ڈیئر۔" بینش کی بات پر وہ فکرمند انداز سے اس کے بالکل پاس مخملور کشن رکھ کر بیٹھ گئی۔

"پھر کیا بات ہے؟" اسے تجسس ہوا۔

"ان کی بڑی صاحبزادی نے یونیورسٹی میں کسی لڑکے کو پسند کرلیا ہے اور تایا ابا اس کی شادی اپنے کسی فرینڈ کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔" وہ بہت مزے سے بولی۔

"آپ کو کس نے بتایا۔؟" وہ حیران ہوئی۔

"ظاہر ہے تیمور نے۔ اور بھلا کون اس گھر میں مجھ

سے ڈھنگ سے بات کرتا ہے۔" بینش کے اپنی خود ساختہ دکھ تھے۔

"پھر اب کیا ہوگا۔" بندیا پریشانی کے عالم میں بینش کا چہرہ دیکھنے لگی' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بات پر اتنا خوش کیوں ہو رہی ہے۔

"تایا ابا تو سخت غصے میں ہیں' سنا ہے اس دفعہ ڈیزی نے بھی صاف صاف ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ شادی کرے گی تو اپنے اسی یونیورسٹی فیلو سے۔ اب مزا آئے گا جب گھر میں ایک برا دنگل لگے گا۔" وہ چٹخارہ لے کر بولی تو بندیا کو اس کی ذہنیت پر افسوس ہوا۔

"ڈیزی باجی کو اپنے والد صاحب کی بات ماننی چاہیے۔" بندیا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"وہ بالکل نہیں مانے گی۔" بینش مسکراتے ہوئے مزید بولی۔ "تائی اماں کو بھی اپنی بیٹیوں کے حسن پر بڑا ناز تھا' اب پتا چلے گا انہیں بھی۔" وہ منہ بناتے ہوئے کھل کر اپنی جلن نکال رہی تھی۔

"پھر کیا ہوگا؟" اسے آنے والے دنوں کا سوچ کر ابھی سے ٹینشن ہونا شروع ہوگئی تھی۔

"پتا نہیں۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور پھر خود ہی اپنی بات میں اضافہ کیا۔ "مجھے لگتا ہے بڑے ابا اسے جلد ہی ملتان سے واپس بلوالیں گے۔"

"بیا' ایک بات پوچھوں آپ سے؟" بندیا کے ذہن میں ابھی ابھی ایک سوال آیا۔

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں۔" وہ اس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں تھی۔

"یہ تائی اماں آپ سے اتنا چڑتی کیوں ہیں؟" اس نے بہت محتاط طریقے سے پوچھا' کیونکہ بینش کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا کہ کب کس بات پر اس کا مزاج برہم ہو جائے۔

"اس کے پیچھے ایک لمبی داستان ہے۔" وہ مسکرائی۔ "بات یہ ہے کہ آغاجی کی منگنی' ان کی چھوٹی بہن کے ساتھ طے تھی' لیکن آغاجی نے انہیں چھوڑ کر میری ماما' جو کہ ان کی کولیگ تھیں' ان سے شادی کرلی' اور پھر ماما اور تائی اماں کی ساری زندگی نہیں بنی'

اصل میں تائی اماں کو اپنے حسن پر مان تھا اور میری ماما کو اپنی تعلیم پر' اور اس طرح یہ ناپسندیدگی' ابھی تک چلی آرہی ہے۔"

"اوہ۔" بینش کی بات پر بندیا نے ایک لمبا سانس لیا' اب وہ ساری بات سمجھ گئی تھی۔

"اوپر سے میں بچپن میں تایا ابا کی لاڈلی تھی اور میری وجہ سے ان کے تینوں بچوں کو خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔" بینش نے مزید اضافہ کیا۔

"ویسے تایا ابا ہیں بہت غصے والے۔" اس نے لقمہ دیا۔

"اب پتا چلے گا ڈیزی کو اپنی من مانی کرنے کا خود کو پتا نہیں کیا سمجھتی تھی۔" بینش نے ایک دفعہ پھر چٹخارہ لیا۔

"آپ کے خیال میں کیسا ہوگا وہ لڑکا؟ ڈیزی باجی کی طرح خوب صورت اور لمبا؟" بندیا کے بے تاب انداز پر بینش نے اسے گھورا۔

"میں نے کون سا دیکھا ہے اسے۔" اس کا موڈ خراب ہو گیا۔

"ہینڈسم تو ہوگا۔" بندیا کو بھی بات کرتے ہوئے پتا نہیں چلتا تھا۔

"جیسا بھی ہو' ہمیں کیا' تم جا کر اپنی اسٹڈی کرو۔" بینش کے ضبط کا پیمانہ چھلکا تو وہ بھی جلدی سے اس کے کمرے سے باہر نکل کر لان کی طرف آگئی۔ سامنے لان چیئر پر تیمور پریشان انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ احساس ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس کے پاس آگئی۔

"کیسے ہیں آپ؟" بندیا نے پہلی دفعہ اسے مخاطب کیا تھا' اس لیے اس کی آنکھوں میں حیرانی چھلکی۔

"فائن' بیٹھو۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا کہ وہ آخر کس لیے اس کے پاس آبیٹھی ہے۔

"آپ کب جا رہے ہیں واپس انگلینڈ؟" بندیا نے خاصے بے تکے انداز میں پوچھا تب ہی تو وہ فوراً ہنس

پڑا۔ "یہ سوال پوچھنے آئی تھیں تم؟"
"نہیں تو۔" وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ "وہ تو میں یونہی پوچھ رہی تھی۔"
"ٹینشن مت لو' میں جلد ہی چلا جاؤں گا۔" تیمور کا دوستانہ انداز بندیا کو اچھا لگا۔
"تائی اماں کی طبیعت کیسی ہے۔؟" اس نے بھی بینش کی دیکھا دیکھی انہیں تائی اماں کہنا شروع کر دیا تھا۔
"بہترین۔" وہ مختصراً" بولا۔
"سنو' اگر اسٹڈیز میں کوئی ہیلپ چاہیے ہو تو میں کچھ دن ہوں یہاں' تم مجھ سے مدد لے سکتی ہو۔" اس نے کھلے دل سے پیشکش کی تو وہ اثبات میں سر ہلا کر واپس اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ تیمور کے گھر میں ڈیزی کی وجہ سے ٹینشن میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا' وہ لوگ کھل کر تو اس چیز کا اظہار نہیں کر رہے تھے' لیکن بندیا جب ان کے پورشن کی طرف جاتی تو تائی اماں' بوا رحمت سے اپنی پریشانی کا اظہار کرتی نظر آتیں۔

تیمور کے والد ڈاکٹر جلال کا پارہ بھی ان دنوں خاصا ہائی رہنے لگا تھا۔ تیمور اور طیبہ بھی الجھے الجھے دکھائی دیتے اور اب تو سب لوگ اس کے سامنے بھی اس مسئلے پر گفتگو کر لیتے تھے' کیونکہ انہیں اس کے مزاج کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا' وہ دوسروں کا خیال رکھنے والی ایک حساس لڑکی تھی اور اس نے کبھی بھی ان لوگوں کی باتوں کا تذکرہ بینش کے سامنے نہیں کیا تھا۔ ان ہی دنوں بندیا کے تھرڈ ایئر کے کالج کے ایگزام ہوئے اور وہ انگلش اور سائیکولوجی میں بری طرح فیل ہو گئی۔ بینش نے اس کا خاصا مذاق اڑایا تھا۔ وہ خود کئی دن تک منہ چھپائے اپنے کمرے میں بیٹھی رہی اس دن تیمور نے آکر۔ اس کی طبیعت صاف کی تھی تو وہ شرمندہ انداز میں ان کی طرف چلی آئی۔
"دو سبجیکٹ میں ہی فیل ہوئی ہو' کوئی پہاڑ تو نہیں ٹوٹ پڑا' جو تم نے اتنی سی شکل بنا رکھی ہے۔" تائی اماں نے اپنے مخصوص انداز میں اسے ڈانٹا' یہ اور بات کہ بندیا کو ان کی ڈانٹ میں چھپی محبت اور پریشانی صاف محسوس ہوئی تھی۔ وہ بندیا کو پسند کرنے لگی تھیں۔ اور اکثر کوئی خاص چیز بناتیں تو اسے بلوا لیتیں۔
"ہاں تو محنت کر کے دوبارا پیپر دے دیجیے گا۔" طیبہ نے بھی نرمی سے دلاسا دیا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں اپنی کتابیں بکھیرے بیٹھی تھی۔
"جب میں نے تم سے کہا تھا کہ جس سبجیکٹ میں مشکل ہو' میرے پاس آجانا تو تم آئیں کیوں نہیں۔" تیمور نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ بندیا نے خفت زدہ انداز میں سر جھکا لیا۔ تائی اماں کو ایک دم ہی اس کی شکل پر ترس آیا۔
"وہ افلاطون جو محلے دار بن کر گھر بیٹھی ہے' وہ اجازت دے گی تو بیچاری آئے گی۔" تائی اماں نے فوراً" اس کی طرف داری کی۔
"اماں! بیا تو سارا دن اپنے کالج میں ہوتی ہے اور گھر آکر بھی اسٹڈی سے نہیں نکلتی' آپ کیوں اس کو الزام دے رہی ہیں۔" تیمور نے جھٹ سے بینش کی صفائی پیش کی تو بندیا نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔
"تم تو چپ ہی رہا کرو' ایک تمہاری بہن نے تنگ کر رکھا ہے مجھے' اوپر سے تم بے وقت کی راگنی شروع کر دیتے ہو۔" انہوں نے تیمور کو جھاڑا تو وہ برا سامنہ بنا کر چپ کر گیا۔ اسی وقت بوا رحمت بوکھلائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔
"بیگم صاحبہ! وہ صاحب کے مہمان آرہے ہیں شام میں' ڈیزی بیٹا کے لیے۔"
"لو اور سنو' ایک تو جلال صاحب کو بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی عادت ہے۔" بڑی اماں جل کر بولیں۔
"بابا کیوں نہیں مل لیتے اس لڑکے سے' آخر ہرج ہی کیا ہے۔" تیمور نے بلند آواز میں تبصرہ کیا' جو لاؤنج میں داخل ہوتے جلال صاحب نے بغور سنا تھا۔
"کس لڑکے سے؟" انہوں نے بے خیالی میں پوچھا۔
"وہی جسے ڈیزی پسند کرتی ہے۔" یورپ میں رہنے

سے تیمور خاصا روشن خیال ہو گیا تھا۔

"تمہیں میرے معاملات میں زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں' اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور یہاں سے چلتے بنو' مجھے جو مناسب لگے گا میں کرلوں گا۔" بندیا کے سامنے ایسی زبردست جھاڑ پر تیمور کا منہ سرخ ہوا۔

"میں تو ویسے ہی ایک جنرل بات کر رہا تھا۔" اس نے بوکھلا کر صفائی دینے کی کوشش کی جو اسے خاصی مہنگی پڑی۔

"تم اپنی جنرل باتیں اپنے پاس رکھو برخوردار! یہ تمہاری ہی دی گئی شہہ ہے' جس کی وجہ سے وہ اپنے باپ کی عزت پیروں میں روندتی پھر رہی ہے' ہونہہ شادی کریں گی محترمہ' جس کے حسب نسب کا ہی علم نہیں۔" وہ بولے نہیں پھنکارے تھے۔

"آپ کیوں اپنا بی پی ہائی کر رہے ہیں' میں کرتی ہوں اس سے بات۔" وہ بوکھلا گئیں۔

"آپ رہنے دیں' اس سے بات کرنے کو' اور پیکنگ کریں' ہمیں رات کو ملتان کے لیے نکلنا ہے۔" جلال صاحب کی بات پر وہ پریشان ہوئیں۔

"لیکن کیوں۔؟" وہ بوکھلا کر بولیں۔

"مجھے یہ معاملہ بس آر یا پار کرنا ہے' میری چھٹی حس مجھے کوئی اچھے سائن نہیں دے رہی۔" وہ ناراض لہجے میں گویا ہوئے۔

"لیکن بابا۔" تیمور نے بولنے کی کوشش کی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں' اس نے میڈیکل چھوڑ کر ایم ایس سی میں ایڈمیشن لیا' میں نے کچھ نہیں کہا اب اسے ہر صورت میری بات ماننا ہوگی۔" ان کے لہجے میں ذرا بھی لچک نہیں تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔

"بابا جو کر رہے ہیں' اس کا رزلٹ اچھا نہیں نکلے گا۔" تیمور بھی خفا خفا سا کھڑا ہوا اور سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا' جبکہ تائی اماں کے چہرے پر پریشانی کی لکیروں کا ایک جال بن گیا تھا۔ بندیا اگلے دن کسی کام سے دوبارہ ان کے پورشن میں گئی تو طیبہ سے پتا چلا کہ وہ جلال صاحب کے ساتھ ملتان جا چکی ہیں۔

طیبہ کا بھی میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا تھا اور وہ آج کل ہر وقت کتابوں میں سر دیے رکھتی' وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس دن بندیا اپنی انگلش کی کتاب کھولے لاؤنج میں بیٹھی کسی سمری کا رٹا لگا رہی تھی' جب بینش حواس باختہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی' وہ کچھ دیر پہلے تایا ابا کے پورشن میں گئی تھی۔

"بندیا! تمہیں پتا ہے' کیا ہوا ہے تایا ابا کے گھر۔؟" بینش پُرجوش انداز میں ہانپتی کانپتی بندیا کے سامنے آن کھڑی ہوئی' اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ لاؤنج کے کھلے دروازے کے باہر تیمور' پریشان انداز میں آغا جی کو بلانے کے لیے اس کے پیچھے ہی تھا۔

"کیا ہوا ہے۔؟" بندیا کا دل انہونی کے احساس سے دھڑکا۔

"بہت مزے کی خبر ہے۔" وہ بے ساختہ انداز میں تالی بجا کر ہنسی۔

"بتائیں تو سہی۔" بندیا کا اسٹائل بہت عجیب لگا۔

"ڈیزی اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی' اب پتا چلے گا تائی اماں کو جب ساری دنیا ان پر ہنسے گی۔ قسم سے مجھے تو سوچ سوچ کر ہی خوشی ہو رہی ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے اس نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا' لیکن اس کا قہقہہ آدھے راستے میں ہی دم توڑ گیا' اس کی نظر دروازے میں کھڑے تیمور پر پڑی' کیا نہیں تھا اس کے چہرے پر دکھ' غم' غصہ' بدگمانی اور ناراضی۔ وہ ان ہی قدموں کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔ اب پریشان ہونے کی باری بینش کی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ موسم سرما کی ایک سرد اور عجیب سی رات تھی' بختاور کی طبیعت صبح ہی سے خراب تھی۔ اس کا آخری مہینہ چل رہا تھا۔ وہ اور ہاشم دونوں ہی ہسپتال جانے کی تیاری کر چکے تھے۔ ہاشم نے ساری پریگننسی میں اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا ہوا تھا۔ ایک پرائیویٹ کالج میں ہاشم کی جاب ہو گئی تھی اور اب تو

اس نے گھر میں پی ٹی سی ایل فون بھی لگوا لیا تھا۔ وہ کالج میں قیام کے دوران بار بار فون کر کے بختاور کا حال پوچھتا بعض دفعہ تو بختاور خود بھی جھنجھلا جاتی۔

"قسم سے بھابھی' ہاشم بھائی کا بس نہیں چلتا کہ آپ کو تعویذ بنا کر گلے میں لٹکالیں۔" ہاشم کے دوست سرفراز کی بیوی فائزہ اس سے ملنے آئی تو اس نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا' اس کی بات پر بختاور مسکرا دی۔

"دراصل میں انہیں ٹینشن بہت ہے' میرے پاس آج کل کوئی ہے بھی نہیں' اور آپ کو پتا ہے' ان دنوں کسی اور کی موجودگی آپ کے لیے کتنی ضروری ہوتی ہے۔" بختاور نے فوراً" اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"لیں ہزار دفعہ' میں اور سرفراز کہہ چکے ہیں کہ جیسے ہی کوئی مسئلہ ہو' ہمیں ایک کال کردیں ہم لوگ گاڑی لے کر پہنچ جائیں گے۔" فائزہ بھابھی کے خلوص پر بختاور کو کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ اب تو ان دونوں میں بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔

"جی ضرور' آپ لوگوں کے علاوہ ہمارا ہے ہی کون۔؟" بختاور نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

اس دن بختاور کو اندازہ نہیں تھا کہ آنے والی رات اپنے دامن میں اس کے لیے آزمائشوں کا ایک طوفان لیے آرہی ہے۔ موسم سرما میں رات گیارہ بجے ہی آدھی رات کا سماں ہوتا ہے۔ وہ دونوں سونے کے لیے لیٹ چکے تھے' جب ان کے فلیٹ کی گھنٹی بجی۔ ہاشم فوراً" ہی اٹھ بیٹھا' بختاور ہلکی سی نیند میں تھی' اس نے ہاشم کو اٹھ کر دروازے کی جانب جاتے دیکھا اور پھر وال کلاک پر رات گیارہ بجے کا ٹائم دیکھ کر پریشانی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی ساری نیند بھک کر کے اڑ گئی۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے۔؟" وہ کچھ لمحے سوچتی رہی اور پھر بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی' جیسے ہی وہ اپنے بیڈروم کے دروازے پر پہنچی' اس نے لاؤنج میں کسی مرد کی آواز کو سنی تو پریشانی سے پردے کے پیچھے رک گئی۔ ہاشم کا کوئی مہمان تھا' جسے لے کر وہ لاؤنج میں آگیا تھا۔

"اعظم بھائی آپ؟ اچانک؟ یہاں کیسے۔۔؟" ہاشم کی آواز پر وہ چونک گئی۔

"بابا کی طبیعت خراب ہے' ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے تم ان سے ایک دفعہ مل لو۔" بختاور نے پردے کی اوٹ سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا' جس کے نین نقش سے جھلکتی شباہت سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ہاشم کے بڑے بھائی تھے۔

"آپ کو کس نے بتایا کہ میں یہاں رہ رہا ہوں۔" وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

"مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ تم شادی کرچکے ہو اور اپنی بیوی کے ساتھ یہاں رہ رہے ہو۔" انہوں نے ہاشم کو حیران کیا۔

"حیرت ہے' آپ لوگ تو مجھ سے جینا مرنا سب کچھ ختم کرچکے تھے' اب کیسے خیال آگیا میرا۔؟" وہ بے زار لہجے میں بولا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ کس بات کی وجہ سے پورا خاندان تم سے ناراض ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں' میں آپ کے نزدیک ملحد ہوں' اور آپ لوگوں کی طرح مذہب کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کو بے وقوف نہیں بناتا۔" اس کی بات نے بختاور کو پریشان کیا۔

"تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے بابا تم سے خفا ہیں' پتا نہیں کس نے یہ خناس تمہارے ذہن میں بھر دیا ہے' نہ تم کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر جاتے اور نہ گمراہ ہو کر آتے۔" وہ بے زار لہجے میں بولے۔

"زندگی گزارنے کے میرے اپنے کچھ اصول ہیں' میں گناہ ثواب کے چکروں میں نہیں پڑتا' صرف اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی کو کوئی دکھ' تکلیف یا رنج نہ پہنچے جس کا آپ لوگوں نے فسانہ بنا رکھا ہے۔" وہ ایک دم غصے میں آگیا۔

"تو تمہاری ان باتوں سے بابا اور پورے خاندان کو جو تکلیف ہوتی ہے' اس کا احساس کیوں نہیں ہے تمہیں؟" وہ بھی جواباً بھڑکے۔

"اس لیے کہ میں آپ لوگوں کی طرح مذہب کی اندھی تقلید نہیں کرسکتا' اپنے کیے گناہوں کو تقدیر کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتا کہ ہماری قسمت میں ایسا لکھا ہوا تھا' آپ لوگوں کو مسئلہ کیا ہے' اگر میں اپنے طریقے سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔" ہمیشہ نرم لہجے میں بات کرنے والے ہاشم کا یہ روپ بختاور کے لیے بہت تکلیف دہ تھا' اسے لگا کسی نے اس کی جان اپنی مٹھی میں لے لی ہو۔

"تم نے اپنی بیوی کو بتایا ہے کہ تم دنیا کے کسی دین اور مذہب کو نہیں مانتے صرف انسانیت کا پرچار کرتے ہو؟" ان کو ایک دم ہی غصہ آیا اور ساتھ ہی بختاور کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹی۔

"اسے میری یہ ہی بات تو اچھی لگی تھی کہ میں انسانیت سے محبت کرنے والا شخص ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولا بختاور کے دل پر ایک قیامت ڈھا گیا۔

"تو صاف صاف بتاتا تھا ناں' تم اللہ' نبی اور کسی تقدیر کو نہیں مانتے' پھر میں دیکھتا کون مسلمان لڑکی تم سے شادی کرتی ہے؟ بلکہ تمہاری یہ شادی بھی سرے سے جائز ہی نہیں' اس معصوم لڑکی کو پتا ہی نہیں وہ گناہ کی زندگی بسر کررہی ہے۔" ہاشم کے بھائی کی بات پر بختاور کو لگا کمرے کی چھت اس کے سر پر آن گری ہے یا کسی نے اسے زور سے دلدل میں دھکا دے دیا ہو۔ پتھروں کی بارش اس کے وجود کو سنگسار کرتی جارہی تھی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

تسنیم شریف

مجھے اس عورت سے نفرت تھی۔ انتہا درجے کی نفرت۔ وہ اسی قابل تھی کہ اس سے نفرت کی جائے۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے، تن کے کھڑی تھی۔ ایک فاتحانہ چمک اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ میں غصے سے اسے گھورتا رہا کیوں کہ اس کے سوا میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا اور میں کیا میرے سارے دوست ہی اسے غصے سے گھور رہے تھے۔ مگر اسے تو کسی کی پروا ہی نہیں تھی۔ اس کا باکڑ بلا شوہر بھی اسی کے مزاج کا اور اسی کا حمایتی تھا۔ تب ہی وہ خود کو کسی ریاست کی ملکہ اور ہمیں شاید کیڑے مکوڑے سمجھتی تھی۔ اس کٹھور اور جذبوں سے خالی عورت کی یہ غلط فہمی میں ہر صورت دور کرنا چاہتا تھا۔ مگر کیسے؟

میرے ننھے سے دماغ میں اس حوالے سے کوئی آئیڈیا نہ تھا لیکن دل میں ٹھان لیا تھا کہ اب تو بدلہ لینا ہی ہے۔ وہ ابھی تک اپنی گیلری میں کھڑی تھی۔ ہماری گیند اس کے ہاتھ میں تھی اور ہونٹوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ۔ اچانک اس نے گیند کو دونوں ہاتھوں سے اچھالنا اور پکڑنا شروع کیا۔ وہ فرسٹ فلور پہ رہتی تھی اور ہم گراؤنڈ فلور پر کھڑے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ غصہ اتنا تھا کہ مجھ سے تو بولا بھی نہیں جا رہا تھا اوپر سے اس نے خود گیند سے کھیلنا شروع کر کے گویا ہمارے جذبات سے کھیلنا شروع کر دیا تھا اور اس وقت تو ہمیں آگ ہی لگ گئی جب اس نے کھیلنا موقوف کر کے مسکرا کے ہمیں دیکھا اور ٹھینگا دکھا کر اندر اپنے گھر بھاگ گئی۔

"کمینی، ذلیل۔" بے ساختہ میرے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔

"اللہ کرے آدھی رات کو اس کا جنازہ اٹھے۔" جاوید بولا۔

"اس کی قبر میں کیڑے پڑیں۔" نعمان کیوں پیچھے رہتا۔

ابھی شاید ہمارے جذبات کے اظہار کا سلسلہ جاری رہتا کہ میری ماں نے مجھے آواز دے ڈالی۔ ہمارا گھر بھی فرسٹ فلور پر تھا مگر اس چڑیل کے گھر سے دس گھر آگے۔ میں نے بیٹ خوامخواہ زمین پر مارا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ گیند پہلے ہی اس کے قبضے میں جا چکی تھی اور کھیل رک چکا تھا۔ میں ٹیم کا کپتان تھا اور کچھ کیے بنا اپنے گھر جا رہا تھا تو باقی لڑکوں نے رک کر وہاں کیا کرنا تھا۔ وہ سب بھی تتر بتر ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

میرا دماغ غصے سے کھول رہا تھا اور کوئی چیز کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ماں نے میرا پسندیدہ کھانا قیمہ پالک اور بگھارے چاول بنائے تھے۔ ناچار مجھے بیٹھنا پڑا۔ میرے سامنے کھانا رکھ کر وہ واپس اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی اور میں کھانے میں کہ دفعتاً شور سا سنائی دیا۔ میں نے آوازوں پہ کان لگایا تو جاوید کی ماں کی اسی چڑیل سے لڑائی ہو رہی تھی۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ایک تو ہمیں کھیلنے نہیں دیتی دوسرے ہماری ماؤں سے لڑتی بھی ہے۔ ہم کتنے بے بس اور کمزور تھے۔ چھوٹے جو تھے۔ چھوٹے نہ ہوتے تو اسے ایسا مزہ چکھاتے جس نے پورے محلے کے بچوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اوپر سے ہماری ماؤں سے بھی لڑتی تھی۔ اس نے دو دفعہ میرے ابا سے شکایت کر کے مجھے پٹوایا بھی تھا۔ میری آنکھیں برسنے لگیں۔ ماں جو یہ شور سن کر باہر جا رہی تھی اس کی غیر ارادی نگاہ مجھ پہ پڑی اور مجھے روتا دیکھ کر وہ باہر کا شور بھول کر لپک کر میرے پاس آئی۔

"کیا ہوا منہ جل رہا ہے پانی لاؤں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"میرا دل جل رہا ہے۔" پتا نہیں کیسے یہ الفاظ میرے منہ سے پھسلے۔

ماں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں بہت بہادر تھا۔ نجانے کیسے میرے ننھے سے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مرد بہادر ہوتے ہیں اور جو بہادر ہوتے ہیں وہ روتے نہیں ہیں بلکہ ظلم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اب یہ ظلم چاہے حالات کی پیداوار ہو یا انسانوں کی۔ مگر اس وقت یہ فلسفہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ میں رو رہا

تھا۔

ماں گھبرائی۔ ”بتانا گڈو کیا ہوا ہے... کسی نے کچھ کہا ہے... لڑائی ہوئی ہے دوستوں سے۔“ ماں کی بے تابانہ محبت دیکھ کر میرے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”ماں! اس چڑیل نے آج پھر ہماری گیند چھین لی۔ محلے میں یہ ہمیں کھیلنے نہیں دیتی اور تو باہر جانے نہیں دیتی۔ کیا اب ہم اپنے محلے میں کھیل بھی نہیں سکتے۔“ میں ماں کے سینے سے چمٹ کر ہچکیوں کے درمیان بولا تو ماں نے کچھ جواب نہ دیا صرف میری کمر سہلاتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد طوفان تھما باہر کا بھی اندر کا بھی... مجھے یقین تھا کہ جاوید کی ماں ہی تھک ہار کر اپنے گھر چلی گئی ہوگی کیوں کہ اب صرف چڑیل کی تیز آواز سنائی دے رہی تھی۔ ماں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھرا اور کچھ لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر میرا ماتھا چوم لیا۔

”بس! اتنی سی بات پہ اتنے آنسو۔“

”ماں! یہ اتنی سی بات نہیں ہے یہ ہماری آٹھویں بال تھی جو اس نے چھین لی۔ تجھے پتا بھی ہے کہ ایک گیند کتنے کی آتی ہے... پورے تیس روپے کی اور ہم سب کا روز کا جیب خرچ کتنا ہے... پانچ روپے... میں نے دو دن بریک میں کچھ نہیں کھایا' میرے دوستوں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ تب جا کر ہم نے یہ گیند خریدی تھی جو اس جھکی بڑھیا نے چھین لی۔“ میں دوبارہ رویا۔

”اچھا نا... رومت... میرے پاس پیسے ہیں میں وہ دے دوں گی تو نئی گیند لے آنا۔“ ماں نے دلاسہ دیا۔

”ماں... تیرے پاس پیسے کہاں سے آئے... ابا تو دو دن سے کام پر ہی نہیں گیا۔“

”وہ تیرا قرآن ختم ہونے والا ہے نا تو مدرسے میں شیرینی کی تقسیم کے لیے رکھے تھے۔ پر تو لے لے کوئی بات نہیں... میں اور جمع کر لوں گی۔“ ماں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں... میں اب گیند نہیں لوں گا... اس دفعہ تو میں بدلہ لوں گا بس بہت ہو گئی۔“

”کیا کرے گا۔“ ماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ میں کیا کروں گا مگر بدلہ ضرور لوں گا۔“

”چچ چچ... کتنی بری بات ہے۔ اتنی بڑی ہے وہ تجھ سے بلکہ وہ تو مجھ سے بھی بڑی ہے... اب بڑوں سے کوئی بدلہ لیتا ہے کیا؟ اور پھر سب سے اچھا بدلہ بتاؤں کیا ہوتا ہے... معاف کر دینا... معاف کر دو تو دشمن خود اپنی نظروں سے گر جاتا ہے...“

میں روتے روتے ہنس پڑا۔ ”اے یار ماں' بس اب چپ ہو جا تو۔ مجھے یہ الٹی سیدھی پٹیاں نہ پڑھا۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ ساتویں جماعت میں اول آیا ہوں ... آٹھویں میں گیا ہوں آٹھویں میں۔“

”ارے چھوڑنا گڈو... ویسے بھی دو دن بعد تو ہم لوگ جا ہی رہے ہیں... اب لڑ جھگڑ کر جائے گا کیا؟“

”ہم جا رہے ہیں... کہاں!“ میں نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

”میرپور' تیرے تایا کے گھر۔ تیرے ابا کا ویزا لگ گیا ہے نا تو وہ سعودیہ جا رہا ہے اور سعودیہ جانے کے لیے بہت سارے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی تیرے ابا نے یہ گھر بیچ دیا ہے۔ اب ہم میرپور میں ہی رہیں گے اور تیرا ابا جب محنت کر کے وہاں سے پیسے بھیجے گا تو میں تجھے بہت اچھے اسکول میں داخل کراؤں گی... پھر تو وہاں سے بہت بڑا بابو بن کر آئے گا۔“ ماں خواب دیکھتے دیکھتے بہت دور بہت آگے نکل گئی تھی۔

مجھے اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے سامنے تو صرف جھکی بڑھیا تھی۔

جھکی بڑھیا... اس چڑیل کا یہ نیا نام مجھے بہت پسند آیا تھا۔

✡ ✡ ✡

میں' نعمان اور جاوید تینوں اسی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ ہماری ٹیم کے باقی لڑکے سامنے' کچی بستی میں رہتے تھے۔ ہمارے گھر والوں نے ہمیں کبھی گلی میں

کھیلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور ہماری بلڈنگ' آج کل کی بلڈنگوں جیسی نہ تھی جو اوپر ہی اوپر چلتی جاتی ہیں' بلکہ یہ صرف گراؤنڈ اور فرسٹ فلور پر مشتمل تھی اور تمام گھر فلیٹوں کی طرح نہیں تھے بلکہ یہ گولائی کی طرز میں بنی ہوئی تھی۔ اسی باعث گراؤنڈ فلور اچھے خاصے میدان کی صورت میں تھا۔ اور ہم کرکٹ کا شوق وہیں کھیل کر پورا کیا کرتے تھے۔ اور کون سا ہر وقت کھیلتے تھے۔ دو مہینے کی چھٹیوں ہی میں تو کھیلتے تھے۔ وہ بھی اس جھکی بڑھیا کو گوارا نہ تھا۔

اب کرکٹ میں شاٹ نہ مارا تو کھیل ہی کیا۔ ہماری بدنصیبی یہ تھی کہ جوں ہی ہم لوگ شاٹ مارتے' گیند ہوا میں تیرتی ہوئی سیدھی اس بڑھیا کی بالکونی پہ لینڈ کرتی جسے بچوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اللہ نے اسے اسی لیے بچوں سے محروم رکھا ہے کیوں کہ وہ بچوں سے محبت نہیں کرتی۔ وہ کٹھور دل کی' محبت و ہمدردی کے جذبوں سے خالی' ایک محروم عورت تھی۔

میری ماں دنیا کی سب سے شان دار عورت تھی۔ وہ مجھ سے تو محبت کرتی ہی تھی میرے دوستوں سے بھی محبت کرتی تھی۔ ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں' پیار کرنے والی۔ محبت کی مٹی سے بنی۔ تب ہی تو وہ مائیں بنتی ہیں۔ مگر یہ عورت... یہ چڑیل' ظالم تھی نا اسی لیے تو ماں نہیں تھی۔ اور ظالم کو سبق سکھانا تو بہت ضروری ہوتا ہے۔ معافی تو مظلوموں کی آس توڑ دیتی ہے۔ میں نے ہر صورت اسے سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا تھا اسی لیے میرا دل نئی نئی تاویلیں گھڑ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس محلے میں وہ ہمارا آخری دن تھا۔ ابا اپنے دوستوں سے ملنے گیا ہوا تھا اور ماں بھی محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر الوداعی ملاقات کر رہی تھی اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ افسردہ بیٹھا تھا۔ ہم تینوں غمزدہ تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب شاید ہمیں دوبارہ ملنا نصیب نہیں ہوگا۔ ابھی ہماری چھٹیاں شروع ہوئے صرف پندرہ دن ہی گزرے تھے کہ ماں نے جدائی کی روح فرسا خبر سنا دی تھی۔ اور ابھی تو مجھے جھکی بڑھیا سے بدلہ بھی لینا تھا۔

ابھی تو بہت سارے کام باقی تھے اور وقت بہت کم تھا۔

✡ ✡ ✡

ہم تینوں کی اس گھر میں آج آخری رات تھی۔ کل صبح کی گاڑی سے ہماری روانگی تھی۔ ماں نے سرشام ہی بستر لگا دیا تھا۔ ابا تو کب کا سو چکا تھا۔ ماں پتا نہیں کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی جب میں نے اسے مخاطب کیا۔

"ماں! میرے سارے دوست ادھر ہی رہ جائیں گے... تو ابا سے بول وہ نہ جائے... اس کے بھی تو سارے دوست یہیں ہیں... دوستوں کے بغیر زندگی کا کیا مزہ..."

"لے! تو دنیا میں دوستوں کی کمی ہے کیا... وہاں بھی تجھے بہت اچھے اچھے دوست مل جائیں گے..."

"لیکن وہ نعمان اور جاوید جیسے تو نہیں ہوں گے۔" میرا گلا رندھ گیا۔

"وہ نعمان اور جاوید جیسے ہی ہوں گے۔ سارے اچھے لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہاں کھیلنے کے لیے بڑے بڑے گراؤنڈ بھی ہیں... تو خوب جی بھر کے کھیلنا اور مزے کی بات یہ کہ وہاں جھکی بڑھیا بھی تو نہیں ہوگی۔" میرے منہ سے ماں اتنی دفعہ اس کے لیے لفظ جھکی بڑھیا سن چکی تھی کہ بے ساختہ اس کے منہ سے بھی یہی لفظ نکل گیا۔

اس کے منہ سے لفظ جھکی بڑھیا نے مجھے بڑا مزہ دیا۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑا تو وہ بھی ہنسنے لگی۔

"ماں! جب میں بڑا ہو جاؤں گا نا تو بہت محنت کروں گا اور بہت سارے پیسے جمع کر کے واپس یہاں کراچی آ جاؤں گا اور یہ جو ہماری بلڈنگ کے سامنے گراؤنڈ پڑا ہے نا اسے' اس کے بدتمیز چوکیدار سمیت خرید لوں گا۔ پھر ہم وہاں کھیلیں گے... پھر تو وہاں کھیلنے سے

منع نہیں کرے گی نا۔۔۔"

"تو میں یہاں کھیلنے سے کب روکتی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ مگر چل چھوڑ۔۔۔ ویسے بھی جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو پھر تیری بات تھوڑی مانا کروں گا۔" میں اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔

"ہیں!" ماں نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں اس کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کے یوں محبت سے گھورنے پر شرمندہ ہو گیا۔

"اچھا نا' مانوں گا۔۔۔" وہ مطمئن ہو کر دوبارہ لیٹ گئی اور میرے بالوں کو سہلاتے سہلاتے سو گئی مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

میرے پاس صرف آج کی رات تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا۔۔۔ آج ہی کرنا تھا۔۔۔ مگر کیا؟

☆ ☆ ☆

میں نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے دیوار پر جمائے۔ اپنے چھریرے بدن کو بالکل ڈھیلا چھوڑ کر اوپر کو کھینچا اور چوکنا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا دھم سے اس کے گھر میں کود گیا۔ میرے کودنے سے دھیمی سی آواز پیدا ہوئی تھی مگر مجھے وہ ایٹم بم کی آواز لگی۔ میں دم سادھے کچھ دیر وہیں دبکا رہا۔ اس روز پہلی دفعہ مجھ پر لوڈ شیڈنگ کی برکات آشکار ہوئیں۔ سچ کہا ہے' جس نے بھی کہا ہے کہ ہر خرابی میں تعمیر کی بھی صورت مضمر ہوتی ہے۔

چند لمحوں بعد جب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو میں نے گھر کا جائزہ لیا۔ دو کمروں کا گھر تھا بالکل ہمارے گھر جیسا۔ چھوٹا سا صحن عبور کر کے میں ایک کمرے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کے اندر آ گیا۔ کچھ لمحوں بعد مجھے اندازہ ہوا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے تو میں نے جیبی ٹارچ نکالی اور الماری کی طرف بڑھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس نے قبضے میں لی گئیں ہماری گیندیں کہاں چھپائی ہوں گی۔ پتا نہیں اس کی نظر میں ان کی کیا اہمیت تھی مگر میرے لیے وہ بہت قیمتی تھیں۔ اور میں نے آج تک ماں کو قیمتی چیزیں الماری میں ہی رکھتے دیکھا تھا۔ اسی لیے میں سب سے پہلے الماری کی طرف بڑھا۔

ایک خانے میں کچھ کپڑے تھے۔۔۔ دوسری طرف کے خانے میں کچھ کھلونے گڑیاں اور اسی قسم کا الم غلم۔ (یقیناً "یہ بھی اس نے دوسرے بچوں سے چھینی ہوں گی۔ میرے دل میں اس کے حوالے سے منفی سوچ کے علاوہ کچھ آتا ہی نہ تھا)۔ مگر مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ کہیں نہ تھی۔ آخر کو چڑیل تھی نا' پتا نہیں اس کے شیطانی دماغ نے انہیں کہاں چھپایا تھا۔

میں ابھی جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میں نے اس کی کڑک دار آواز سنی۔ "کون ہے؟"

میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں اس کے گھر میں ایک چور کی حیثیت سے موجود تھا۔ حالانکہ مجرم وہ تھی مگر پکڑا میں جاتا۔ مگر یوں نامراد جانا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے ٹارچ بند کی۔ جلدی سے جیب سے شاپر نکالا اور جو چیز بھی میرے ہاتھ لگی اس میں ٹھونسی اور لپک کر صحن کا رخ کیا اور منٹوں میں باہر۔ میرا ہیولہ دیکھ کر وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی تھی مگر میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے گھر بخیر و عافیت پہنچ گیا۔

میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے جلدی سے شاپر اپنے اسکول کے بیگ میں چھپایا اور اپنے بستر میں گھس گیا۔۔۔ باہر شور بڑھ رہا تھا۔۔۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کیں اور سر تک چادر تان لی۔

اس روز پتا چلا میں اتنا بہادر تھا نہیں جتنا کہ اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح جب ہم جانے لگے تو ابا سامان اٹھا اٹھا کر ٹیکسی کی چھت پر رکھنے لگا۔ ہم غریبوں کا سامان تھا ہی کتنا۔ مگر ابا پھر بھی اسے سنبھال سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ مطمئن اور مسرور۔۔۔ ماں بھی خوش تھی۔ ایک حسین سپنا اس کی آنکھوں میں بھی جگمگا رہا تھا اور میں۔۔۔ میرا دل رو رہا تھا۔ میں اپنی سب

سے قیمتی دولت اپنے دوست یہیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔
نعمان اور جاوید محلے کے مرکزی دروازے پر اداس کھڑے تھے۔ میں تیزی سے ان کی طرف لپکا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھے اور پھر ہم تینوں دوست مل کر اتنا روئے اتنا روئے کہ شاید ہی کوئی رویا ہو۔

ہماری ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں جب ماں نے آکر مجھے ان سے جدا کیا۔ میرے آنسو پونچھے۔ ان دونوں کے ماتھوں کو بھی باری باری چوما انہیں دعائیں دیں اور مجھے لے کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ابا نے گاڑی کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ بس میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ جوں ہی میں گاڑی میں بیٹھا۔ میری نگاہ غیر ارادی طور پر اوپر اٹھ گئی۔

وہ گلی میں کھلنے والی اپنی گیلری میں کھڑی تھی اور ہمیں ہی دیکھ رہی تھی۔ نجانے اس کی نگاہوں میں کیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے نظریں ہٹا کے سڑک پر جمادیں، جہاں ہماری گاڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں زندگی میں صرف تین مرتبہ رویا تھا۔ ایک اس وقت جب نعمان اور جاوید سے بچھڑ کر میرپور چلا آیا تھا۔

دوسرے ماں کی موت پر۔ ابا نے سعودیہ میں دوسری شادی کرلی تھی اور ماں اس غم کو سہہ نہ سکی تھی۔ یہ عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں جن سے محبت کرتی ہیں ان کے لیے ان کے دل اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ ان کی ساری خطائیں کوتاہیاں، خود غرضیاں حتیٰ کہ بے وفائیاں بھی برداشت کرلیتی ہیں مگر اتنے نازک کہ شراکت کے ذرا سے بوجھ سے ٹوٹ جاتے ہیں' بند ہو جاتے ہیں۔ ماں نے ابا کی طویل جدائی تو برداشت کرلی تھی مگر اس کی دوری کا غم اسے لے ڈوبا۔

اور تیسرے آج۔۔۔ آج جب ڈاکٹر نے مجھے یہ روح خراش خبر سنائی کہ میں کبھی باپ نہیں بن سکتا کیوں کہ میں پیدائشی بانجھ تھا۔۔۔ آہ! بچوں کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ بچے جو اس کائنات کا حسن ہیں۔ جن کے دم سے دنیا کی رونقیں ہیں۔ میں اس بے بہا دولت کو پانے سے محروم تھا۔ میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ کر مسل دیا تھا۔ یکدم ہی میرا شاندار وجود کسی کھنڈر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ صرف وہ لوگ اولاد سے محروم ہوتے ہیں جو محبت کے جذبے سے نا آشنا ہوتے ہیں مگر میں تو ایک رقیق اور گداز دل کا مالک تھا۔ رب کا فرماں بردار بھی تھا اور ماں باپ کا بھی میں نے تو اس کے بندوں کو بھی کبھی نہیں ستایا تھا۔ پھر بھی محرومی۔۔۔

اگر میری بیوی ناہید بانجھ ہوتی تو وہ زبردستی میری دوسری شادی کرا دیتی۔ مجھے یقین کی حد تک گمان تھا کیوں کہ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی اور بچوں کی اسے بھی شدید چاہ تھی اور شاید میں بھی دوسری شادی کرلیتا' میں اپنے بارے میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ اس میں کوئی نقص نہ تھا' ادھورا تو میں تھا۔ میں نے روتے روتے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ملول و افسردہ چہرہ لیے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم اگر چاہو تو میں تمہیں آزاد کرسکتا ہوں۔" میں نے کس دل سے یہ بات کہی تھی' میرا رب ہی جانتا تھا۔ وہ یہ سن کر تڑپ گئی۔ "اس سب میں میرا کیا قصور ہے؟"

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ تب ہی تو ایسے کہہ رہا ہوں۔۔۔ میرے ساتھ رہ کر تم کیوں محرومی کی زندگی گزارو۔۔۔ کسی اچھے آدمی سے شادی۔۔۔"

"بس۔۔۔ بس کردیں۔" وہ روتے روتے میرے گلے لگ گئی۔

خاموشی' تنہائی اور آنسو۔ اب شاید یہی ہمارا مقدر تھے۔

☆ ☆ ☆

ایک زمانے بعد میں پھر کراچی جا رہا تھا۔ میرا تبادلہ

ہو گیا تھا۔ میری بیوی ناہید بہت پرجوش ہو کر سامان باندھ رہی تھی۔ ہماری روانگی صبح تھی۔ میں نے بھی اپنے ضروری کاغذات اور دیگر چیزیں سمیٹ لی تھیں۔ اور ایک آخری بار الماری میں نگاہ دوڑائی کہ کچھ رہ تو نہیں گیا کہ سب سے نچلے خانے کو ٹٹولتے ہوئے ایک شاپر میرے ہاتھ سے ٹکرایا اور میں نے اسے باہر کھینچ لیا۔

لمحہ کا ہزارواں حصہ نہ لگا اسے پہچاننے میں۔ اسے شاپر کو دیکھ کر کیا کیا نہ یاد آ گیا تھا مجھے۔

وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ الوداعی رات۔ رخصتی کی رات۔ جدائی کی رات.... اور گناہ کی رات۔ اس رات کے اندھیرے نے میرا بھرم رکھ لیا تھا۔ مجھے ماں کی نظروں میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ ناہید کسی کام سے اندر آئی تو مجھے یوں بیٹھا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا ایسے کیوں بیٹھے ہیں اور یہ کیا ہے؟" اس نے بولتے بولتے میرے ہاتھ سے شاپر لیا۔ اور اس میں موجود تمام سامان بیڈ پر گرا دیا۔

وہ حیرت سے ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی اور میں نے بھی پہلی بار دیکھا کہ میں نے کیا چرایا تھا۔ کپڑے کی بنی دو گڑیاں تھیں۔ ایک ننھی سی بے بی فراک' ایک جھنجھنا اور ایک دوپٹہ۔ یہ ساری چیزیں بوسیدہ ہو گئی تھیں اور اپنا اصلی رنگ کھو بیٹھی تھیں۔

میرپور آتے ہوئے پورے راستے میں نے اپنے اسکول بیگ کی بڑی حفاظت کی تھی۔ اسے ماں سے ہر لمحے بچایا تھا اور تایا کے گھر میں سیٹ ہوتے ہی اسے الماری کے سب سے نچلے خانے میں اپنے سامان میں سب سے نیچے دبا دیا تھا۔ اس کے بعد اماں کے ڈر سے دو تین دن تک تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ پھر ابا کے جانے کا ہونے لگا تو اس گہما گہمی میں' یہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔

تایا لاولد تھے۔ انہوں نے مجھے ہی اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ ماں کے گزرنے کے تھوڑے عرصے بعد وہ بھی چلے گئے تھے اور میں تایا کے گھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔

کتنا زمانہ گزر گیا تھا۔ میری کنپٹیاں سفید ہو گئی تھیں۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ اس سارے عرصے میں ایک دفعہ بھی مجھے اپنی چوری کا خیال نہیں آیا تھا۔ ایک دفعہ بھی نہیں! ندامت کے ساتھ ساتھ مجھے حیرانی بھی تھی۔

"یہ کیا ہے۔" ناہید نے حیرانی سے پوچھا۔

"میری ننھی ننھی آرزوؤں اور خواہشوں کا تاوان۔"

"مطلب؟"

"بچپن.... جس کی بذات خود کتنی عمر ہوتی ہے۔ تین سال یا چار سال یا پھر پانچ سال.... ہے نا۔" میں نے تائیدی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں میری بے ربط باتیں نہیں آ رہی تھیں۔ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

میں بولتا رہا۔ "پوری زندگی کا سب سے حسین دور.... محرومیوں کے باوجود مالا مال مفلسی کے باوجود آسودگی.... بے فکری۔ شاید قدرت سب کو اس دولت سے نوازتی ہے.... مگر۔" آگے مجھ سے کچھ بولا نہ گیا۔ میرا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔

ناہید یہ دیکھ کر تڑپ کر میرے قدموں میں آ بیٹھی۔ اپنے خوب صورت ہاتھوں کے پیالے میں میرا مضمحل پژمردہ اور تھکن سے بھرا چہرہ لے کر مسکرائی۔

"قدرت انسان کو آزماتی بھی تو ہے۔ مالا مال کر کے بھی اور محروم کر کے بھی۔ دے کر بھی اور لے کر بھی اور آزمائش بھی ایک نعمت ہے اور شاید یہ بھی خاص بندوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جو بچے پڑھنے جاتے ہیں استاد ان ہی کا امتحان لیتا ہے.... راہ چلتے ہر بچے کا نہیں.... ہے نا۔"

"زندگی سے بڑا کون استاد ہو گا جو ہر ایک کا امتحان لیتی ہے۔ چاہے خاص ہوں یا عام۔" میں نے سوچا ضرور مگر کہا نہیں۔ وہ منتظر نگاہوں سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ہاں! اتنا سبق تو میں نے بھی سیکھ لیا ہے کہ انسان زندگی میں سب کچھ کر لے مگر کسی تیچر سے شادی نہ

کرے۔" میں نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور ہنستی چلی گئی۔
ماحول ایک دم خوش گوار ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ناہید کراچی پہلی بار آئی تھی اور بے حد خوش تھی۔
ہم ایئرپورٹ سے باہر آئے تو محکمہ کی جانب سے آنے والا ڈرائیور کار سمیت میرا منتظر تھا۔ میں گریڈ بائیس کا افسر تھا۔ مجھے گھر بھی محکمہ کی جانب سے الاٹ ہوا تھا۔ اس نے ہمارا سامان گاڑی کی چھت پر رکھا اور ہمارے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ بے حد مؤدب تھا اور میری شخصیت سے کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو گیا تھا۔
شاہراہ فیصل سے گزر کر ہم شاہراہ قائدین پر پہنچے تو مجھے احساس ہوا کہ کراچی کتنا بدل گیا ہے۔ چمچماتی سڑکوں اور فلائی اوورز کا جال بچھ گیا تھا۔ اونچی اونچی عالی شان عمارتیں، سڑکوں پر گاڑیوں کا اژدھام لوگوں کا جم غفیر۔ بڑے بڑے ہورڈنگز۔۔۔ سب کچھ اجنبی ہونے کے باوجود آشنا سا لگ رہا تھا۔ جوں ہی ہماری گاڑی ایم اے جناح روڈ پر پہنچی میرا ذہن بولٹن مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔
"سنو! گاڑی پہلے بولٹن مارکیٹ کی طرف لے چلو۔" ڈرائیور نے فرماں برداری سے سر اثبات میں ہلایا۔
بولٹن مارکیٹ سے میں نے دو چادریں خریدیں۔ بالکل ویسی گلابی پھولوں والی، جیسی میری ماں گھر سے باہر جاتے پر اوڑھ کے نکلتی تھی۔ دو چار قدم آگے چلا تھا کہ میرے قدم ٹھٹک گئے۔ سامنے کی دکان پر گیندیں لٹک رہی تھیں۔ اس دکان میں سارا کرکٹ کا ہی سامان تھا۔ گیندیں، بلے، دستانے، وکٹ۔ سب کچھ موجود تھا۔ بے اختیار میں نے ایک بلا اور کریچ کی گیند خرید لی۔ اب میری عمر کھیلنے کی تو نہیں تھی۔۔۔ مگر میرے اندر کا بچہ آج زمانے بعد مچلا تھا۔۔۔ اور بچوں سے تو مجھے ہمیشہ سے پیار تھا۔ چاہے وہ انسانوں کے بچے ہوں یا جانور، پرندوں کے۔ میرے دل میں سب کے لیے جگہ تھی۔
"یہ کیا ہے؟" میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو ناہید نے بیٹ اور بال کی طرف اشارہ کیا اور مسکرا کر پوچھا۔
"میری پہلی محبت۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ تو ڈرائیور نے مڑ کر مجھے دیکھا اور گاڑی بڑھا دی۔
"ویسے ایک بات بتاؤں میں آپ کو۔ محبت کرنا بھی آرٹ ہے۔ یہ نہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے اور نہ ہر کسی سے کی جا سکتی ہے۔"
"اوکے ٹیچر۔" میرا دل خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ میرے لہجے کی کھنک پر بے ساختہ ڈرائیور کے منہ سے قہقہہ نکل گیا۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ ناہید جھینپ کر باہر دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

محکمہ کی جانب سے جو گھر مجھے ملا تھا اس کا ایڈریس میرے پاس تھا مگر اس کی لوکیشن کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ ایک جوں جوں منزل نزدیک آنے لگی تو میرے دل میں اتھل پتھل شروع ہو گئی۔ یہ گلیاں، یہ دکانیں، یہ سڑک۔۔۔ سب کچھ جانا پہچانا تھا۔ یہیں کہیں نعیم کے باپ کی دودھ کی دکان تھی۔۔۔ مگر اب کہاں ہے؟ میں نے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر گاڑی آگے بڑھ گئی۔ رستہ پیچھے رہ گیا۔
اوہ! یہیں، اس پیڑ کے نیچے ہی تو ہم اسکول سے واپسی پر چنوں کی چاٹ کھایا کرتے تھے۔۔۔ یہیں کہیں جاوید کے ابا کا گیرج تھا۔۔۔ یہیں تو تھا۔۔۔ ابھی سب کچھ یہیں تو تھا۔۔۔ اچانک گاڑی جھٹکے سے رکی۔ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔
"یہ تم مجھے کہاں لے آئے۔" میں نے حیرت سے اردگرد دیکھا۔
یہ تو وہی بلڈنگ تھی جہاں ہم رہتے تھے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب اس کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نعمان اور جاوید روئے تھے۔۔۔ ابھی کل ہی تو۔۔۔
"صاحب! محکمہ کی جانب سے ادھر ہی آپ کو گھر ملا

ہے۔" ڈرائیور کے بتانے پر میں نے غور سے دیکھا۔
ہماری بلڈنگ کے سامنے برسوں سے ایک میدان خالی پڑا تھا۔ رفتہ رفتہ وہاں لوگ کچرا پھینکنے لگے تھے مگر اس کے باوجود اس کا بہت بڑا حصہ خالی تھا۔ میں نے بچپن میں کبھی اسے خریدنے کی خواہش کی تھی۔۔۔ حکومت نے اس پر سرکاری ملازمین کے لیے گھر بنا دیے تھے۔ ناہید خوشی خوشی اپنے نئے گھر میں داخل ہوئی۔ ڈرائیور پہلے ہی سامان اندر لے جاچکا تھا۔
میں ٹرانس کی حالت میں تنہا وہاں کھڑا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ناہید ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے شاور لیا اور ایک فرحت بخش احساس کے ساتھ باہر آگیا اور گیلری سے جائزہ لیا۔ یہ دو منزلہ گھر تھا۔ میدان کو پاٹ کر اس پر بنائے گئے گھروں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ میرے الاٹ شدہ گھر کا مرکزی دروازہ عین اس بلڈنگ کے سامنے تھا جس میں کبھی میں رہتا تھا۔ چار کمرے تھے اور ایک بہت بڑا صحن تھا۔ بہت زیادہ بڑا۔ جس کے ایک حصے میں خودرو جھاڑ جھنکاڑ اگ گیا تھا۔
میں دوبارہ کمرے میں آیا اور احتیاط سے سوٹ کیس کھول کر وہ شاپر نکال لیا جس میں مال مسروقہ تھا۔ اس چوری کا بوجھ یکدم ہی بڑھ گیا تھا۔ انتقاماً "لی ہوئی" چیزیں یکدم ہی ندامت کا سامان بن گئیں تھیں۔
میں نے احتیاط سے جگی بڑھیا کی چرائی ہوئی تمام چیزیں دوسرے شاپر میں منتقل کیں اور بولٹن مارکیٹ سے خریدی گئیں دونوں چادروں کا شاپر اٹھالیا اور انہیں لیتا ہوا اپنی بلڈنگ میں داخل ہوا۔
گرچہ صبح کا وقت تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت اس وقت ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ایسا سناٹا نہیں ہوتا جیسے اس وقت وہاں پھیلا ہوا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ بلڈنگ کے بیشتر گھروں پر تالا پڑا تھا۔ ان پر جمی گرد اور جالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکینوں کو رخصت ہوئے عرصہ بیت گیا ہے اور کسی نے انہیں دوبارہ آباد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے نیچے سے کھڑے کھڑے دیکھا۔ ہمارا گھر اور اس سے متصل دو چار گھر کھنڈر کا منظر پیش کر رہے تھے۔ نعیم اور جاوید کے گھر بھی بند پڑے تھے۔
طائرانہ نگاہ ڈالتے ڈالتے میری نگاہ کے فوکس میں اچانک "وہ" آگئی۔ وہی، میرے بچپن کی قاتل، میری ننھی منھی خوشیوں کی قاتل، میرے بے فکری کے دنوں کو آزردگی سے بھر دینے والی ظالم عورت۔۔۔ جگی بڑھیا۔
جس وقت میں نے اسے یہ نام دیا۔ وہ بڑھیا نہیں تھی۔ بڑی عمر کی عورت تھی۔ میں نے بس یوں ہی غصے میں اسے یہ نام دے دیا تھا۔ مگر آج وہ واقعی بوڑھی ہو چکی تھی۔ بہت بوڑھی۔ اس کی کمر بھی دہری ہو گئی تھی مگر طنطنہ باقی تھا۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔
جان لیوا سناٹے میں صرف دو نفوس سانس لے رہے تھے۔ ایک قاتل، ایک قتیل۔ ایک چور ایک مجرم۔ میں نے حوصلہ جمع کیا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔
"السلام علیکم۔" میں نے نرمی سے جھجکتے ہوئے اسے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔" اس کی پاٹ دار آواز گونجی۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگے کیا بولوں۔ وہ میرے تذبذب کو بھانپ گئی۔
"کس سے ملنا ہے؟ کہاں سے آئے ہو۔۔۔ کون ہو؟"
ایک گولہ سا میرے حلق میں پھنسنے لگا۔
"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ امانت تھی آپ کی۔۔۔ میرے پاس۔"
میں نے اس کا سامان اسے دیا۔
"میری امانت!" اس نے حیرت سے میرے ہاتھ سے شاپر لیا اور چیزیں دیکھنے لگی۔
کپڑے کی بنی گڑیا میں اپنا رنگ کھو چکی تھیں۔ بے بی فراک کا کپڑا بوسیدہ اور سیلن زدہ تھا۔ دوپٹے میں باریک باریک چھید ہو گئے تھے۔ جھنجھنا اکثر جگہوں سے پچک گیا تھا۔ وہ حیرت سے اس سامان کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ میرا نہیں ہے۔ کس نے دیا ہے تمہیں؟"

"یہ آپ ہی کا ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

اپنے سامنے کھڑے کسی باوقار، متین اور خوش لباس انسان سے وہ کسی مذاق یا بدتمیزی کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔ میرے اصرار پر میرا چہرہ کھوجنے لگی۔ مگر پہچاننے سے قاصر رہی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کا کوئی رنگ نہ تھا۔ ابھی اس کی حیرت باقی تھی کہ میں نے چادروں والا شاپر بھی اس کی طرف بڑھایا۔

"اور یہ میری طرف سے ہے۔۔۔ آپ کے لیے۔"

اس نے پھر شاپر تھاما اور اس میں جھانک کر دیکھا۔

"کون ہو تم؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا ۔۔۔ میں تمہیں نہیں جانتی۔۔۔ اور یہ سب۔" اس کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آرہا تھا۔

"میں ۔۔۔ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں ۔۔۔ ماں جی۔"

اچانک ایک گیند دھم سے آکر اس کے برآمدے میں گری۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ گیند کیا تھی۔ پرانے کپڑوں کو گول مول کر کے گیند کی شکل دے دی گئی تھی۔ وہ مجھے نظر انداز کر کے بچوں کو گھورنے لگی۔ میں نے بھی گیلری میں سے جھانکا۔ نیچے دو بچے، تین یا چار سال کی عمر کے کھڑے تھے اور بے بسی سے اپنی گیند کو اس کے ہاتھوں میں دیکھ رہے تھے۔

میں سیڑھیاں اتر کے نیچے آیا۔ دونوں بچے صرف نیکر پہنے، ننگ دھڑنگ باسی چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ بیٹ کی جگہ پرانی کسی پیٹی کی اکھاڑی ہوئی لکڑی ان کے ہاتھوں میں تھی۔ دونوں نے خوفزدہ اور سہمی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا مجھے ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔

"چلو اوئے! منہ بھی نہیں دھویا اور کھیلنے آگئے۔۔۔ بتاؤں تمہیں۔"

ناگاہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ "صاحب! آپ یہاں؟"

"یہ دونوں بچے تمہارے ہیں؟"

"جی صاحب۔" اس نے تھوک نگلا۔

"ان دونوں کو لے کر میرے گھر پہنچو۔" میں حکم دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ بیچارہ ہانپتا کانپتا دونوں کو میرے گھر لے آیا۔ میں نے تینوں کو صحن میں رکنے کی تاکید کی اور اندر جا کر وہ بلا اور کرکٹ کی بال لے آیا جو کل آتے ہوئے خریدی تھی۔ اور دونوں بچوں کی طرف بڑھائی۔ دونوں نے اپنے باپ کو دیکھا۔

"لے لو۔" میرے پرشفقت لہجے اور باپ کی اجازت سے دونوں نے بیٹ اور بال لے لی۔

"اور کھیلو یہاں۔۔۔ اور روز یہاں آکر کھیل لیا کرو، جب بھی تمہارا دل چاہے۔" میں نے اپنے صحن میں انہیں کھیلنے کی دعوت دی۔ ڈرائیور ہکا بکا کھڑا تھا۔

"اور تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جاؤ اپنی بیوی کو بھیجو۔۔۔ گھر کی صفائی کی ڈیوٹی اسی کی ہے نا۔"

"جی صاحب۔" وہ بوکھلاتا ہوا مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

ذرا سی دیر میں آنگن میں تیز چمکیلی دھوپ پھیل گئی تھی۔ میں اور ناہید فرسٹ فلور کی گیلری میں کھڑے چائے پی رہے تھے اور نیچے بچوں کو اپنے آنگن میں کھیلتے دیکھ رہے تھے۔ دونوں بچوں کو ان کی ماں نے ہاتھ منہ دھلا کر ڈھنگ کے کپڑے پہنا دیے تھے اور ان دونوں نے مزید بچوں کو بلا لیا تھا۔ تیز دھوپ میں ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ خوشی ان کی پیشانیوں پر پسینے کی بوندیں بن کر چمک رہی تھی۔

اچانک گیند تیزی سے اوپر آئی۔ ناہید ڈر کے نیچے جھکی اور میں نے اچک کر اسے پکڑا۔ ہم دونوں کے کپوں سے چائے چھلک کر کپڑوں پر گر گئی تھی۔ ہم نے بیک وقت داغوں کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ گیند میں نے واپس بچوں کی طرف اچھال دی۔

وہ خوش تھے۔ چلا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ میرا آنگن خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ میری فیملی مکمل ہو گئی تھی۔ کون کہتا ہے کہ "میں بانجھ ہوں۔" یہ سب بچے میرے بچے تھے۔

میں نے ایک نظر سامنے جھگی بستی کی بلڈنگ پر ڈالی۔ جہاں سناٹے مزید گہرے ہو گئے تھے۔

☆

شفق افتخار

"پولیس کا ہے کام مدد آپ کی۔" اس نے ایک نگاہ گیٹ پہ لگے سائن بورڈ پہ ڈالی تھی اور قدم اندر کی طرف بڑھا دیے تھے۔ جہاں مستعدی سے پھرتے اہلکاروں نے رک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اپنے مطلوبہ کمرے کا پوچھ کر اس طرف چلی آئی تھی۔

"سر! مجھے ایک رپورٹ درج کروانا ہے۔" اس

مکمل ناول

نے ڈیوٹی پہ موجود ایک انسپکٹر سے کہا۔

"جی.... ضرور آئیے.... بیٹھیے میڈم آپ۔" انسپکٹر نے بڑے ادب سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا، کیونکہ فی الحال وہ اس بات سے قطعی لاعلم تھا کہ یہ رپورٹ کس کے خلاف درج کروائی جائے گی۔ ساتھ ہی اس نے انٹرکام پہ کسی کو اندر آنے کے لیے کہا تھا۔ اسی لمحے ایک اہلکار کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے کچھ رجسٹر وغیرہ تھام رکھے تھے۔ شاید یہ وہی تھا جسے ابھی انٹرکام پہ بلایا گیا تھا۔

"جی میڈم.... کیا رپورٹ درج کروانا ہے اور کس کے خلاف؟ اور وقوعہ کیا ہے۔ ذرا تفصیل سے بتائیں۔" اس اہلکار نے کاغذ قلم سنبھالا تو وہ انسپکٹر بھی اپنی سیٹ پر الرٹ ہو کر بیٹھا۔

"سر! مجھے ہراساں کیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی میں بھی اور یونیورسٹی کے باہر بھی....." وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی

"میڈم، جو کہنا ہے کھل کر بولیں، ہم لوگ یہاں آپ کی مدد کرنے کے لیے ہی بیٹھے ہیں، آپ گھبرائیں مت۔" انسپکٹر کی بات سن کر اس کا اعتماد پھر سے بحال ہوا تھا۔

"سر! مجھے اشعر اقبال کے خلاف رپورٹ کروانی ہے۔ وہ اور اس کے دوست مل کر مجھے ہراساں کر رہے ہیں اور اپنی آفرز قبول نہ کرنے پہ مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے ہیں اس لیے مجھے مجبوراً آج یہاں آنا پڑا۔" وہ پراعتماد انداز سے بولتی چلی گئی تھی۔

"آپ بالکل صحیح جگہ آئی ہیں۔ ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔ بائی دا وے کون ہے یہ لڑکا اور اس کی ہمت کیسے ہوئی میرے علاقے میں کسی لڑکی کے ساتھ

ایسی حرکت کرنے کی۔" انسپکٹر کے ماتھے کے بل گہرے ہوگئے تھے جبکہ دوسرے اہلکار کا رنگ اشعر اقبال کا نام سن کر اڑ چکا تھا اور اس کا قلم کچھ بھی لکھنے سے انکاری ہو چکا تھا اور وہ مسلسل انسپکٹر کو اشارے کنایوں میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن انسپکٹر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ تب ہی اس اہلکار نے ایک پرچی پہ کچھ لکھا اور اسے انسپکٹر کے سامنے رکھ دیا تھا۔ جسے پڑھ کر اس انسپکٹر کا رنگ بھی بڑی تیزی سے بدلا تھا۔

"او بی بی۔۔۔ کیوں ہماری نوکری کے پیچھے پڑی ہو۔ جانتی ہو یہ ہیں کون۔۔۔ جن کے خلاف تم رپورٹ درج کروانے آئی ہو۔ یہ ہمارے علاقے کے ایم این اے صاحب کا بیٹا ہے۔" اس بندے کی ٹون ہی بدل گئی تھی۔

"سو واٹ سر۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کسی ایم این اے کا بیٹا ہے یا ایم پی اے کا۔ کرائم۔۔۔ کرائم ہوتا ہے۔ آپ اس کے خلاف رپورٹ درج کریں پلیز۔" وہ ابھی بھی اپنی بات پہ ڈٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے ہمیشہ یہی سیکھا تھا کہ حق اور سچ پہ ڈٹ جانا چاہیے۔

"او جاؤ بی بی۔۔۔ اپنا کام کرو۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ کل کو تم کسی کے بھی خلاف رپورٹ درج کروانے آجاؤ گی تو ہم کریں گے کیا؟ ایسے بے کار نہیں بیٹھے ہم گھر سے اس طرح بھاگو گی تو یہی ہوگا نا' اب یہی دیکھ لو۔ بھلا شریف بچیوں کا تھانے میں کیا کام۔ آجاتے ہیں منہ اٹھا کر کہیں سے بھی۔ سلیم! جاؤ بی بی کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔" اس قدر بے عزتی پہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس انسپکٹر کا منہ توڑ دے مگر اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ کا بہت شکریہ انسپکٹر۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ ایک آزاد اور بالغ شہری ہونے کے ناتے یہ میرا حق ہے جس سے آپ مجھے محروم کر رہے ہیں اور اپنے فرض سے بھی کوتاہی کر رہے ہیں لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے اور یہ سچ میں سب کے سامنے لا کر رہوں گی۔ آپ اچھی طرح جان لیجئے کہ مشہور جرنلسٹ علی حسنین میرے بڑے بھائی ہیں اور میڈیا کیا کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا۔" اس انسپکٹر کے چہرے پہ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔ اس کی حالت آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی ہو چکی تھی۔ وہ باہر نکل آئی تھی اور اسے باہر نکلتا دیکھ کر اس انسپکٹر نے تیزی سے اپنے موبائل پہ کوئی نمبر ڈائل کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شدید حبس کے بعد آج موسم بہت خوش گوار ہوگیا تھا۔ صبح سے چلتی ٹھنڈی ہوا نے گرمی کے احساس کو قدرے کم کر دیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش اس وقت قدرے تیز ہو چکی تھی۔ رائٹنگ ٹیبل پہ رکھی ڈائری کے ورق ٹیرس سے آتی تیز ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آفس سے آیا تھا۔ امی اور زارا سو چکے تھے۔ کھانا وہ باہر ہی کھا آیا تھا۔ ہاں کافی کی طلب نے جب زیادہ ستایا تو وہ اٹھ کر کافی بنانے چلا آیا تھا۔

سنو

سنو تم نے کبھی ساحل پہ بکھری ریت دیکھی ہے؟
سمندر پاس بہتا ہے!!
مگر اس کے مقدر میں ہمیشہ پیاس رہتی ہے!!
سنو تم نے کبھی صحرا میں جلتے پیڑ دیکھے ہیں؟
جو کو چھاؤں دیتے ہیں!!!
مگر ان کو صلے میں ہمیشہ دھوپ ملتی ہے
سنو تم نے کبھی شاخوں سے بچھڑے پھول دیکھے ہیں
یہ خوشبو بانٹ دیتے ہیں
بکھر جانے تک لیکن۔ ہوا کا ساتھ دیتے ہیں
سنو تم نے کبھی میلے میں بجتے ڈھول دیکھے ہیں
عجیب المیہ ہے ان کا
بہت ہی شور کرتے ہیں مگر اندر سے خالی ہیں
بس اتنی سی پہیلی ہے
بس اتنا سا فسانہ ہے

یہی میری کہانی ہے
کہ میں
اندر سے خالی ہوں
خالی دل۔ خالی دل
"محبت کرلینا بہت آسان ہے۔ کسی کو دل میں بسالینا آسان تر۔ پر یہ سوچ جان نکال لیتی ہے کہ کسی کو اتنا شدت سے چاہنے کے بعد بھی آپ اسے پا نہیں سکے تو۔"
اس نے تھک کر ڈائری کو بند کر کے رکھا تھا اور کافی کا مگ ایک سائیڈ پہ رکھ کر اپنا لیپ ٹاپ آن کر لیا تھا۔ اسے ایک رپورٹ پر کام کرنا تھا۔ تب ہی بجتے ہوئے موبائل نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ کال آئی ڈی رحمٰن کی تھی۔ وہ اس کا جونیئر تھا۔
"ہاں رحمٰن بولو۔" اس نے فون آن کر کے کان سے لگالیا۔
"سر! وہ کل کی رپورٹ کے بارے میں آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" رحمٰن کچھ جھجک کر بولا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ایسی کوئی بات سننا پسند نہیں کرتا تھا۔
"کیا بات۔" وہ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
"سر! وہ زاہد صاحب بہت شور مچا رہے ہیں کہ کل کے ایڈیشن میں یہ رپورٹ نہیں لگنی چاہیے۔"
"کیوں۔ زاہد صاحب کو کیا تکلیف ہے۔" اس نے تیکھے لہجے میں رحمٰن کی بات کاٹ دی تھی۔
"سر! دراصل اس بلڈنگ کا مالک ان کا قریبی رشتہ دار ہے۔ جس کے بارے میں یہ رپورٹ ہے۔"
شہر میں ایک کئی منزلہ عمارت ناقص میٹریل استعمال ہونے کی وجہ سے تعمیر کے صرف سال بھر بعد گر گئی تھی اور کتنے ہی لوگ اس حادثے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور کتنے ہی لوگ زخمی ہو کر اسپتال میں پڑے تھے اور اس کے علاوہ لوگوں کا جو نقصان ہوا تھا وہ الگ۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر کئی دنوں سے اس پہ کام کر رہا تھا اور اب تمام شواہد اور ثبوت کے ساتھ یہ رپورٹ کل کے اخبار میں شائع ہونا تھی۔
بلڈنگ کا جو اصل مالک تھا، وہ ملک سے باہر فرار ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ کام کرنے والے چند پرزوں کو پولیس نے محض خانہ پری کے لیے گرفتار کر رکھا تھا اور اب کل کی رپورٹ میں سب حالات کھل کر سامنے آجاتے، اس لیے رشتے دار ہونے کے ناتے زاہد صاحب کی پریشانی فطری تھی۔
"ہوں۔ اب سمجھا۔ ایک بات تو طے ہے رحمٰن کہ یہ رپورٹ کل کے ایڈیشن میں لگ رہی ہے اور دوسرا زاہد صاحب سے کہہ دو کہ اگر انہیں رشتہ داریاں نبھانی ہیں تو وہ گھر جا کر بیٹھیں اور ہمیں ہمارا فرض نبھانے دیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھ گئے نا میں کیا کہہ رہا ہوں۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔
اس نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ وہ حق اور سچ کا ساتھ دے۔ حق اور سچائی اس کے خون میں شامل تھی۔ اس کی تربیت کا حصہ تھی۔ اپنے اردگرد کے حالات دیکھ کر وہ دن رات کڑھتا رہتا تھا اور اپنے طور پر اپنا کردار ادا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے فون آف کر کے رکھا اور دوبارہ لیپ ٹاپ آن کر لیا تھا۔ اس معاملے میں اس کا ذہن بالکل صاف تھا۔

☼ ☼ ☼

چار سو سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے درخت، پیڑ پودے ہر طرف سبزے کی بہار تھی۔ آس پاس کتنے ہی پھول تھے۔ جنگلی پھول، رنگین اور خوب صورت رنگوں والے پھول۔ اس نے جھک کر کتنے ہی پھول توڑے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ اس وقت پھولوں سے بھر چکے تھے۔ وہ اس وقت سفید ٹخنوں تک آتے لباس میں ملبوس تھی اور کھلے بالوں میں پھولوں کا بنا تاج تھا۔ وہ ایک بے حد خوب صورت جنگل تھا۔ جس میں وہ اس وقت موجود تھی۔ قدرتی خوب صورتی سے مالا مال۔
یکایک اس کے ذہن میں خیال آیا اسے تو کہیں

پہنچنا تھا۔ کہاں۔۔۔؟ شاید کسی سے ملنے جانا تھا۔ ہاں وہ یہاں کسی سے ملنے ہی تو آئی تھی۔ اس ملاقات کا سوچ کر ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ جانے عشق اور دھڑکن کا آپس میں کیسا یہ تال میل ہے۔ محبوب سے ملاقات کا سوچ کر ہی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور اگر ملاقات ہو جائے تو سوچیے کہ کیا ہو۔۔۔ اس کے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگی تھی۔ سفید لباس ہوا سے سرسرا رہا تھا۔

برستی بارش کی کن من ماحول کو اور خوب صورت بنا رہی تھی۔ اردگرد کا منظر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے پراسرار سا ہو رہا تھا مگر وہ مسلسل چلتی جا رہی تھی۔ بے قرار۔۔۔ بے پروا۔۔۔ یک دم ہی اس کے سفید بے داغ لباس پہ بارش کے برستے قطروں میں سے ایک قطرہ گرا تھا۔ سرخ قطرہ۔۔۔ گاڑھا سرخ۔۔۔ تازہ خون کی مانند بالکل گاڑھا سرخ۔۔۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے لباس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے قدم ڈگمگا کر رہ گئے تھے اور پھر جیسے اس کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

بارش کے تمام قطرے اب تیزی سے سرخ رنگ میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس کا لباس تیزی سے سرخ رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ گاڑھا سرخ خون اور سامنے نظر آتے منظر نے اس کی نگاہوں کو بھی خون آشام کر دیا تھا۔ اب اس کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑک رہا تھا، کیونکہ جو دل کا مکین تھا۔ دھڑکنوں میں بستا تھا۔ یہ بارش تو اس کے خون سے ہو رہی تھی۔

زمین پہ اس کے قدموں کے پاس وہ جنگل میں خون میں لت پت پڑا تھا۔ زمین اس کے خون ناحق سے رنگین ہو رہی تھی اور آسمان جیسے خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس کا بے داغ لباس اب مکمل طور پہ سرخ رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آواز گلے میں گھٹ سی گئی تھی۔ جسم سے جان کیسے نکلتی ہے یہ اس نے آج جانا تھا۔

کیونکہ جو شخص اس وقت زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ وہ اس کی زندگی تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھتی چلی گئی تھی۔ وہ تو اس سے ملنے آئی تھی۔ محبت کا میٹھا درد دل میں بسائے۔ اسے بتانے آئی تھی کہ وہ اسے کس قدر عزیز ہے۔ پر یہاں تو۔۔۔ وہ اب بلند آواز سے رو رہی تھی۔

اسے لگا وہ جیسے نیند میں رو رہی ہے، ہچکیوں سے۔۔۔ کسی احساس کے تحت اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کیسا احساس تھا؟ ڈر کا، خوف کا۔۔۔ یا کسی بہت اپنے کے چھن جانے کا خوف۔۔۔ یک دم ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا اور بدن پسینے میں شرابور تھا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے سائیڈ ٹیبل سے پانی اٹھا کر پیا کپکپاتے ہاتھوں سے ٹیبل لیمپ روشن کیا تھا۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

یہ خواب اس نے آج دوسری بار دیکھا تھا۔ پہلی بار بھی وہ اتنا ہی ڈر گئی تھی جتنا کہ آج۔۔۔ پانی پی کر اس کے حواس ذرا قابو میں آئے تھے۔ یکایک اس کا دھیان مصطفیٰ کی طرف گیا تھا۔ کیونکہ پہلی بار کی طرح آج بھی وہ خون میں لت پت چہرہ پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔

"مگر یہ مصطفیٰ تو نہیں تھا۔" اس نے خود ہی اپنے خیال کو جھٹکا تھا۔

"تو پھر۔۔۔ کون۔۔۔؟" جو اس کے دل میں تھا اسے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ زبان پہ لانا نہیں چاہتی تھی۔

"حسنی۔۔۔" ایک سرسراتی سرگوشی اس کے لبوں سے نکلی۔ وہ پورے دل و جان سے کانپ اٹھی۔ اس نے حیرانی سے پریشان دل کی سرگوشی سنی تھی۔ گویا محبت نے بہت گہرے نیچے کہیں بہت نیچے تہ تک اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"زارا تمہیں کیا ضرورت تھی میری غیر موجودگی میں اکیلے اتنا بڑا قدم اٹھانے کی۔ جب میں نے کہا بھی تھا کہ میں خود ہی اس معاملے کو ہینڈل کرلوں گا۔"

"سوری بھائی۔۔۔ وہ میں۔۔۔" وہ شرمندگی سے دھیمی

آواز میں بولی۔ اسے بھی اب معاملے کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا کہ اسے بھائی کی غیر موجودگی میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔

"امی! آپ کو تو اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ میں دو دن کے لیے گھر سے باہر کیا رہا۔ یہ محترمہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئیں۔ اگر کوئی بات ہو جاتی تو۔۔۔"

وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں دو دن کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور آج صبح ہی واپس آیا تھا اور ابھی جب اسے زارا کے اکیلے پولیس اسٹیشن جانے کے بارے میں پتا چلا تو اس کا غصے میں آنا فطری تھا۔

"بیٹے! میں کیا سمجھاتی اسے۔ یہ مجھے بتا کر تھوڑی گئی تھی۔ مجھے بتا کر جاتی تو میں بھلا اسے جانے دیتی اور ویسے بھی تمہاری دی ہوئی ڈھیل ہے۔ اب خود بھگتو۔۔۔ تم دونوں بہن بھائی بھلا کب کسی کی سنتے ہو۔"

امی حسب معمول ہمیشہ کی طرح سارا الزام بیٹے کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو چکی تھیں۔

"جی بھائی۔۔۔ امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو پُراعتماد ہونا چاہیے۔ اپنے حقوق کا پتا ہونا چاہیے۔ اور اس کے لیے آواز بھی اٹھانی چاہیے۔ زارا کا ازلی اعتماد لوٹ آیا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر مجھے صرف اس بات پر اعتراض ہے کہ تم وہاں اکیلی صرف دوستوں کے کہنے پر چلی گئیں۔۔۔ کیا تمہارا کوئی دوست ساتھ گیا تھا۔۔۔ یقیناً نہیں گیا ہوگا۔" اس نے زارا کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسی لیے اپنی بات جاری رکھی۔

"دیکھو زارا۔۔۔ میرا دن رات ایسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں ایسے معاملات کو بگڑتے دیر نہیں لگتی' اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں خود اس معاملے کو ہینڈل کروں۔ کیونکہ ایک دفعہ پہلے بھی میں اس کے باپ سے اس معاملے پر بات کر چکا ہوں۔ انی وے' میں دیکھتا ہوں کہ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ کیونکہ اس انسپکٹر کے رپورٹ درج نہ کرنے کا مطلب ہے کہ وہ ان کا آدمی

ہے اور اب تک یقیناً" وہ اس بات کو ان لوگوں تک پہنچا چکا ہوگا۔ بس اب تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

پہلے تو اس نے اس بات کو یونیورسٹی کا ایک معاملہ سمجھ کر اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا مگر اب معاملہ حد سے بڑھتا جارہا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے ڈین سے پہلے ہی شکایت کرچکا تھا اور اس کا خاطر خواہ جواب نہ ملنے پہ اشعر اقبال کے باپ سے بھی مل چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو سمجھائے کہ وہ یونیورسٹی کے اندر ایسا نہ کرے اور تعلیمی ادارے کے تقدس کا خیال رکھے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اور اب زارا نے اس معاملے میں پولیس کو انوالو کرکے معاملے کو کسی حد تک سنگین کردیا تھا اور اب اسے ہی کچھ کرنا تھا۔

"آئی ایم سوری بھائی۔ میری وجہ سے آپ کو اتنی پریشانی ہورہی ہے۔ مجھے فراز نے بھی منع کیا تھا کہ میں نہ جاؤں۔ پر پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا کہ میں نے آپ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔" زارا کو اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں سے پریشانی کا اندازہ ہوچکا تھا اور وہ اب اپنی جلدبازی پر پچھتا رہی تھی۔

"کاش کہ تم فراز کو ہی اپنے ساتھ لے جاتیں۔"

فراز اس کے بابا کے دوست کا بیٹا تھا اور زارا کا یونیورسٹی فیلو بھی۔ وہ خاصا سمجھ دار اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔

"چلو اب تم اتنی پریشان نہ ہو۔ میں دیکھ لوں گا۔ بس تھوڑی احتیاط سے کام لو۔ کل سے ویسے بھی تمہاری یونیورسٹی سے چھٹیاں ہیں۔ تو تم بلاضرورت گھر سے باہر نہیں نکلوگی، فون بھی یوز نہ ہی کرو تو بہتر ہے اور امی آپ بھی۔ باہر جانا ہو تو ڈرائیور کو ساتھ لے جائیں یا میرے ساتھ جائیں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک میں اس مسئلے کو حل نہ کرلوں۔ سمجھ گئے ہیں نا آپ لوگ۔" اس نے اپنی بات مکمل کرکے زارا اور امی کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا جیسے تم کہو۔ اس زارا کو تو عادت ہے اپنے گلے میں کوئی نہ کوئی مصیبت ڈالے رکھنے کی اور ساتھ میں ہمیں بھی پریشان کرتی ہے۔" امی نے ایک تیز نگاہ زارا پہ ڈالی تھی۔ جواب خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پریشانی اب اس کے چہرے پر صاف نظر آرہی تھی۔

"چلو بچے تم کھانا تو کھاؤ۔ دو دن بعد گھر آئے ہو اور آتے ہی اس پریشانی میں گھر گئے۔" امی نے انہیں کھانے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ جسے وہ لوگ اپنی باتوں میں لگ کر کھانا یکسر بھول چکے تھے۔

"جی امی۔ زارا تم پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ چلو کھانا کھاؤ۔ شاباش۔"

وہ پیار سے زارا کا سر تھپک کر بولا تھا اور خود بھی کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تھینک یو منال۔ آج تم نے میری بہت مدد کرادی یار۔ ورنہ میں تو پریشان ہی ہوگئی تھی۔" بھابھی نے کچن پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ جہاں دعوت کا سارا انتظام مکمل تھا۔

"اس میں تھینک یو کی کیا ضرورت ہے بھابھی۔ میں فارغ ہی تھی۔" منال نے سویٹ ڈش کو گارنش کے بعد فریج میں رکھا۔

"کیوں آج تمہاری ڈیوٹی نہیں ہے؟" بھابھی نے وہیں کچن ٹیبل کی چیئر پہ بیٹھ کر سلاد بنانا شروع کیا۔

"دراصل امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ورنہ وہ میری کافی مدد کردیتیں اور ملازمہ کا تو تمہیں پتا ہے۔ صبح کام کرکے چلی جاتی ہے تو دوبارہ آنے کو تیار نہیں ہوتی۔ پھر ارتضیٰ نے بھی اچانک ہی دوستوں کو دعوت پہ بلالیا۔"

ارتضیٰ بھائی، منال کے تایا زاد تھے۔ آج انہوں نے اچانک ہی اپنے دوستوں کی دعوت کی تھی اور تائی امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سو فائزہ بھابھی نے منال سے مدد مانگی تھی اور آج چونکہ منال اس وقت فارغ تھی۔ سو ان کی مدد کرنے اوپر چلی آئی تھی۔ ورنہ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہ گھر پہ کم ہی نظر آتی تھی لیکن

آج اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔
"ہیلو لیڈیز... بن گیا کھانا... خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔" اسی پل مسکراتے ہوئے مصطفیٰ نے کچن میں داخل ہو کر کہا۔
"ہاں بھئی، تمہیں تو خوشبو آئے گی۔ کھانے کو منال کا ہاتھ جو لگ گیا ہے۔" بھابھی نے ہنستے ہوئے اسے کہا۔
مصطفیٰ نے ایک مسکراتی نگاہ منال پہ ڈالی۔ وہ اس لمحے اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا دی تھی۔
مصطفیٰ... ارتضیٰ بھائی سے چھوٹا تھا اور اس کا اور منال کا نکاح اس وقت ہوا تھا جب ابھی منال میڈیکل کے سکینڈ ایئر میں تھی اور مصطفیٰ نے اس وقت اپنی انجینئرنگ مکمل کی تھی۔
یہ نکاح دونوں کی خوشی اور گھر والوں کی مکمل رضامندی سے ہوا تھا اور رخصتی منال کے ہاؤس جاب کے بعد متوقع تھی اور آج کل وہ ہاؤس جاب مکمل کر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کر رہی تھی اور مصطفیٰ اپنا سوفٹ ویئر ہاؤس کامیابی سے چلا رہا تھا۔ سو عنقریب ہی رخصتی متوقع تھی۔ منال کا دل و دماغ اس رشتے سے بہت خوش اور مطمئن تھے مگر اب جانے کیوں اپنی آنے والی زندگی کا سوچ کر اور مصطفیٰ اور اپنے رشتے کے بارے میں سوچ کر اس کا دل ڈوب سا جاتا تھا۔
"ارے کیا ہوا... کیا سوچ رہی ہو۔" بھابھی کب کچن سے گئیں اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ احساس تب ہوا جب مصطفیٰ نے ہلکے سے اس کا گال چھوا تھا۔ وہ چونک سی گئی تھی۔
"کچھ نہیں... کیا ہو گا... چائے پیو گے۔" اس نے فوراً ہی خود کو کمپوز کیا تھا۔ اسے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی تھی کہ وہ مصطفیٰ کے نکاح میں ہے۔ اس کی امانت اور اسے خائن نہیں بننا تھا۔
"شیور... پر ساتھ دینا پڑے گا۔" مصطفیٰ چیئر کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔
مصطفیٰ کے چہرے پہ اس پل بڑی کھلی کھلی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں بے پناہ چاہت... اور اسے یہ مسکراہٹ نہیں چھیننی تھی۔ فیصلہ صاف اور واضح تھا۔ وہ بھی کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔ وہ سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیتا گاڑی اندر لے آیا تھا۔
"کیسے ہیں حسنی بابا... بڑے دنوں بعد آئے۔" چوکیدار اسے گاڑی سے اترتا دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں کریم بابا..."
"مالک کا بڑا کرم ہے حسنی بابا... سب خیریت ہے۔"
"مصطفیٰ اندر ہے کریم بابا..." اس نے اندر قدم بڑھانے سے پہلے ان سے پوچھا تھا اور ان سے اثبات میں جواب ملنے پہ اندر چلا آیا تھا۔
آج کافی دنوں کے بعد وہ مصطفیٰ سے ملنے آیا تھا۔ مصطفیٰ نہ صرف اس کا خالہ زاد تھا بلکہ بہترین دوست بھی تھا مگر پچھلے کئی دنوں سے وہ زارا والے معاملے میں اس بری طرح الجھا رہا تھا کہ کسی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی اور یہ بات بھی ایسی تھی کہ وہ کسی سے شیئر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اب اس نے یہ مسئلہ حل کر لیا تھا اور اب یونیورسٹی کے ڈین اور اس لڑکے کے والد نے مکمل یقین دہانی کرائی تھی کہ اب ان لوگوں کو کوئی شکایت نہیں ہو گی کیونکہ اس بار حسنی نے اپنے جرنلسٹ ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور ان لوگوں کو جواب میں سنگین نتائج کی وارننگ دی تھی اور بات کو بگڑتا دیکھ اور میڈیا میں جانے کے خوف سے ان لوگوں نے آئندہ ایسی کسی بھی قسم کی شکایت نہ ملنے کی یقین دہانی کرا دی تھی مگر پھر بھی اس نے زارا کو احتیاط برتنے کی خاص تاکید کی تھی کیونکہ اسے ان لوگوں پہ بھروسا نہیں تھا لیکن وہ زارا کو گھر میں بند کر کے بھی نہیں رکھ

سکتا تھا۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی اور وہ بھی اس وقت جب یہ اس کا لاسٹ سمسٹر چل رہا تھا اور دو دن بعد اس کے ایگزامز اسٹارٹ ہو رہے تھے مگر اس وقت وہ سب کچھ بھلائے یہاں چلا آیا تھا تاکہ مصطفیٰ کے ساتھ کچھ وقت گزار سکے۔

اندر آتے ہی اس کی پہلی نگاہ منال پہ پڑی تھی، جو چائے کا مگ تھامے بڑی فرصت سے بیٹھی تھی۔

"ہیلو ڈاکٹر، کیا حال ہے بھئی... کیا ہو رہا ہے۔ اب تو تم نظر ہی نہیں آتی ہو۔" وہ سلام دعا کے بعد وہیں بیٹھ گیا تھا۔ پتا تھا کہ اس کی آمد کی خبر ملتے ہی مصطفیٰ چند لمحوں بعد خود ہی نیچے چلا آئے گا۔

"میں تو ٹھیک ہوں اور یہیں ہوں۔ نظر تو آپ نہیں آتے۔" منال نے الٹا اس سے شکوہ کر دیا تھا۔ جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ وہی گرفت میں لینے والی دل نشین ہنسی۔

"السلام علیکم چاچو..." اس سے پہلے کہ وہ منال کو جواباً کچھ کہہ پاتا۔ سامنے سے آتے اس کے پاپا کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جن کو مصطفیٰ کی طرح وہ بھی چاچو ہی کہا کرتا تھا۔

"واہ بھئی... آج تو مشہور لوگ میرے گھر آئے ہیں۔" انہوں نے بھی منال کی طرح شکوہ ہی کیا تھا۔ جسے سن کر منال بھی مسکرا دی تھی۔ وہ انہیں وضاحت دینے لگا تھا۔

"جانتا ہوں مصطفیٰ سے ملنے آئے ہو مگر اب کچھ دیر یہاں بھی بیٹھ جاؤ۔ مصطفیٰ کو بھی یہیں بلوا لیتے ہیں۔ منال بیٹا جاؤ، ذرا اچھی سی چائے تو بنواؤ۔"

"جی بابا..." وہ اپنا مگ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لبوں پہ وہی دھیمی نرم مسکراہٹ تھی۔ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ پشت پہ پھیلے براؤن گھنگریالے بالوں کو حسنی نے بس ایک نگاہ ہی دیکھا تھا کہ اس سے زیادہ نہ سکت تھی اور نہ ہی اجازت...

منال کچن میں آئی۔ اسپتال میں ایک تھکا دینے والا دن گزارنے کے بعد ایک خوش گوار شام اس کے لبوں پہ مسکراہٹ لے آئی تھی۔ جس وقت اس نے ٹرے سجا کر ملازمہ کے ہاتھ بھیجی تب تک وقت مصطفیٰ بھی نیچے آچکا تھا اور اب ان لوگوں کی باتوں اور ہنسنے کی آوازیں کچن تک آ رہی تھیں۔

منال وہاں جانے کے بجائے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ نہ جانے کیوں دل کبھی کبھی ایسے راستے پہ قدم رکھ دیتا ہے کہ جو بہت طویل اور تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ منزل نظر ہی نہیں آتی کیونکہ شاید اس راستے کی کوئی منزل ہوتی ہی نہیں ہے۔ پھر بھی جانے کیوں دل اسی راستے پہ قدم رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆
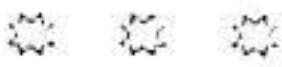
جنہیں خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے
انہیں راتیں چھوٹی لگتی ہیں اور...

جنہیں خواب پورا کرنا اچھا لگتا ہے
انہیں دن چھوٹا لگتا ہے

اس کی آنکھوں میں ان گنت خواب تھے۔ دل نشین... دل کش خواب... جنہیں پورا کرنے کا وہ خواہش مند تھا مگر یہ خواب ان سارے خوابوں میں سے اس کی آنکھوں کا سب سے حسین خواب تھا مگر حسنی اس خواب کو پورا کرنا چاہتا بھی نہیں تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسا ہی خواب اتنی ہی شدت سے کسی اور کی آنکھوں کو بھی روشن کیے ہوئے ہے اور ان آنکھوں کی روشنی اسے دل و جان سے عزیز تھی۔

کھلے لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ وہ جانے کب سے نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ جہاں ایک ہی تصویر روشن تھی۔ کام کرتے کرتے جانے کس وقت وہ تصویروں والا فولڈر کھول بیٹھا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا اور اب آنکھوں میں وہ پل جیسے پھر سے جی اٹھے تھے۔ جب وہ سب لوگ فیملی ٹرپ پہ ناردرن ایریاز کی سیر کو گئے تھے۔ یہ تب ہی کی تصویر تھی۔ اس تصویر میں سب ہی موجود تھے مگر وہ ایک چہرے پہ نگاہیں ٹکائے ہوئے تھا۔ آنکھوں میں چمک اور لبوں پہ وہی دھیمی

مسکراہٹ تھی اور نہ جانے کب تک وہ ایسے ہی بیٹھا رہتا' اگر دروازے پہ ہونے والی دستک اسے اپنی طرف متوجہ نہ کرلیتی۔

"آجائیں۔۔۔" حسنی نے لیپ ٹاپ بند کر کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔

"ارے امی آپ۔۔۔ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔" وہ امی کو اندر آتے دیکھ کر فوراً" ہی سیدھا ہو بیٹھا اور قدرے فکر مندی سے پوچھا۔

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے بیٹا۔ بس نیند نہیں آرہی تھی تو سوچا کہ تھوڑی دیر تم سے باتیں کرلوں۔" امی اس کے پاس بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"یہی تو میں جاننا چاہ رہا ہوں کہ میری پیاری سی امی کو نیند کیوں نہیں آرہی تھی۔" حسنی نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"سچ بتاؤں حسنی! تو میں زارا کی وجہ سے کافی فکر مند ہو گئی ہوں۔ اس سارے معاملے کی وجہ سے میں بہت گھبرا گئی ہوں۔ میرا دل بہت ڈر رہا ہے بیٹا۔۔۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو۔۔۔" پریشانی ان کے چہرے پہ صاف نظر آرہی تھی۔

"امی! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ اب تو وہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ اس لڑکے کے یونیورسٹی آنے پہ پابندی لگ چکی ہے۔ ویسے بھی وہ یونیورسٹی کا سابقہ اسٹوڈنٹ تھا۔ اس لڑکے کے باپ سے بھی میری سیٹل منٹ ہو گئی ہے۔ اب آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں اور زارا کا بھی یہ لاسٹ سمسٹر ہے اور ایگزامز کے بعد تو وہ گھر پر ہی رہے گی نا۔" حسنی نے تفصیلاً" انہیں سمجھایا تھا مگر پھر بھی وہ کچھ خاص مطمئن دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ آخر ماں تھیں نا۔ شاید کسی انہونی کا احساس تھا انہیں۔

"حسنی میں چاہتی ہوں بیٹا کہ اب زارا کی شادی کردوں۔ فراز کی امی کئی بار اشارتا" مجھے کہہ چکی ہیں۔ تمہارے بابا بھی فراز کو کافی پسند کرتے تھے۔ ویسے بھی فراز اچھا لڑکا ہے اور زارا بھی اسے جانتی ہے۔ میرا دل بہت ڈر گیا ہے بیٹا۔ تمہارے بابا کی یوں اچانک ڈیتھ کے بعد میری جان تم دونوں میں ہی اٹکی رہتی ہے۔"

حسنی نے ان کے قریب ہو کر ان کے کندھے پہ بازو پھیلا لیا اور انہیں خود سے لگالیا۔ بابا کے بعد اب امی ہی ان دونوں کے لیے سب کچھ تھیں۔

"ٹھیک ہے امی! جیسا آپ کو ٹھیک لگے' آپ کریں۔ مگر ایک بار زارا سے ضرور پوچھ لیں۔ بس آپ اتنی ٹینشن نہ لیں۔۔۔ کیونکہ آپ کی جان ہم دونوں میں اٹکی رہتی ہے لیکن اگر آپ نے اپنی طبیعت خراب کرلی نا تو ہم دونوں کی جان پہ بن آئے گی۔"

"ہش بد تمیز۔۔۔ اللہ نہ کرے کبھی تم دونوں کو کچھ ہو۔۔۔ فضول باتیں مت کیا کرو۔" امی نے ہولے سے اسے جھڑکا۔ "تم دونوں ہی تو میری کل کائنات ہو۔ ایک بار میں زارا کی طرف سے ذرا مطمئن ہو جاؤں تو پھر تمہارا بھی کچھ کرتی ہوں۔" امی نے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ ہنس پڑا تھا اور اس خوب صورت پر کشش ہنسی کی انہوں نے کتنی ہی بلائیں لے ڈالی تھیں۔

"ٹھیک ہے امی۔۔۔ مگر اب آپ سو جائیں۔۔۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

"ہاں میں تو جا رہی ہوں سونے۔۔۔ مگر اب تم بھی سو جاؤ حسنی۔۔۔ رات کافی ہو گئی ہے۔ اب کام کرنے مت بیٹھ جانا۔" امی اس کی پیشانی چوم کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

امی کے جانے کے بعد اس نے پھر سے لیپ ٹاپ کھول لیا تھا۔ جہاں اب بھی وہی تصویر کھلی پڑی تھی۔ جن آنکھوں میں خواب اتر آئیں' ان آنکھوں میں اتنی آسانی سے نیند کہاں آتی ہے بھلا۔۔۔ لیکن وہ یہ بات کسی سے بھی کہہ نہیں سکتا تھا۔ جانتا تھا کہ آج کی رات وہ پھر سے جاگتے ہوئے گزارے گا۔

☆ ☆ ☆

آج زارا کا فائنل اسائنمنٹ تھا۔ دل و دماغ پہ جیسے ایک بوجھ سا دھرا تھا جو آج اسے اترتا ہوا محسوس ہو رہا

تھا۔ ایک طرف فائنل ایگزام کی ٹینشن تھی تو دوسری طرف اشعر اقبال کا خوف اس کے دل و دماغ پہ سوار ہو چکا تھا اور تیسری طرف وہ بھائی کی ہدایت کے مطابق محتاط رہتے رہتے جیسے تھک سی گئی تھی۔ یونیورسٹی کے پہلے ہی روز سے اشعر اقبال اور اس کے دوستوں نے جیسے اس کا پیچھا ہی لے لیا تھا۔ وہ جتنا ان لوگوں کو نظر انداز کرتی تھی، وہ لوگ اتنا ہی اس کے پیچھے آتے تھے اور یونیورسٹی میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ زارا نے اسے خود سے اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ حالانکہ اس نے کبھی بھی اس بندے کی کسی بھی قسم کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ پہلے وہ کبھی گھر پہ بھی ذکر نہیں کرتی تھی مگر پھر معاملہ اس قدر بڑھا کہ امی اور بھائی کو پتا لگ گیا۔

پر آج اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اب اس کی جان چھوٹ جائے گی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ صرف اس کی سوچ تھی۔ پیپرز کے دوران اسے حسنی نے ہی پک اینڈ ڈراپ کیا تھا اور آج بھی وہی اسے لینے آرہا تھا مگر وہ اپنی کسی میٹنگ کی وجہ سے تھوڑا لیٹ ہو گیا تھا اور ابھی اس کی کال آئی تھی کہ وہ پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہے۔

"سوری یار۔۔۔ تھوڑا لیٹ ہو گیا۔ ابھی بھی میٹنگ ادھوری چھوڑ کر آیا ہوں۔" حسنی نے زارا کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔۔۔ سوری بھائی، آپ کو میری وجہ سے اتنی پریشانی ہوئی۔۔۔ میں۔۔۔" حسنی نے ایک خفگی بھری نگاہ زارا پہ ڈالی تو اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"زارا! آج تو یہ کہہ دیا ہے، آئندہ نہ کہنا۔۔۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور اگر ہو بھی تو تم میری بہن ہو۔ میری ذمہ داری ہو۔ تمہارا خیال رکھنا میرا فرض ہے، آئی سمجھ۔" حسنی نے بابا کے بعد ہمیشہ زارا کو ایک بڑے بھائی سے زیادہ باپ بن کر پروٹیکٹ کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ زارا بھی ہمیشہ ہر بات کے لیے بھائی کی طرف ہی دیکھتی تھی اور حسنی نے بھی اسے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔

"چلو اب اترو۔۔۔ اور ہاں امی سے کہنا آج میں تھوڑا لیٹ ہو جاؤں گا۔" حسنی نے گھر کے سامنے گاڑی روکی تھی۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے بھائی۔۔۔ لنچ تو کرلیں۔" زارا نے اترتے ہوئے اسے وہیں ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ میٹنگ ادھوری چھوڑ کر آیا ہوں۔ تم جاؤ شاباش۔۔۔"

"ٹھیک ہے بھائی" زارا گاڑی سے اتری تو حسنی نے چوکیدار پہ ایک نگاہ ڈالی تھی۔ وہ مستعد بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی گارڈ بھی الرٹ کھڑا تھا۔ یہ گارڈ اس نے چند دن پہلے ہی تعینات کیے تھے اور اس کی کارکردگی سے وہ مطمئن بھی تھا۔ زارا گھر کے اندر چلی گئی تو اس نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔ اسے ابھی آفس پہنچنا تھا۔

علی حسنین اپنے بابا کا چھوڑا ہوا پرنٹنگ پریس چلا رہا تھا اور بہت کامیابی سے چلا رہا تھا۔ اس کا اخبار شہر کا اچھا اور مستند اخبار مانا جاتا تھا اور اپنے اخبار کے نام سے ہی وہ بہت جلد ایک چینل کھولنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ جس کا تقریباً کام مکمل ہو چکا تھا، جبکہ اس کے علاوہ حال ہی میں اس نے ایک پرائیویٹ چینل کے اینکر پرسن کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور اس کا پروگرام لوگوں میں بہت مقبول ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زارا نے عصر کی نماز پڑھ کر جاءنماز لپیٹ کر صوفے پہ رکھی تھی۔ گھر آنے کے بعد اس نے امی کے ساتھ لنچ کیا تھا اور اپنے کمرے میں آکر سو گئی تھی۔ ابھی اس کی آنکھ کھلی تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے فوراً اٹھ کر وضو کیا اور نماز ادا کی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی اس نے فائر کی آواز سنی تھی اور وہ آواز نہایت قریب سے آئی تھی۔ بالکل ایسے جیسے فائرنگ بالکل گھر کے باہر ہوئی ہو۔

زارا فوراً ہی گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ تاکہ

امی کے پاس جاسکے۔ امی پہلے سے ہی لاؤنج میں موجود تھیں۔ وہ بھی فائر کی آواز سن کر ہی کمرے سے باہر آئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور لب مسلسل ورد کررہے تھے۔ جانے کیوں ان کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ زارا ان کے پاس آگئی تھی۔ دونوں کو ہی یہ اطمینان تھا کہ باہر گیٹ پہ چوکیدار اور گارڈز دونوں ہی موجود ہیں۔ اس لیے وہ کسی حد تک محفوظ ہیں مگر یہ ان کی غلط فہمی تھی۔

اگلے ہی لمحے لاؤنج میں لان کی طرف موجود گلاس ڈال ایک چھناکے سے ٹوٹی تھی اور نہایت تیزی سے چار لوگ اندر کودے تھے' کیونکہ لاؤنج کا دروازہ اندر سے لاک تھا اور کوشش کے باوجود اتنی آسانی سے باہر سے کھولا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ دونوں ڈر کے مارے ایک دوسرے کے اور بھی قریب آگئیں۔ امی نے زارا کو خود سے لپٹالیا تھا۔ وہ فائرنگ باہر موجود چوکیدار اور گارڈز پہ کی گئی تھی۔ اب وہ زندہ تھے یا نہیں' وہ دونوں نہیں جانتی تھیں۔ کیونکہ اگر زندہ ہوتے تو اب تک ان کی مدد کو آچکے ہوتے۔ وہ تعداد میں کل پانچ تھے اور ان لوگوں نے اپنے چہروں کو بھی چھپانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی تھی اور زارا نے با آسانی پہچان لیا تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔ ان کے ارادے خطرناک تھے۔ اس کا اندازہ ان دونوں کو اچھی طرح ہوچکا تھا۔

امی نے زارا کو خود میں چھپانے کی ایک ناکام سی کوشش کی تھی مگر ایک شیطانی طاقت نے بے دردی سے انہیں الگ کیا تھا اور وہ دو ناتواں خواتین کر بھی کیا سکتی تھیں' جبکہ وہ پانچ توانا مرد تھے اور ان میں چھٹا شیطان۔۔۔ اشعر اقبال زبردستی زارا کو کھینچ کر کمرے میں لے گیا تھا اور انہیں اسٹور روم میں بند کردیا گیا۔

زارا کا دوپٹا ابھی بھی نماز کے اسٹائل میں بندھا ہوا تھا۔ ایک ماں کے ہاتھ اسٹور روم کا دروازہ پیٹ پیٹ کر سرخ ہوگئے تھے اور چیخ چیخ کر گلے میں خراشیں پڑ گئیں تھیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی اور سب منتیں۔۔۔ واسطے بے کار گئے۔ دور کہیں سے اذان کی آوازیں ابھی بھی آرہی تھیں۔ جب انہوں نے ایک دلدوز چیخ سنی تھی۔۔۔ تو گویا جیت شیطان کی ہوئی اور ان کی معصوم' بے قصور زارا' آج پامال ہوئی۔۔۔ وہ دل تھام کر وہیں بیٹھتی چلی گئی تھیں۔

"حسنی۔۔۔ میری زارا۔۔۔"

ایک گھٹی گھٹی سی آواز ان کے حلق سے نکلی تھی۔ تسبیح ابھی بھی ان کے ہاتھ میں دبی تھی۔

☼ ☼ ☼

علی حسنین میٹنگ روم سے نکلا تو رحمٰن نے بتایا کہ مصطفیٰ کافی دیر سے آیا بیٹھا ہے۔ مصطفیٰ کی آمد کا سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔

"آہا۔۔۔ آج میرے یار کو بھی میری یاد آہی گئی آخر۔۔۔" حسنی نے آفس میں داخل ہوتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ مصطفیٰ ہنستے ہوئے اس کے گلے آلگا

"میری جان تیری یاد تو ہمیشہ ہی آتی ہے۔ بس یہ زندگی کے جھمیلے جان ہی نہیں چھوڑتے۔"

مصطفیٰ کے شکوے پہ حسنی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"جناب کی رخصتی ابھی ہوئی نہیں اور زندگی کے جھمیلوں نے پہلے ہی گھیر لیا۔ آجا بیٹھ۔" مصطفیٰ سامنے رکھے صوفے پہ بیٹھا تو اس نے انٹر کام اٹھا کر کافی اور ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا تھا۔ کیونکہ اس نے ابھی تک لنچ نہیں کیا تھا اور اس وقت بھوک زوروں پہ تھی۔

"اور سناؤ طیفی' گھر میں سب کیسے ہیں اور جناب ڈاکٹر صاحبہ کا کیا حال ہے۔" وہ بولتا ہوا اس کے پاس ہی آبیٹھا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ مصطفیٰ کچھ بولتا' حسنی کا موبائل بج اٹھا تھا۔ کالر آئی ڈی دیکھ کر اس نے فوراً" کال پک کی تھی کیونکہ یہ گھر سے اس کے گارڈ کی کال تھی۔ گارڈ جو دو گولیاں لگنے کے باوجود خوش قسمتی سے بچ گیا تھا۔ اس نے اکھڑی سانسوں کے درمیان حسنی کو گھر پہ ہونے والے واقعے کی اطلاع دی تھی اور وہ اطلاع۔۔۔ جیسے حسنی کی سانس اکھڑ گئی تھی۔ وہ تیزی

سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مصطفیٰ نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھا تھا۔ اسے بھی یک دم ہی کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔

"حسنی کیا ہوا؟"

"طفی! گھر چلو فوراً"۔ وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ مصطفیٰ کو اس لمحے اس کی آواز لرزتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا لیکن گھر پہنچ کر ایک قیامت تھی جو ان کی منتظر تھی۔

چوکیدار اور ایک گارڈ موقع پر ہی دم توڑ چکے تھے۔ گیٹ کے باہر ایمبولینس اور پولیس کی گاڑی کھڑی نظر آرہی تھی۔ کیونکہ پڑوسیوں نے فائرنگ کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع دی تھی' جبکہ گھر کے اندر ابھی تک کوئی نہیں گیا تھا۔ حسنی تیزی سے بھاگ کر گھر میں داخل ہوا۔ لاؤنج کا دروازہ ہنوز اندر سے لاک تھا۔ وہ تیزی سے گھوم کر گلاس وال کی طرف آیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ گلاس وال توڑ کر ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ مصطفیٰ اس کے ساتھ ہی تھا۔ حسنی کے لیے یہ سوچ ہی جان لیوا تھی کہ اس کی ماں اور بہن گھر میں اکیلی تھیں اور ان پر جانے کیا کچھ بیت گیا۔

وہ اسی ٹوٹی ہوئی گلاس وال سے اندر داخل ہوا تھا۔ جبکہ مصطفیٰ اس سے پہلے ہی اندر داخل ہو چکا تھا اور سامنے نظر آتے کمرے کا منظر کھڑے کھڑے ہی جیسے اس کی جان نکال کر لے گیا تھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروزاہ بند کر دیا تھا۔ حسنی دیوانوں کی طرح کمروں کے دروازے کھول کھول کر امی اور زارا کو دیکھ رہا تھا۔

"حسنی اندر مت جاؤ پلیز۔" اسے تیزی سے اس کمرے کی جانب بڑھتا دیکھ کر مصطفیٰ نے اتنی ہی تیزی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا۔ حسنی نے بھیگی ہوئی سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"پہلے دیکھو خالہ کہاں ہیں۔" مصطفیٰ نے اس لمحے اپنی آواز کو بھیگتا محسوس کیا تھا۔ ایک درد تھا جو اس پل پل میں اٹھا تھا اور جب اسٹور روم کا دروازہ کھولا تو۔۔۔

"امی۔۔۔" حسنی تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ وہ زمین پہ دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھی تھیں اور ان کا سر ایک طرف کو لڑھک رہا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح ابھی بھی لپٹی تھی۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔"

حسنی نے ان کے پاس دو زانو بیٹھ کر ان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر تھپتھپایا تھا۔ چند سیکنڈز میں انہوں نے آنکھیں کھول دیں تھیں۔

"حسنی۔۔۔ میری زارا۔۔۔" ان کے لبوں سے نکلنے والے پہلے الفاظ یہی تھے۔ وہ تیزی سے حسنی کو پرے دھکیل کر اٹھی تھیں۔ وہ بھی تیزی سے ان کے پیچھے ہی لپکا تھا۔ اس کا دل کسی انہونی کے احساس سے بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ اس ماں کی آنکھوں سے آنسو قطار در قطار گر رہے تھے اور دل آہ و بکا کر رہا تھا کہ میری بیٹی کا آخر کیا قصور تھا۔

☆ ☆ ☆

اس وقت سب سے ضروری اور اہم' زارا کو اسپتال پہنچانا تھا اور ان لوگوں نے ہر چیز کو چھوڑ کر سب سے پہلے زارا کو اسپتال پہنچایا تھا کیونکہ اس کی حالت بہت خراب تھی اور وہ مستقل بے ہوش تھی۔ جنگل میں آگ کی طرح یہ خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ اسپتال میں سب ہی پہنچ چکے تھے۔

پورا میڈیا متحرک ہو چکا تھا۔ اسپتال میں ہر طرف بس میڈیا اور پولیس کے ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ یہ وہی اسپتال تھا جہاں منال جاب کرتی تھی اور وہ اس وقت آن ڈیوٹی تھی۔ اس نے "فوراً" ہی زارا کو ایمرجنسی میں شفٹ کیا تھا۔ وہاں سب ہی لوگ آگئے تھے۔ مصطفیٰ کی پوری فیملی۔۔۔ منال کے ماما بابا۔۔۔ زارا کو ایمرجنسی میں لے جایا گیا تو اتنی دیر سے کھڑی وہ باہمت سی ماں بھی اس پل وہیں ڈھے گئی۔ ان کا بی پی خطرناک حد تک شوٹ کر گیا تھا۔ ان کا بھی ٹریٹمنٹ ہو رہا تھا اور مصطفیٰ مستقل ان کے ساتھ تھا۔

حسنی تو جیسے مسلسل اک شاک کی سی کیفیت میں

تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ان لوگوں کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے اور کیوں ہوا ہے؟ آخر ان کا ایسا کیا قصور تھا؟ کیونکہ صاف نظر آرہا تھا کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کیونکہ گھر کی کوئی بھی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہوئی تھی۔ جس سے پتا لگتا کہ یہ چوری کی واردات تھی۔ ایک معاملہ جو اس نے اپنی دانست میں سلجھا لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

نہ جانے کتنے ہی لمحے... کتنے ہی گھنٹے بیت چکے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اپنی ماں اور بہن کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک آگ سی لگی تھی۔ اثر و رسوخ رکھتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں کر پایا تھا' تو ایک غریب آدمی جس کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ جس کی ساری زندگی انصاف کے لیے دھکے کھاتے گزر جاتی ہے۔ وہ کیسی بے بسی محسوس کرتا ہوگا۔ یقیناً" بالکل ایسی ہی جیسی اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا۔ لاچار... اور بے بس...

"حسنی..." تب ہی کوئی اس کے پاس آکر بیٹھا تھا اور دھیمے سے پکارا تھا۔

"حسنی... تم ٹھیک ہو۔" منال کے سوال کے جواب میں اس نے جن نگاہوں سے منال کو دیکھا تھا وہ نگاہیں منال کو اندر تک کاٹ گئی تھیں۔ کیا کچھ نہیں تھا ان نگاہوں میں... غصہ... تکلیف... بے بسی... کرب...

وہ پھر سے نگاہیں چرا گیا تھا۔ کیسے نگاہیں ملا پائے گا وہ اب کسی سے بھی... کہ وہ ایک ایسا بھائی ہے جو اپنی بہن کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔ وہ روز محشر اپنے باپ کا سامنا کیسے کرے گا۔ ایک آنسو بہت خاموشی سے اس کی آنکھوں سے پھسلا تھا۔

"زارا اب ٹھیک ہے... خطرے سے باہر ہے... کچھ دیر تک ہوش میں آجائے گی... تم پلیز سنبھالو خود کو... آنٹی کو بھی بمشکل سنبھالا ہے سب نے... پلیز تم ان کو لے کر گھر چلے جاؤ... ہم سب یہاں ہیں' زارا کے پاس..." منال نے دھیرے سے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا تھا۔ لفظ نہیں تھے مگر تسلی تو دینی تھی۔

حسنی کا وجود جیسے کسی پہاڑ کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ نیچے اور نیچے کسی اتھاہ گہرائی میں... اور کبھی دل پہ مرہم کی طرح لگتی یہ آواز اس پل دل کو چیر رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس پل منال کے کندھے پہ سر رکھ کر زور زور سے روئے... چیخ چیخ کر خود کو قصوروار گردانے۔ مگر بہرحال وہ ایک مرد تھا۔ اسے حالات سے لڑنا سکھلایا گیا تھا اور وہ لڑے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ اسے اب اپنی ماں اور بہن کو سنبھالنا تھا۔ انہیں ان حالات سے نکالنا تھا۔

وہ رات ان سب لوگوں نے اس اسپتال میں جاگتی آنکھوں سے گزاری تھی۔

☼ ☼ ☼

"اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اتنا غیر سمجھ لیا تھا۔ تم نے ہم سب کو... کیا زارا صرف تمہاری بہن تھی... میری کچھ نہیں لگتی وہ... کچھ تو بتایا ہوتا... کچھ تو کہا ہوتا یار... اب ہمیں سارے معاملے کا پتا لگ رہا ہے۔ جب پانی سر سے گزر چکا ہے۔"

اس رات کی اگلی صبح مصطفیٰ بری طرح سے حسنی پہ برس پڑا تھا' بلکہ صرف مصطفیٰ ہی نہیں سب نے ہی جیسے اسے کٹہرے میں لا کھڑا کیا اور وہ جو پہلے ہی بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اور زیادہ احساس جرم میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔

"مصطفیٰ میں نہیں جانتا تھا۔ خدا کی قسم میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب اس طرح سے ہو جائے گا۔ میں تو اپنے طور پہ تمام معاملے کو سلجھا چکا تھا یار... ختم کر چکا تھا... مجھے باقاعدہ طور پہ یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ اب ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ دن دہاڑے میرے گھر میں گھس آئیں گے وہ لوگ..." حسنی کے لہجے میں اب تاسف کے ساتھ ساتھ غصہ بھی ابھر آیا تھا۔ پورا میڈیا

اور پولیس حرکت میں آچکی تھی اور پولیس اس معاملے کو ڈکیتی کا رنگ دینے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی' جبکہ میڈیا پہ اب تک ہزاروں کہانیاں سامنے آچکی تھیں۔

"تم ایک بار مجھ سے ذکر تو کرتے نا حسنی۔۔۔ میں اسد سے بات کرتا وہ سیکرٹ برانچ میں ہے۔ وہ خاموشی سے سارے معاملے کو حل کرلیتا' تو شاید آج ہم اس ناقابل تلافی نقصان سے بچ جاتے۔۔۔ یا کاش تم نے زارا کو اس دن پولیس میں رپورٹ کرانے سے نہ روکا ہوتا۔۔۔ میرا دل پھٹ رہا ہے حسنی۔۔۔ زارا کو' خالہ کو دیکھ کر۔۔۔ اب تو ہمارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔"

مصطفیٰ نے بمشکل اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو چھپایا تھا۔

"تم جانتے ہو مصطفیٰ! میری زندگی میں یہ لفظ "کاش" ایک آسیب کی طرح چمٹ سا گیا ہے اور اب دن بدن اس آسیب کا قد بڑھتا جارہا ہے۔" اس کی آواز مصطفیٰ کو جیسے کسی گہرائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ عزیز دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔

"اور اب ایک اور کاش۔۔۔ کہ کاش میں زارا کے لیے کچھ کرپاتا۔۔۔ پر میں اب بھی کروں گا۔۔۔ جو چلا گیا میں وہ لوٹا تو نہیں سکتا مگر اسے انصاف دلانے کے لیے ہر حد تک جاؤں گا۔۔۔ ان شیطان صفت لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہی اب میری زندگی کا مقصد ہے۔ چاہے مجھے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔۔۔"

اٹل عزم تھا جو اس لمحے مصطفیٰ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ ایک ایسا عزم جو اس کا اب مقصد حیات تھا۔ مصطفیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اپنے ساتھ کی یقین دہانی کرائی تھی۔

☆ ☆ ☆
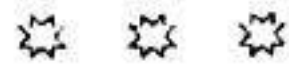
زارا کی طویل بے ہوشی نے کوما کی شکل اختیار کرلی تھی۔ وہ کوما میں جاچکی تھی۔۔۔ ایک باحیا۔۔۔ عزت دار لڑکی جسے دن دیہاڑے اس کے گھر میں گھس کر اس کی ماں کے سامنے بے عزت کیا جائے' وہ مر بھی جائے تو کم ہے۔ وہ تو پھر دکھ۔۔۔ اذیت اور تکلیف کے سے کوما میں جاچکی تھی۔ حسنی سب کے باہم مشورے سے امی کو خالہ لوگوں کی طرف لے آیا تھا۔ کیونکہ خود تو وہ اس بری طرح سے اس مسئلے میں پھنسا ہوا تھا کہ وہ سارا سارا دن گھر ہی نہیں آتا تھا۔ ایسے میں وہ اکیلی اپنے گھر میں کیسے رہتیں۔ اس نے امی کو مصطفیٰ لوگوں کی طرف شفٹ کردیا تھا۔

اور خود وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے ایک دوست کے فلیٹ میں رہنے لگا تھا۔ جو ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اپنے گھر کی اس نے مرمت وغیرہ کرواکر اسے بند کردیا تھا۔ زارا ہنوز اسپتال میں تھی اور منال کے اسی اسپتال میں کام کرنے کی وجہ سے وہ مطمئن تھا اور منال بھی پوری ذمہ داری سے اس کا خیال رکھ رہی تھی اور زارا کے کمرے کے باہر دو گارڈز بھی تعینات تھے کیونکہ بہرحال یہ ایک پولیس کیس تھا۔

اس واقعے کو گزرے تقریباً" ایک ماہ ہوچکا تھا۔ زارا کی ابھی تک وہی حالت تھی اور کیس میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ حسنی جس قدر پیش رفت کرتا وہ اپنے ذرائع استعمال کرکے اسے واپس پیچھے دھکیل دیتے تھے اور وہ پھر سے وہیں آجاتا تھا۔ جہاں سے چلا تھا۔۔۔ اپنی بہن کا دکھ اسے اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔۔۔ پر اس نے سوچ لیا تھا اسے ہر حال میں ان ظالموں کو ان کے انجام تک پہنچانا ہے' تاکہ کل کو وہ کسی اور زارا کو ہاتھ لگانے سے پہلے سو دفعہ سوچ لیں۔۔۔ مگر کیسے۔۔۔ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا جو اس کے سامنے تھا۔

☆ ☆ ☆

آج تقریباً" پورے ایک ہفتے بعد وہ امی سے ملنے آیا تھا۔ وہ ابھی تک خالہ کی طرف ہی تھیں اور یہاں کسی حد تک ان کا دل بہلا رہتا تھا اور طبیعت بھی کافی سنبھل گئی تھی۔ وہ نیچے منال کے پورشن میں ہی رہ رہی تھیں' کیونکہ۔ جوڑوں کے درد کی وجہ سے وہ

سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی تھیں۔ اس لیے احمد چاچو نے بخوشی انہیں اپنے پورشن میں ٹھہرنے کے لیے کہا تھا۔

اور ویسے بھی ان کے پورشن میں تھا ہی کون۔۔۔ چاچو۔۔۔ چاچی۔۔۔ منال اور حدید۔۔۔ چاچو سارا دن آفس۔۔۔ منال اسپتال اور حدید یونیورسٹی۔۔۔ تو سارا دن عائشہ چاچی اکیلی ہی ہوتی تھیں۔۔۔ اس طرح سے انہیں بھی دوسراہٹ مل گئی تھی اور اب تو تائی بھی زیادہ تر نیچے ہی رہتی تھیں۔ اس وقت رات کے کھانے کے بعد وہ مصطفیٰ کے ساتھ باہر لان میں آبیٹھا تھا۔ وہ لوگ ابھی بھی اسی معاملے میں ڈسکس کر رہے تھے۔ معاملے کا جیسے کوئی حل سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

"یہاں پر بڑے لوگوں پہ ہاتھ ڈالنا اتنا آسان کام بالکل نہیں ہے۔"

"حسنی۔۔۔ میرا خیال ہے ہم اسد سے بات کرتے ہیں۔ وہ یقیناً ہماری مدد کرے گا۔" مصطفیٰ نے ایک بار پھر سے اس کی توجہ اپنے دوست کی طرف دلائی تھی۔ جس کا وہ پہلے سے ہی ذکر کر چکا تھا۔

"ہوں۔۔۔ میں بھی کئی دنوں سے یہی سوچ رہا ہوں طیفی۔۔۔ اب ضروری ہے کہ ہم ان پہ مضبوط ہاتھ ڈالیں۔۔۔ تاکہ کچھ تو پیش رفت ہو۔۔۔ ورنہ تو اب تک میری ساری کوششیں بے کار ہی جا رہی ہیں۔ میں دس قدم آگے بڑھتا ہوں تو وہ بندہ مجھے واپس اسی جگہ دھکیل دیتا ہے۔ جہاں سے میں چلا تھا۔ میرے سارے سورسز جیسے بے کار ہو گئے ہیں۔" اس نے مصطفیٰ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا کیونکہ وہ خود بھی کئی دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس کیس کو حل کرنے میں ہماری مدد ضرور کرے گا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ انہیں مقابلے کی ٹکر دی جائے۔"

مصطفیٰ نے اسی وقت اپنے سیل فون سے اسد کو کال ملائی تھی اور رابطہ ہونے پہ وہیں لان میں اس سے ذرا دور ہٹ کر بات کرنے لگا تھا۔ تب ہی منال وہاں چلی آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ جس میں چائے کے تین مگ رکھے تھے۔ اس نے ٹرے وہیں ٹیبل پہ رکھ دی تھی۔ ایک نگاہ فون پہ بات کرتے مصطفیٰ پہ ڈالی تھی اور دوسری سوچ میں ڈوبے حسنی پہ۔۔۔ وہ ایسے گم صم سا بیٹھا تھا کہ جیسے اس کی وہاں آمد سے بے خبر ہو۔

"چائے۔۔۔" اس نے ایک مگ اٹھا کر حسنی کے سامنے رکھا تھا اور اپنا مگ اٹھا لیا تھا۔

"تھینک یو۔۔۔" مگ اٹھاتے ہوئے ایک ذرا سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ منال جانتی تھی کہ وہ رات کے کھانے کے بعد چائے یا کافی ضرور پیتا ہے' تو وہ یہ کیسے بھول سکتی تھی کہ وہ ہمیشہ پھیکی چائے پیتا ہے اور اس بات کا اندازہ حسنی کو پہلا گھونٹ بھرتے ہی ہوا تھا۔

ایک دلفریب مسکراہٹ نے بڑے دنوں بعد اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ منال نے جانے کیوں اس پل بہت غور سے اسے دیکھا تھا اور حسنی نے وہ نگاہ محسوس بھی کر لی تھی مگر خاموش رہا تھا۔ بس پھر چند ہی لمحے لگے تھے' حسنی کو خود کو نارمل کرنے میں اور پھر وہ اس سے زارا کے متعلق بات کرنے لگا تھا۔

"زارا کی جسمانی حالت تو اب خطرے سے باہر ہے۔" منال نے حسنی کے استفسار کے جواب میں کہا تھا اور اس کا یہ کوما اسے پہنچنے والی ذہنی تکلیف کا نتیجہ ہے اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی یہ کیفیت کب تک رہے گی۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی آنکھیں کھول دے۔۔۔ ہو سکتا ہے کل۔۔۔ ایک ماہ بعد۔۔۔ ایک سال بعد۔۔۔ یا شاید پوری زندگی بھی نہیں۔۔۔ مگر بہر حال ہمیں اللہ سے پوری امید ہے۔۔۔ وہ چاہے تو پل میں سب بدل دے۔ کیونکہ میں نے ایسے لوگوں کو بھی ٹھیک ہوتے دیکھا ہے' جن کے ٹھیک ہونے کا ایک فیصد بھی چانس نہیں ہوتا۔ بٹ وہ سروائیو کرتے ہیں۔۔۔ کیونکہ اللہ نے ان کی زندگی لکھی ہوتی ہے۔ اگر اللہ چاہے تو معجزے اب بھی ہوتے ہیں۔"

اس نے خاموشی سے اپنی جانب دیکھتے حسنی کو خاصی تفصیل سے جواب دیا تھا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ دن بدن مایوس ہوتا جارہا ہے' حالانکہ یہ اس کی فطرت نہیں تھی... مگر اب کیوں... شاید اپنوں کے دکھ انسان کو یوں ہی تھکا دیتے ہیں۔

"میں ناامید نہیں ہوں... منال... مجھے اپنے اللہ پہ پورا بھروسا ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بس ایک گلٹ ہے۔ جو میرے اندر جم سا گیا ہے۔ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے کہ میں اپنی بہن کی حفاظت نہیں کرسکا اور اب بھی کچھ نہیں کرپا رہا ہوں۔ اسے انصاف دلانے کے لیے... میرے ہاتھ پاؤں جیسے بندھ سے گئے ہیں۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں شاید مایوس سا دکھنے لگا ہوں۔ خاموش بھی اور تھوڑا اداس بھی..."

منال کو اس لمحے اس کی آنکھیں پُرنم سی محسوس ہوئیں۔ پر اگلے ہی لمحے وہ نگاہیں پھیر چکا تھا۔ جانتا تھا کہ سامنے موجود ہستی ایک پلک کی جنبش کو بھی سمجھتی ہے۔ تو یہ تو آنکھوں میں آئی نمی تھی۔

"حسنی... اس وقت حوصلہ اور ہمت ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہیں' اگر تم حوصلہ کھو دو گے... ہمت ہار دو گے تو سمجھو سب کچھ کھو دو گے... جو ہوا... جو گزرا... وہ واپس نہیں آسکتا مگر یقین کرو... ہم پہ بھی یہ وقت اتنا ہی بھاری ہے جتنا تم پہ... ہم سب ہر لمحہ... ہر پل تمہارے ساتھ ہیں۔ بس ایک بار آواز کو بلند ہونے دو... دنیا کے سامنے سچ کو آنے دو۔ دیکھنا اس ملک کا ہر بچہ' بڑا تمہارے ساتھ کھڑا ہوگا۔ بس تھوڑا سا حوصلہ..." ان نرم انگلیوں نے ذرا سا اس کے ہاتھ کی پشت کو چھوا تھا۔

اور حسنی کو اس لمحے لگا تھا کہ جیسے اس کے اندر نئی توانائیاں جاگ اٹھی ہوں... نیا حوصلہ... مسکراہٹ نے بے ساختہ اس کے لبوں کو چھوا تھا اور اس بار یہ مسکراہٹ ایک مضبوط حوصلہ مند انسان کی مسکراہٹ تھی... جس نے منال کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

"میری اسد سے بات ہوگئی ہے۔ ہم کل صبح اس سے ملنے جارہے ہیں حسنی..." مصطفیٰ بات ختم کرکے ان کے پاس آبیٹھا تھا۔ اس نے سیل فون ٹیبل پہ رکھ کر اپنا چائے کا مگ اٹھالیا تھا۔

"ٹھیک ہے' ہم ضرور جائیں گے۔"

"ہم ایک عزم کرتے ہیں مگر پھر پیچھے دھکیل دیے جاتے ہیں' پھر اٹھتے ہیں' پھر دھکیل دیے جاتے ہیں' پھر اٹھتے ہیں' پھر وہی... مگر ایک وقت آئے گا جب وہ عزم سب کو پیچھے دھکیل دے گا۔ بس اس وقت کو آنے دو..."

☆ ☆ ☆

اس رات' بہت عرصے بعد اس نے اس لمحے کو سوچا تھا جب اس محبت کے طلسم نے اسے اپنے سحر میں جکڑا تھا اور پھر وہ لمحہ' وہ پل جیسے اس کی زندگی کا محور بن گئے تھے۔ نادرن ایریاز میں گزارے وہ دن ان سب کی زندگیوں کے یادگار ترین دن تھے۔ انہیں وہاں آئے ہوئے دوسرا یا شاید تیسرا دن تھا۔ جب وہ لوگ دوپہر کے قریب واک کے لیے نکلے تھے۔ زارا' حسنی' مصطفیٰ' منال' ارتضیٰ بھائی اور فائزہ بھابھی... اور ہانیہ مصطفیٰ کی چھوٹی بہن جو زارا کی ہی ہم عمر تھی۔

مال روڈ پہ گھومتے ہوئے وہ لوگ ایک اسٹال پہ کافی پینے کے لیے رکے تھے۔ وہاں سے کافی لے کر وہ لوگ مختلف اسٹالز دیکھتے دیکھتے کافی آگے آگئے تھے۔ تب ہی مصطفیٰ کو یک دم ہی احساس ہوا کہ منال کافی دیر سے ان لوگوں کے ساتھ نہیں تھی۔

"حسنی... منال کافی دیر سے نظر نہیں آرہی ہے یار... ابھی کافی لیتے وقت تو وہ ساتھ ہی تھی۔"

اور پھر اس کے احساس دلاتے ہی یک دم ہی سب پریشان ہوگئے تھے اور ارتضیٰ نے فوراً" ہی مصطفیٰ کو ڈانٹا تھا کہ وہ اتنی دیر سے تمہارے ہی ساتھ تھی' تو تمہیں ہی اس کا دھیان رکھنا چاہیے تھا۔ ان دنوں ان دنوں کے نکاح کو تھوڑا ہی ٹائم ہوا تھا۔

"بھائی میں تو..." مصطفیٰ گڑبڑا گیا تھا۔ کیونکہ ارتضیٰ بھائی کی سخت گیر طبیعت سے سب ہی گھبراتے

تھے اور اس وقت تو بات ہی ایسی تھی۔

"مصطفیٰ ٹائم ضائع مت کرو۔ چل کر دیکھتے ہیں، وہ یہیں کہیں ہوگی۔ ارتضیٰ بھائی آپ ان لوگوں کو لے کر ریسٹ ہاؤس جائیں۔ ہم منال کو لے کر آتے ہیں اور ہاں۔ ابھی آپ وہاں کسی کو مت بتائیے گا۔"

اور پھر حسنی نے اسے ایک سمت میں ڈھونڈنا شروع کیا تھا اور مصطفیٰ نے دوسری طرف۔ مصطفیٰ ازحد پریشان ہو گیا تھا۔ کیونکہ ڈھلتی سہ پہر تھی اور اس وقت تو وہاں ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی اور یہاں کے موسم کا بھی کوئی بھروسا نہیں تھا۔ مصطفیٰ کو اس لمحے مال روڈ پر گھومتی ہر لڑکی پہ منال کا گمان ہو رہا تھا۔ پر منال کہیں نہیں تھی۔ اس کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ حسنی بھی اسے ڈھونڈتا ہوا کافی دور نکل آیا تھا۔ جہاں اب ڈھلوانی راستہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ اب حقیقتاً" پریشان ہو چکا تھا اور بارش بھی اب خاصی تیز ہو چکی تھی اور منال کا کہیں کوئی اتا پتا نہیں چل رہا تھا جبکہ اس علاقے میں تو لینڈ سلائیڈنگ کا بھی بہت خطرہ تھا۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار کو اور تیز کر لیا تھا۔

تب ہی خاصی دور اس کی نگاہ چھوٹے سے بھیڑ کے بچے کو اٹھائے کھلکھلاتی ہوئی کسی لڑکی پہ پڑی تھی اور دور سے ہی اسے پورا یقین تھا کہ وہ لڑکی منال ہی تھی۔ وہ تقریباً" بھاگتے قدموں سے وہاں پہنچا تھا۔ وہ ایک مقامی گھر کے باہر بچوں کے ساتھ کھیلتا ایک چھوٹا سا روئی کے گالے جیسا سفید رنگ کا بھیڑ کا بچہ تھا۔ جسے وہ اس وقت اپنی گود میں اٹھائے ہوئے تھی۔

اس منظر کی خوب صورتی نے بے ساختہ حسنی کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ اس نے بنا اسے ڈسٹرب کیے۔ سیل فون نکالا اور مصطفیٰ کو منال کے مل جانے کا ٹیکسٹ کیا اور پھر اس قیمتی لمحے کی ایک کھلکھلاتی ہوئی تصویر اپنے پاس محفوظ کر لی۔

فلیش لائٹ کی روشنی پہ منال نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا تھا اور سامنے حسنی کو پا کر وہ اسی طرح اس بھیڑ کو اٹھائے اس کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ اس لمحے اس قدر خوش اور مطمئن لگ رہی تھی کہ حسنی چاہ کر بھی اسے اس لاپروائی پہ ڈانٹ نہیں پایا تھا۔

"دیکھو تو حسنی۔ یہ کتنا پیارا ہے۔ بالکل نرم روئی کے گالے جیسا۔" وہ اپنے گال اس کے چہرے پہ ٹکائے ہوئی تھی۔ برستی بارش میں بھیڑ کے بچے کو خود سے لگائے بھیگی سی اس لڑکی کی کشش نے لمحہ بھر میں جانے کیوں اس کے دل کو اپنی طرف کھینچا تھا۔

"حسنی کیا سوچ رہے ہو۔" اس کی خاموشی پہ منال نے دوبارہ اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ جیسے چونک کر ہوش میں آیا۔

"آں ہاں، کچھ نہیں۔ کیا کرتی ہو یار۔ کب سے ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں۔ ہم سب کتنے پریشان ہو گئے تھے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ کتنی دور نکل آئی ہو تم اور موسم بھی دیکھو، کس قدر خراب ہو رہا ہے۔" وہ اپنی خفت مٹانے کو بولا تھا اور اس میں کامیاب بھی ٹھہرا تھا۔ کیونکہ منال اب خاصی شرمندہ سی کھڑی تھی۔

اسے سچ میں اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ گھومتے گھومتے کہاں آ گئی تھی اور یہاں ان بچوں کو اس بھیڑ کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر وہ بھی ان کے ساتھ مگن ہو گئی تھی۔ اسے نہ برستی بارش کا احساس رہا اور نہ گزرتے ٹائم کا۔

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔ مجھے سچ میں اندازہ ہی نہیں ہوا۔" منال نے کہتے ہوئے واپس جانے کو قدم بڑھائے تھے۔

"تمہیں سچ میں اندازہ نہیں ہوا منال کہ تم مجھے آج کہاں لے آئی ہو۔" اس کے ساتھ قدم قدم چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

جانے ایسا کیا تھا اس لمحے۔ اس پل میں۔ جو اس کا سب کچھ چھین کر لے گیا تھا۔ حالانکہ وہ منال کو بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس نے ایسا کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ سب آپس میں بہت اچھے دوست تھے۔ خاص کر مصطفیٰ۔ منال اور حسنی۔ تو پھر اب

آج اچانک ایسا کیا بدلا تھا کہ پل بھر میں جیسے دل کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی تھی اور وہ بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ محبت تو کمیں ہی لمحے بھر کا ہے۔ پل بھر میں انسان کو چوپٹ کردیتی ہے اور وہ یوں ہی دیکھتا رہ جاتا ہے۔

"ارے آرام سے دیکھ کر منال۔" وہ دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ جانے کیسے منال کا پاؤں کسی پتھر سے رپٹا تھا۔ اور اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے بے ساختہ ہی حسنی کے بازو کو تھاما۔ حسنی نے فوراً" ہی اسے سہارا دینے کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ پہلوئے دل جیسے روشن ہوا تھا۔ مثل مہتاب۔

"منال۔ ٹھیک ہو۔ چوٹ تو نہیں لگی۔" وہ اب جھک کر اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اب بھی اس کا بازو تھامے ہوئے تھی۔

"ہاں' میں ٹھیک ہوں بالکل۔ بس ذرا سی ٹھوکر لگی تھی۔" حسنی کو لگا کہ جیسے وہ اس لمحے اس کی قربت سے گھبرائی تھی۔ منال نے نگاہیں چرا کر بس پل بھر کو اسے دیکھا تھا اور پھر نگاہ ہٹالی تھی۔

مگر وہ لمحہ جیسے دونوں کی زندگیوں میں تبدیلی لے آیا تھا۔ محبت لے آیا تھا مگر اس سے اگلے ہی لمحے وہ دونوں سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے تھے۔ کیونکہ یہ محبت ان دونوں کے لیے نہیں تھی۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں تھے۔ پھر آنے والے کتنے ہی دن وہ دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چراتے رہے تھے لیکن جو محبت دل میں روشن ہو چکی تھی۔ وہ بجھ تو نہیں سکتی نا اب۔ مگر الاؤ کو کم ضرور کیا جاسکتا تھا۔ سب کچھ وہی تھا تو پھر بدلا کیا تھا؟ صرف دل کی دنیا۔ وہ تو ہر انسان کی زندگی میں ایک بار ضرور بدلتی ہے۔ اب وہ بدلاؤ ہر زندگی پہ اثر انداز ہو' یہ ضروری تو نہیں۔

بعض اوقات ان دونوں کو ہی محسوس ہوتا کہ وہ صرف ان دونوں کا وہم تھا۔ وہ لمحہ جس میں صرف محبت لکھی تھی۔ وہ صرف پل بھر کی کہانی تھی۔ کیونکہ ایک دوسرے سے ان کا رویہ یہی کہتا تھا۔ حسنی جانتا تھا کہ وہ اس کے عزیز دوست کی منکوحہ ہے۔ اس کے نکاح میں ہے اور نکاح تو نسل آدم کی بقا ہے' تکمیل ہے' وہ گھر جوڑنے کے لیے کیا جاتا ہے توڑنے کے لیے نہیں۔ جوڑنے والا اللہ کا پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیروکار ہے۔ بے شک حسنی کو اللہ اور اس کے رسول کا پسندیدہ بننا تھا۔ وہ خائن نہیں بن سکتا تھا۔

کچھ محبتیں دلوں میں رہیں تو ہی اچھی لگتی ہیں۔ ان کا پرچار سوائے دکھ اور تکلیف کے کچھ نہیں دیتا اور محبت بذات خود کیا کم اذیت ہے کہ انسان اور تکلیف اور اذیتیں خود پہ لادے۔

☆ ☆ ☆

"آنٹی آپ پلیز گھر جائیں۔ میں یہاں ہوں زارا کے پاس۔ آپ صبح سے یہاں ایسے ہی بیٹھی ہیں۔ اس طرح تو آپ خود کو بیمار کرلیں گی۔"

منال نے زارا کے کمرے میں اس کے چیک اپ کے بعد آنٹی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ آج اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی مگر زارا کی وجہ سے اس نے صبح میں بھی چکر لگایا تھا۔ تب آنٹی اور حسنی دونوں ہی اس کے ساتھ آئے تھے اور تب سے اب تک آنٹی یہیں تھیں اور اب منال اپنے ڈیوٹی ٹائم پہ آئی تھی تو آنٹی کو مسلسل اس غیر آرام دہ حالت میں بیٹھے دیکھ کر ان کے پاس چلی آئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ مسلسل ورد کرتے ہوئے انہوں نے پہلے زارا پہ دم کیا تھا اور پھر منال کو بھی اپنی دعاؤں کے حصار میں لیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا۔ تم پریشان نہ ہو۔ یہاں زارا کے پاس بیٹھ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ وہاں گھر پہ ہوتی ہوں تو میری جان یہیں اسی میں اٹکی رہتی ہے یہاں بے شک یہ خاموش لیٹی ہے مگر کم از کم میری نگاہوں کے سامنے تو ہے۔" انہوں نے زارا پہ ایک محبت بھری نگاہ ڈالی تھی۔ وہ خوب صورت لڑکی دنوں میں ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئی تھی۔ شربتی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے صاف نظر آرہے تھے۔

"منال۔۔۔" انہوں نے دھیرے سے پکارا تھا۔ نگاہیں ابھی بھی زارا پہ ٹکی تھیں۔

"جی آنٹی۔۔۔" منال کو اس لمحے ان کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لمحے اسے اس ماں پہ بے پناہ ترس آیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا پوچھیں گی۔ کیونکہ وہ روز ہی منال سے یہ سوال پوچھتی تھیں۔

"زارا ٹھیک تو ہو جائے گی نا۔" سوال آج بھی وہی تھا۔ بس اس ماں کے اندر امید نئی تھی' یقین نیا تھا کہ ہاں میری دعا میں اتنا اثر ہے کہ میری بیٹی ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔ کیونکہ میرا اللہ ایک ماں کی دعا ضرور سنے گا۔

"ان شاء اللہ آنٹی' زارا بہت جلد بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ فزیکلی اب وہ پہلے سے بہت بہتر ہے لیکن اس کا دماغ ابھی بھی شاک کی کیفیت میں ہے اور اسی لیے وہ ابھی کوما میں ہے۔ مگر آپ پریشان نہ ہوں' ان شاء اللہ وہ بہت جلد اس ٹراما سے بھی نکل آئے گی۔" منال نے ہمیشہ کی طرح انہیں بھرپور تسلی دی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کے صرف یہ چند تسلی کے لفظ اس ماں کے دل پہ مرہم کی طرح لگتے ہیں۔

"اللہ کرے! ایسا ہی ہو بیٹا جیسے تم کہہ رہی ہو۔ ورنہ اگر اس کی یہی حالت رہی تو میں مزید برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میرے دونوں بچے جس تکلیف سے گزر رہے ہیں' یہ میں کیسے برداشت کر رہی ہوں' یہ صرف میرا دل ہی جانتا ہے۔ اولاد کی تکلیف کوئی بھی ماں برداشت نہیں کر سکتی' تو میرا اللہ یہ سب کیسے برداشت کرے گا۔ وہ سب دیکھ رہا ہے۔ وہ انصاف ضرور کرے۔۔۔ گا۔"

"بالکل آنٹی اللہ کے یہاں انصاف کا در کبھی بھی بند نہیں ہوتا۔ بس آپ حوصلہ رکھیں۔۔۔ اپنا خیال رکھیں۔۔۔ کیونکہ اس وقت آپ کے دونوں بچوں کو آپ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ حسنی بھی آپ کی وجہ سے پریشان ہے اور رہا زارا کا سوال تو اب میں یہاں ہوں اس کے پاس۔۔۔ آپ آرام سے گھر جائیں اور گھر جا کر آرام کریں۔ مصطفیٰ باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ چلیں میں آپ کو چھوڑ آتی ہوں۔" منال نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اٹھایا تھا اور منال جب تک ڈیوٹی پہ رہتی تھی' انہیں تسلی رہتی تھی کیونکہ وہ زارا کا بھرپور خیال رکھتی تھی' اس لیے وہ بھی مصطفیٰ کے ساتھ گھر چلی آئی تھیں۔

✲ ✲ ✲

"پاپا پلیز۔۔۔ کسی طرح میری اس کیس سے جان چھڑا دیں میں۔۔۔ آئندہ آپ جو کہیں گے۔۔۔ وہی کروں گا۔ وہ جرنلسٹ تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔" یہ اشعر اقبال تھا جو کافی دیر سے اپنے باپ کی منت سماجت کر رہا تھا اور وہ مسلسل اسے ہی سنائے جا رہے تھے۔

"پلیز پاپا۔۔۔ بس آخری بار۔۔۔"

"دیکھو اشعر بات بہت صاف اور واضح ہے۔ میں نے تمہیں کتنی دفعہ منع کیا تھا کہ اب اس معاملے کو ختم کرو۔ مگر تم نے میری بات بالکل نہیں سنی۔ اب خود بھگتو۔ الیکشن سر پہ کھڑے ہیں اور تم نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ حالانکہ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ وہ بندہ میڈیا کا ہے۔ اس کی بہن سے دور رہو۔۔۔ مگر نہیں' تمہارے اندر تو آگ لگی تھی۔ کیا پورے شہر میں لڑکیوں کی کمی ہو گئی تھی؟"

ان کا پارہ پھر سے چڑھنے لگا تھا اور وہ بس خاموشی سے سننے پہ مجبور تھا' کیونکہ بالآخر حسنی نے کافی بھاگ دوڑ کر کے ان کے گرد گھیرا کافی تنگ کر دیا تھا۔ اشعر کے ملک سے باہر جانے پر پابندی لگ چکی تھی اور اب یہ معاملہ ایف آئی اے کے ہاتھ میں تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹا بری طرح پھنستے' کیونکہ اگر معاملہ کھل جاتا تو پھر آگے معاملات کی طویل لسٹ تھی۔۔۔ جو شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی اور ایسے میں ان کا پریشان ہونا فطری تھا۔ مگر کچھ ترپ کے پتے ابھی بھی ان کے ہاتھ میں تھے' جنہیں وہ ضائع کیے بغیر ٹھیک وقت پہ کھیلنا چاہتے تھے۔

لیکن اشعر جیسے پاگل سا ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کی سب سرگرمیوں پہ پابندی لگ چکی تھی۔ ہر عیاشی ختم ہو چکی تھی اور وہ جیسے بند پنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا اور نکلنے کو بے چین تھا۔ اب یہ وہ انہیں کیا بتاتا کہ وہ لڑکی اس کے لیے چیلنج بنتی جا رہی تھی اور کسی طور ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی اور یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے... تم زیادہ پریشان مت ہو... میں کچھ کرتا ہوں... اگر اس کے ہاتھ لمبے ہیں تو ہم نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ انگلی ٹیڑھی کرنا ہم بھی جانتے ہیں۔" بالآخر اکلوتے بیٹے کی پریشان صورت ان سے دیکھی نہیں گئی تھی۔

انہوں نے اس کا کندھا تھپکا تھا۔ گویا اپنے ساتھ کا احساس دلایا تھا اور اشعر کے منہ سے ایک گہری اطمینان بھری سانس نکلی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کا باپ اس کی پشت پہ موجود تھا۔ اسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی بھلا...

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم خالہ..." انہوں نے نماز پڑھ کر سلام پھیرا ہی تھا کہ انہیں اپنی پشت پہ ایک تھکی تھکی سی آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔" انہوں نے جاء نماز تہ کر کے وہیں صوفے پہ رکھی اور ہاتھ میں تسبیح تھامے وہیں اس کے برابر آ بیٹھیں۔

چند لمحے ورد کرنے کے بعد انہوں نے دعا مانگی اور پھر اس کے چہرے پہ دم کرتے ہوئے انہوں نے ایک نگاہ حسنی کے تھکے تھکے سے چہرے پہ ڈالی تھی۔ چند دن پہلے تک کیا کھلتا ہوا چہرہ تھا اور اب تو جیسے آنکھوں کی جوت ہی بجھ کر رہ گئی تھی۔

"خالہ... امی ابھی تک نہیں آئیں اسپتال سے..." اس نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔ صبح اس نے ہی امی کو اسپتال 'زارا کے پاس ڈراپ کیا تھا اور اب رات ہو چکی تھی۔

"نہیں بیٹا... منال چھ بجے ڈیوٹی آف کر کے آ گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ نہیں آئی تھیں۔ اب مصطفیٰ آفس سے لوٹتے ہوئے لیتا ہوا آئے گا۔ کھانا لگاؤں بیٹا' کچھ کھالو... تم نے صبح بھی ناشتا نہیں کیا تھا۔"

"نہیں خالہ... دل نہیں چاہ رہا... ایک کپ کافی بنوا دیں..." اس نے دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ انہوں نے افسوس اور دکھ سے حسنی کو دیکھا تھا۔ جانے کتنے دنوں سے انہوں نے اسے ڈھنگ سے کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ کافی کا مگ لے کر وہ نیچے لان میں چلا آیا تھا۔ وہ اس وقت کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا تھا' کیونکہ اتنے دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ لوگ آخر کار اس قابل ہو چکے تھے کہ ان کا کیس عدالت میں فائل ہونے جا رہا تھا۔

مصطفیٰ کے دوست اسد نے ان کی بہت مدد کی تھی اور اس کی وجہ سے ہی یہ سب اس حد تک ممکن ہو سکا تھا۔ ورنہ تو حسنی جتنا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ گردن تک دوبارہ سے اندر دھنسا دیا جاتا تھا۔ جانے کتنے ہی دنوں سے وہ بے چین و بے قرار تھا۔ نیند تو جیسے اس کی آنکھوں میں اترنا ہی بھول چکی تھی۔ مسکراہٹ تو جیسے اس کے لبوں کا راستہ ہی بھول ہی چکی تھی مگر اب اس کا مضبوط ارادہ کل ان لوگوں کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنے جا رہا تھا۔ اب خدا کرے کہ وہ آگے بھی اپنے ارادے میں کامیاب ہو پاتا۔

"خالی پیٹ کتنے کپ کافی کے پی چکے ہو۔ تعداد یاد ہے کچھ؟" ایک اپنائیت بھری آواز نے اسے سوچوں سے نکالا۔

"اگر پہلے پتا ہوتا کہ تم تعداد پوچھو گی تو میں گنتی کر لیتا۔" وہ جواباً بولا۔ خالی مگ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"اچھا چلو... کھانا لگ گیا ہے۔ سب تمہارا ویٹ

کر رہے ہیں۔" وہ اسے اس وقت کھانے کے لیے ہی بلانے آئی تھی۔

"منال... مجھے بالکل بھوک نہیں ہے یار... تم لوگ کھالو۔ میں بس امی کا ویٹ کررہا ہوں۔ ان سے مل کر چلا جاؤں گا۔" وہ اسے ٹالنے کو بولا۔ سچ یہی تھا کہ اس کا بالکل بھی کھانا کھانے کا دل نہیں تھا اور ویسے بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے کافی پی تھی۔

"حسنی... بہت بری بات ہے۔ کھانا ٹیبل پہ لگ چکا ہے۔ سب تمہارا ویٹ کررہے ہیں اور تم انکار کررہے ہو۔ اور مصطفیٰ سے ابھی میری بات ہوئی ہے۔ آرہے ہیں وہ لوگ بس راستے میں ہیں۔"

"اف منال... تم نہیں مانوگی۔" اور ہمیشہ کی طرح اسے منال کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ ہتھیار تو وہ کب کا ڈال چکا تھا۔ بس اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا تھا۔

"اب اٹھ بھی چکو۔"

اسے پھر سے سوچوں میں ڈوبتا دیکھ کر منال نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور بالآخر اسے اٹھنا پڑا تھا۔ کچھ دیر بعد مصطفیٰ بھی امی کو لے کر آگیا تھا اور اس دن بڑے دنوں بعد حسنی نے خود کو تھوڑا فریش محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایف آئی اے اور رینجرز کے سادہ لباس میں ملبوس اہلکار اشعر اقبال کو اس کے فارم ہاؤس سے اٹھا کر لے گئے تھے، جو کہ شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ یہ ساری کارروائی رات کے اندھیرے میں سیکرٹ برانچ کے آفیسر اسد بھٹی کی نگرانی میں ہوئی تھی اور اس خاموشی سے ہوئی تھی کہ اشعر اقبال یا اس کے باپ کو کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

اندر ہی اندر تمام ثبوت اور شواہد اکٹھے کیے گئے تھے، جو کہ تمام ہی حقیقت پہ مبنی تھے۔ خوش قسمتی انہیں وہ کال ریکارڈنگ بھی مل گئی تھی۔ جو کال زارا کے رپورٹ درج کراتے وقت اس انسپکٹر نے اشعر اقبال کے باپ کو کی تھی۔ یہ ساری کارروائی بھی حسنی کے اس پروگرام کے نتیجے میں سرانجام دی گئی تھی، جو کہ اس نے کل رات اپنے نئے لانچ ہونے والے چینل کی اوپننگ ٹرانسمشن میں کیا تھا۔

حسنی نہیں جانتا تھا کہ کبھی زندگی اسے اس مقام پہ لے آئے گی کہ وہ چینل جسے لانچ کرنے کے وہ ہمیشہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس پہ نشر ہونے والے اس کے پہلے پروگرام کا موضوع اس کی اپنی بہن کی ذات ہوگی... یا وہ پروگرام اس کی اپنی فیملی کے متعلق ہوگا مگر اس وقت یہ لاسٹ آپشن تھا جو اس کے پاس بچا تھا اور اس پروگرام کے چلنے کے بعد جیسے ہر چیز کھل کر سامنے آگئی تھی اور جواباً فوری طور پر یہ کارروائی عمل میں لائی گئی تھی اور آج جہاں علی حسنین کے حمایتیوں میں اضافہ ہوا تھا وہیں اسے دھمکیوں بھری کالز بھی آنی شروع ہوگئی تھیں مگر اب وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔

ایک بوجھ تھا جو کئی مہینوں سے اس کے سینے پہ دھرا تھا۔ وہ اگر آج پوری طرح اترا نہیں تھا تو قدرے کم ضرور ہوگیا تھا۔ یقیناً اب وہ وقت دور نہیں تھا کہ جب مجرم کٹہرے میں ہوں گے اور انصاف کا بول بولا ہوگا۔ بس قانون کو ذرا سا مضبوط ہونے کی ضرورت تھی۔

☼ ☼ ☼

"منال تم ریسٹ کرتیں بیٹا... میں کھانا لگوادیتی... سارے دن کی تھکی ہوئی آئی ہو..." امی نے آتے ساتھ ہی اسے کچن میں مصروف دیکھ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں امی... سب کچھ تیار تو ہے، بس ٹیبل ہی لگوانی ہے نا، آپ بیٹھیں میں کر لیتی ہوں۔"

منال ابھی کچھ دیر قبل ہی اسپتال سے گھر آئی تھی اور اس وقت ملازمہ کے ساتھ مل کر رات کے کھانے کے لیے ٹیبل لگوا رہی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اس کی موجودگی میں بھی امی کام کریں... کیونکہ اس کی

غیر موجودگی میں تو وہی سب کچھ دیکھتی تھیں۔ سو وہ ڈیوٹی سے واپس آکر پوری کوشش کرتی تھی کہ جس قدر ہو سکے ان کی مدد کر کے۔

اسی پل منال کا فون بجا تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی پلیٹیں وہیں سلیب پہ رکھیں اور کچن ٹیبل پہ رکھا اپنا فون اٹھالیا۔ کالر آئی ڈی علی حسنین کے نام سے شو ہو رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی کال پک کی تھی۔ حسنی اور آنٹی اس وقت زارا کے پاس اسپتال میں تھے۔

"حسنی۔۔۔ زارا ٹھیک ہے۔" منال نے کال پک کر کے جو پہلا سوال کیا تھا وہ یہی تھا۔

"منال۔۔۔" ایئرپیس سے ابھرتی اس کی آواز بہت دھیمی رہی تھی۔

منال کا دل لمحہ بھر کو بہت تیزی سے دھڑکا تھا کیونکہ آج صبح زارا کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ اسے ٹھیک سے سانس نہیں آرہا تھا مگر ابھی جب منال ڈیوٹی آف کر کے گھر آئی تھی۔ اس وقت وہ کافی بہتر تھی۔ پھر اب حسنی کی کال بھی اسے گھر آئے ہوئے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔

"زارا کو ہوش آگیا ہے۔۔۔ منال۔۔۔" مگر اگلے ہی لمحے حسنی کے لبوں سے ابھرنے والا جملہ بے ساختہ ہی اس کے لبوں پہ کلمۂ شکر لے آیا تھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔۔۔ حسنی سچ کہہ رہے ہو۔۔۔ وہ اب کیسی ہے۔" منال نے بے ساختہ ہی اس سے پوچھا۔

"ہاں وہ ٹھیک ہے۔۔۔ بس ابھی چند لمحے پہلے ہی اسے ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹرز اسے چیک کر رہے ہیں۔ امی اس کے پاس ہی ہیں۔۔۔ طیفی کا فون آف جا رہا ہے۔ اس لیے پہلے تمہیں کال کی۔۔۔"

اس لمحے منال کو اس کی آواز پرجوش مگر کپکپاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"میں تھوڑی دیر میں اسپتال آتی ہوں حسنی۔۔۔ تم لوگ اس کے پاس ہی رہو۔ اور میں مصطفیٰ کو بھی دیکھتی ہوں کہ وہ ابھی آفس میں ہے یا گھر آچکا ہے۔"

"منال۔۔۔" منال نے عجلت میں کہہ کر فون رکھنا چاہا تھا مگر تب ہی اسے حسنی کی مدھم سی پکار ایئرپیس سے سنائی دی تھی۔ سو وہ خاموشی سے اسے سننے لگی۔

"میں خوش ہوں منال کہ اللہ نے میری کچھ تو آزمائشیں کم کیں۔۔۔ اب میں مزید ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"

"میں نے کہا تھا نا تمہیں کہ بس ذرا سا حوصلہ۔۔۔ اور کامل یقین سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" منال کی تسلی سے ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح اس کا حوصلہ بڑھا تھا۔ اس نے ان دونوں کو جلدی پہنچنے کی تاکید کر کے فون رکھ دیا۔

"کیا ہوا منال' خیریت تو ہے نا۔" پاس بیٹھی امی جو بڑے صبر سے اس کے فون بند کرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کے فون رکھتے ہی فوراً" پوچھا تھا۔

"امی۔۔۔ زارا کو ہوش آگیا ہے۔ وہ کوما سے باہر آگئی ہے۔ حسنی کی کال تھی۔" اس نے خوشی سے لبریز آواز میں بتایا۔ بالآخر ان لوگوں کی محنت رنگ لے آئی تھی اور پورے تین ماہ بعد بالآخر زارا ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی تھی۔

"اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے مالک۔۔۔" امی نے بے ساختہ ہی کہا تھا۔

"جی امی۔۔۔ میں بس کھانا کھا کر نکلتی ہوں اسپتال۔۔۔ آپ پلیز جلدی سے کھانا لگوا دیں۔۔۔ میں ذرا مصطفیٰ کو دیکھ لوں۔۔۔ حسنی کہہ رہا ہے کہ اس کا فون آف جا رہا ہے اور تائی کو بھی بتا دوں۔" وہ فون ہاتھ میں لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ خوشی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

"ہاں ہاں تم جاؤ۔۔۔ میں دیکھ لیتی ہوں مگر کھانا کھائے بغیر مت جانا۔"

امی نے اسے تیزی سے کچن سے نکلتا دیکھ کر پیچھے سے کہا تھا۔ "وہ جی اچھا امی۔" کہتی تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں پھیلی روشنی جیسے اس کی آنکھوں کو

جند ھیانے لگی تھی۔ اسے آنکھیں کھولنے میں وقت ہو رہی تھی۔ پپوٹوں پہ جیسے کوئی بھاری سل رکھی ہو۔ خود پہ جھکے اجنبی چہرے۔۔۔ کمرے کا نامانوس ماحول۔۔۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔

"بیٹا! اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں۔" خود پہ جھکے اس نرم چہرے والے شخص نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ بمشکل ہی اثبات میں سر ہلا پائی تھی۔

تب ہی عقب سے نظر آتے جس چہرے پہ اس کی نگاہ پڑی تھی۔ اس کے پرنور شفقت بھرے چہرے اور مسکراتے لبوں نے جیسے اس کی نگاہوں میں شناسائی سی بھر دی تھی۔ وہ اس کی ماں کا چہرہ تھا۔ اس کی پیاری ماں کا۔۔۔ اور جب ماں کا چہرہ یاد آیا تو یکایک جیسے آنکھوں کے سامنے کوئی فلم سی چلنے لگی تھی۔ وہ ہر منظر۔۔۔ ہر لمحہ اس کی آنکھوں میں زندہ ہو گیا تھا جیسے۔۔۔ وہ یقیناً" اسپتال میں تھی۔۔۔ اور کیوں تھی۔۔۔ یہ اب اسے بہت اچھی طرح سے یاد آچکا تھا۔

اس کے بھاری پپوٹے مزید بھاری ہونے لگے۔ آنکھیں لہو رنگ ہو گئی تھیں اور اس سے جیسے ان سے لہو ہی گرنے لگا تھا' سفید لہو۔۔۔ آنسوؤں کی صورت۔۔۔ ایک لڑکی بھلا ان حالات میں اور کر بھی کیا کر سکتی ہے۔ یا رو سکتی ہے یا پیٹرول چھڑک کر خود کو آگ لگا سکتی ہے اور وہ اس وقت صرف رو ہی سکتی تھی۔

"اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ اور مکمل ہوش میں ہیں۔ کوشش کریں کہ یہ پچھلا کچھ بھی یاد نہ کریں۔" ماں کے عقب سے نظر آتا بھائی کا چہرہ جسے دھیمے لہجے میں ڈاکٹر نے تاکید کی تھی اور اسے اثبات میں سر ہلاتا دیکھ کر ایک سیل رواں تھا جو زارا کی آنکھوں سے رواں ہوا تھا اور جس کے آگے اس وقت بند باندھنا بہت مشکل تھا۔

اپنی بربادی پہ رونے کا موقع تو اسے اب ہی ملا تھا۔ وہ روتی نہ تو کیا کرتی۔ ورنہ ہوش و حواس سے بیگانہ رہ کر تو اس نے کتنے ہی دن خاموشی سے گزار لیے تھے اور پھر وہاں اس اسپتال کے کمرے میں زارا اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ اپنے ساتھ ساتھ ماں اور بھائی کو بھی رلا دیا تھا اور ان دونوں کے لیے اسے اس وقت سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ جب منال' مصطفیٰ کے ساتھ وہاں پہنچی تو زارا کی حالت پھر سے بگڑ گئی تھی' تو مجبوراً" منال کو اسے نیند کا انجکشن دینا پڑا' کیونکہ اس وقت یہی اس کے لیے بہتر تھا۔

☼ ☼ ☼

زارا کے ہوش میں آتے ہی جیسے سب لوگ پھر سے جی اٹھے تھے۔ باقی حالات تو اپنی جگہ پہ۔۔۔ کیونکہ جو ہوا اسے کوئی بدل نہیں سکتا تھا مگر اس وقت سب سے اہم اس وقت صرف زارا کی صحت یابی تھی' وہ گھر آچکی تھی۔ حسنی چاہتا تھا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ وہیں اس فلیٹ پہ ساتھ رہیں جہاں وہ آج کل رہ رہا تھا مگر کسی نے بھی اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ خاص کر ایسے حالات میں جبکہ اشعر اقبال کسٹڈی میں تھا اور اس کا باپ کسی بھوکے شیر کی طرح ہو رہا تھا۔ کیونکہ ان دونوں باپ بیٹے کے خلاف جیسے ایک پورا پینڈورا باکس کھل چکا تھا۔

منی لانڈرنگ' کرپشن۔۔۔ دھوکہ دہی۔۔۔ ہراسمنٹ۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔۔۔ اس لیے وہ لوگ زارا اور خالہ کو اپنے گھر ہی لے آئے تھے۔ کیونکہ ان دونوں کا وہاں اکیلے رہنا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

آج رات کا کھانا ان سب نے مل کر کھایا تھا۔ زارا کی حالت ابھی بھی گو کہ پہلے جیسے نہیں تھی مگر اسے ان تمام اپنوں میں بیٹھ کر اسے گویا ایک تحفظ کا احساس ہو رہا تھا اور وہ خصوصاً" اس بات پہ بہت مطمئن اور خوش تھی کہ ان سب لوگوں نے اس کا ان حالات میں اس قدر ساتھ دیا ہے ورنہ عموماً" بعض لوگ ان حالات میں لڑکی کو بھی برابر کا قصوروار گردانتے ہیں مگر زارا اس معاملے میں خوش قسمت رہی تھی۔۔۔ کہ اس کے اپنے اس کے ساتھ تھے۔۔۔ اور اس کا بھائی اور اس کی ماں اس کی پشت پہ موجود تھے اور باقی سب بھی۔۔۔

منال اور مصطفیٰ نے بھی ان حالات میں ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ حسنی ان دونوں کو وہاں چھوڑ کر ڈنر کے بعد واپس فلیٹ پہ چلا آیا تھا۔ کیونکہ اسے کچھ کام نپٹانا تھا اور وہ بہت تھک بھی چکا تھا اسی لیے آج وہ ایک بھرپور نیند لینا چاہتا تھا۔ تاکہ کل وہ پھر سے تازہ دم ہو کر ہر چیز کا مقابلہ کر سکے۔ آج کتنے ہی دنوں بعد اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے دل کا تمام کتھارسس ایک کافی کے مگ کے ساتھ بیٹھ کر اپنی ڈائری پہ منتقل کرلے۔۔۔ پھر سے اپنی وہی دنیا بسائے۔ جو اس کی زندگی تھی' جو اس کی رگ رگ میں دوڑتی تھی۔ جہاں اس کے دلکش ودلربا خواب تھے۔

اس نے گلاس ونڈو کھول دی تھی۔ بارش کی ہلکی کن من نے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ ایک خوش گوار احساس نے بے ساختہ ہی اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ وہ آج خود کو کسی قدر مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ کئی دنوں کا ایک بوجھ تھا جو اس کے وجود پہ دھرا تھا' وہ آج قدرے کم ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی کو کھلا ہی رہنے دیا تھا اور مگ تھامے رائٹنگ ٹیبل پہ آبیٹھا تھا۔ ڈائری کے ورق آج بھی ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ بھوری آنکھوں کی چمک اس کے کسی خاص لمحے میں موجود ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ سنہری قلم موتی بکھرانے لگا تھا۔

"اور جو شخص قطرہ قطرہ کر کے رگ و جان میں سمایا جا چکا ہو۔ وہ یک لخت کیسے نکالا جا سکتا ہے۔" یہ سوچ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ لے آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم ابا!" آج اتوار تھا اور مصطفیٰ قدرے دیر سے سو کر اٹھا تھا۔

فریش ہو کر جب وہ لاؤنج میں آیا تو ابا وہیں ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ سامنے دھرا چائے کا خالی کپ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ وہ ناشتا کر چکے ہیں۔ مصطفیٰ بھی وہیں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام۔ آج کافی دیر سے جاگے۔۔۔ طبیعت ٹھیک ہے؟" ابا نے اخبار ہٹا کر اسے دیکھا۔

"جی ابا۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ بس آنکھ ہی نہیں کھلی۔" مصطفیٰ نے انہیں کہتے ہوئے ایک نگاہ سامنے لگی گھڑی پہ ڈالی تھی۔ جہاں دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔

واقعی آج وہ کافی دیر تک سویا تھا۔ ورنہ عموماً "اتوار" کو بھی وہ جلدی ہی جاگ جایا کرتا تھا۔ امی اسے دیکھ کر اس کا ناشتا وہیں لے آئی تھیں۔ وہ ناشتا کرتے ہوئے ابا سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

"مصطفیٰ۔۔۔ حسنی سے بات ہوئی ہے تمہاری۔۔۔ کافی دنوں سے ادھر آیا نہیں ہے۔" ابا نے یک دم ہی اس سے پوچھا۔

"جی ابا۔۔۔ کل رات ہی بات ہوئی تھی۔۔۔ کافی مصروف ہے۔۔۔ شاید آج چکر لگائے۔۔۔ خیریت۔۔۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" مصطفیٰ نے چائے کا مگ ہونٹوں سے لگائے ہوئے ابا کے پرسوچ چہرے کی طرف دیکھا۔

"ہوں۔۔۔ خیریت ہے۔۔۔ پر مصطفیٰ! مجھے حالات کچھ اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔۔۔ اس کا کیس عدالت میں ہے اور اس لڑکے کا باپ' بہت تلملا رہا ہے۔ دیکھو تو اس لیے پورا اخبار ان ہی خبروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس نے علی حسنین کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی ہیں اور ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ کس حد تک جا سکتے ہیں۔" ابا کے چہرے پہ پریشانی اس وقت صاف نظر آرہی تھی۔

مصطفیٰ بھی ان کی بات سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے اخبار اٹھا کر اپنے سامنے کرلیا۔ واقعی پورا اخبار ان ہی خبروں سے بھرا پڑا تھا۔

"ابا! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ میں نے بھی اسے بہت سمجھایا ہے کہ وہ لوگ کافی بااثر ہیں' سب کچھ اتنا کھل کر نہ کرے۔۔۔ مگر اس پہ تو جیسے ایک جنون سا سوار ہو گیا ہے۔ آج آئے تو پلیز آپ بات کریں حسنی سے۔۔۔ میری تو وہ سنتا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آج آیا تو میں سمجھاؤں گا اسے۔۔۔

میں جانتا ہوں' وہ جو کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔ مگر یہاں سچ کی بھی کبھار بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ جاتی ہے۔ اس بات کا خیال رکھے۔ اس کے اندر جو آگ لگی ہے وہ اتنی آسانی سے ٹھنڈی تو نہیں ہو گی مگر پھر بھی کچھ احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔" ابا نے اخبار لپیٹ کر کے ایک طرف رکھا تھا اور دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ حسنی سے بات ضرور کریں گے۔ کیونکہ اب حسنی کے ہاتھ ایک ایسا ثبوت لگا تھا جو ان باپ بیٹے کی بنیادیں تک ہلا گیا تھا۔

زارا کے کیس کو تو وہ کسی نہ کسی طرح جھوٹا ثابت کرنے پہ تلے ہوئے تھے مگر اس ساری جدوجہد کے نتیجے میں ایک اور لڑکی سامنے آئی تھی۔ صالحہ نام کی اس لڑکی کے ساتھ بھی اشعر اقبال نے یہی کچھ کیا تھا۔ کیونکہ اس غریب لڑکی پہ بھی اس کا دل آگیا تھا اور جب اس لڑکی کا بوڑھا غیرت مند باپ فریاد لے کر ان تک پہنچا تو اس نے اسے جھوٹا ثابت کیا اور اپنے گارڈز کے ساتھ مل کر اس بوڑھے شخص پہ اس قدر تشدد کیا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر وہیں دم توڑ گیا اور یوں یہ کیس خود بخود دب گیا۔ کیونکہ ان غریب لوگوں کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ ان کا مقابلہ کر پاتے۔

مگر اب میڈیا پہ چلتی ان خبروں نے اس لڑکی کو بھی ہمت دلائی اور اس نے علی حسنین سے رابطہ کیا اور اسے پوری کہانی سنا کر مدد کی درخواست کی تھی اور حسنی نے اس لڑکی کی مدد کرنے کا پورا پورا یقین دلایا تھا اور یہ خبر جب ان لوگوں تک پہنچی تو ان کا بوکھلانا تو بنتا تھا اور اگر یہ کیس ثابت ہو جاتا تو اشعر اقبال ایک قاتل بھی ثابت ہوتا اور اگر عدالت نہ بکتی اور انصاف سے فیصلہ سامنے آتا تو پھانسی یا عمر قید کی سزا تو اس کا مقدر ضرور بنتی۔

اور ایسے لوگوں کو سرعام پھانسی کی سزا ہی ملنی چاہیے۔ جو دوسروں کو جیتے جی زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ روز جینے اور روز مرنے پر مجبور کر دیتے ہیں' تو ایسے میں حسنی کو ڈھیروں کے حساب سے دھمکیاں مل رہی تھیں تو سب کا پریشان ہونا تو لازمی تھا۔

☆ ☆ ☆

صالحہ نے عدالت میں گواہی دے دی تھی اور اس کی گواہی اس کیس کے لیے جیسے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی تھی۔ اب یہ کیس انتہائی مضبوط ہو چکا تھا اور قوی امید تھی کہ اگلی پیشی میں فیصلہ سنا دیا جائے گا" جو کہ یقیناً" زارا کے حق میں ہو گا۔ اشعر اقبال' اس کا باپ اور ان کے حواری جیسے پاگل سے ہو گئے تھے۔

وہ لوگ ساری زندگی یہی کچھ کرتے آئے تھے اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ لوگ اس طرح کٹہرے میں آئے تھے اور ایک معمولی جرنلسٹ اس طرح سے ان سے مقابلہ کر رہا تھا۔

حسنی آج بہت خوش تھا۔ اس کی کئی دن کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ بالآخر آج وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے جا رہا تھا۔ اس نے اپنی کوششوں سے ان کے گرد شکنجہ اس قدر کس دیا تھا کہ وہ لوگ بری طرح پھڑپھڑا رہے تھے اور برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو طے ہے۔ وہ خود اس وقت جس قدر مطمئن لگ رہا تھا' باقی سب لوگ اسی قدر پریشان تھے۔ اس وقت یہاں لاؤنج میں تقریباً" سب ہی جمع تھے۔

"آپ سب لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور آپ سب کی پریشانی بھی بالکل بجا ہے مگر اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ آخر یہاں کسی کو تو پہلا قدم اٹھانا ہی ہو گا نا... میں یہ صرف زارا کے لیے نہیں کر رہا' کیونکہ یہ ظلم صرف میری بہن کے ساتھ نہیں ہوا' بلکہ یہاں روز کسی نہ کسی زارا کے ساتھ یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ بس انداز مختلف ہے۔ صالحہ بھی میری بہن ہے۔ اس کا کیا قصور تھا۔ جو اس کے ساتھ اس قدر ظلم ہوا... ظلم کے خلاف کوئی تو آواز اٹھائے گا نا... پلیز آپ اس طرح اس اسٹیج پر آکر مجھے کمزور نہ کریں۔"

حسنی نے خالو جان کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے کہ وہ ان لوگوں سے اس طرح براہ راست نہ الجھے۔ کیونکہ وہ لوگ اب حسنی

سے دشمنی پہ اتر آئے تھے مگر اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ جیسے وہ ہر طوفان سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو۔

منال نے بہت خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔ کل رات سے اس کا دل بہت پریشان تھا۔ پچھلی دو راتوں سے وہ مسلسل وہی خواب دیکھ رہی تھی۔ جو پچھلے کئی مہینوں سے اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ وہی جنگل... وہی بارش... اور پھر اس پانی کا سرخ رنگ میں تبدیل ہو جانا... اور پھر... اس سے آگے وہ اس وقت مزید کچھ اور نہیں سوچ پائی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ حسنی اب کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔

"بیٹا! تمہاری سب باتیں ٹھیک ہیں اور تمہارا جذبہ قابل ستائش ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ آخر کب تک اس ملک میں نام نہاد جمہوریت کے نام پہ یہ سب ہوتا رہے گا اور لاشوں پہ سیاست چمکائی جاتی رہے گی۔ مگر ہمارا فرض ہے تمہیں سمجھانا اور تمہارا ساتھ دینا... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں... کیونکہ حق اور سچ کا ساتھ دینا ہم پہ فرض ہے... بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری ماں اور بہن کو اس وقت تمہاری بہت ضرورت ہے اور تم ہی ان کا سہارا بھی ہو... بس جو بھی کرو یہ بات ذہن میں رکھ کر کرو۔" احمد چاچو نے یہ سب کہہ کر جیسے تمام گفتگو ہی سمیٹ دی تھی۔

اسی لمحے مصطفیٰ نے حسنی کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ تو حسنی نے بھی اس کا اشارہ سمجھ کر ان کی ساری باتوں کے جواب میں بس خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ سب اس کی فکر اور بھلائی کے لیے ہی کہہ رہے ہیں مگر اب وہ کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کیونکہ اگر وہ بڑے لوگ تھے تو اس کا اللہ ان سے بھی بڑا تھا۔ اس بات پہ اسے کامل یقین تھا۔ اس لمحے ان سب کے درمیان سے منال خاموشی سے اٹھ کر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔

اور اس وقت وہاں حسنی کے علاوہ کسی نے بھی اس کا اس طرح سے خاموشی سے اٹھ کر جانا محسوس نہیں کیا تھا۔ اسکی آنکھوں میں چمکتی نمی وہ بہت دیر پہلے ہی محسوس کر چکا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے درحقیقت کیا بات پریشان کر رہی ہے۔ منال کے اس خواب کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ محبت بھرے دل نے انہونی کو بہت پہلے سے ہی بھانپ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے منال... کوئی پریشانی ہے... بہت چپ چپ ہو۔" مصطفیٰ نے ایک نگاہ منال کے سنجیدہ سے چہرے پہ ڈالی تھی۔ زیادہ تو وہ پہلے بھی نہیں بولتی تھی مگر اس وقت وہ حد سے زیادہ خاموش سی لگی تھی اسے اور ایسا وہ کئی دن سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں تو کوئی بھی پریشانی نہیں ہے۔ بس تھوڑا تھک گئی ہوں۔ شاید اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے۔" وہ لوگ اسپتال سے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ مصطفیٰ نے آفس سے نکل کر منال کو بھی پک کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کی ڈیوٹی بھی آف ہو چکی تھی۔

"ٹھیک ہے... تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔ ورنہ کچھ تو ہے۔ جو تم چھپا رہی ہو... اتنا تو تمہیں میں جانتا ہوں سویٹ ہارٹ..." مصطفیٰ نے ایک مسکراتی نگاہ اس کے صبیح چہرے پہ ڈالی تھی۔

ہمیشہ کی طرح گھونگھریالے بال بے ترتیبی سے بندھے تھے۔ مصطفیٰ کے اس انداز پہ وہ جھینپ کر مسکرا دی تھی اور اس لمحے اس چمکتی مسکراہٹ کو مصطفیٰ نے اپنے اندر قید کر لیا تھا۔

"مصطفیٰ... تم مجھے نروس کر رہے ہو۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی گاہے بگاہے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور وہ نگاہیں اور مسکراہٹ مسلسل منال کو نروس کر رہے تھے۔ اس لیے وہ جھنجلا کر بول اٹھی تھی۔ اس لمحے مصطفیٰ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ اسے بس اس وقت منال کا موڈ ٹھیک کرنا تھا اور وہ کر چکا تھا کیونکہ وہ کبھی بھی اسے پریشان اور اداس نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"تم کل کورٹ جاؤ گے؟" چند لمحے کی خاموشی کے بعد منال نے اس سے پوچھا۔

"ہاں بالکل جاؤں گا اور ممکن ہے کہ کل عدالت کا

فیصلہ سامنے آجائے تو اس موقع پہ میں حسنی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرا اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے اور دعا کرو منال کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہی آئے۔ ورنہ تو یہ ساری بھاگ دوڑ بے کار جائے گی اور پتا نہیں پھر بعد میں حالات کیا رخ اختیار کر جائیں۔ ابھی اتنی ٹینشن ہے۔ تم بھی اسی وجہ سے پریشان ہو نا۔"

بالآخر مصطفیٰ نے اس کے دل کا حال جان ہی لیا تھا۔ منال نے بھی اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اب وہ اسے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کا دل صرف اور صرف حسنی کے لیے پریشان اور بے قرار ہے۔

"ظاہر ہے مصطفیٰ۔ حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ صرف ایک میں ہی کیا۔ سب ہی اس قدر پریشان ہیں۔ اللہ کرے سب ٹھیک ہو جائے جلدی سے بس۔" آج کل اس کا پورا وجود جس تکلیف اور اذیت میں مبتلا تھا۔ وہ کم از کم اس چیز کو مصطفیٰ سے تو شیئر نہیں کر سکتی تھی۔

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ کیا خیال ہے' کہیں ڈنر کے لیے چلیں۔ گھر فون کر کے بتا دیتے ہیں۔" مصطفیٰ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے' چلتے ہیں۔"

منال کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا' کیونکہ اس وقت اسے سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ خود کو کسی طرح سے اس خوف اور اذیت سے نکال سکے جو اسے کسی آکٹوپس کی طرح گھیر رہی تھی اور یوں بھی وہ لوگ کبھی کبھار گھر والوں کی اجازت سے ڈنر یا لنچ کے لیے چلے جاتے تھے۔

"ویسے میں کچھ سوچ رہا ہوں۔" اس لمحے مصطفیٰ کی آنکھوں میں واضح شرارت تھی۔ جسے منال محسوس ہی نہیں کر پائی۔

"کیا۔" اس نے بے خیالی میں پوچھا تھا۔

"یہی کہ ابا سے اب تمہاری رخصتی کی بات کر ہی لوں۔ کافی پرانا نہیں ہو گیا ہمارا نکاح۔ تمہارا کیا خیال ہے یار۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اس کی طرف جھک کر پوچھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" منال نے مسکرا کر رخ پھیر لیا اور مصطفیٰ نے اس لمحے اس کے چہرے پہ پھیلتی لالی کو بہت دلچسپی سے دیکھا تھا اور مسکرا کر بمشکل ہی اپنا دھیان اس پر سے ہٹا کر ڈرائیونگ پہ کر لیا تھا۔ یقیناً اب دوری ناقابل برداشت تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ الارم کب کا بج بج کر خاموش ہو گیا تھا۔ کیسی بے خبری کی نیند تھی جو آج اسے آئی تھی۔ کروٹ کے بل لیٹا وہ بے خبر سو رہا تھا۔ کمبل بے ترتیبی سے اس کے وجود پہ پڑا تھا۔ رات کو وہ کافی دیر سے سویا تھا۔ شاید اسی لیے اس وقت اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ اسی لمحے اس کے موبائل پہ بیٹ الارم نے بجنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں اور مندی مندی آنکھوں سے موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا۔

"اف۔" حسنی نے ٹائم دیکھ کر موبائل واپس رکھا تھا۔

وہ لیٹ ہو چکا تھا۔ اس کی فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی۔ ایک تاسف نے اس کے وجود کو گھیر لیا تھا۔ چند لمحے یوں ہی بستر پہ لیٹے رہنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی بھی سرخی تھی۔ نیند کا خمار جیسے پورے وجود پہ چھایا ہوا تھا۔ جانے کیوں آج اس کا دل بالکل بھی اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ لمبی تان کر سو جائے بس۔ مگر آج اسے بہت سے کام نپٹانے تھے اور سب سے اہم کام آج کورٹ جانا تھا اور عین ممکن تھا کہ آج کی پیشی میں زارا کے کیس کا فیصلہ آجاتا۔

یہی سوچ کر وہ بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ واش روم جا کر فریش ہوا۔ وضو کیا اور باہر نکل آیا تھا۔ جاء نماز بچھا کر اس نے فجر کی نماز قضا ادا کی تھی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے اور آج بہت دنوں بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے جانے کیوں اس کی نگاہوں کے سامنے منال کا چہرہ لہرایا تھا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے وہ

ہر دعا مانگنا بھول گیا تھا۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور دعا مانگ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کبھی بھی کسی بھی دعا میں منال کو نہیں مانگا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر دعا قبول ہو گئی تو... وہ محبت پہ دوستی قربان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے دوست کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

اس نے جاء نماز تہہ کر کے بیڈ پہ رکھی اور تیار ہونے چل دیا۔ کورٹ کا ٹائم دس بجے تھا اور اس وقت ساڑھے سات ہوئے تھے۔ تیار ہو کر وہ کچن کی طرف آیا ــــ فریج کھول کر اس نے جوس نکالا اور ساتھ ہی بریڈ نکال کر ٹوسٹ' ٹوسٹر میں ڈال دیے۔ جوس گلاس میں نکال کر وہ وہیں کچن ٹیبل کے پاس اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ جانے کیوں اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج امی کے ہاتھ کا بنا ہوا ناشتا کرے۔

کتنے ہی دن ہو گئے تھے' اس نے امی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا نہیں کھایا تھا۔ ناشتا نہیں کیا تھا مگر اس وقت... ایسا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اتنا ٹائم نہیں تھا کہ وہ پہلے مصطفیٰ کی طرف جاتا' وہاں ناشتا کرتا اور پھر کورٹ کی طرف نکلتا' کیونکہ کورٹ کے ٹائم سے پہلے اسے اپنے وکیل سے ملنا تھا اور آج وہ ایک منٹ کے لیے بھی لیٹ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آج یہ سارا سلسلہ کسی بھی طرح بس ختم ہو جائے اور کورٹ کے چکروں سے اس کی جان چھوٹ جائے لیکن اس وقت اس کا دل اتنا برا ہوا کہ اس نے ٹوسٹ کو وہیں ٹوسٹر میں چھوڑا اور بس جوس کے چند گھونٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوا ــ ناشتے کے باقی لوازمات وہیں ٹیبل پہ رکھے تھے اور اس نے جوس بھی آدھا چھوڑ دیا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے وہ گھر سے نکل آیا تھا۔

جانے کیوں آج حسنی کے وجود پہ ایک بے دلی اور کسلمندی سی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ آج کے دن کا اس نے کس قدر انتظار کیا تھا اور پوری امید بھی تھی کہ فیصلہ اس کے حق میں ہی ہوگا' پھر بھی جانے کیوں۔ مصطفیٰ کو امی اور زارا کو لے کر کورٹ آنا تھا اور آج خالو اور احمد چاچو بھی اس کے ساتھ تھے اور حسنی کو وکیل سے مل کر اور پھر ان کے ساتھ ہی کورٹ جانا تھا مگر کیا یہ سب اتنا ہی آسان تھا کہ جتنا نظر آ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"ڈاکٹر علی... ڈاکٹر منال... پلیز جلدی آئیں ایمرجنسی ہے۔ سرجن بخاری آپ کو او پی ڈی میں بلا رہے ہیں۔" ایک نرس نے ڈاکٹرز روم میں آکر پھولی سانسوں سے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنا راؤنڈ لے کر آکر بیٹھے تھے۔ ان دونوں نے تیزی سے ہاتھ میں تھامے چائے کے مگ واپس رکھے اور فوراً" ہی او پی ڈی کی طرف بھاگے۔ جہاں سرجن بخاری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سارہ بھی موجود تھیں اور وہاں موجود تمام ہی لوگ مریض کا خون روکنے کی کوشش کر رہے تھے' جو نہایت ہی تیزی سے بہہ رہا تھا۔

منال چہرے پر ماسک چڑھاتی تیزی سے آپریشن ٹیبل کے قریب آئی تھی۔ جہاں ہر طرف بس خون ہی خون نظر آ رہا تھا اور مریض کی ہارٹ بیٹ تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر سارہ کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے اس نے بس ایک سرسری نگاہ مریض کے چہرے پر ڈالی تھی لیکن وہ سرسری نگاہ جیسے اس کی جان ہی نکال کر لے گئی تھی۔ وہ اندر تک ہل گئی تھی۔

خون میں نہایا وہ علی حسنین تھا۔

وہ ایک چہرہ جو اسے پوری دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ اس وقت زندگی اور موت کے دوراہے پہ کھڑا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی مگر علی حسنین کسی تکلیف میں ہو' وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے گولیاں لگی تھیں اور گولیاں جس رخ سے ماری گئی تھیں' وہ صورت حال کافی سنگین تھی۔ ایک گولی عین اس کے دل کے قریب لگی تھی۔ جس سے اس کے دل کو کافی نقصان پہنچا تھا اور ایک گولی اس کی سانس کی نالی کو چھو کر گزری تھی اور تیسری گولی اس کے دائیں کندھے میں پیوست تھی اور ایسے میں مسلسل بہتا خون صورت حال کو مزید سنگین کر رہا تھا۔

آپریشن ٹیبل پہ لیٹا وجود اس وقت منال کی جان نکال رہا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اب تک کھڑی کیسے ہے۔ مر کیوں نہیں گئی' وہ خون۔۔۔ وہ بارش۔۔۔ وہ جنگل۔۔۔ وہ اس کے لباس کا سفید سے سرخ ہو جانا۔۔۔ خون کی بارش۔۔۔ وہ سب جیسے اس کی آنکھوں میں زندہ ہو گیا تھا گویا وہ اس بات کی نشاندہی تھی۔

"ڈاکٹر منال۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں۔" ڈاکٹر سارہ نے لمحہ بھر کو رک کر منال کے ساکت ہاتھوں اور بہتے آنسوؤں کو دیکھا تھا۔ ماسک کے پیچھے اس کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔

"آپ باہر جائیں پلیز۔۔۔ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔" ڈاکٹر سارہ نے مصروف انداز میں اسے پیچھے ہٹایا تھا۔ وہ کسی بے جان لاشے کی طرح چند قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"پیشنٹ کی ہارٹ بیٹ تیزی سے کم ہو رہی ہے اور خون تیزی سے ضائع ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ گولی اس کی سانس کی نالی کو بالکل ٹچ کرتی ہوئی گزری ہے۔"

جس وقت نرس اس کی حالت کے پیش نظر اسے بازو سے پکڑ کر آپریشن تھیٹر سے باہر لا رہی تھی۔ اس نے سرجن بخاری کے جو آخری الفاظ سنے تھے' وہ یہی تھے۔

بمشکل باہر آ کر اس نے اسی لمحے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے دھڑکتے دل اور کپکپاتے ہاتھوں سے مصطفیٰ کا نمبر ملایا تھا اور پھر اس کی ہمت جیسے ختم ہو گئی تھی۔۔۔ جواب دے گئی تھی۔ وہ وہیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔۔۔ اس کا دل جیسے بند ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

حسنی گھر سے نکل کر سیدھا وکیل کے آفس گیا تھا۔ اسے ان سے مل کر کچھ ضروری ڈسکشن کرنی تھی اور پھر ان کے ساتھ ہی کورٹ جانا تھا۔ کافی دیر تک وہ لوگ وکیل کے آفس میں بیٹھے رہے تھے۔ تقریباً" ساڑھے نو بجے کے قریب وہ لوگ کورٹ جانے کے لیے نکلے تھے۔ وہ لوگ حسنی کی گاڑی میں ہی تھے اور ڈرائیو بھی وہ خود ہی کر رہا تھا۔ سب کے لاکھ کہنے کے باوجود کہ وہ اپنا خیال رکھے۔ محتاط رہے۔ اتنی تلقین کے بعد بھی وہ کبھی بھی اپنے لیے محتاط نہیں رہا تھا۔ اس کے گھر اور آفس کے لیے سیکورٹی تھی مگر اس نے کبھی بھی اپنے لیے ڈرائیور یا گارڈ نہیں رکھے تھے۔ اسے ہمیشہ سے ہی خود گاڑی ڈرائیو کرنا اچھا لگتا تھا۔ نگاہیں ونڈ اسکرین پہ جمی تھیں۔ ڈرائیونگ بھی احتیاط سے ہی کر رہا تھا۔ مگر اس کا دھیان کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔ اس کا خیال پتا نہیں کیوں بار بار گھر کی طرف جا رہا تھا۔ امی اور زارا کی طرف جا رہا تھا۔ مصطفیٰ پتا نہیں ان کو لے کر نکلا یا نہیں۔ وہ منال کو سوچ رہا تھا۔ گاڑی سگنل پہ رکی تھی۔ وہ سگنل گرین ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

صبح کا وقت تھا اس لیے سڑکوں پہ بہت رش تھا۔ اسی لمحے سگنل گرین ہوا تھا۔ اس نے ایک نگاہ سگنل پہ ڈالی تھی اور لمحہ بھر کو نگاہ جھکا کر گاڑی کے گیئر پہ کی تھی اور جیسے وہ لمحہ قیامت کا بن گیا تھا۔ اسی پل اسے اپنی گردن پہ جلن سی محسوس ہوئی تھی اور سرخ گاڑھے خون کی لکیر اس کی گردن سے نکل کر اس کی سفید شرٹ میں جذب ہونے لگی تھی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ویسی ہی جلن اسے اپنے سینے میں بائیں جانب اور دائیں کندھے میں بھی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دھواں سا چھانے لگا تھا۔

بھوری آنکھوں میں پانی سا بھرنے لگا تھا۔ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اس کی سفید شرٹ تیزی سے سرخ ہو رہی تھی۔ اسے بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔ تکلیف کا وہ احساس پورے وجود کو جیسے اپنے حصار میں لینے لگا تھا۔ اس کا سانس بند ہو رہا تھا۔ اس کی گاڑی پہ فائرنگ ہوئی تھی۔ کون لوگ تھے کہاں سے آئے۔ ہمیشہ کی طرح نامعلوم ہی رہے تھے۔ تمام ٹریفک جام ہو چکی تھی۔

اشعر اقبال کے باپ نے اپنی چال چل دی تھی۔ اس نے اپنا وہ ترپ کا پتہ کھیل لیا تھا۔ جو اس نے صحیح

وقت کے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ ڈھلکتی گردن سے اس نے دیکھا تھا۔ وکیل صاحب کا بے جان وجود بھی خون میں لت پت اس کے برابر والی سیٹ پر پڑا تھا۔ اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ اس کے دل نے نہایت تکلیف محسوس کرتے ہوئے اس پل ماں کو پکارا تھا۔ پر وہ اس لمحے اس سے دور مصطفیٰ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی کورٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ اور جانے کیوں بار بار پہلو بدلتی اور بے چینی سی محسوس کر رہی تھیں۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا جیسے۔ علی حسنین کے لبوں نے بند ہوتی پلکوں کے ساتھ جو آخری نام پکارا وہ ماں کا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں میں جو عکس لہرایا تھا وہ منال کا تھا۔

☼ ☼ ☼
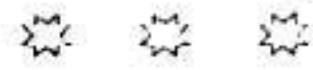
ڈاکٹرز کی تمام تر کوششوں کے باوجود علی حسنین جانبر نہیں ہو سکا تھا۔ کیونکہ اسے گولیاں ماری ہی اس اینگل سے گئی تھیں کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں۔ مگر پیچھے اپنی یادیں اور ایک نہ ختم ہونے والی تکلیف چھوڑ جاتے ہیں۔ جو ان کے پیارے اپنے پوری زندگی محسوس کرتے ہیں۔ ان سب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب یوں ہو جائے گا۔

علی حسنین کو ان کی زندگیوں سے گئے آج پورا ہفتہ ہو چکا تھا۔ ان سب کی زندگی میں وہ ایک ایسا خلا چھوڑ گیا تھا۔ جو کبھی بھی پُر نہیں ہو سکتا تھا۔ زارا اور آنٹی کا برا حال تھا۔ وہ ماں بار بار اپنے ہوش کھو دیتی تھی۔ اور وہ سب بمشکل ہی زارا اور انہیں سنبھالے ہوئے تھے۔

وہ سچ کا حامی تھا۔ تو اسے سزا تو ملنی تھی۔ حق باطل کی لڑائی میں جیت تو ہمیشہ حق اور سچ کی ہی ہوتی ہے۔ مگر سر تب بھی کٹتے تھے اور سر اب بھی کٹ رہے ہیں۔

بس طریقہ کار الگ ہے۔ مصطفیٰ عزیز از جان دوست کو کھو کر حد سے زیادہ غم زدہ تھا۔ اور منال! وہ تو پل پل مر رہی تھی۔

اسپتال میں مصطفیٰ کو کال کرنے کے بعد وہ بمشکل ہی خود کو سنبھال کر آپریشن تھیٹر میں آئی تھی۔ وہ اس لمحے حسنی کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ اس کا آپریشن ہو چکا تھا۔ مگر اس کی حالت ابھی بھی خطرے سے باہر نہیں تھی۔ اس نے پل بھر کو آنکھیں کھولی تھیں اور منال کو اپنے قریب پایا تھا اور حسنی نے اس ایک لمحے میں اپنی پوری زندگی جی لی تھی۔

''منال۔'' اس کے لب ہلے تھے۔ آواز منال تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر اس نے حسنی کے ہلتے لب ضرور محسوس کیے تھے۔ وہ اس کے قریب جھک آئی تھی۔ اس کا دل اس لمحے بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ اور آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ جسم سے روح کا نکلنا کیا ہوتا ہے۔ یہ آج منال نے جانا تھا۔ جان کنی کی تکلیف آج اس نے محسوس کی تھی۔ منال نے آہستہ سے حسنی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اشارے سے اسے بتایا تھا۔ وہ اس کے اور قریب جھک آئی تھی۔ حسنی کے ہاتھ پہ اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی تھی۔

''منال۔'' لمحہ بھر کو اس کی آواز ڈوبی تھی۔ اور ساتھ ہی منال کا دل بھی۔

''میں۔ میں۔ بہت محبت کرتا ہوں تم سے۔''

اٹک اٹک کر ادا کیے گئے یہ الفاظ اس وقت منال کا دل چیر گئے تھے۔ اقرار ہوا بھی تو کب۔ وہ آج تک امید و بیم کی کیفیت میں تھی۔ امید ملی بھی تو کہاں۔

''کیا۔ تم بھی۔'' آکسیجن ماسک کے پیچھے اس کی سانس اٹک رہی تھی۔ اس نے منال سے پوچھا تھا۔ اب وہ منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بہتی آنکھوں سے منال کے اثبات میں سر ہلانے کی دیر تھی۔ اس لمحے محبت روشنی بن کر اس کی آنکھوں میں چمکی تھی۔ اس کی نیم جان رگوں میں اقرار زندگی بن کر دوڑا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے وہ سب جیسے خواب ہوا تھا۔ زندگی کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔ وہ ان سب سے بہت دور جا چکا تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں ہمیشہ کے لیے پلکوں کی چادر تان کر

سوچکی تھیں۔
ماں سے ملنے کی خواہش دل میں لیے۔ محبت کا چہرہ آنکھوں میں بسائے وہ بہت دور جا چکا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اندر آتے مصطفیٰ کے سینے سے لگ کر وہ اس قدر ٹوٹ کر روئی تھی کہ مصطفیٰ کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
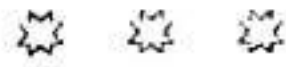
حسنی کے فلیٹ سے اس کا سامان سمیٹنے کے لیے مصطفیٰ، حدید اور ایک دوست کو ساتھ لے آیا تھا۔ زارا والے واقعے کے بعد سے حسنی یہیں اسی فلیٹ میں رہ رہا تھا، جو اس کے کسی بیرون ملک مقیم دوست کا تھا۔ زیادہ سامان تو نہیں تھا۔ اس کے کپڑے اور ضرورت کا سامان۔۔۔ اس کا لیپ ٹاپ، کچھ کتابیں، کچھ ڈائریز اور فائلز وغیرہ تھیں۔ اس کی جاء نماز اسی طرح بیڈ پر پڑی تھی جس طرح اس نے اس دن فجر کی قضا نماز ادا کرنے کے بعد تہہ کرکے رکھی تھی۔
ٹوسٹر میں توسٹ اسی طرح پڑے تھے اور جوس کا آدھ پیا گلاس بھی وہیں کچن ٹیبل پہ پڑا تھا۔ امی کے ہاتھ کا بنا ناشتا کرنے کی خواہش دل میں لیے وہ منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ تمام سامان سمیٹ کر انہوں نے کارٹنز میں ڈال دیا تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے، دیکھتے ہوئے پل بھر کو بھی مصطفیٰ کی آنکھوں سے آنسو نہیں رکے تھے۔
وہ اس کا قریبی دوست تھا اس کا جگر، بچپن کا ساتھی اور اب اس کی موت کا دکھ اس کی زندگی کا ساتھی بن گیا تھا۔ مصطفیٰ کو رہ رہ کر اس کی تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔ خاص کر آخری دنوں میں وہ بہت اداس اور غمگین سا رہنے لگا تھا۔ اپنے بابا کو بہت یاد کرنے لگا تھا۔ وہ ان سے شرمندگی محسوس کرتا تھا کہ وہ زارا کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔ جسے وہ اس کی تحویل میں دے کر گئے تھے۔ اسے اس بات کا غم اندر ہی اندر ختم کر رہا تھا۔
لیکن اس دن وہ کافی خوش تھا۔ جس دن عدالت کا فیصلہ آنا تھا، اسے لگتا تھا اس طرح اس کا گلٹ تھوڑا کم ضرور ہو جائے گا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی جان دے کر سارے قرض ہی چکا جائے گا۔ وہ چند دنوں سے بار بار مصطفیٰ کو تاکید کر رہا تھا کہ اسے زارا اور امی کا بہت خیال رکھنا ہے اور مصطفیٰ ہمیشہ اسے کہتا تھا کہ وہ اتنا پریشان نہ ہو اور کبھی کبھار اسے ڈانٹ بھی دیتا تھا مگر کبھی بھی مصطفیٰ اپنے دل میں ابھرنے والے خدشے کو اس سے کہہ نہیں پایا تھا کہ وہ آخر ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے، تو گویا اس کا خدشہ درست تھا، وہ اسے چھوڑ کر جانے والا تھا۔
یہ مصطفیٰ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔
اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کا سب سامان سمیٹ کر وہ لوگ گھر لے آئے تھے۔ کچھ فائلز اور اس کا آفیشل لیپ ٹاپ وغیرہ پولیس نے اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا۔ کیونکہ بہرحال یہ ایک پولیس کیس تھا۔ اس وقت پورے ملک میں ایک شور مچا ہوا تھا۔ پورے میڈیا میں ہر طرف بس یہی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ صحافی برادری میں انتہائی غم و غصہ پایا جا رہا تھا اور سب کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان حالات میں جب اس کی بہن کا کیس عدالت میں تھا اور آج اس کا فیصلہ سنایا جانا تھا تو ایسے میں یہ قتل کون کروا سکتا ہے مگر فی الحال رپورٹ ہمیشہ کی طرح "نامعلوم افراد" کے خلاف ہی درج کی گئی تھی۔
مصطفیٰ اس کا لیپ ٹاپ اور اس کی اپنی ایک تصویر اور اس کی ڈائریز اپنے کمرے میں اٹھا کر لے آیا تھا۔ لیپ ٹاپ آن کیا تو اس پہ پاس ورڈ تھا۔ اس نے اسے بنا کسی چھیڑ چھاڑ کے واپس رکھ دیا تھا۔ کسی اور وقت کھولنے کا سوچ کر۔ اس نے ڈائری ہاتھ میں لے لی تھی۔ وہ ایک پرسنل ڈائری تھی۔ جس میں اس کے خوب صورت احساسات اور جذبوں بھرے موتی بکھرے تھے۔ مصطفیٰ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ حسنی کو ڈائری لکھنے کی

عادت ہے اور شاید یہ بات تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا مگر اس وقت یہ ڈائری اسے ایک نئے علی حسنین سے متعارف کروا رہی تھی۔

بظاہر لاابالی نظر آنے والا اور جذبہ محبت کو چٹکیوں میں اڑانے والا۔ وقت کا زیاں قرار دینے والا۔۔۔ خود کسی کی محبت میں اس حد تک گرفتار تھا اور وہ بھی اس قدر خاموشی سے۔۔۔ کہ جس سے محبت کر رہا تھا' پتا نہیں اسے بھی خبر تھی یا نہیں۔۔۔ پر اس کی ایک ایک بات اور فیلنگ کو پڑھتے ہوئے مصطفیٰ کو برا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اپنے دوست کے کردار اور عمل پہ فخر محسوس ہو رہا تھا۔

"منال۔۔۔ تو کیا وہ بھی۔۔۔" لمحہ بھر کو مصطفیٰ کے ذہن میں ایک سوچ نے جنم لیا تھا۔

اسے اسپتال میں حسنی کی موت کی خبر سن کر اپنے گلے سے لگ کر بلک کر روتی منال کا خیال آیا تھا۔ پر اس رونے میں کہیں بھی منافقت نہیں تھی' بلکہ منال کے کسی بھی عمل میں کبھی بھی کوئی منافقت نہیں تھی۔ اسے بھروسا تھا خود پہ۔۔۔ اپنے دوست پہ اور منال بھی۔۔۔ اس نے تھک کر جیسے تمام چیزیں سمیٹی تھیں۔ اس کا ذہن و دل مطمئن ضرور تھا۔ مگر دل عزیز دوست کی جدائی پہ ازحد غمگین تھا۔

☆ ☆ ☆

عدالت کا فیصلہ آچکا تھا۔ اشعر اقبال اور اس کے باپ پہ تمام کیسز ثابت ہو چکے تھے۔ جس میں علی حسنین کا قتل سرفہرست تھا۔ پولیس کی تحویل میں اس ٹارگٹ کلر نے خود اعتراف کیا تھا کہ اس نے علی حسنین کا قتل کس کے کہنے پہ۔۔۔ اور کن وجوہات کی بنا کیا تھا۔ اقبال ملک کی اسمبلی کی رکنیت معطل ہو چکی تھی۔ انہیں نااہل قرار دے دیا گیا تھا اور ان دونوں باپ بیٹے کو پھانسی کی سزا مع جرمانہ سنائی گئی تھی۔

اس جنگ میں جیت تو ہمیشہ کی طرح حق اور سچ کی ہی ہوئی تھی مگر اس نقصان کا کیا جو اس درمیان ہو چکا۔ ان خوب صورت دلربا لوگوں کا کیا' جو اپنے پیاروں سے بچھڑ گئے۔

ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ خاک تو ان خاک نشینوں پہ ناز کرتی ہے کہ جن شہیدوں کے خون سے وہ رنگی ہے۔ مگر کیا وہ خوب صورت لوگ اللہ نے اس لیے بنائے تھے کہ انہیں یوں بے گناہ۔۔۔ بے قصور۔۔۔ حق اور سچ کی لڑائی لڑتے ہوئے خاک نشین کر دیا جائے۔

آرٹس کونسل میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا' جو علی حسنین کی یاد میں سجائی گئی تھی اور ایسے ہی کتنے خاندان جن کے پیارے ایسی ہی کسی ناگہانی موت کا شکار ہوئے تھے۔ ان تمام لوگوں کے گھر والوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

تقریب کے بعد ایک واک کا اہتمام تھا۔ واک کا جب آغاز ہوا تو زیادہ لوگ نہیں تھے۔ مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے تو لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی گیا۔ یہ ایک پُرامن واک تھی۔۔۔ اس میں کوئی شور شرابا نہیں تھا۔ کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ نہ ملکی املاک کو کسی بھی طرح کا کوئی نقصان پہنچایا گیا تھا' کیونکہ اس واک کے شرکا جانتے تھے کہ ملکی املاک کو نقصان پہنچا کر اسے مزید پیچھے کی طرف نہیں لے جانا کہ یہاں کھانے والے تو بہت ہیں مگر بنانے والے آٹے میں نمک کے برابر۔۔۔

واک میں شریک تمام لوگوں نے ہاتھوں میں مختلف بلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔ جس پہ امن اور انصاف کے حوالے سے مختلف باتیں درج تھیں اور باقی لوگوں نے ہاتھوں میں موم بتیاں اٹھا رکھی تھیں۔ اس واک کا اختتام علی حسنین کے گھر کے سامنے ہونا تھا۔ جہاں پھر ایک دعائیہ تقریب ہونا تھی۔

اس کے گھر کے گیٹ پہ "پھولوں کا" کارڈز کا ایک انبار تھا جو جمع ہو چکا تھا۔ وہ سب دھیمے دھیمے قدموں سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے زارا۔۔۔ منال۔۔۔ مصطفیٰ اور حدید تھے۔۔۔ اور ان کے

کچھ اور دوست۔۔۔ حسنی کے کتنے ہی دوست اور جاننے والے۔ منال کے بہت سے ساتھی ڈاکٹرز بھی تھے۔
ان چاروں کی ہی آنکھیں پرنم تھیں۔
مصطفیٰ نے ایک نگاہ منال کو دیکھا تھا۔ جس نے ہاتھ میں موم بتی تھام رکھی تھی اور جس کی پھڑپھڑاتی لو کی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور جس میں آنکھوں کی نمی واضح چمک رہی تھی۔ اسی لمحے اس نے بھی مصطفیٰ کو دیکھا تھا۔ آنکھوں میں چمکتی نمی اور لبوں پہ دھیمی اداس مسکراہٹ۔ دونوں ہی صاف اور بے ریا تھیں۔ مصطفیٰ نے اس کا ہاتھ تھام کر قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

وہ لوگ حسنی کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ گیٹ پہ علی حسنین کی بڑی سی مسکراتی تصویر لگی تھی اور اس کے نیچے پھولوں کا انبار تھا۔ جس سے پورا گیٹ اور آس پاس کا ایریا چھپ سا گیا تھا۔ منال نے اپنے ہاتھ میں تھاما سرخ گلاب عین اس کی تصویر کے نیچے رکھا تھا۔ دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ مگر اب یہ دکھ تو عمر بھر کا تھا۔

اس کی تمام تر شدتیں اس کی ڈائری سے منال پہ عیاں ہو چکی تھیں۔ جو اسے مصطفیٰ کے کمرے میں حسنی کے سامان سے ملی تھی۔ منال کو فخر ہونے لگا تھا خود پہ اور اپنی محبت پہ۔۔۔ بے شک وہ دلربا شخص چاہے جانے کے قابل تھا۔

سیدھا ہوتے ہوئے اس کی نگاہ حسنی کی مسکراتی تصویر پہ پڑی تھی۔ اسے لگا یہ مسکراہٹ اس کے لیے ہے۔ وہ بھی مسکرا دی تھی۔ زارا اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ بمشکل خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ اس کے بھائی نے اس کی خاطر یہ سب کیا تھا اور اپنی جان دے دی تھی۔ وہ کیسے نہ روتی۔۔۔ اس کا دل دکھ سے پھٹ رہا تھا۔

"کاش میرا بھائی کسی طرح سے میرے پاس واپس آجائے' کاش وقت پلٹ آئے۔"

یہ سوچ اس لمحے اس کے پورے وجود میں ٹکراتی پھر رہی تھی اسی لمحے کوئی خاموشی سے زارا کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"فراز تم۔۔۔" زارا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

اتنے عرصے میں وہ فراز کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ تو سمجھی تھی کہ اب فراز کبھی نہیں آئے گا۔ پر وہ آیا بھی تو کب۔۔۔ جب وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔

"میں نے تم سے محبت کی تھی زارا۔۔۔ مجھے واپس تو آنا ہی تھا۔" وہ اب مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

اندھیرے میں روشنی کی کرن بھی ضرور آتی ہے۔ پر اس اندھیرے اور روشنی کے درمیان کسی کو سب کچھ مل جاتا ہے اور کسی کا سب کچھ کھو جاتا ہے۔ زارا کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

بنتِ سحر

اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں وہ کتاب پر جھکی تھی۔۔۔ ہوا میں کچے چکوترے کی خوشبو پوری گلی میں بکھری ہوئی تھی۔۔۔ روشنی کی خواہش میں خاکستری پتنگے قریب آتے اور پھر وہیں جل بھن کر رہ جاتے تھے۔

ایک ایسا ہی جلتا بھنتا پتنگا My love story پر گرا تھا۔۔۔ وہ گڑبڑا گئی تھی۔۔۔ ”اف۔۔۔ اسے بھی ابھی مرنا تھا' ایک تو یہ کتاب اتنی خستہ حال سی ہے اوپر سے پتنگے بھی قتل ہو ہو کر اس میں دفن ہونے کے متمنی نظر آنے لگے۔ وہ کمینہ جوڈی تو مجھے کچا سالم نگل جائے گا۔“

اب وہ کھڑی ہو کر اپنا سرمئی رنگ کا فراک جھاڑ رہی تھی۔۔۔ وہ خراماں خراماں چلتی اس گیٹ تک آئی اور بیل لگاتار بجائی۔۔۔ کھٹاک سے دروازہ کھلا اور ایک چہرہ نمودار ہوا۔۔۔

”لڑکی۔۔۔! تمہیں چین کیوں نہیں پڑتا؟ بلاوجہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرتی رہتی ہو۔۔۔“

اور لڑکی صاحبہ کا فشارِ خون تیزی سے بلند ہوا تھا۔

”تم نے ایک بار کافی پلا کر مجھ پر بہت احسان کر دیا تھا۔۔۔ خدا وہ وقت جلد قریب لائے جب میں تمہارا احسان چکا دوں۔“

وہ ہنسا تھا۔۔۔ سنہرے جگنوؤں نے رفتار دھیمی کر لی تھی۔۔۔ ہنسی میں سات سُروں کے سُرگم تھے۔۔۔ ڈوبتے' ابھرتے بنتے بگڑتے۔

I am your love
I am your moon
I am your bird ...
I am your pair ...

وہ اس بے ڈھنگی آواز پر واپس پلٹی تھی۔

”بیان حلفی کب لکھ کر دے رہے ہو۔“ سرمئی فراک ہوا سے اڑ کر پھولا پھولا سا نظر آنے لگا تھا۔۔۔ سنہری جگنوؤں سی آنکھوں والا وہ شخص ٹھٹکا پھر چونکا۔

”کیسا بیان حلفی؟“ وہ اس کے ماتھے پر سیدھی پڑتی روشنی میں نمودار ہوتے بل گن رہی تھی۔

”یہی کہ اگر مرزا ملک کو مس مایا کے ہاتھوں قتل ہوتا ہوا دیکھا بھی گیا تو اس پر کوئی بھی فردِ جرم لاگو نہیں ہوگا۔۔۔“

مرزا ملک گیٹ کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ”اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے جو قتل جیسے خوفناک اقدام پر غور و فکر کر رہی ہو۔۔۔“

مایا وہیں ساکت ہوئی تھی۔۔۔ ”لفظ نفرت کہنے میں تم نے ایک لمحہ لگایا۔۔۔ لفظ محبت کتنے وقت میں دہراؤ گے؟“ اس نے افسوس سے سر جھٹکا تھا۔۔۔ سنہری آنکھوں میں سب کچھ تھا سوائے لفظ محبت کے۔

”دیکھو مایا! میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں ان چکروں میں پڑنے والا نہیں۔۔۔ میں وہ پنچھی ہوں جو محبت کا دانہ چکھے گا تو وہ اس کے لیے زہر بن جائے گا۔“

وہ کتاب سینے سے لگائے ہوئے اس کے قریب آئی تھی۔۔۔ ”محبتوں کی صداقت کے قصے تو ضرور سنے ہوں گے۔۔۔ نہیں ملو گے تو دعا سے مانگ لوں گی۔ خدا مجھے مایوس نہیں کرے گا۔۔۔“

☆ ☆ ☆

صبح زرد' زرد سی طلوع ہوئی تھی۔ وہ چرچ میں بیٹھی مقدس مریم کی تصویر سے راز و نیاز کر رہی تھی۔۔۔ دور

کہیں فٹ پاتھ کے بغلی پارک میں کوئی نو آموز لڑکا گٹار بجانے کی مشق کرنے میں مصروف تھا۔۔۔ مگر سُر تھے کہ مل ہی نہیں رہے تھے۔۔۔ اس اندھے لڑکے میں اور مایا میں ایک چیز مشترک تھی کہ دونوں ضد کے پکے تھے۔ نہ وہ گٹار بجانے سے دستبردار ہو سکتا تھا اور نہ ہی مایا دعائیں کرنا چھوڑ سکتی تھی۔۔۔ موم بتی کی مہک سارے میں پھیل کر چرچ کے گنبد میں گم ہو رہی تھی۔۔۔

"مقدس مریم۔۔۔! یہ میری آپ کے پاس آخری حاضری ہے۔۔۔ آپ کی دعا سے ہزاروں لوگوں کو "محبت" مل جاتی ہے۔ ایک سال دو مہینوں سے دعا کر رہی ہوں۔ میرے آنسوؤں سے موم بجھ جاتی ہے مگر وہ مرزا ملک مٹی کا مادھو پگھلتا ہی نہیں۔۔۔ اور وہ کمینہ جوڈی میری محبت پر آوازیں کستا ہے کہ میری محبت میں "طاقت" نہیں۔۔۔ اور میری محبت میں "اثر" نہیں۔۔۔ سو کمینے مرے ہوں گے کبھی وہ پیدا ہوا ہو گا۔۔۔ مجھے پتا ہے چرچ میں ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔۔۔ مگر جلے دل کے پھپھولے کہاں پھوڑے جائیں آخر۔۔۔؟"

دو زانو بیٹھی وہ قطرہ قطرہ پگھلتی موم پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔۔۔ دور سے گٹار کی آواز مدھم ضرور ہوئی تھی مگر مکمل طور پر گم نہیں ہوئی تھی۔۔۔

"محبتوں کے سفر ہمیشہ ہی طویل ہوتے ہیں مگر اب میں تھکنے لگی ہوں 'وہ سنہری آنکھوں والا مرد میری "زندگی" بن گیا ہے۔۔۔ ساری زندگی دوسروں کی محبتوں پر بہانگ دہل قہقہے لگانے والی آج چُپ ہے۔۔۔ محبتوں میں "چُپ" معمولی ہوتی ہے اور دعا "سانس" ہوتی ہے۔ مجھے محبت محبوب کی چوکھٹ کے سامنے رسوا کراتی ہے۔۔۔ محبت میں رسوائی کیوں ہوتی ہے۔" مایا کی آواز میں مرگھٹ کے پار رہنے والی گلوکارہ خضری کی آواز کی سی اداسی تھی۔۔۔ خضری روز ریت کے ٹیلے پر "محبوب' محبوب" کی صدائیں لگاتی رہتی تھی محبوب نہ آیا تھا مگر موت نے آلیا تھا موت سے میں نہیں ڈرتی۔۔۔ مگر پھر بھی کبھی تو ایسا ہو کہ مرزا ملک کی آنکھوں میں محبت چھلکتی نظر آئے۔۔۔ میں بھی تو دیکھوں محبت جب آنکھوں میں آن بسے تو آنکھوں کا رنگ کیسا ہوتا ہو گا۔۔۔ ان سنہری آنکھوں میں محبت کیسی ہو گی۔"

شمالی ہوا کے زبردست جھونکے سے موم کا شعلہ دم توڑ گیا مگر اس کا کثیف سا دھواں چرچ کی عمارت میں چکرا تا رہ گیا۔۔۔ حیرت در حیرت۔۔۔ دائرہ در دائرہ۔۔۔

زندگی میں کچھ چیزیں قابل برداشت اور ناقابل برداشت کے درمیان پنڈولم کی طرح گھومتی رہتی ہیں۔۔۔

اور جب بھی مایا کا ٹکراؤ جوڈی سے ہوتا تھا یہی کیفیت عود کر آتی تھی۔۔۔ وہ لمبے سرو قد درختوں کے درمیان والے راستے سے چرچ کی طرف سے ہو کر گھر کی طرف خراماں خراماں چلتی جا رہی تھی۔۔۔ جوڈتھ بھی دبے پاؤں ساتھ چلنے لگا۔

"ہزار بار کہا ہے کہ اپنا پرفیوم تبدیل کر لو۔۔۔ مجھے الجھن ہوتی ہے۔" وہ ہنسنے لگا تھا۔۔۔ ننھی چڑیوں کا غول پھر سے ان کے سروں پر سے اڑتا ہوا آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔

"کیا تم میرا پیچھا کر رہے تھے؟" تیکھی نظروں سے سالم نگلنے کی سعی کی گئی مگر جوڈتھ اتنے ہلکے وجود کا نہیں تھا۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے جا رہے تھے خشک پتوں کی چرچراہٹ ان کے قدموں تلے آکر مردہ راگ کی طرح ابھرنے لگی۔۔۔ ہلکا آہستہ سا۔۔۔

"شاید تم نے دیکھا نہیں جب تم مقدس مریم سے راز و نیاز میں مصروف تھیں تو میں تمہارے عقب میں ہی بیٹھا تھا۔۔۔ اور رہی بات پرفیوم کی تو جلد ہی تمہیں گولڈن روز کی خوشبو میں بسا نظر آؤں گا۔" وہ چلتے چلتے ٹھٹک گئی تھی۔

"اس کا مطلب میرا کل تمہارے لیے پرفیوم پیک کروا رہی تھی۔۔۔؟" مایا کو لگا تھا وہ بوکھلائے گا اس کی بات کی تردید کرے گا مگر وہ اس کے برعکس ڈھٹائی سے ہنسنے لگا تھا۔

"ہاں تو۔۔۔ محبت کرتی ہے وہ مجھ سے۔۔۔" مایا حیران

ہوئی تھی۔۔۔ سورج کی ترچھی کرنیں چھن چھن کر کول تار پر پڑنے لگی تھیں۔۔۔ سیاہ رنگ میں زرد رنگ جذب ہونے لگا تھا۔

"تم محبت کے نام پر چوٹ کر رہے ہو۔۔۔ وہ دن رات کا آرام بھلائے دو وقت کی جاب کرتی ہے۔۔۔ اپنی فیملی کی واحد کفیل ہے۔۔۔ اس نے ہمیشہ اپنے سے زیادہ دوسروں کا سوچا ہے۔۔۔ کبھی تم نے دیکھا ہے اس کی آنکھوں کے گرد کتنی تھکن اور اداسی ہے۔۔۔ اس کی تاریک زندگی کے تاریک راستوں پر تم واحد روشنی ہو۔۔۔ جب کبھی اسے پتا چلا کہ وہ محبت کے نام پر دھوکا کھا رہی ہے تو وہ مرگھٹ کے پار کی خضریٰ کی طرح مر جائے گی۔"

وہ رک گئے تھے۔۔۔ مایا ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔۔۔

ہوا سے اس کے بھورے بال مکئی کے بھٹے کی چھال کی طرح اڑنے لگے تھے۔۔۔ "مگر مایا۔۔۔ میں اب اس کے قدموں میں تو بیٹھنے سے رہا۔۔۔ میں نے اس سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرے۔۔۔"

مایا نے اس کی آواز میں تاسف تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ مگر وہاں صرف اور صرف بے پروائی تھی۔۔۔ مایا کو اس گندمی رنگت والی لڑکی پر شاید ترس آیا تھا۔۔۔ ہوا میں ابابیلوں کی سی روانی تھی۔۔۔ چھدرے پتے ہل ہل کر جھوم جاتے تھے۔۔۔ جوڈی آرام سے اسپورٹس شوز سے کسی زہریلے کیڑے کو کچل رہا تھا۔۔۔ ایک پل کو لگا وہاں "محبت" تھی جو مرتی جا رہی تھی۔۔۔ ختم ہو رہی تھی۔۔۔ خاموشی ہولے سے وہاں آئی اور سرکنڈوں کے جھنڈ میں سر چھپانے لگی تھی۔۔۔ مایا نے گہری سانس لے کر کہا تھا۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔۔۔ میریتا اور میری دوستی اس وقت سے ہے' جب ہم پہلی بار اسکول گئے تھے۔۔۔ وہ بہت ملنسار اور عاجزی پسند تھی۔۔۔ اسٹار شائن اسکول کے احاطے میں لگے درختوں کو اسی نے پانی دے دے کر بڑا کیا تھا۔۔۔ میں نے اکثر اسے کلاس روم کی ڈسٹ بن میں ریپر ڈالتے دیکھا تھا۔۔۔ تب میں اس پر بہت ہنستی تھی۔۔۔ پھر پتا ہے جب میں نے اس سے اس موضوع پر بات کی تو اس نے کیا جواب دیا تھا۔۔۔؟"

وہ چپ چاپ اس کی باتیں غور سے سنتا چلا جا رہا تھا۔۔۔ مایا نے پلٹ کر دوبارہ تاسف نامی چیز ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔

"اس نے کہا تھا وہ پھول' پودوں کی دوست ہے۔۔۔ انسانوں کو دکھ بانٹنے کے لیے انسان مل جاتے ہیں مگر ان کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔۔۔ جب انسان چھوڑ جاتے ہیں ناں تو یہ سہارا دیتے ہیں۔۔۔ میں سہارے اکٹھے کر رہی ہوں۔" مایا کی آواز پر خاموشی نے سر اٹھایا تھا پر دوبارہ چھپ گئی۔

"اس نے ہمیشہ دوسروں کی غلطیوں پر پردہ ڈالا ہے۔۔ قربان ہونے کی صلاحیت اس کی گھٹی میں ہے شاید۔۔ اس نے ہمیشہ خود کو بہادر کہا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ اس نے رات کے پچھلے پہر چرچ کی سیڑھیوں پر روتے ہوئے گزارے ہیں۔۔۔ انمول لوگ کبھی کبھی ملتے ہیں۔۔۔ آگے تمہاری مرضی جو چاہے کرو۔۔۔ مگر ہمیشہ یاد رکھنا محبت میں تجارت نہیں کی جاتی۔۔۔"

موروں نے اڑنے کی جسارت کی تھی مگر ان کے پنکھ ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔۔۔ جوڈتھ کو لگا وہ میریتا کو کبھی دکھ نہیں دے پائے گا۔۔۔ یہ انصاف نہیں کہ انسانیت پسند لوگوں کی راہوں میں کیل گاڑ دیے جائیں۔۔۔

کونجوں کے ٹولے نے محفل خضریٰ کی طرف نگاہ کی تھی۔۔۔ اور کشادہ دلی کے ساتھ پنکھ چوڑے کر دیے۔

آیئے ہم بھی "محفلِ خضریٰ" میں قدم دھرتے ہیں۔۔۔ محبت کی کہانیوں کی اول شرط احترام ہے۔

مرگھٹ کے پار کی وادی آب زلال کی باسی خضریٰ تھی۔۔۔ جو کہ شکل و صورت میں سیاہی کا نقاب تھی۔۔۔ وہ ہر طاق رات کی شام آب زلال کے شیریں کنویں کے پاس گیت گاتی تھی۔۔۔ اس کے گیتوں کی مداح سرائی میں کوئلیں اور ابابیل مشغول رہتے تھے۔ سات خوشبوؤں کی رات سبت کیل میں آب زلال کے کنویں پر محبوب نے قدم رکھا۔۔۔ خضریٰ نے محبوب کی

طرف نگاہ کی تھی اور آب زرد کی سی محبت اس کے وجود میں داخل ہوئی تھی محبوب کی رباعی گاتی خضری پر محبوب نے اچٹتی نظر ڈالی اور گھوڑے کی باگ تھامے سفر زندگی میں قدم رکھتا چل دیا۔۔۔

ہر شام 'شام انتظار کی مانند گزرتی رہی مگر۔۔۔ مسافر راستے بھول جاتے ہیں۔۔۔ کونجوں نے پیغام محبت کی اڑان بھری مگر لاحاصل۔۔۔ خضری مرگھٹ کی پہاڑی چوٹی پر گیت گاتے گاتے مرگئی۔۔۔ امید ہی زندہ نہ بچی۔۔ دیکھنے والوں نے کہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں سبت لیل کے قصے کی اداسیاں تیر رہی تھیں۔۔۔ لمحہ بھر آنکھیں کھلیں اور پھر گردن سمت مشرق ڈھلکتی چلی گئی جہاں کوئی باگ تھامے گیا تھا۔

محبت کے قصے کی داستان پھر کبھی سہی۔۔۔ فی الحال قصہ حال کی طرف قصد کیجیے۔۔۔

☆ ☆ ☆

یہ نومبر کی سرد سرد شام تھی۔۔۔ وہی روز کے معمول کا سا ماحول تھا۔۔۔ آج مایا جوڈتھ سے نئی کتاب لے آئی تھی۔۔۔ مگر جانے کیوں آج پتنگوں نے سنہری روشنیوں پر فریفتہ ہونے کی کوشش ترک کردی تھی۔۔

شام میں گرمی کا زوال اور خنکی کا عروج صاف نظر آتا تھا۔۔۔ مرزا ملک نے روشنی کا نارنجی حصار توڑا تو کتاب کے اوراق پر ایک سایہ پڑ گیا۔۔۔ سنگی بنچ پر وہ بیٹھ گیا تھا۔۔۔ اپنا کافی کا کپ وہ ہاتھ میں تھامے چسکیاں لے رہا تھا۔۔۔ دوسرا کپ بنچ پر بچی ہوئی جگہ پر رکھ دیا تھا۔۔۔ جو شاید نہیں یقیناً "مایا کے لیے تھا۔

"کون سی کتاب پڑھ رہی ہو۔۔۔؟" مدھم سا سوال سناٹے کی چادر چاک کر گیا تھا۔

"Moon is mine" پڑھ رہی ہوں۔۔۔ تم آج یہاں راستہ بھول کر آئے ہو؟"

سوال پر سوال ڈال دیا گیا تھا۔۔۔ اب وہ کتاب بند کر کے کافی کا کپ اٹھا رہی تھی۔

"میں دانستہ طور پر ہی آیا ہوں۔۔۔ اور صاف صاف کہانی واضح کرنے آیا ہوں۔" مایا نے گہرا گھونٹ لیا تھا۔۔۔ ہلکا دھواں بھاپ کی صورت کپ سے اٹھ کر اطراف میں پھیلنے لگا۔۔۔ مطلب آج سارا قصہ تمام ہونے کو تھا۔

"کہانی کہہ کر میرے جذبے کی بے توقیری نہ کرو۔۔۔ کہانیاں اکثر جھوٹی ہوتی ہیں۔۔۔ محبت حقیقت ہے۔"

وہ پیٹھ موڑے بیٹھا تھا۔۔۔ بنچ کے سامنے فرش کے قطعے پر اس کا سایہ پڑنے لگا تھا۔

"مایا۔۔۔ محبت کرنا آسان ہے مگر اسے نبھانا بہت مشکل ہے۔۔۔ کبھی اس طرح نہیں ہوتا کہ محبت کی اور خوشی خوشی رہنے لگے۔۔۔ میں پاکستان کے پسماندہ علاقے کا لڑکا ہوں۔۔۔ جس پر پورے گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہو وہ محبت افورڈ نہیں کر سکتا۔۔۔ سب سے بڑی بات ہمارے بیچ مذہب کی دیوار ہے۔۔۔ پاکستان میں وقت بدلا ہے مگر سوچ ابھی تک کائی زدہ پانی کی طرح ٹھہری ہوئی ہے 'میرا مذہب اجازت دیتا ہے مگر روایات نہیں دیتیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔"

وہ وضاحت دے رہا تھا۔۔۔ مایا کی کپ پر گرفت سخت ہوئی تھی۔۔۔ اک پل کو لگا کپ ٹوٹ جائے گا۔۔۔ مگر نہیں۔

"تو کیا میں سمجھ لوں کہ تمہیں روایات نے زنجیر کر لیا ہے۔۔۔ رہی بات مذہب کی تو میں بھی رفتہ رفتہ اس حقیقت کو قبول کرلوں گی۔۔۔ انجیل مقدس اسلام کی پیش گوئی کرتی ہے 'میرے ابو مسلم تھے۔۔۔ پرورش امی نے کی تو عیسائیت کی تعلیم ملی۔۔۔ بہر حال اگر بات سب کچھ صاف صاف کہنے کی ہے تو میں اتنا کہوں گی کہ میں تاعمر تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔"

مایا کی بات پر آشیانے کی طرف واپس پلٹی کوئل ٹھٹکی تھی۔ خضری کا قصہ پھر سے جنم لینے کو تھا۔۔۔ مگر محبتوں کے انتظار کرنے کی روایت تو کب کی ہے۔۔۔ ہر بار موت مقدر میں نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی امید 'دعا اور سچی آس کی مثلث موت کو بھی ہرا دیتی ہے۔۔۔ اور مایا مثلث کے تینوں کونے تھامے کھڑی تھی۔۔۔ وہ دور چمکتی ست رنگی روشنیوں کو دیکھتا ہوا چپ کی چادر

اوڑھے بیٹھا تھا۔۔۔ مگر چپ توڑنا ضروری تھا۔

"مایا! میرے پاس تمہیں دینے کے لیے پر آسائش زندگی نہیں ہے۔۔۔ میرے گھر والوں کو فی الحال میری ضرورت ہے۔۔۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو، تمہیں ہزار چاہنے والے مل جائیں گے۔۔۔"

مایا نے بغور ان سنہری آنکھوں میں جھانکا تھا۔۔۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا یا خود کو، یہ جاننا مشکل تھا۔۔۔ شرمیلی ہوا نے بے باکی کی ردا اوڑھی اور سارے میں مٹرگشت کرنے لگی۔۔۔ روشنیاں اب بھی جل رہی تھیں۔

"جانتی ہوں کہ زندگی کا سفر گزر جائے گا۔۔۔ ہزاروں ملیں گے ان میں مرزا ملک نہیں ہوگا، سمجھوتا کرنے کی کوشش بھی کرلوں تو شاید وہ یادیں کبھی بھی نہ بھول سکوں گی کہ راتوں کے کئی تاریک پہر کتاب پڑھنے کے بہانے میں نے تمہاری چوکھٹ پر گزارے ہیں۔۔۔ کب سے دعا کر رہی ہوں وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے میں تمہارا "ورد" بھول ہی نہ سکی۔۔۔"

اداس کونج نے جھکا سر اٹھایا تھا کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں دعاؤں میں مانگا جاتا ہے۔۔۔ اور بلاشبہ مرزا ملک خوش قسمت تھا۔

پربتوں کے پار ایک شہر طلسم کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔۔۔ ایک قوس قزح رنگی جذبہ جو مدت طویل سے قید میں تھا اسے اذن آزادی دیا گیا۔۔۔ وہ جذبہ اس ویران گلی کے اوپر ٹھہرے آسمان پر کسی تارے کی مانند ٹوٹا اور افشاں گراتا ہوا مرزا ملک کو رنگین کر گیا۔

دور سے سیٹیوں کی سی آواز گونجی۔۔۔ اور ڈھیروں سنہری پتنگے مرزا ملک اور مایا کے گرد چکرانے لگے۔

فٹ پاتھ کے پار اس پارک میں اندھے لڑکے نے گٹار بڑی مہارت سے بجایا تھا۔۔۔ اور سحر طاری کر دینے والے میوزک کی آواز سے کو باندھنے لگی۔۔۔ سنہری آنکھوں والا مرد ہلکے سروں میں ہنسا تھا۔

"مایا۔۔۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو ایسا ہی سہی۔۔۔ زندگی میں خوش قسمتی ایک بار بڑی چاہ اور دل سے دستک دینے آتی ہے۔۔۔ تم میرے لیے ویسی ہی ہو۔۔۔ میرے دل کے دروازے کھل چکے ہیں۔۔۔"

مایا کی آنکھوں میں ست رنگی نور جگمگایا تھا۔۔۔ اردگرد کی فضا میں نارنجی انار چھوٹنے کے بعد کا سا سماں بکھرنے لگا۔

"مگر مایا۔۔۔ میری ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں۔۔۔ تمہیں کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا۔۔۔ کرلوگی ناں۔۔۔؟"

محبوب نے سوال کیا اور اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"اب تک انتظار ہی کرتی آئی ہوں۔۔۔ کسی نئے برس کی پہلی شام یہیں اسی بنچ پر ہم دونوں اکٹھے ہوں گے۔۔۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی کافی تم بنانا۔۔۔"

وہ ہنس رہا تھا۔ ہنستے ہنستے آنکھوں میں پانی آجانا کتنا دلفریب نظارہ ہوتا ہے۔۔۔ اندھا لڑکا اردگرد سے بے نیاز گنگناتا رہا تھا۔۔۔ اور سنہری شام قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔

نئے سال کی سنہری سرد سرد شام نے اس لمبی گلی میں قدم رکھا تھا۔۔۔ سارا ماحول دودھیا دھند کی لپیٹ میں تھا۔۔۔ دور تک گلی میں پھیلی دھند میں اسٹریٹ لیمپس کی روشنی نے زردی بھردی تھی۔۔۔ سنہری پتنگے جو پہلے روشنیوں سے چمٹے نظر آتے تھے اب جانے کہیں دور درختوں کی چوٹیوں پر روپوشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

سنگی بنچ پر دو وجود شال اوڑھے کافی کا فل سائز مگ تھامے بیٹھے ہیں۔۔۔ پہلی بار سرد ہوا نے اپنی روش بدلی تھی لڑکی کافی کا ایک گھونٹ بھرتی ہے اور پھر کپ لڑکے کی طرف بڑھا دیتی ہے۔۔۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے یہ کام جاری ہے۔

"اگر تم یہاں آتے اور میں تمہیں نہ ملتی تو تم کیا کرتے؟" لڑکی نے سوال کیا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو بخوبی احسن طریقے سے نبھایا۔۔۔ میرے دل میں یہ احساس تھا کہ دور سرحد پار میرا کوئی منتظر ہوگا۔۔۔ ہر آنے والے دن میں، میں نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ اس نے میرے جینے کی وجہ رکھی ہے۔۔۔ میں نے اس خیال کو دل میں جگہ ہی نہیں دی کہ تم مجھے انتظار کرتی ہوئی نہیں ملوگی۔۔۔ جب جذبوں میں سچائی ہو تو وہ جذبے رد نہیں کیے جاتے۔۔۔" اس لڑکے نے جواب دیا تھا۔ بنچ

کے پاس ایک سفری بیگ پڑا تھا۔۔۔ بس کا مطلب مسافر سیدھا یہیں آیا تھا۔۔۔

لڑکی سنہری آنکھوں والے شخص کی طرف دیکھ کر دھیمے سے مسکراتی ہے اور مگ سے ایک گھونٹ بھرتی ہے۔۔۔ آسمان پر تارے موجود تھے۔۔۔ لڑکی نے تاروں کی طرف نگاہ کی تھی۔

"ہم ساری زندگی کہتے رہتے ہیں کہ وقت گزر گیا مگر ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہم غلط ہوتے ہیں۔۔۔ شاید وقت ٹھہرا رہتا ہے ہم گزر جاتے ہیں۔۔۔ میں نے اس عرصہ میں اصل "خدا" بھی تلاش کر لیا ہے۔۔۔ شاید کبھی تمہارے دل میں خیال آئے کہ میں نے تمہاری وجہ سے اسلام قبول کیا تو پہلے بتا دوں تمہیں۔۔۔ میں نے اپنے دل سے راہِ ہدایت پر قدم رکھا ہے۔۔۔"

مایا کے چہرے پر نورِ ہدایت کا چراغ جھلملا رہا تھا۔۔۔ جو روشنی کے ساتھ ساتھ خوشبو بھی دیتا ہے۔۔۔

اب کافی کا مگ مرزا ملک کے ہاتھوں میں تھا۔۔۔ وہ ہلکے ہلکے گھونٹ لیتا کہہ رہا تھا۔۔۔

"میں تمہیں ٹھکرا دیتا تو شاید زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرتا۔۔۔ میں اب خدا کا شکر گزار ہوں۔ کل صبح ہی ہمارا نکاح ہو گا اور پھر تمہارے ویزا لگنے کی دیر ہے۔ ہم پاکستان چلے جائیں گے۔۔۔ وہاں تمہارا شایانِ شان استقبال ہو گا۔۔۔ گھر والوں نے تمہارے لیے بہت کچھ بھیجا ہے۔۔۔"

کافی کا مگ ختم ہو گیا تھا۔ اور ان دونوں کے قریب تیسرے فریق کی حیثیت سے پڑا تھا۔۔۔ وہ دونوں آج رات بس باتیں ہی کرنے والے تھے۔۔۔ بھلا محبتوں کے انتظار کی طویل کہانیاں لمحوں میں کہاں سمٹ سکتی ہیں۔۔۔

رات کے پردے پر تاروں نے روشنی میں اضافہ کر دیا تھا اور پربتوں کے پار ٹھہری اداسی نے زقند بھری اور لمحۂ موجود میں محبت کے ملن پر کونجوں کے ساتھ دھمال ڈالنے لگی۔

رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی۔ ایک نئی امید کے ساتھ نیا دن طلوع ہونے کو تھا۔۔۔

پارک میں ننھی ننھی روشنیاں جگنوؤں کی طرح جل رہی تھیں۔۔۔ گندمی رنگت والی لڑکی میرینا، جوڑی کے ساتھ واکنگ ٹریک پر خراماں خراماں چل رہی تھی۔

جوڑی ہوا کے سروں کے ساتھ ساتھ مدھم آواز میں بولتا چل رہا تھا۔۔۔

"بہت ساری چیزوں کی طرح محبت بھی کبھی دوسروں کے سمجھانے پر آشکار ہوتی ہے۔۔۔ اگر کچھ عرصہ پہلے مایا مجھے احساس نہ دلاتی تو آج ہم اکٹھے نہ ہوتے۔۔۔ خدا اسے اور مرزا ملک کو ہمیشہ خوش رکھے۔۔!"

اس کی دعا کسی ست رنگی گلال کی طرح آسمان کی طرف اڑتی چلی گئی تھی۔

میرینا نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ گندمی رنگت بیک گراؤنڈ روشنیوں میں کسی ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔

"میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو پس پشت ڈال کر دوسروں کا سوچا ہے۔ مگر میں غلط تھی۔ اصل سہارا تو خدا ہوتا ہے لوگ تو وسیلے بنتے ہیں۔ میں دوسروں کے لیے وسیلہ تھی اصل ذات تو وہی ہے۔"

وہ دونوں ہنستے ہوئے آئسکریم بار کی طرف جا رہے تھے۔

چاند کی زرد روشنی میں وہ سونے کے پانی سے نہائے مجسموں کی طرح واکنگ ٹریک پر چلتے جا رہے تھے۔

"محبت مل جانے کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا جاتا۔ بس حال میں جیا جاتا ہے۔ محبت نہ ملے تو مصلحت ہوتی ہے مختصری، جو پربتوں کی باسی تھی۔ محبوب کی چاہ میں حالت انتظار میں جاں سے گزر گئی۔۔۔ مگر کچھ خوش قسمت لوگوں کو محبت خود چن لیتی ہے۔۔۔ اس کی وجہ ان محبت زدہ دلوں کی نیکیاں دعائیں اور عبادتیں ہوتی ہیں۔"

نئے برس کی آہٹ پر بیت جانے والے لمحوں کی چاپ دم توڑتی ہے اور نیا برس روشن دن کی طرح طلوع ہوتا ہے۔۔۔

"زندگی کی حقیقت خوش رکھنے اور خوش رہنے میں ہے۔۔۔"

سحر بتول

محبت ابر جو

نیا ملک ' نیا شہر ' نئے چہرے ' نئے نئے تجربات ' سڈنی ائیر پورٹ پر اترتے ہی پہلی سوچ اس کے ذہن میں یہی آئی تھی۔ وہ جو شوقین تھا نئے ایڈونچرز کا ' لوگوں کا مشاہدہ کرنے کا ' ان کے چہرے پڑھنے میں ماہر '

کون ' کب ' کیا سوچ رہا ہے یہ جاننے کا جنون۔

"میں ایک اچھا سائیکاٹرسٹ بن سکتا تھا لیکن میرے اندر کا آرٹسٹ.... جسے ہر وقت کچھ یونیک کرنے کی دھن رہتی ہے ' اس معصوم کا کیا ہوتا"۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی وہ مسکرایا۔

یونی ورسٹی آف کیمبرج سے ڈسٹنکشن کے ساتھ آرکیٹیکچر میں بیچلرز اور پھر ماسٹرز اس لیے کیا تھا کہ ایک دن سڈنی میں بنے بابا کے آفس کا چارج سنبھالے 'لعنت ہو تجھ پر.... سالار حسین....

ائیر پورٹ سے باہر آ کر اسے سامنے ہی آفس کا مینیجر نظر آیا تھا جو یقیناً" اسے ہی ریسیو کرنے آیا تھا اور یقیناً" اسے بابا نے ہی آنے کو کہا تھا کہ میرا لاڈلا پہلی بار سڈنی جائے گا ' کہیں کھو نہ جائے.... اف بابا کی یہ ادائیں بھی نا....

"ہیلو سر! میں پیٹر ہوں۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ سفر کیسا رہا؟"

"ٹھیک ہے.... میں سب سے پہلے آفس جانا چاہتا ہوں۔ گاڑی کہاں ہے؟"

"وہاں.... لیکن اگر آپ کچھ دیر آرام کرنا چاہیں تو

میں آپ کو گھر لے چلتا ہوں۔ پھر بعد میں آفس لے جاؤں گا۔"

"نہیں شکریہ! مجھے کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے۔"

"سوری سر! آیئے۔" (یہ تو ضدی اور بہت مغرور لگتا ہے۔)

☼ ☼ ☼

آفس وزٹ کے بعد وہ Dover Heights میں بنے اپنے اپارٹمنٹ میں آیا تھا جو بابا نے کچھ سال پہلے خریدا تھا۔ ایک نیا ٹھکانا' نہ جانے کتنے عرصے تک' اس نے گہری سانس لے کر سوچا اور اپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگا۔ سیل پر آئی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"السلام علیکم بابا!"

"وعلیکم السلام! پہنچ گئے؟"

"جی کب کا' آفس کا بھی جائزہ لے لیا اور اب اپارٹمنٹ کا انسپیکشن کر رہا ہوں۔"

"آفس۔۔۔" بابا نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم وہاں ہو بھی آئے' تھوڑا آرام کر لیتے' خیر کیسا لگا؟

"کیا آفس؟ بہت کچھ بدلنا پڑے گا۔ اسپیشلی وہاں کا انٹریر اینڈ آرکیٹیکچر۔۔۔ ہاں اسٹاف کے بارے میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"ہاں۔۔۔ جانتا ہوں تمہیں!" بابا نے بھی اس کی بات کا مزہ۔ لے کے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا گھر میں سب کیسے ہیں؟ ماما' بابا اور آپی آ گیا دبئی سے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ سب ٹھیک ہیں اور تمہیں بالکل مس نہیں کر رہے۔" بابا کی اس بات پر ہنسا تھا وہ۔

"بابا! آپ کو بالکل جھوٹ بولنا نہیں آتا۔" اس کی آنکھوں میں شرارت اور مسکراہٹ تھی۔

"شہزادے! تو کچھ زیادہ ہی خوش فہم نہیں ہو گیا سڈنی جا کر؟" بابا کو جب بھی اس پر زیادہ پیار آتا تو اسے اسی نام سے مخاطب کرتے اور آپی ہمیشہ یہی کہتا کہ بابا آپ کے یہ کہنے سے اس کا دماغ مزید اونچا نہیں ہو سکتا' کیونکہ اللہ نے سات آسمان ہی بنائے ہیں۔

"خیر۔۔۔ اب آرام کرو' صبح بات کرتے ہیں اور ہاں اپنی پھوپھو کے گھر جانا مت بھولنا۔ کل سنڈے ہے

مکمل ناول

کل ہی چلے جانا۔ آفس چارج لینے کے بعد ٹائم نکالنا مشکل ہوگا' اللہ حافظ!"

"ٹیک کیئر۔۔۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔ فون بند ہوچکا تھا۔

"پھوپھو کے گھر؟ ان سے تو میں اپنے ہوش میں صرف ایک بار ملا ہوں' اس دن جس دن میرا۔۔۔" اس نے گہری سانس خارج کی۔ "چل بیٹا فریش ہوکے سو لے' کل سے برے دن شروع ہو رہے ہیں۔ میرے یا آفس اسٹاف کے' یہ ابھی کنفرم نہیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ یونی ورسٹی آف میلبورن میں ڈاکٹر آف میڈیسن کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ بہت ریزرو تھی' کلاس میں بھی کچھ اسٹوڈنٹس کے ساتھ ہی اس کی تھوڑی بہت بات چیت تھی۔ اس کے اکثر فیلوز اسے مغرور اور بددماغ سمجھتے تھے۔ اس کے مشرقی نقوش کے ساتھ کہیں کہیں جھلکتے اسکاٹش نقوش مجموعی طور پر ایسا تاثر دیتے تھے کہ مقابل بات کرنے سے پہلے دس بار سوچتا ضرور۔ صرف نہناں تھی' اس کی بیسٹ فرینڈ۔

نہناں تو اس کے ہر نقش پہ فدا تھی' اس کی نیلی آنکھوں میں پتا نہیں دنیا جہان کے کون کون سے تاثرات اسے نظر آتے تھے۔ جھیل جیسی آنکھیں' جن میں کبھی نرمی جھلکتی تھی' تو کبھی غصہ۔۔۔ کبھی بے گانگی اور اجنبیت اور کبھی ہنستی ہوئی روشن آنکھیں۔۔۔

اف نہناں اور اس کے چیپ ڈائیلاگز۔۔۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ وہ دل کش اور خوب صورت تھی' مگر کیا فائدہ' جب سراہنے والا ہی انجان ہو۔ نہناں انڈین مسلم تھی اور عرصہ دراز سے اس کی فیملی میلبورن میں مقیم تھی۔ اس کی اپنی فیملی سڈنی میں رہتی تھی۔ شروع شروع میں یہاں آکے وہ گھر سے دوری کا شکار ہوئی تھی۔ ہر وقت اسے ماما' بابا اور شیزی یاد آتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر بننے کے جنون نے اس کو صبر کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوئے اس نے بھاپ اڑاتی کافی کے کپ سے گھونٹ لیا اور دور تک پھیلی ہوئی سفید روئی پر نگاہیں جما دیں۔ یہ موسم اسے بہت پسند تھا' سرد موسم۔۔۔ جس میں برف کی راجدھانی تھی اور دھند کی حکمرانی' سرد سا تاثر دیتے سوکھے درخت۔۔۔ "میری زندگی بھی ان درختوں کی طرح ہے' بہار کی آمد کی منتظر۔۔۔ جو ہر منظر کو بدل دے۔۔۔ انتظار۔۔۔ بظاہر ایک لفظ۔۔۔ مگر اپنے اندر ایک کٹھن سفر رکھے ہوئے۔ کاش وہ دن نہ آیا ہوتا' تو آج شاید۔۔۔ کبھی کبھی بابا سے بہت سے شکوے ہوتے ہیں مجھے' لیکن ان کا بھی کیا قصور' وہ بھی مجبور تھے دادی کی خواہش کے آگے۔۔۔ پھر غلطی کس کی ہے؟ شاید اسی شخص کی۔۔۔ ہاں اسی کی ہے۔" وہ جیسے ایک نتیجے پہ پہنچ ہی گئی۔ ایک تھکی سانس لے کر کافی کا آخری گھونٹ لیا اور یونی جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ پھوپھو کے گھر آگیا تھا اور اس وقت ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس گھر کے مالکوں کا انتظار کر رہا تھا۔

"السلام علیکم!" حسن انکل اور پھوپھو کو دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا' بیٹھو اور سفر کیسا رہا؟" انکل نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔۔۔"

"ہم تو پرسوں سے انتظار کر رہے تھے بیٹا آپ کا۔ جب بابا جان نے مجھے آپ کے یہاں آنے کا بتایا تو بہت خوشی ہوئی مجھے۔ بلکہ میں تو یہ چاہتی تھی کہ آپ یہاں ہمارے گھر رہو۔" اس کی یہاں آمد سے پھوپھو بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

"بہت شکریہ۔۔۔ آفس یہاں سے کافی دور پڑے گا' اسی لیے بابا کے اپارٹمنٹ میں رہنے کا ارادہ ہے۔"

"اب آگئے ہو تو ڈنر کرکے ہی جانا۔"

"نہیں پھوپھو۔۔۔ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو میں یہاں ہوں' تو چکر لگتا رہے گا آپ کی

طرف۔۔۔ بھی۔۔۔ اور یہ کچھ گفٹس بھجوائے ہیں بابا نے آپ لوگوں کے لیے۔" سالار نے ٹیبل پر رکھے پیکٹز کی طرف اشارہ کیا۔

"بابا جان بھی کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے ہیں۔ روکا بھی ہے انہیں، لیکن۔۔۔ نانا کی بھجوائی ہوئی چیزیں دیا اور شاہ زیب کو بہت پسند آتی ہیں، پھر آپ اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہیں۔" حسن انکل نے پھوپھو کو چھیڑا تو دونوں مسکرانے لگے۔

"شاہ زیب کہاں ہے؟ آیا نہیں یونی سے؟"

"آگیا ہے۔ میں نے بلایا ہے' آتا ہی ہوگا۔"

"آتا ہی ہوگا نہیں شاہ زیب صاحب آچکے ہیں۔ السلام علیکم بھائی!" ماں کو اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس نے سالار کو سلام کیا اور اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام آپی سے تمہارا جس طرح ذکر سنا تھا مجھے لگا کہ تم سکس' سیونتھ اسٹینڈرڈ کے اسٹوڈنٹ ہوگے لیکن تم تو۔۔۔" سالار نے بے تکلف ہوتے ہوئے بات شروع کی' کیونکہ اس سے زیادہ رسمی ہونا اس کے بس میں نہیں تھا اور واقعی وہ شاہ زیب کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"آپی مطلب عبادلالہ؟ ہاں وہ اپنے آپ کو ہمارا بزرگ سمجھتے ہیں۔" اس کی اس بات پر سالار نے قہقہہ لگایا۔

"بزرگ۔۔۔ ھم۔۔۔ انٹرسٹنگ۔۔۔"

رات گئے جب وہ پھوپھو کے گھر سے ڈنر کرکے اٹھا تو شاہ زیب سے کافی بے تکلفی اور دوستی ہو چکی تھی' اس سے چھ سال ایج ڈیفرنس ہونے کے باوجود۔۔۔ وہ ایسا ہی تھا جو اچھا لگے' بہت جلدی اس سے دوستی کرنے والا۔ اپنے بزنس حلقے میں وہ بہت زیادہ اکھڑ اور مغرور مشہور تھا اور لوگوں کے خیال میں غرور اور بددماغی اس کی شان دار شخصیت پر جچتی بھی بہت تھی۔ جبکہ فرینڈز اور فیملی میں وہ بہت خیال رکھنے والا اور زندہ دل سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک کی تکلیف کا احساس کرنے والا۔ گاڑی کو روڈ پر لاتے ہوئے اس نے سوچا کہ سب سے ہی ملاقات اچھی رہی۔ جتنا میں جھجک رہا تھا اب اتنا ہی ریلیکس ہوں۔ سب سے مل لیا سوائے۔۔۔

☼ ☼ ☼

"Hussy تم کہاں غائب تھے اور میری کالز کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے؟" وہ تیزی سے لیکچر ہال کی طرف جا رہا تھا' جب پیچھے سے اسے کسی نے پکارا اور انگریزی میں سوال کیا۔ وہ جانتا تھا اسے کس نے پکارا ہے۔

"اوہ پلیز۔۔۔ ناٹ آگین۔" وہ بے زاری سے بڑبڑایا اور آگے بڑھنے لگا' جب وہ تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔

"پلیز۔۔۔ میری بات سنو۔ پلیز ایک بار۔۔۔ تم کیوں ایسا کر رہے ہو۔" اب کی بار اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

وہ جولی۔۔۔ جولیا ڈیوڈ سن۔۔۔ اس کے ڈپارٹمنٹ کی سب سے حسین اور اسٹائلش لڑکی۔۔۔ اس کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی۔ وہ تھا ہی ایسا۔۔۔ اتنا شان دار کہ کوئی بھی لڑکی اس کی دوستی کی تمنا کرتی' اس کے ساتھ کی حسرت رکھتی' چاہے وہ ساتھ چند گھنٹوں کا ہی کیوں نہ ہو۔ پوری یونی کی لڑکیاں فدا تھیں اس کے قد پر۔۔۔ شان دار ڈریسنگ پر۔۔۔ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش پر۔۔۔ کسی کو اس کے ٹینس کھیلنے کا انداز اچھا لگتا' تو کوئی گولف کے شاٹس کی دیوانی۔۔۔ تو پھر جولی کا کیا قصور تھا۔۔۔ ہاں وہ باقیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی دیوانگی دکھا رہی تھی اس کے لیے۔

"تم بار بار کیوں مجھے تنگ کرنے کے لیے آجاتی ہو۔" وہ واقعی اب تنگ آچکا تھا۔

"کیونکہ میں محبت کرتی ہوں تم۔۔۔ تم سے شادی۔۔۔"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں تم سے دوستی یا شادی کرنے میں۔" اب کی بار وہ اور زور سے چلایا تھا۔ "میں نے پرسوں بھی یہ بات کلیئر کردی تھی کہ مجھے نہ تم سے دوستی کرنی ہے' نہ شادی۔۔۔ تو پھر کیوں میرا وقت برباد کرنے آجاتی ہو۔ تم جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح جانتا

ہوں میں۔ نہ جانے کتنے تمہیں برت چکے ہوں گے‘ مجھے جھوٹا کھانے کی عادت نہیں۔‘‘ اب ان کے نزدیک بہت سے لوگ کھڑے ہو چکے تھے جو دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ واقعی آج کل فرسٹریٹڈ تھا بہت زیادہ۔

’’تم۔ تم نے مجھے۔ تم ایسا کیسے سوچ سکتے ہو میں ایسی نہیں۔‘‘ وہ دکھ اور غم کی تصویر بنی حسرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ واقعی تھا بھی ایسا ہی۔ اسے لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلاوجہ وہ ان سے بے تکلف بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پاس وقت اور پیسہ بہت تھا۔ وہ خود کو بہت باکردار اور ہر وہ لڑکی جو اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتی اسے بدکردار سمجھتا تھا۔ کیا واقعی وہ اتنا شریف اور اچھا تھا؟

اس واقعے کے چند دنوں بعد جب اسے جولی کی خودکشی کرنے کا پتا چلا تو وہ پرسکون ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کوئی دکھ، غم یا شرمندگی نہیں تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جولی نے اس کی وجہ سے خودکشی کی تھی مگر پھر بھی۔ اسے کوئی افسوس نہیں تھا اس کی موت کا۔ اس کے خیال میں ایک بدکردار لڑکی کا ٹھیک انجام ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ چھٹیوں پر سڈنی آئی ہوئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ جب وہ آئی ہو تو سب اپنے کام چھوڑ کر اسے وقت دیں۔ اس کے نخرے اٹھائیں اور اکثر ایسا ہی ہوتا مگر اس بار نہ جانے کچھ مختلف تھا۔ کل کا سارا دن تو ٹھیک گزرا۔ شیزی اور اس کی نوک جھونک‘ بابا کا اس کی طرف داری کرنا اور شیزی کو ڈانٹنا‘ ماما کا اس کے لیے گرم گرم چیزیں بنانا اور بوا کا پریشان ہونا۔

لیکن آج صبح سے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی اس کی۔ بابا اور شیزی باہر گئے ہوئے تھے اور ماما اور بوا کچن میں نہ جانے کون کون سی ڈشز بنا رہی تھیں۔ ایسا کون آ رہا تھا جس کے لیے اتنا اہتمام۔۔۔؟ خیر مجھے کیا۔

شام میں جب وہ سو کر اٹھی تو لاؤنج سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ان ساری آوازوں کو وہ پہچانتی تھی‘ سوائے ایک کے۔۔۔ دھیمی گہری آواز۔۔۔ جو سامعین کی سماعتوں کو کھینچ لینے کا فن رکھتی ہو۔۔۔ اندر تک اتر جانے والی آواز۔۔۔

کون تھا یہ؟

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اجنبی چہرے پر پڑی اور وہ وہیں ساکت ہو گئی‘ یہ چہرہ اتنا بھی اجنبی نہیں تھا اس کے لیے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہاں۔۔۔ یہاں کیا کر رہا ہے۔۔۔ کسی نے اس کا ٹھٹکنا نوٹ نہیں کیا تھا‘ سب باتوں میں مگن تھے اور وہ بے یقین نظروں سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ رہی تھی۔

’’یہ کب آیا سڈنی؟ اور کیوں؟ کسی نے مجھے بتایا بھی نہیں۔‘‘ اسے افسوس ہوا۔ اگلے لمحے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ مجھے وہی کرنا ہے جو اتنے سالوں سے کرنے کا سوچا ہوا تھا۔۔۔ اگنور۔۔۔ وہ پرسکون ہو گئی اور اپنے چہرے کو سپاٹ بناتے ہوئے آگے بڑھی۔

’’ہیلو ایوری باڈی!‘‘ اس نے مجموعی طور پر کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا اور بوا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سالار نے شیزی سے بات کرتے کرتے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اوہ۔ تو یہ ہیں محترمہ دیا صاحبہ۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر سے شیزی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

’’سالار بھائی! میں سمجھتا تھا آپ بہت ہی پراؤڈ قسم کے بندے ہوں گے جس کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوگا۔‘‘ شاہ زیب نے شرارتی انداز میں کہا۔

’’کیوں۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟ ایسا کیوں سوچا تم نے؟‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

’’آپ کو دیکھ کے پہلا تاثر یہی آتا ہے چارمنگ۔۔۔ جینیس اور ایروگنٹ۔‘‘ اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

’’شاہ زیب! کافی سے زیادہ انٹرسٹنگ انسان ہیں۔‘‘ سالار نے اس کی بات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ویسے اس دن مجھے آپ کے کم مسکرانے کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔"

"واہ! تھوڑے عرصے میں تم نے یہ بھی اندازہ لگالیا کہ میں کم مسکراتا ہوں' یار کیا چیز ہو تم؟ ویسے کیا وجہ ہے میری اس کنجوسی کی؟" دونوں ہی کو اس بے سروپا گفتگو میں مزہ آنے لگا۔

"اس لیے کہ لڑکیاں آپ کی ایک مسکراہٹ پر ہی دل ہار جاتی ہیں' اب کس کس کے دل کو سنبھالیں گے آپ۔" وہ دونوں دنیا کو مکمل نظرانداز کیے آپس میں مگن تھے اور وہ ان دونوں کی حد درجہ بے تکلفی پر حیران ہوتے ہوئے اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

نہ جانے کتنے گھنٹوں سے وہ اسی حالت میں تھا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ رحم۔۔۔ معافی۔۔۔ سکون۔۔۔ بس یہی تین الفاظ بار بار اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ بے سکونی اس کے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب یہ بے سکونی نہیں ہوگی تو وہ کیسا محسوس کرے گا؟ شاید اپنا آپ خالی خالی۔۔۔ اس کے ہونٹوں میں نامحسوس ہونے والی جنبش تھی لیکن پھر بھی اس کی بات اس تک پہنچ رہی تھی جسے لفظوں کی ضرورت ہی نہیں تھی' دلوں کے بھید جاننے کے لیے۔ ہاں وہ اپنے رب کے سامنے پچھلے کئی گھنٹوں سے سر بہ سجود تھا۔

"اے اللہ مجھے بخش دے۔۔۔ معاف کردے۔۔۔ رحم کردے میرے مالک۔۔۔ تو۔۔۔ تو رحمٰن ہے۔۔۔ اللہ مجھے دعا کے وہ الفاظ دے دے جس سے تو میرے گناہ بخش دے۔ میں بہت گناہ گار ہوں' میں جانتا ہوں۔۔۔ میں نے کفران نعمت کیا ہے۔ تو نے جو احسان کیا تھا میری ذات پر ایک ایسے گھر میں مجھے پیدا کرکے جو۔۔۔" اور پھر چند لمحوں کے لیے اس کا ذہن بالکل خالی ہوگیا۔۔۔ کورا کاغذ۔۔۔ بس صرف ایک لفظ کی پکار تھی وہاں۔۔۔ وہ ایک لفظ بہت بھاری تھا اس کی زبان سے ادا نہیں ہو پایا۔ "لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیری بخشش میرے گناہوں سے کہیں زیادہ ہے' ایسا کوئی گناہ نہیں جس کی تیرے ہاں بخشش نہیں۔۔۔ ہاں بس دل میں شرمندگی اور ہونٹوں پہ توبہ کا ہونا شرط ہے۔ اے اللہ! میں شرمندہ ہوں' توبہ کرتا ہوں سچے دل سے' پھر کیوں تو مجھے سکون نہیں دیتا؟ یہ یقین دیتا کہ میرا گناہ واقعی بخشا جاچکا ہے۔"

کافی دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا سجدے سے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ کیا وہ ڈپریشن کا مریض بن کر ساری زندگی گزارنے والا تھا؟ لیکن اس سب کی وجہ؟ اس نے تھک کے سوچا۔۔۔ کیا واقعی وہ وجہ جانتا تھا؟ کیا

وہ نہیں جانتا تھا؟

☼ ☼ ☼

تو بالآخر وہ آ ہی گیا۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں بیڈ کراؤن پہ سر رکھتے ہوئے سوچا۔ میں اسے کبھی نہ پہچانتی اگر لالہ نے مجھے اس کی تصویریں نہ بھیجی ہوتیں۔ وہ ویسا ہی ہے آج بھی جیسا چھ سال پہلے تھا نہیں... اس نے بے اختیار نفی کی۔ وہ ویسا نہیں ہے بلکہ اور زیادہ شان دار پرسنالٹی ہوگئی ہے اس کی۔ "لیڈی کلر" اس نے مدھم آواز میں تمسخر سے کہا۔

"میں نفرت کرتی ہوں اس سے شدید نفرت... اور شاید وہ بھی مجھے ناپسند کرتا ہے' تب ہی تو آج ہم دونوں نے اگنور کیا ایک دوسرے کو... اس نے جو کچھ میرے بارے میں لالہ سے کہا تھا کیسے بھول سکتی ہوں میں اپنی وہ توہین... اتنے سخت الفاظ اس نے اتنے آرام سے کہہ دیے تھے اس کے بارے میں' جسے وہ جانتا تک نہیں' کبھی بات تک نہیں کی' بلکہ بات کرنے کے قابل سمجھا ہی کہاں۔" ایک اور تلخ سوچ۔

"آج اس شخص کو اپنے سامنے دیکھ کر ایک بار پھر مجھے اپنی ہتک یاد آگئی۔ ویسا ہی سناٹا اترا میرے دل و دماغ میں جیسے پانچ سال اور دو ماہ پہلے اترا تھا۔ ٹیبل پر سب کتنے خوش اور مگن تھے' ماما' بابا بھی... انہیں بھی میری اذیت کا کا پتا نہیں چلا اور وہ شیزی کا بچہ... کیسے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا اس سے' جیسے وہ بچپن کی سہیلیاں ہوں... بد تمیز نہ ہو تو...

لیکن مجھے اب اسے اگنور کرنا ہے۔ مجھے اس پر اب اپنی نفرت بھی ظاہر نہیں کرنی۔ اس کو یہ تاثر دینا ہے کہ اس کا ہونا' نہ ہونا میرے لیے برابر ہے۔ ہاں یہی کرنا ہے' مجھے بھولنا ہو گا وہ سب... لیکن اتنا آسان نہیں ہوتا اپنی توہین بھولنا... اور ایک بار پھر وہ ماضی کی وادی میں کھو گئی۔

☼ ☼ ☼

مراد علی اور کمال حسین نہ صرف کزن تھے' بلکہ ایک دوسرے کے جگری دوست بھی تھے اور یہ دوستی اس وقت اور بھی مضبوط ہوگئی جب مراد علی کی شادی کمال حسین کی بہن سے ہوئی۔ کمال حسین نے اپنے ماں باپ کی خواہش پر ان کی بھانجی شہربانو سے شادی کی جو کہ بیوہ تھیں اور تین بچوں کی ماں تھیں۔ ان دنوں وہ بزنس کی دنیا میں اپنے قدم جمانے میں مصروف تھے۔ اس لیے شہربانو بیگم کو زیادہ وقت نہ دے سکے' جس سے ان دونوں کے بیچ تلخیاں اور دوریاں بڑھیں۔ شہر بانو خود بھی مزاج کی تیز تھیں اور اپنے میکے سے ملی جائیداد پر نازاں' ہر وقت کمال حسین کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ ان کے بچے بھی ان کے نقش قدم پر چلتے۔ کمال حسین اور شہربانو کا اکلوتا بیٹا صارم حسین گھر کے ماحول' ماں کی لاتعلقی اور سوتیلے بھائیوں کے سلوک سے تنگ آکر فوج میں چلا گیا' تاکہ گھر سے زیادہ سے زیادہ دور رہ سکے۔ کمال حسین بھی بیوی کے رویوں سے تنگ آکر اپنا بزنس سیٹ کرنے یو کے چلے گئے۔ اس سارے عرصے میں مراد علی اور عافیہ نے ان کا بہت ساتھ دیا۔

کمال حسین نے بالآخر اپنا گھر دوبارہ بسانے کا سوچا اب شہربانو سے انہیں کسی اچھائی کی امید نہیں تھی۔ انہوں نے ایک سکاٹش مسلم لڑکی فاطمہ سے شادی کرلی۔ فاطمہ سے ان کی دو اولادیں تھیں۔ زینب اور عباد۔ جب زینت سترہ سال کی اور عباد آٹھ سال کا تھا' اس وقت فاطمہ انتقال کر گئیں۔ اس عرصے میں جب شہربانو نے صارم کی شادی اپنی بھتیجی سے کروانی چاہی تو صارم حسین نے انکار کر دیا' کیونکہ ان کی بھتیجی کا مزاج بھی ان ہی جیسا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد بھی ان کی طرح کی زندگی گزارے۔

کمال حسین کی ایما پر صارم نے اپنی ایک کولیگ شازمین سے شادی کرلی' جس پر شہربانو اور ان کے بیٹوں نے انہیں گھر سے چلے جانے کا حکم دے دیا کہ یہ گھر شہربانو کی ملکیت تھا۔ سالار ایک ہی بیٹا تھا صارم کا' جب فاطمہ کے انتقال پر کمال حسین' زینب اور عباد کو پاکستان لے آئے اور صارم کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ کچھ عرصے بعد زینب کی شادی حسن مراد علی سے

ہو گئی اور وہ ان کے ساتھ آسٹریلیا چلی گئی۔ مراد علی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند میں تھا جب اس کے سیل پر کال آنے لگی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اسکرین کو دیکھا۔ زینب کا نمبر اسکرین پر تھا۔

"پھوپھو کے گھر سے کال اس وقت....؟" وہ نیند میں بڑبڑایا۔

"السلام علیکم پھوپھو! رات کے اس وقت.... سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس نے ایک ہی سانس میں سوال کیے۔

"سالار بیٹا! میں بہت پریشان ہوں، تم فوراً آجاؤ۔" زینب نے بوجھل لہجے میں کہا۔ اسے ان کے لہجے میں نمی صاف محسوس ہوئی۔

"کیا ہوا پھوپھو، مجھے بتائیں؟ انکل کہاں ہیں؟"

"شیزی پولیس اسٹیشن میں ہے۔" اس بار دوسری طرف سے آنے والی آواز پھوپھو کی نہیں تھی، شاید وہ رو رہی تھیں اور مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

"پولیس اسٹیشن...." اس نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیوں؟"

"ہمیں کچھ نہیں پتا۔ بابا کو شیزی کی کال آئی تھی پولیس اسٹیشن سے تو وہ فوراً چلے گئے۔ ہم لوگ یہاں گھر پر بہت پریشان ہیں۔" پریشانی اور خوف اس کی آواز سے صاف جھلک رہے تھے۔

"ماما نے اس لیے آپ کو فون کیا کہ آپ بابا کے پاس پولیس اسٹیشن چلے جائیں۔ وہ اکیلے سب کیسے ہینڈل کریں گے۔"

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں اور آپ پھوپھو کا خیال رکھیں۔ میں انکل سے کانٹیکٹ کرکے ان کے پاس چلا جاتا ہوں، ٹیک کیئر۔ بائے۔"

☆ ☆ ☆

"شاہ زیب!" زینب اور دیا شاہ زیب کو زخمی حالت میں آتا دیکھ کر اس کے قریب آئیں۔ "یہ کیا ہوا ہے؟ کیسے لگے یہ زخم؟ اور پولیس کیوں؟"

"پلیز.... پھوپھو.... اسے بیٹھنے تو دیں۔" زینب کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سالار نے کہا اور شاہ زیب کو سہارا دیتے ہوئے لاؤنج کے صوفے پر بٹھا دیا۔

"ماما! میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔" شاہ زیب نے پشیمان لہجے میں کہا۔ ماں اور بہن کے پریشان چہرے دیکھ کر وہ ایک بار پھر شرمندہ ہو گیا اور یہ شرمندگی سالار نے اس کے چہرے پر باآسانی پڑھ لی۔

"شاہ زیب! میرے خیال سے تم اب ریسٹ کرو اور کچھ کھا کر میڈیسن ضرور لے لینا جو ڈاکٹر نے دی ہیں۔" اس نے ایک فکرمند بھائی کی طرح کہا۔

"مہدیہ! آپ پلیز اسے روم تک لے جائیں۔ انکل اور پھوپھو سے بات کرنے سے پہلے اس نے ان دونوں کو اٹھانا چاہا۔ شاہ زیب خود بھی ماں اور باپ سے شرمندہ تھا اسی لیے فوراً جانے کے لیے اٹھ گیا۔

"بیٹا اسے روم تک لے جاؤ۔" حسن مراد نے دیا سے کہا۔

"جی بابا...."

ان دونوں کے جانے کے بعد زینب نے حسن مراد کی طرف سوال کرتی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر برسوں کی تھکن تھی۔ چند گھنٹوں میں ہی وہ بوڑھے لگنے لگے تھے۔ وہ لوگ چار گھنٹوں بعد شاہ زیب کو لے کے گھر آسکے تھے۔ شاہ زیب کے دوستوں کا کچھ لڑکوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات مار کٹائی تک پہنچ گئی اور کسی نے پولیس کو بلا لیا۔ حسن مراد اور سالار نے اپنے اثر و رسوخ استعمال کرکے اسے پولیس تحویل سے نکالا۔ سارا وقت وہ حسن انکل کو تسلی دیتا رہا۔ اسی نے سارا پیپر ورک کروایا تھا۔ ورنہ تو شاہ زیب کو زخمی حالت میں دیکھ کر حسن مراد اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ واقعی ذمہ دار بیٹا کتنی بڑی نعمت ہے اللہ کی۔

"آج جو کچھ بھی ہوا آپ دونوں کے لیے بہت پریشان کن اور تکلیف دہ ہے۔" سالار کی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ بات شروع کس طرح کرے۔
"جس عمر میں وہ ہے اکثر لڑکے اس عمر میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں آپ کے فیملی میٹرز میں انٹرفیئر نہیں کرنا چاہتا لیکن میں شاہ زیب کو چھوٹا بھائی ہی مانتا ہوں۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہو۔" حسن مراد نے کہا۔ "تم ہماری فیملی کے ہی ہو۔ تب ہی تو اس مشکل وقت میں تمہیں پکارا۔ آج جس طرح تم نے پولیس سے بات کی' میں اکیلے سب ہینڈل نہ کرپاتا کبھی' تمہارا بہت شکریہ بیٹا۔"
"بیٹا بھی کہہ رہے ہیں اور شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں۔" وہ واقعی ان دونوں کی پریشانی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس نے بھی کم تنگ نہیں کیا تھا' ماما پاپا کو۔
"ہم نے اتنی رات کو تمہیں ڈسٹرب کیا۔"
"میں بالکل بھی ڈسٹرب نہیں ہوا اور آپ دونوں پلیز مجھے شرمندہ مت کریں۔ بس اب شاہ زیب کی طرف توجہ دیں۔ اس واقعے کے بعد بہت شرمندہ ہے وہ۔ اس لیے میری آپ دونوں سے ریکویسٹ ہے کہ اس سے بہت زیادہ جرح مت کیجئے گا' کہیں وہ اور زیادہ ڈسٹرب نہ ہوجائے۔" حسن مراد اور زینب دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم اسے سن رہے تھے۔
اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پاپا ہمیشہ ایک بات کہتے ہیں مجھ سے کہ تمہارے پیروں میں ہم نے بیڑیاں ڈال دی ہیں' گھر کی اور گھر والوں کی محبت کی' تم انہیں توڑنا بھی چاہو تو توڑ نہیں سکتے اور واقعی یہ صحیح بھی ہے۔ میں دنیا میں جہاں بھی چلا جاؤں مجھے پتا ہے کہ میرے ماں باپ مجھ سے پیار کرتے ہیں' میرا انتظار کرتے ہیں اور مجھے ان ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جو میرا اصل ہے۔ آپ دونوں کو بھی اسے مزید توجہ دینی ہوگی اور پھر اسے باہر دوست بنانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"
"ہاں.... تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ جس معاشرے میں ہم نے بچوں کو پروان چڑھایا ہے وہاں والدین کو دوست بن کر ہی رہنا پڑتا ہے۔ بہت زیادہ سختی اس معاشرے میں نقصان دہ ہوتی ہے۔ اپنے بزنس میں مصروف ہو کر میں نے ان دونوں پر توجہ کم کردی تھی شاید' اسی لیے اس نے گھر سے باہر دوست بنائے۔ بہت دنوں سے ہم اس کے معمولات میں تبدیلی دیکھ رہے تھے۔ وہ دیر سے گھر آنے لگا تھا' دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت باہر گزارتا' بس اپنی مصروفیات میں گم ہو کر اس سے پوچھا ہی نہیں۔ مجھ سے کوتاہی ہوگئی اور اب ان شاء اللہ اس کا ازالہ بھی میں کروں گا۔"
"آپ پریشان نہ ہوں' وہ ان شاء اللہ سنبھل جائے گا۔ مجھے اب اجازت دیجئے اور کل شام میں ڈاکٹر نے بلایا ہے۔ ڈریسنگ چینج کرنے کے لیے۔ چلتا ہوں' اللہ حافظ۔"
"صارم بھائی نے اپنی اولاد کی کتنی اچھی تربیت کی ہے۔ سالار کتنا حساس اور محبت کرنے والا بچہ ہے۔ کتنے خوش قسمت ہیں بھائی اور بھابی۔ اس کے ہر ہر انداز میں نظر آتا ہے بھائی کا دیا گیا یقین اور اعتماد۔" اس کے جانے کے بعد زینب نے حسن مراد سے کہا۔ انہوں نے تائید کرنے والے انداز میں سر ہلایا۔ ان تینوں کی یہ گفتگو دیا نے بھی سنی تھی اور بہت خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یو باسٹرڈ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری فیملی کو گالی دینے کی۔" وہ حلق کے بل چلایا تھا اور اگلے ہی لمحے اس نے احسن کی شرٹ کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا۔
"جو وہ ہیں میں نے انہیں وہی کہا ہے۔ میری دادی کو تمہارے دادا نے دھوکا دیا ہے۔ وہ اور تمہارے مما' پاپا سب انتہائی گھٹیا اور بیچ لوگ ہیں۔" حسن بھی اب اس کے چہرے کو اپنے ناخنوں سے زخمی کر رہا تھا۔
سالار نے اسے چھوڑتے ہوئے اس کے گال پر ایک گھونسا لگایا تھا۔
وہ دونوں چودہ اور پندرہ سال کے بچے اس وقت گتھم گتھا تھے.... اور اس کی وجہ.... جو نفرت کمال حسین اور صارم حسین کے لیے ان کے سوتیلے بیٹوں

اور بھائیوں کے دلوں میں تھی اب وہی ان کی اولاد میں بھی منتقل ہو چکی تھی۔ انہیں بچپن سے یہی بتایا گیا تھا کہ ان کی دادی کو کمال حسین نے بہت دکھ دیے اور چھپ کر شادی کرلی اور صارم نے بھی ماں کو چھوڑ کر باپ کا ساتھ دیا۔ جب سالار، صارم حسین کے ساتھ بیمار دادی سے ملنے ان کے گھر آیا تو احسن نے اپنی نفرت کے زیر اثر اس کے مما، پاپا، بابا اور آپی سب کے بارے میں اس کے سامنے بہت بکواس کی۔ مما کی وہاں تمیز سے رہنے کی ہدایات نہ ہوتی تو وہ بہت پہلے اس کا منہ توڑ چکا ہوتا۔

"تم ہو گھٹیا، تمہارے ماں، باپ اور پوری فیملی ہوگی نیچ۔ انہوں نے بہت تنگ کیا میرے پاپا اور بابا کو تب ہی انہیں یہ گھر چھوڑنا پڑا۔" سالار نے اس کے جبڑے پر ایک اور گھونسا جڑا۔ جواباً اس نے بھی اس کا بازو پکڑ کر موڑا تھا۔

"بڑی تکلیف ہو رہی ہے تمہیں حقیقت سن کر۔" احسن نے تمسخر سے کہا۔ "تمہارا وہ سوتیلا چچا کیا نام تھا اس کا۔۔۔ خیر جو بھی ہو تمہارے دادا کا وہ ناجائز۔۔۔" احسن اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ سالار نے ایک جھٹکا دے کر خود کو آزاد کرایا اور اسے زور سے دھکا دیا، جس سے وہ زمین پر اوندھے منہ گرا تھا اور پھر سالار اس کو لاتوں سے مارنے لگا۔ پھر اسے اپنے نزدیک بلا نظر آیا تھا۔۔۔ اب چودہ سالہ سالار اپنے سے ایک سال بڑے احسن کو بُلے سے بری طرح پیٹ رہا تھا۔

"ہاؤ ڈیر یو۔۔۔ تم نے آپی کو گالی دی، میرے بابا کو گالی دی۔ اب دیکھنا کیا حشر کرتا ہوں تمہارا۔" وہ مسلسل اسے بری طرح مار رہا تھا۔ اس کے سر پر گویا خون سوار تھا۔ احسن کے سر سے خون نکلتا دیکھ کر بھی وہ رکا نہیں۔ نہ جانے کتنی دیر وہ احسن کو مارتا رہا جب کسی نے اسے دھکا دے کر دور ہٹایا تھا۔

وہ احسن کی ممی تھیں جو روتے ہوئے بے ہوش احسن کو اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ احسن کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا، اس کا پورا چہرہ خون سے لال تھا۔ اسے اب معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ شرمندہ احسن کی حالت دیکھ کے بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے خیال میں اس نے جو کیا وہ ٹھیک تھا، بس اسے پاپا کی ڈانٹ کی وجہ سے تھوڑی پریشانی تھی۔

سالار حسین چاہے کتنا خود پسند، ضدی، ہٹ دھرم تھا لیکن وہ اپنے مما، پاپا، بابا اور آپی سے بہت محبت کرتا تھا۔ دنیا میں صرف یہی چار لوگ تھے جن کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ اسے دنیا میں کسی اور کی پروا نہیں تھی، سوائے ان چار لوگوں کے جو اس کو بہت چاہتے تھے۔ احسن کو دیکھتے ہوئے اب وہ یہی سوچ رہا تھا کہ پاپا کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں اس وقت لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھے کافی کے ساتھ دھوپ کا مزہ بھی لے رہے تھے۔ شیزی کے زخم اب کافی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے۔ آج سالار خاص طور پر اسی سے ملنے آیا تھا، چند ضروری باتیں کرنے۔

"یونی کب جوائن کر رہے ہو؟" سالار نے بات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"دو، تین دن میں ان شاء اللہ۔"

"مجھے امید ہے کہ اب تم ان لڑکوں سے دور رہو گے جنہوں نے تمہیں شرمندہ کروایا اپنی فیملی کے سامنے۔"

"جی میری سمجھ میں آگیا ہے کہ ایسے دوست جو آپ کو غلط راہ دکھائیں وہ کبھی مخلص نہیں ہوتے۔" شیزی کے لہجے میں پچھتاوے تھے۔

"تم اپنی اسٹڈیز کے ساتھ ساتھ اپنی فیلڈ کے مطابق کوئی پارٹ ٹائم جاب کیوں نہیں کر لیتے۔ اس سے بہت فائدہ ہوگا تمہیں آگے چل کر۔۔۔" سالار نے بڑے بھائی کی طرح مشورہ دیا۔ وہ اس کے فارغ وقت کو کارآمد بنانا چاہتا تھا کہ اسے پھر ان لڑکوں کی طرف پلٹنے کا موقع نہ ملے۔

"ہم۔۔۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، بہت کر لیے بابا کے پیسوں پر عیش۔"

"جو مزہ باپ کے پیسوں سے عیش کرنے میں آتا ہے' وہ اپنے سے نہیں آتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے پیسوں سے انسان ضرورت پوری کرتا ہے اپنی' عیش نہیں' جس عمر میں تم ہو اس میں دوستوں کے ساتھ موج مستی کو ہی انسان زندگی سمجھتا ہے۔ میں روک نہیں رہا تمہیں اس سب سے' بس آئندہ دوست بناتے ہوئے احتیاط برتنا۔" سالار نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں مجھے یہ بات کہنی بھی چاہیے یا نہیں' مگر کبھی کبھی بے تحاشا محبت بھی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ اکلوتے ہونے کی وجہ سے ہر وقت ماما' بابا کی نصیحتیں اور فکر۔۔۔ چڑ ہونے لگتی تھی کبھی کبھی مجھے۔۔۔ اس لیے باہر ایسے دوست بنائے میں نے کہ کچھ تو فرار مل سکے۔ میں اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ نہیں رہا' بس پتا نہیں کیوں۔۔۔ کبھی کبھی میرا شدت سے دل چاہتا ہے کہ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا جس سے میں اپنے مسائل شیئر کرتا۔ ہر بات ڈسکس کرتا۔

مہدیہ میری بہت اچھی دوست ہے مگر وہ ہے تو ایک لڑکی۔۔۔ اس سے بہت کچھ میں چاہ کر بھی نہیں کہہ پاتا اور اب تو وہ زیادہ تر پڑھائی میں مصروف ہوتی ہے۔ ایسے میں آپ ہی بتائیے کہ میں باہر ہی دوست تلاش کروں گا نا؟ ماں باپ چاہے کتنے اچھے دوست کیوں نہ ہوں' ہمیشہ ایک پردہ ہوتا ہے اولاد اور ان کے بیچ۔۔۔ احترام اور لحاظ کا۔" شیزی نے اپنی تمام الجھنیں اسے بتا ہی دیں۔

"ہم دونوں اکلوتے بیٹے ہیں اپنے والدین کے۔ ان کے بڑھاپے کا واحد سہارا۔۔۔ بہت امیدیں ہیں انہیں ہم سے۔۔۔ اسی لیے شاید وہ بہت زیادہ حساس ہیں ہمارے لیے۔ وہ بس یہ چاہتے ہیں کہ ہم کامیاب زندگی گزاریں۔ میں بھی کبھی تمہاری طرح ہی سوچتا تھا' مگر پھر آپی آگیا اور ہم بہت اچھے دوست بن گئے۔ محبتوں کو کبھی بوجھ مت سمجھو' جب یہ نہیں ملتیں انسان کو تب اسے ان کی قدر سمجھ میں آتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے ذہن کی اسکرین پر بہت سی یادیں ابھریں۔۔۔ تنہائی اور پچھتاوؤں بھری یادیں۔ "اپنے ماں' باپ اور بہن سے فرار مت حاصل کرو' کیونکہ جب یہ واقعی تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے' تب تم بہت پچھتاؤ گے۔ تم جتنا اپنی فیملی کے قریب رہو گے' اتنا ہی اس معاشرے کی بدصورتی سے دور رہو گے۔ تم چاہو تو ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں؟ تم مجھ سے ڈسکس کرلیا کرو اپنے پرابلمز' یہ سوچے بغیر کہ میں تم سے چھ سال بڑا ہوں۔ آپی کو بھی میں نے کبھی بڑا نہیں سمجھا' اسی لیے ہم دنیا کے کسی بھی موضوع پر بلا جھجک بات کرتے ہیں۔ تم بھی مجھ سے جو چاہے ڈسکس کرسکتے ہو۔ چاہے پڑھائی اور یونی کے متعلق یا کوئی پرسنل بات' یا پھر گرل فرینڈز اور ان کے مسائل۔۔۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہمارے بیچ ہوئی بات کبھی آگے نہیں جائے گی۔ آپی تک بھی نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

سالار کو شاہ زیب میں اپنا ماضی نظر آرہا تھا۔ ایک تو وہ اسے اس تکلیف اور دکھ سے بچانا چاہتا تھا جس سے وہ گزرا تھا' اپنی جذباتیت کی وجہ سے۔۔۔ دوسرا اس میں اس کی اپنی بھی غرض تھی۔۔۔ اسے عالیان کا دیا ہوا قرض اتارنا تھا' کیونکہ کسی کا مقروض ہونا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔

اپنے کمرے کی بالکنی میں کھڑی دیا کافی دیر سے ان دونوں کو بات کرتا دیکھ رہی تھی اور اتنی ہی دیر سے اس کا خون جل رہا تھا۔۔۔ ناپسندیدگی اور ناگواری صاف عیاں تھی اس کے چہرے سے۔۔۔

✡ ✡ ✡

شاہ زیب نے اپنے ٹھیک ہونے کی خوشی میں آج ٹریٹ دی تھی۔ حسن علی اور زینب نے تو پہلے ہی انکار کردیا تھا جانے سے' اس لیے اب وہ اور دیا' سالار ہی کے ساتھ جارہے تھے۔ وہ بھی ساتھ جارہا ہے یہ جان کر دیا نے بھی جانے سے انکار کردیا تھا۔ شاہ زیب نے اسے کس مشکل سے راضی کیا' یہ ایک الگ کہانی تھی۔ اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے جو غصہ جھلک رہا

تھا اس کے چہرے سے' اسے لگا کہ وہ اسے اور سالار کو کچا چبا جائے گی۔ حالانکہ کل تک بہت پر جوش تھی وہ اس ٹریٹ کے لیے مگر اب۔۔۔۔

"کیا آرڈر کرنا ہے۔" سالار نے دونوں سے پوچھا۔

"آپ دونوں بتائیں' آپ مہمان ہیں آج میرے۔" شاہ زیب نے شاہانہ انداز میں کہا۔ "پھر تو مینو مدیحہ کو ہی ڈیسائیڈ کرنا چاہیے' آخر انہوں نے ہی تمہاری دن رات تیمارداری کرکے میڈیکل اسٹوڈنٹ ہونے کا حق ادا کیا ہے۔" سالار نے دیا کے چہرے کے تاثرات غور سے دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر میڈیکل اسٹوڈنٹ کا لفظ استعمال کیا۔

وہ آج سارا راستہ خاموش رہی تھی۔ شاہ زیب نے اسے کئی بار مخاطب کیا لیکن اس نے زیادہ بات نہیں کی' بلکہ اس کے سامنے تو ہمیشہ ہی چپ رہتی تھی وہ۔ اس نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ وہ اسے اگنور کرنے کی پالیسی اپنائے ہوئے ہے۔ کبھی وہ شاہ زیب سے کوئی مذاق کر رہا ہوتا تو مدیحہ کے چہرے پر ناگواری ہوتی' یعنی اسے ان دونوں کی بے تکلفی پسند نہیں۔۔۔ کیوں؟

"نہیں' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں میڈیکل اسٹوڈنٹ نہیں بلکہ بہن ہونے کا حق ادا کر رہی تھی۔" اس نے بہن پر زور دیتے ہوئے تپے تپے انداز میں کہا۔

جواب کیونکہ اس کی توقع کے عین مطابق آیا تھا' اس لیے اس کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی' جسے چھپانے کے لیے اس نے فوراً" پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تمہیں پے کرنا ہے' تو تم خود آرڈر کرو۔" توپوں کا رخ اب شاہ زیب کی طرف تھا۔

"اچھا یار' ناراض کیوں ہو رہی ہو۔" پھر ان ہی دونوں نے آرڈر دیا وہ لاتعلق سی بیٹھی ریسٹورنٹ کا جائزہ لیتی رہی۔

"بھائی! آپ کے 7 o clock پر فٹ آئٹم بیٹھا ہے۔" کھانے کے دوران شیزی نے سالار سے کہا۔

"اپنے 4 o clock دیکھو۔" اس نے جواباً" کہا تھا مسکراتے ہوئے۔ شیزی نے اپنے دائیں جانب مڑ کے دیکھا۔ وہاں اسے ایک آئینے میں وہی لڑکی نظر آئی تھی جس کی طرف وہ سالار کو متوجہ کرانا چاہتا تھا۔

"مطلب آپ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں اسے اپنے 10 o.clock ۔" شیزی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کی یہ نئی قسم کی گھڑی مدیحہ کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ہاں۔۔۔ لیکن وہ یہ ضرور سمجھ گئی تھی کہ دونوں دوسری ٹیبل پر بیٹھی الٹرا ماڈرن لڑکی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔

"ویسے ایسی لڑکیاں بڑی ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اتنی آسانی سے سیٹ نہیں ہوتیں۔" شاہ زیب نے گویا پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ "ایسی لڑکیوں" پر۔ سالار نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اس کی بات پر۔

"نہیں یار! پھر تمہیں انہیں سیٹ کرنے کا ایک سمپل اصول نہیں پتا۔" سالار نے رازداری سے کہا۔

"وہ کیا۔۔۔" اسی انداز میں پوچھا گیا۔

"تم انہیں جتنا اگنور کرو گے وہ اتنی جلدی تمہاری طرف اٹریکٹ ہوں گی۔" سالار نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"چلیں ٹرائی کروں گا' یہ اصول اگلی بار۔۔۔۔"

"ہاں ضرور کرنا۔ سو فیصد رزلٹ آئے گا۔" سالار نے یقین دہانی کرائی۔

"ویسے یہ اصول آپ کتنی لڑکیوں پہ اپلائی کر چکے ہیں؟" شیزی نے شرارت سے دریافت کیا۔

"نہیں یار! یہ میرا تجربہ نہیں ہے' مشاہدہ ہے اور میں ایک انتہائی شریف بندہ ہوں۔ ایسے کاموں پہ ٹائم اور پیسہ برباد نہیں کرتا۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"چلیں' آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں میں۔" شیزی کو نہ چاہتے ہوئے بھی ماننا پڑا تھا۔

"یہ 7 o clock اور 10 o clock یہ سب کیا ہے؟" دیا نے شاہ زیب سے پوچھا۔

"یار تم رہنے دو۔ تم پڑھاکو لڑکی ہو۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تم اپنی میڈیکل کی بکس پر ہی

دھیان دو۔" شیزی نے اسے ٹالا۔
"مجھے پتا ہے کہ تم پچھلی ٹیبل پر بیٹھی اس لڑکی کے بارے میں بات کررہے ہو جو آگے میں منہ مار کر آئی ہوئی ہے۔ لولی پاپ بن کر۔" دیا کو اس کے جواب نے تپا ہی تو دیا تھا اور اب سے کچھ لمحے پہلے سالار نے جو کہا تھا وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔
"ویسے تم لڑکوں کو آرٹیفشل چیزیں ہی پسند آتی ہیں' نیچرل بیوٹی کے مقابلے میں۔" دیا نے ایک اور طنز کیا۔
"اوہو! تم اتنا سیریس کیوں ہو رہی ہو' مذاق کر رہا تھا میں۔" شیزی نے اسے بہلانا چاہا۔
"ہاہ مذاق۔۔۔ تمہیں اتنا بھی احساس نہیں ہے کہ تمہاری اپنی بہن کو بھی لوگ ایسی ہی فضول نظروں سے دیکھ رہے ہوں گے جیسے تم۔ واقعی تم لڑکے بہت ہی چیپ اور تھرڈ کلاس ہوتے ہو۔ ایسے مرد جو ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے بھاگیں' ان میں انا اور غیرت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔"
"یار مذاق کر رہے تھے ہم۔۔۔ تم اسے مذاق کی طرح ہی لو۔ اتنا سیریس کیوں ہو رہی ہو؟ یہاں ہم مردوں کی ایک سو ایک برائیوں پر تقریر کرنے نہیں آئے۔" شیزی بھی چڑ گیا تھا۔
"مہدیہ! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم صرف مذاق کررہے تھے۔ ایسا کچھ نہیں جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔" سالار نے اسے سمجھانا چاہا۔ پھر وہ سارا وقت خاموش رہی تھی۔ لنچ کے بعد شاہ زیب نے آئس کریم کھلانے کی آفر کی (اسے پتا تھا کہ آئس کریم سے دیا کا موڈ ٹھیک ہو سکتا تھا) آئس کریم کھانے کے دوران ہی سالار کی کوئی آفیشل کال آئی اسے آفس پہنچنا تھا۔ اب مسئلہ ان دونوں کو گھر ڈراپ کرنے کا تھا۔
"بھائی! آپ چلے جائیں آفس۔ ہم ٹیکسی سے گھر چلے جائیں گے۔" شاہ زیب نے آسان ساحل بتایا۔
"میں ٹیکسی سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔ یہ شخص سمجھتا کیا ہے خود کو۔ جب واپس نہیں ڈراپ کرسکتا تھا تو لایا ہی کیوں اپنی گاڑی پر۔" دیا کا دماغ کھول رہا تھا غصے سے۔ ساری ٹریٹ کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ صرف اس شخص کی وجہ سے ریزرو رہنا پڑا اسے ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہیں پائی تھی وہ اور پھر اس نے جو باتیں کی تھیں لڑکیوں کے بارے میں۔۔۔
"اف یہ لڑکی! بات کو سمجھتی ہی نہیں ہے۔" شاہ زیب نے کوفت سے سوچا۔ "پھر سب وے سے چلے جائیں گے۔" اس نے ایک اور حل بتایا۔
"ہاں۔۔۔ تم جاؤ سب وے سے گھر۔ وہاں سے گاڑی لے کر آؤ واپس مجھے لینے۔ میں یہیں آئس کریم پارلر میں ویٹ کررہی ہوں تمہارا۔" دیا نے جیسے بات ہی ختم کردی۔
"دماغ خراب ہے میرا جو شہر کے آخری کونے میں جاکر پھر واپس آؤں۔" شیزی نے چڑ کے کہا۔
"تو کس گدھے نے کہا تھا گھر سے اتنی دور آنے کو۔" بلا کا اطمینان تھا لہجے میں اور اس کی اس بات پر سالار بے یقین نظروں سے یک ٹک اسے دیکھنے لگا یعنی کہ اتنی جرات ہے اس لڑکی میں۔۔۔ کہ اس کے سامنے اسے ہی ایسے شان دار نام سے پکارے۔۔۔ ضدی اور نخرے والی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ لڑکی جرات مند بھی ہے۔ اس نے بے اختیار تجزیہ کیا۔
"دیا!" شاہ زیب نے دانت پیستے ہوئے اسے تنبیہہ کی اس بکواس پر۔۔۔
"شاہ زیب! تم میری کار لے جاؤ۔ آفس یہاں سے قریب ہے' میں چلا جاؤں گا اور گاڑی آفس ڈرائیور کو بھیج کے منگوالوں گا۔" سالار نے سکتے سے باہر آتے ہوئے شاہ زیب سے کہا۔ شاہ زیب کو بھی اندازہ تھا کہ وہ ضد کی کتنی پکی ہے' اس لیے فوراً" چابی لے لی۔ شکر ہے دیا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
"یہ پاگل ہے بھائی' اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں آپ سے۔ غصے میں یہ الٹا سیدھا بول دیتی ہے' پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔" شاہ زیب نے شرمندہ انداز میں آہستہ سے کہا جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔
"کوئی بات نہیں۔ میں خفا نہیں ہوں۔ بلکہ صرف

حیران ہوں۔" یہ جملہ اس نے صرف سوچا تھا۔ بولا نہیں تھا۔

مجھے برا کیوں نہیں لگا؟ اگر کوئی اور ایسا کہتا تو دماغ درست کر دیتا ہے میں اس کا لیکن مجھے غصہ نہیں آیا' نہ جانے کیوں۔

کیب میں بیٹھتے ساتھ ہی اس نے اپنا سیل نکالا اور مسکراتے ہوئے ایک میسج ٹائپ کرنے لگا۔ "پاپا آپ نے بھی چُن کر لڑکی ڈھونڈی ہے میرے لیے... بالکل میری طرح۔ ضدی اور جرات مند... اور محترمہ کے غصے کے تو کیا ہی کہنے "آپ کے بیٹے کو آپ کی بہو نے گدھا کہہ ڈالا۔ یہ جرات بھلا سالار حسین کی منکوحہ کے علاوہ اور کس میں ہو سکتی ہے۔" اور بھیج دیا۔

چند لمحوں بعد ہی پاپا کا جواب آگیا۔ "بیٹا جی میں نے کہا تھا کہ ایک دن تم ضرور مانو گے کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ تمہارا پرفیکٹ میچ... اس لقب پر میرا دل چاہ رہا ہے کہ اپنی بہو کو "ستارۂ جرات" سے نوازوں... "پاپا کا میسج پڑھتے ہوئے وہ مسکراتا رہا اور پھر رات میں سونے سے پہلے وہ یہی سوچتا رہا کہ وہ میری طرح ہے۔ وہ ناراض ناراض سی تپی ہوئی نیلی آنکھیں اسے ڈسٹرب کرتی رہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے
وہ بالکل میرے جیسا ہے
کہ جیسے عکس پانی میں
یا سایہ روبرو میرے
وہی لہجہ وہی باتیں
وہی آنکھوں سے ہنس دینا
کبھی جو روٹھنا تو...
بے رخی کی حد ہی کر دینا
کبھی آنکھوں کے رستے سے
کبھی دل میں اتر جانا
کبھی بے چین رکھنا خود کو
مجھ کو بھی سزا دینا
میری دنیا سجا دینا
نگاہ بھی سرد کر لینا
کبھی تتلی کے سارے رنگ
میرے دامن میں بھر دینا
مجھے اکثر یہ لگتا ہے
وہ بالکل میرے جیسا ہے
کہ جیسے عکس پانی میں
یا سایہ روبرو میرے

☆ ☆ ☆

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ کیا فضول بات کی تھی تم نے ان کے بارے میں' وہ بھی ان ہی کے سامنے۔" شاہ زیب نے گاڑی آگے بڑھاتے ہی دیا کی کلاس لینا ضروری سمجھا۔ یہ لڑکی... احساس ہی نہیں اسے اپنے رشتے کا۔

"میری مرضی' جو مجھے صحیح لگا وہ کہا۔ تم زیادہ میرے بزرگ نہ بنو اور دھیان سے گاڑی چلاؤ۔" اس نے بھی ڈھیٹ بنتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے نا ان سے تمہارا کیا تعلق ہے' پھر بھی... انہیں اگر برا لگا ہو تو؟ کیا سوچتے ہوں گے وہ تمہارے بارے میں کہ کتنی بدزبان اور بدتمیز ہو تم۔"

"کچھ زیادہ ہی اس کی سائڈ نہیں لے رہے تم۔ ہر وقت چمچے بنے رہتے ہو اس شخص کے۔" دیا بھی تپ گئی۔

"اوہ... تو اب سمجھا۔" اس نے اوہ کو خاصا لمبا کھینچا۔" جیلس ہو رہی ہو کہ وہ تمہارے گرو جی کیوں نہیں ہیں۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ میں کیوں ہونے لگی جیلس؟" دیا کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

"ویسے مجھے تم بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ لڑکیاں تو اپنے ان کے بارے میں میٹھے خواب دیکھتی ہیں اور ایک تم عجیب ہی ہو' بے چارے سالار بھائی...." اور شاہ زیب کی اس بات پر اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹ بھینچے تھے۔ چھن سے کچھ ٹوٹا تھا اندر... میٹھے میٹھے خواب... اس نے تنفر سے سوچا۔ تمہیں کیا پتا کہ

یہ میٹھے میٹھے خواب میں نے بھی دیکھے تھے چھ سال پہلے۔ لیکن ان خوابوں نے مجھے اذیت کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اس کے سامنے کا منظر دھندلا ہوتا گیا۔

☼ ☼ ☼
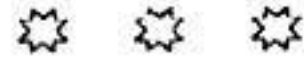
عافیہ مراد علی بہت بیمار تھیں۔ کینسر کا مرض اپنی آخری اسٹیج پر تشخیص ہوا تھا۔ ان کی زندگی کی بہت کم امید تھی۔ ان ہی دنوں حسن مراد علی اپنی فیملی کے ساتھ کئی سالوں بعد پاکستان آئے تھے۔ عافیہ مراد علی کی خواہش تھی کہ ان کے بھائی کمال حسین سے ان کے بچوں کے تعلقات' ان کے مرنے کے بعد بھی مضبوط رہیں اور اسی لیے انہوں نے اپنی کسی بھی پوتی کی شادی کمال حسین کے پوتے سے کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اپنے مرنے سے پہلے وہ یہ خوشی دیکھنا چاہتی تھیں۔

یاور مراد علی کی بیٹی ان دنوں اپنے ننھیال گئی ہوئی تھی۔ شاید قسمت نے ان کا ساتھ لکھا تھا' اسی لیے صرف مہدیہ ہی وہاں تھی۔ ان دنوں سالار بھی چھٹیوں پہ انگلینڈ سے آیا ہوا تھا۔ کسی کو بھی اس فیصلے پہ اعتراض نہیں تھا' لیکن جب سالار نے سنا وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔

"نکاح۔ پاپا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس نے بے یقینی سے باپ کو دیکھا۔ "ایسے کیسے میں کسی سے نکاح کرسکتا ہوں۔ نہیں میں یہ نہیں کروں گا۔"

"سالار! میں کیسے ایک مرتی ہوئی عورت کو انکار کروں؟ تمہیں کس وجہ سے اعتراض ہے؟ کیا تم انگلینڈ میں کہیں کمٹڈ ہو؟" صارم حسین نے پریشانی سے پوچھا۔

"پاپا ایسا کچھ نہیں۔ بس یہ سب بہت جلدی ہے۔ میرے بہت سے خواب اور امبیشنز ہیں' مجھے ابھی اپنا کیریر بنانا ہے اور جسے میں نے دیکھا تک نہیں' میں کیسے اس سے نکاح کرسکتا ہوں؟ آپ پلیز میری بات کو سمجھیں پاپا' آپ تو میرے دوست ہیں' آپ جانتے ہیں کہ اپنا ہر فیصلہ میں نے خود کیا ہے۔ ابھی نکاح مت کریں۔ ابھی ہم دونوں ہی بہت چھوٹے ہیں اس سب کے لیے۔ چند سال بعد۔"

صارم نے اس کی بات کاٹی۔ "اور تمہیں کیا پتا کہ چند سال بعد وہ زندہ بھی ہوں گی یا نہیں؟ تم اتنے بے حس کیسے ہوسکتے ہو؟ میں نے تو تمہیں یہ نہیں سکھایا؟ جب چند سال بعد کرنا ہے تو ابھی کیوں نہیں؟"

"کیونکہ پاپا نکاح کوئی کھیل نہیں۔ میں اور وہ لڑکی ہم دونوں ہی مینٹلی تیار نہیں اس سب کے لیے۔" سالار کو پتا تھا کہ پاپا کو قائل وہ اسی وقت کرسکتا تھا جب وہ قائل ہونا چاہتے ہوں۔ جو کہ اس وقت ناممکن لگ رہا تھا۔

"ابھی صرف نکاح ہوگا۔ رخصتی تمہاری اور اس کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد۔"

"اور اگر اس وقت مجھے یا اسے کوئی اور پسند آگیا تو کیا آپ لوگ یہ نکاح ختم کرنے دیں گے؟" سالار نے پہلی بار اونچی آواز میں کہا۔ "نہیں نا؟ تو اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں۔ ہم کوئی جانور نہیں جو ہماری مرضی پوچھے بغیر آپ لوگ اتنا بڑا فیصلہ کرلیں۔"

"وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔" صارم نے ایک نیا انداز اپنانا چاہا۔ لیکن مقابل بھی سالار حسین ہی تھا ضد اور ہٹ دھرمی میں اپنی مثال آپ۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں یہ بات؟ دو ملاقاتوں میں کیسے پتا چل گیا آپ کو؟ آپ نے بھی تو دادی کے فیصلے کے خلاف مما سے شادی کی تھی' پھر آپ میرے ساتھ کیوں زبردستی کررہے ہیں؟ پاپا آپ سمجھ کیوں نہیں رہے ہم دونوں جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ایک مرنے والے کی خواہش پر آپ لوگ ہماری خوشیاں داؤ پر کیوں لگا رہے ہیں۔ میں اس رشتے سے منع نہیں کررہا۔ چند سال تک انتظار کرنے کا کہہ رہا ہوں۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ پاپا کو وہ ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی زندگی کو دوسروں کے ہاتھ میں نہیں سونپ سکتا تھا لیکن پاپا کے چہرے کے

تاثرات۔۔۔

اور پھر نہ جانے کس طرح پاپا نے اسے راضی کیا تھا' اس نکاح کے لیے۔۔۔ نکاح نامے پر دستخط کرتے وقت اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ پاپا نے اس کے ساتھ زبردستی کی ہے' اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیا ہے۔ میں اس نکاح کو نہیں مانتا' کبھی اس رشتے کو نہیں نبھاؤں گا۔ میرے ساتھ زبردستی کا انجام اب سب دیکھیں گے میں یہ کاغذی رشتہ توڑ دوں گا۔۔۔ وقت آنے پر دیکھیں گے پاپا کہ مجھ سے زبردستی کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

26 دسمبر۔۔۔ اسے نہیں پتا تھا کہ یہ تاریخ اس کی زندگی میں اہم بن جائے گی۔۔۔ اس کے نکاح کا دن۔۔۔ اس کا نکاح۔۔۔ کتنا عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے یہ سوچتے ہوئے۔۔۔ کہ اب وہ کسی کی منکوحہ ہے۔

"سالار۔۔۔" اس نے مدھم آواز میں نام پکارا۔۔۔ اس کے لہجے میں جھجک۔۔۔ شرم اور گھبراہٹ سب ہی کچھ تھا۔۔۔ ٹین ایج کی وہ لڑکی۔۔۔ جو پاکستان پہلی بار آئی تھی۔۔۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی زندگی ایک دم بدل جائے گی۔۔۔ یوں۔۔۔ اچانک۔۔۔ اس طرح۔۔۔ جب ماما نے اسے بتایا' دادی کی خواہش اور سب کی رضامندی کا تو وہ پہلے تو حیران ہوئی اور تھوڑی پریشان بھی' لیکن پھر یہ سوچ کے مطمئن ہو گئی کہ بابا کبھی بھی اس کے لیے غلط فیصلہ نہیں کر سکتے اور پھر ابھی رخصتی تو نہیں ہوئی۔

اس کی نظروں کے سامنے سالار کا سراپا آیا جب وہ لاؤنج میں نانا (کمال حسین) کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کاش پہلے پتا ہوتا تو ٹھیک سے ہی دیکھ لیتی انہیں میں۔۔۔ وہ بے اختیار جھینپ گئی اپنی اس سوچ پر۔۔۔ سالار کی اسمائل کتنی پیاری ہے نا۔۔۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھیں بھی پورا ساتھ دیتی ہیں۔۔۔ اور انکل کے گھر کی لائبریری میں ان کے نام کے کتنے سرٹیفکیٹس۔۔۔ اور ٹرافیز ہیں۔۔۔ یعنی کے خاصے جینئس اور آؤٹ اسٹینڈنگ ہیں وہ۔۔۔ اپنے نام کی طرح۔۔۔ ہر جگہ لیڈ اور کمانڈ کرتے ہوئے۔

وہ پاگل لڑکی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی رات بھر۔۔۔ آج رات نیند پرائی ہو گئی تھی۔۔۔ کہ وہ آج پیا کی ہو کر آئی تھی۔۔۔ نہ جانے کب وہ سپنے بنتے ہوئے نیند کی وادی میں داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

آفس کے کام میں اور پھر اپنے بلڈنگ ڈیزائن کے پروجیکٹس اور کنٹریکٹس جو اس نے سٹڈی آتے ساتھ ہی سائن کیے تھے' ان سب میں بے تحاشا مصروف ہو گیا تھا وہ۔۔۔ آج ویک اینڈ تھا تو صبح دیر تک سوتا رہا۔ اپنی نیند اسے بڑی پیاری تھی لیکن بھلا ہو آپی کا جس نے فون کر کے اٹھا دیا اسے۔

"کیا کر رہا تھا تو۔۔۔" فون ریسیو کرتے ساتھ ہی آپی کی آواز آئی۔

"سو رہا تھا۔" وہ نیند میں بولا۔

"سوتا ہی رہ تو بس۔۔۔" آپی اس کی گھنٹوں سونے والی عادت سے ہمیشہ چڑتا تھا۔ اس کا شیڈول بہت ٹف تھا۔ بابا کا آفس اور پھر اپنا آفس (کنسٹرکشن اینڈ ڈیزائن) سنبھالنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے اسے اپنی نیند کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں سے وہ بیس گھنٹے کام ہی کرتا تھا تاکہ ماضی کی تلخ یادوں سے فرار مل سکے۔

"یار آپی! قسم سے کبھی کبھی تو مجھے اپنی بیوی لگتا ہے ہر وقت میری نیند کا دشمن بنا رہتا ہے۔" ابھی بھی وہ نیند میں تھا سخت جھنجلایا ہوا۔

"تجھے تو جیسے بڑا تجربہ ہے نا بیویوں کا۔" آپی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

وہ دونوں ایسے ہی تھے۔ اتنے فرینک تھے ایک دوسرے سے۔۔۔ حالانکہ رشتے میں چچا بھتیجے تھے۔ صرف تین سال کا فرق تھا دونوں میں اسی لیے بہت بے تکلف تھے۔ کوئی انجان آدمی انہیں بھائی یا دوست ہی سمجھتا۔ آپی کا نک نام سالار نے ہی رکھا تھا۔ جب وہ

نیا نیا ان کے گھر آیا تھا تو اس کی اور آبی کی خوب لڑائی ہوتی۔ سالار کو اعتراض تھا کہ یہ میرے گھر کیوں آیا ہے اور آبی کہتا۔ کہ یہ میرے بابا کا گھر ہے۔ لڑتے لڑتے نہ جانے کب وہ ایک دوسرے کے پکے دوست بن گئے۔ ہر چیز بانٹنے والے۔ دکھ سکھ۔ سب۔

"تو تو بڑا خوش ہو گا نا۔ آزادی سے مما سے لاڈ اٹھوا رہا ہو گا۔"

"ہاں یار' تجھے تو پتا ہے بھابھی ماں مجھے کتنا چاہتی ہیں۔ جب تک میں آفس سے نہ آجاؤں' سوتی نہیں ہیں وہ کہ پھر مجھے کھانا کون دے گا۔" آبی نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

اور یہ سچ بھی تھا۔ آٹھ سال کا وہ خاموش گھبرایا ہوا بچہ۔ دیکھتے ہی شازمین کو بہت اپنا لگا۔ انہوں نے کبھی سالار اور اس میں فرق نہیں کیا اور آبی بھی بہت محبت اور عزت کرتا تھا ان کی۔ ماں کا درجہ دیتا تھا۔ سالار تو پھر کبھی کبھی ان کی بات ٹال دیتا لیکن عباد نے کبھی ان کی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔

"ہاں پتا ہے ہے' مما کا چمچہ ہے تو۔ مجال ہے جو ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر لے۔ ایسے چیلے پر پیار تو آتا ہی ہے نا نہیں۔"

"تو بس جل وہاں بیٹھ کر۔" آبی نے اس کے تپے ہوئے انداز پر قہقہہ لگایا۔

"اور بھائی نے بتایا تھا کہ تجھے ہماری بھانجی کافی سے زیادہ اچھی لگی ہے اور اس کے لیے تو گدھا بننے کو بھی تیار ہے۔" آبی نے شرارت سے کہا۔

"پاپا نے تجھے بتا دیا۔ پاپا سے تو میں ابھی پوچھتا ہوں۔" سالار کو یہ امید نہیں تھی پاپا سے۔

"تمہارا میسج انہوں نے سب کو مزے لے لے کر سنایا۔ سب کافی دیر تک انجوائے کرتے رہے۔ دیا نے میرا دل خوش کر دیا۔" آبی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اچھا سن! میں اور بابا نیکسٹ منتھ سڈنی آ رہے ہیں۔"

"رئیلی! دیٹس گڈ۔ کام کی بات آخر میں ہی بتایا کر تو۔" وہ پرجوش ہو گیا۔ مہینوں بعد ان دونوں سے ملنے کا خیال ہی مزہ دے گیا اسے۔

"چل اب بہت بکواس سن لی تیری۔ بند کر فون اور سونے دے۔" کہتے ساتھ ہی اس نے کال کاٹ دی' پتا جو تھا کہ آگے سے پھر کوئی بکواس کرے گا آبی۔

☼ ☼ ☼

کافی دنوں بعد آج پھوپھو کے گھر چکر لگایا تھا اس نے لیکن گھر پر بوا اور مہدیہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ کچھ دیر بوا کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ واپس جانے لگا۔ ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے ڈرائنگ روم میں دیکھا اور اگلے لمحے وہ مسکرایا تھا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی جیسے کسی بچے کا کوئی کھلونا ٹوٹ گیا ہو اور وہ حسرت سے اس کھلونے کو دیکھ رہا ہو۔

کچھ ایسے ہی تاثرات سے وہ اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ رونے اور ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرنے کا مشغلہ بھی جاری تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ رو کیوں رہی ہو؟" سالار کو ترس آ ہی گیا اس پر۔ اس کی آواز پر چونک کر اس نے سالار کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"کچھ نہیں۔" دھیمی آواز اور بوجھل لہجے میں جواب دیا گیا۔

"کچھ نہیں ہوا تو کیا ہابی ہے آپ کی رونا؟ پلیز ٹیل می کیا ہوا؟" اب کی بار تھوڑا تپ کے سالار نے کہا تھا۔ اپنی پریشانی میں اس نے سالار کی بات پر غور نہیں کیا' ورنہ اب تک تو یہی لیپ ٹاپ وہ اس کے سر پر مار چکی ہوتی۔

"میری آج اسائنمنٹ سب مشن کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔ تین دن کی محنت کے بعد اسائنمنٹ بنایا تھا میں نے مگر جس ڈرائیو میں سیو کی تھی فائل وہ اوپن نہیں ہو رہی۔" اس نے اپنا مسئلہ بتا ہی دیا۔

کیا تھی یہ لڑکی؟ وہ سمجھ نہیں سکا تھا اسے۔ کبھی اتنی بہادر اور کبھی بچوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر

روتی ہوئی۔۔۔ سالار نے اس کے روئے روئے سرخ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ سرخ ڈوروں والی نیلی آنکھیں۔۔۔ کتنا خوب صورت ملاپ تھا۔ اس کا دل چاہا وہ کہے کہ تمہاری آنکھیں رونے سے اور بھی خوب صورت ہو جاتی ہیں۔۔۔ لیکن ابھی اس کا اپنی ہی بیوی کے ہاتھوں شہید ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سو گہری سانس لے کر وہ اس کے ساتھ ہی تھوڑا فاصلہ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"لاؤ دکھاؤ مجھے کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔" اس نے اچھے بچوں کی طرح فوراً" لیپ ٹاپ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اُف اتنی فرماں برداری۔۔۔ کہیں یہ خواب تو نہیں۔

"ہارڈ ڈسک کرپٹ ہو گئی ہے۔ اسے چینج کرنا پڑے گا۔ آپ نے اپنی اسائنمنٹ کا بیک اپ نہیں بنایا کہیں۔" کچھ دیر کے بعد سالار نے پوچھا۔

"نہیں میں تو کبھی بیک اپ نہیں بناتی۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

"بہت اچھا کرتی ہیں آپ۔" وہ بڑبڑایا۔

"آپ نے کچھ کھایا؟ میں کافی بنا کے لاؤں آپ کے لیے؟" اپنی بے وقوفی کا اسے احساس ہو رہا تھا اور اس کے سامنے شرمندگی الگ اس لیے اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔

(اوہو۔۔۔ تو اب رشوت بھی دی جائے گی اپنا کام کروانے کے لیے) "ضرور۔۔۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔۔۔ اتنے میں آپ کافی بنائیں ــــ میں کوشش کرتا ہوں آپ کی فائل کو ڈرائیو سے ریکور کرنے کی۔" پھر اپنی کمپیوٹر اسکلز کا استعمال کرتے ہوئے اس نے کمانڈ لائن سے اس کی فائل اوپن کر ہی لی۔ اتنے میں وہ کافی کے ساتھ ساتھ گرم گرم پاستا بھی لے آئی۔

"یہ پاستا آپ نے اتنی جلدی بنا بھی لیا۔" وہ حیران ہوا۔

"نہیں یہ میں نے لنچ میں بنایا تھا۔" (اب میں اتنی بھی شکر گزار نہیں محترم کی کہ اسپیشلی کچھ بناؤں۔۔۔

خوش فہمیوں کی حد تو دیکھو ذرا۔) اب کیونکہ مسئلہ حل ہو گیا تھا اس لیے وہ اپنی پرانی روش پر آ گئی۔

یعنی یہ اتنی بھی بے مروت نہیں اور تھوڑی بہت کوکنگ تو جانتی ہی ہے۔۔۔ سالار نے خوش ہوتے ہوئے سوچا۔

"انکل یا شیزی سے کہہ کر نئی ہارڈ ڈسک منگوا لیجیے گا۔" کھانے کے بعد اٹھتے ہوئے اس نے کہا اور اللہ حافظ کہتا باہر نکل گیا۔

"بندہ اتنا بھی برا نہیں، کمپیوٹر اسکلز تو کافی اچھی ہیں، شاید کسی زمانے میں پارٹ ٹائم کمپیوٹر مکینک رہا ہو۔۔۔" اور اپنی اس سوچ پر وہ مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

سالار حسین ماں، باپ اور دادا کا بے انتہا لاڈلا۔۔۔ قدم قدم پر اس کی حفاظت کی گئی تھی۔ جب وہ صرف ڈھائی سال کا تھا تو اسے لوکیمیا کی بیماری ہو گئی تھی۔ خون کی شدید کمی ہونے کی وجہ سے اسے ہر مہینے اسے خون کی بوتلیں چڑھتی تھیں۔ صارم حسین اور شازمین کے لیے یہ وقت کڑا امتحان تھا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ہر سرد

گرم سے بچانا چاہتے تھے۔ اس بیماری کے بعد بھی انہوں نے اس کی کوئی بات رد نہیں کی' ہر فرمائش پوری ہوئی تھی اس کی۔

۔نہ جانے کتنی مرادوں کے بعد وہ مکمل صحت مند ہوا تھا۔

اللہ کا خاص کرم تھا اس پہ کہ اس بیماری نے اس کی ذہنی صلاحیت پر اثر نہیں کیا تھا۔ صحت مند ہونے کے بعد بھی وہ دوسری پوزیشن پر بھی نہیں آیا۔ ہر کھیل اور غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ آگے ہوتا۔ اپنے نام کی طرح... ٹینس اور اسنوکر اس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ وہ ہر طرح کی ڈبیٹس میں حصہ لیتا تھا اور ایسے ایسے دلائل دیتا تھا کہ سننے والا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ماں' باپ اور دادا کا لاڈ پیار' ٹیچرز کی خاص توجہ اور دوستوں کی سراہتی نظروں نے اسے بچپن ہی میں بہت خود سر' ضدی اور ہٹ دھرم بنا دیا تھا۔

وہ اپنا ہر فیصلہ خود کرتا تھا۔ صارم حسین ہائیر اسٹینڈز کے لیے اسے اسٹیفورڈ یونی ورسٹی سے کیمیکل انجینئرنگ کروانا چاہتے تھے' جہاں عباد اور اس کے بہت سے کزنز تھے' لیکن اس نے پاپا سے ضد کرکے کیمبرج یونی ورسٹی سے آرکیٹیکچر میں بیچلرز کرنے کا فیصلہ منوا ہی لیا۔ وہ یوکے اس لیے جانا چاہتا تھا کہ وہاں ان کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ وہ اکیلا اور آزاد رہنا چاہتا تھا۔ پاپا کے کسی جاسوس کے بغیر...

سالار کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع اسے لالہ (عباد) نے فراہم کیا تھا۔ ان کے نکاح کے بارے میں جان کر عباد بہت خوش ہوا تھا۔ ایک طرف لاڈلا بھتیجا اور جان سے پیارا دوست تھا تو دوسری طرف اس کی ننھی پری تھی۔ بابا سے اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ سالار راضی نہیں تھا اس رشتے کے لیے لیکن پھر بھی وہ مطمئن اور خوش تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ دیا کو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھال دے گا اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

دیا کو اس نے سالار کی ہر عادت' پسند' ناپسند کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ گھنٹوں چیٹنگ پر صرف ایک ہی موضوع پر بات کرتے... سالار... وہ یہ شوق سے کھاتا ہے' یہ کلرز پسند ہیں' ٹینس کا بیسٹ پلیر... اس کے شوق... اس کے خواب اور خواہشیں... اور بھی نہ جانے کیا کیا... عباد نے ہی سالار کے بچپن کی بہت سی پکچرز اسے بھیجی تھیں۔ انگلینڈ سے اپنی جو بھی پکچرز وہ آئی کو بھیجتا' وہ دیا کو ضرور فارورڈ کرتا۔ نکاح کے بعد کے گیارہ مہینے اور انتیس دن اس نے سالار کو سوچنے اور اس کی تصویریں دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا۔ کبھی تقریر کرتے ہوئے' کبھی کسی یونی فنکشن میں پرفارم کرتے ہوئے' کبھی گولف یا ٹینس کھیلتے ہوئے' تو کبھی سیر و تفریح کرتے ہوئے لی گئیں تصویریں۔ ہر دن ڈھلنے کے ساتھ اس کا سالار سے عشق کا سورج بلندی پر ہی جاتا لیکن کبھی کبھی وہ سوچتی ضرور کہ سالار نے کبھی اس سے کانٹیکٹ کیوں نہیں کیا۔ اتنے مہینے گزر جانے کے باوجود بھی... ایک بار اس نے لالہ سے پوچھ ہی لیا۔

"بیٹا! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ وہ تھوڑا مختلف ہے۔ اسے اپنا کیریر بنانے کا جنون ہے۔ اپنے ایک پروفیسر کو وہ بہت سے پروجیکٹس میں اسسٹ بھی کرتا ہے' تجربہ حاصل کرنے کے لیے۔ حالانکہ ابھی اس کا چوتھا سمسٹر ہی ہے لیکن وہ بہت ذمہ دار ہے۔ اس وجہ سے اس کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ میری اس سے بات ہوتی رہتی ہے' تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا ہے وہ۔" یہ پہلا جھوٹ تھا جو عباد نے دیا سے بولا تھا مصلحت کے تحت... یہ ضروری تھا... لیکن اس جھوٹ کا انجام...

دوسری طرف دیا سوچ رہی تھی کہ کیا پوچھتے ہیں وہ میرے بارے میں لیکن بولنے میں شرم آڑے آگئی۔

"جی لالہ..." وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"تمہارے میڈیکل میں ایڈمیشن کا کیا بنا۔" عباد نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ان شاء اللہ ہو جائے گا' میں بہت پرامید ہوں

لیکن بس ماما' پاپا کے بغیر ہاسٹل میں کیسے رہوں گی؟" وہ واقعی پریشان تھی۔

"ارے میری نیلی پری' اتنی سی بات سے پریشان ہے۔" اس کی نیلی آنکھوں کی وجہ سے اسے وہ اکثر نیلی پری ہی بلاتا تھا۔ "دیکھو تمہیں بہت محنت کرنی ہے۔ سالار بہت جینئس ہے' اس کا اکیڈمک ریکارڈ ہمیشہ شان دار رہا ہے۔ اس لیے وہ یہی چاہے گا کہ اس کی بیوی بھی ڈسٹنکشن ہولڈر ہو۔" بیوی لفظ پر اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔۔۔ اور سالار کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔۔۔ اتنی ہی پاگل تھی وہ۔۔۔ کچی عمر کے خواب انسان کو ایسا ہی بنا دیتے ہیں۔۔۔ سب کچھ کرنے کا حوصلہ مل جاتا ہے۔

"تمہیں پتا ہے اسے کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟" عباد نے اس کے ہاتھ میں ایک اور میٹھا خواب تھمایا۔

"اسے سمپل' ایلیگنٹ اور کانفیڈنٹ لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ اپنی عزت اور وقار کی حفاظت کرنے والی ایک ایسی لڑکی جس کی زندگی میں کبھی کسی اور کی گنجائش نہ ہو سوائے اس کے۔"

ہاں وہ ایسی ہی بن جائے گی اور شاید وہ ایسی ہی تھی۔۔۔ آج تک کسی لڑکے سے اس کی دوستی نہیں ہوئی۔۔۔ ماما نے بہت سختی کی تھی اس پر اور ان کی ناراضی اور ڈانٹ کے خوف نے اسے کبھی بھی غلط نہیں کرنے دیا تھا۔

"جانتی ہو وہ چیپکو اور چھمک چھلو ٹائپ لڑکیوں سے بہت الرجک ہے۔ چڑ ہوتی ہے اسے ضرورت سے زیادہ بولڈ لڑکیوں سے جو بوائے فرینڈ بدلنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتیں۔ اس کی آج تک کسی بھی لڑکی سے بہت زیادہ بے تکلفی نہیں ہوئی۔ ہر ایک سے وہ ایک فاصلہ اور حد رکھ کر بات کرتا ہے۔ اس کی کبھی کوئی گرل فرینڈ نہیں رہی اور نہ اب ہے' حالانکہ وہ لندن میں اکیلا رہتا ہے' کوئی روک ٹوک نہیں' لیکن بھابھی ماں نے ہمیں لڑکیوں کی عزت کرنا ہی سکھایا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ وفادار اور مخلص رہے گا اپنی مس رائٹ کے ساتھ تب ہی اسے بھی مخلص اور صرف اس سے محبت کرنے والی لڑکی ملے گی۔" لالہ کی باتوں کو سنتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ میں کتنی لکی ہوں جسے ایسی سوچ رکھنے والا شوہر ملا۔

کتنا اچھا ہے نا وہ۔ دیا نے سوچا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج پھوپھو کی طبیعت کا پوچھنے آیا تھا' کافی دن سے وہ بیمار تھیں' اس لیے اس نے صبح آفس جانے سے پہلے ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اور پھوپھو کچن میں رکھی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ شور مچاتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔

"ماما یہ ڈرائیور کہاں ہے؟ مجھے ابھی اور اسی وقت اپنی فرینڈ کے گھر جانا ہے اور وہ پتا نہیں کہاں ہے۔" وہ ابھی ابھی بے دار ہوئی تھی' اس لیے نیند میں اس نے ٹیبل پر بیٹھے سالار پر غور ہی نہیں کیا' وہی اس کی ازلی لاپروائی۔

"دیا! کیا صبح صبح ہنگامہ مچا رکھا ہے اور یہ کیا تم سر جھاڑ منہ پہاڑ آگئی ہو' کم از کم شاور تو لے لیتیں۔" اس کا حلیہ دیکھ کر زینب کا دل چاہا اس کو دو جڑ دیں۔ کل رات سونے سے پہلے بوا نے اس کے سر پر خوب بھر بھر کے تیل لگایا تھا کہ اس سے دماغ مزید تیز ہوتا ہے۔۔۔ کس حلیے میں وہ آئی تھی پیچھے وہ کیا سوچے گا۔

"سوری ماما!" وہ منمنائی۔۔۔ سالار کو دیکھ جو چکی تھی۔

"اف۔۔۔ یہ شخص کبھی اپنے گھر پر کیوں نہیں ٹکتا؟ ہر وقت یہاں کھانے پینے آجاتا ہے بھوکا کہیں کا۔۔۔" ٹیبل پر رکھی چیزوں کو دیکھ کر اس نے کوفت سے سوچا۔ دوسری طرف سالار نے کافی کا سپ لیتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ اس کے لبوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔۔۔

بالوں کو ٹائٹ سے جوڑے میں جکڑے ہوئے۔۔۔ رنگ برنگا نائٹ ڈریس پہنے۔۔۔ وہ کوئی دیکھنے کے لائق چیز لگ رہی تھی لیکن اس کی جو چیز سالار کو بہت اٹریکٹ کرتی تھی وہ اس کا پُراعتماد انداز تھا۔ ماں کی ڈانٹ کے باوجود ایسے حلیے میں بھی وہ اس کے سامنے

بڑے اعتماد سے کھڑی تھی اپنے چہرے پر ڈونٹ کیئر کا تاثر دیتی ہوئی... کیا شاہانہ انداز تھا اس کا... سالار عش عش کر اٹھا اس کی اس ادا پہ... یعنی کہ ایک اور مماثلت ان دونوں کی عادتوں میں گنڈیار...

"مجھے ابھی اور اسی وقت بہت ضروری سمانتھا سے ملنے جانا ہے' ورنہ وہ واپس نیو کاسل چلی جائے گی آج شام تک' پلیز آپ ڈرائیور کو فون کر کے بلائیں۔"

"تمہارے بابا کے آفیشل کام سے کہیں گیا ہوا ہے وہ..."

"پھر میں کیسے جاؤں؟ کوئی گاڑی بھی نہیں گھر پر اور کیب پہ اکیلے آپ جانے نہیں دیں گی۔" وہ واقعی پریشان تھی۔

"آپ کو کس طرف جانا ہے' میں ڈراپ کر دوں گا۔" اس نے اس کی رونی صورت دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں شکریہ... آپ کو زحمت ہوگی' میں چلی جاؤں گی کسی طرح۔" ماں کی وجہ سے اس نے بہت تمیز سے جواب دیا تھا' ورنہ اپنے مخاطب کیے جانے پر وہ سلگ گئی تھی۔ جبکہ سالار نے اس کے چہرے پر ناگواری محسوس کرلی تھی لیکن وہ باز کہاں آنے والا تھا' اسے مزہ آتا تھا اس کو تپا کر...

"بیٹا... تم لے جاؤ اسے' ورنہ یہ تو سارا وقت ہنگامہ مچائے رکھے گی۔" پھوپھو نے جگہ کا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "جاؤ تم جلدی سے تیار ہو کر ناشتا کرو۔ اسے بھی دیر ہو رہی ہے۔" اٹھو۔

"جی..." اب جانا تو تھا ہی' ورنہ سمانتھا سے ملاقات نہ ہو پاتی' اس لیے چپ چاپ اٹھ گئی۔

"محترمہ! میں آپ کا شوفر نہیں ہوں آگے آ کے بیٹھیے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے جب پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنا چاہا تو سالار نے کہا۔ وہ چپ چاپ آگے آگئی... "آفر تو خود ہی کی تھی ڈرائیور بننے کی..." گاڑی کے اسٹارٹ ہوتے ہی دھیمی آواز میں میوزک آن ہو گیا تھا۔

"یہ آپ کی اسکول فیلو ہے؟" سالار نے بات شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی..." مختصر جواب آیا۔ وہ دوسری جانب چہرہ کیے ہوئے تھی جیسے' بہت مجبوری میں بیٹھی ہوئی ہو۔

"یونی شاید نیکسٹ ویک سے اوپن ہو رہی ہے۔"

"جی..." ہر بات کا پتا ہونا کیا ضروری ہے اسے؟

"اسائنمنٹ سبمٹ کروادی تھی؟"

"جی..."

"آج موسم اچھا ہے نا؟" ایک اور بے تکا سوال۔

"جی..." یہ آدمی بالکل کھسکا ہوا ہے۔

"میں آپ کو اچھا لگتا ہوں۔"

اب کی بار اس نے حیرت اور الجھن سے چہرہ اس کی طرف کیا۔ کیا یہ پاگل تھا؟ اس کے چہرے پر اسے شرارتی مسکراہٹ نظر آئی... آنکھوں میں ناچتی شوخی اسے زہر لگی تھی۔

"میں نے سوچا کہ آپ ہر سوال کا "جی" میں جواب دے رہی ہیں تو اپنے مطلب کا سوال کرلیا' تاکہ مطلب کا ہی جواب ملے۔" اس نے وضاحت کی شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ...

وہ چند لمحوں تک بہت خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی' پھر دوبارہ چہرہ موڑلیا۔ اس کی آنکھوں میں جو کچھ تھا وہ سمجھ نہیں سکا' اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود... سالار نے ایک مرتبہ پھر اس کا جائزہ لیا۔ وہ اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا لباس مناسب تھا۔ جسم کو مکمل ڈھکتا ہوا۔ کہیں سے بھی اس کا جسم نمایاں نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ وہ بہت ڈیسنٹ ڈریسنگ کرتی تھی' سمپل اور ایلیگنٹ ہاں یہی دو لفظ آئے تھے اس کے ذہن میں۔ پھر اسے اس کا صبح والا حلیہ یاد آگیا تو ایک بار پھر شرارت سوجھی۔

"آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں' ان فیکٹ صبح بھی بہت پیاری لگ رہی تھیں۔" اس نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھ پر دھیان دینے کے بجائے آپ روڈ پر دھیان دیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس قسم کی فضول گفتگو اور بے تکلفی مجھے ہرگز پسند نہیں۔" چڑ ہی تو جاتی تھی وہ اس

کی باتوں سے۔
"تہمدیہ! آپ مجھے اتنا ناپسند کیوں کرتی ہیں؟" سالار نے آخر کار پوچھ ہی لیا۔
"میں جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔" ناگواری سے جواب آیا۔
"پلیز آپ۔" اس کا لہجہ مصالحانہ تھا۔
"گاڑی روکیے فوراً۔" اس نے غصے سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اتنی ناراض رہتی ہیں مجھ سے؟ میں واقعی جاننا چاہتا ہوں کہ میرا کیا قصور ہے؟ میں نے پہلے بھی آپ کی بدتمیزی کو برداشت کیا ہے۔ حالانکہ میں اپنی انسلٹ برداشت نہیں کرتا لیکن پھر بھی اگنور کیا میں نے۔" سالار نے اس بار تھوڑی اونچی آواز میں غصے سے کہا تھا۔ وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی، نہ جانے کیا مسئلہ تھا اس کے ساتھ۔ کیا ہوگا ان دونوں کا؟ وہ خاموش رہی تھی۔ اس کی دوست کا گھر آگیا تھا۔ گاڑی روکنے کے بعد سالار نے ایک گہرا سانس لے کر غصے کو کنٹرول کیا تھا۔
"سوری! مجھے ایسے لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی آپ سے۔" اس کی خاموشی کو ناراضی جان کر سالار نے دھیمی آواز میں کہا۔
"بہت شکریہ آپ کا، مجھے ڈراپ کرنے کا۔ میری وجہ سے خاصی زحمت ہوئی آپ کو۔" اس بار دیا کا لہجہ بہت دھیما تھا اور اسے اگلی کسی بھی بات کا موقع دیے بغیر وہ گاڑی سے اتر کر چلی گئی تھی۔ سالار کافی دیر تک اس کے ٹوٹے لہجے پر غور کرتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

یونی ورسٹی کھلتے ہی دیا واپس چلی گئی تھی۔ یونی آکر وہ دوبارہ اپنے خول میں سمٹ گئی تھی لیکن اس بار وہ زیادہ ہی کھوئی کھوئی اور خاموش تھی۔ اس کی یہ خاموشی نمناں سے چھپی نہ رہ سکی۔
"کیا بات ہے، اس بار تم بہت اداس ہو واپس آکر۔" نمناں نے پوچھا تھا۔
"گھر سے آنے کے بعد میں ہمیشہ ہی اداس ہوتی ہوں۔ کوئی نئی بات تو نہیں۔" اس نے ٹالنا چاہا۔
"لیکن اس بار تم نے تیزی سے اپنی لڑائی کے قصے نہیں سنائے کہ کیسے وہ تمہیں تنگ کرتا رہا اور نہ ہی بوا جی کے مزے مزے کے قصے۔"
"بس... اس بار وہ کہیں اور مصروف تھا۔"
"کہاں...؟" نمناں نے جاننا ضروری سمجھا۔
"بس وہ ہمارا ایک کزن آیا ہوا ہے پاکستان سے، اسی کے ساتھ زیادہ وقت گزرتا ہے اس کا۔" دیا نے لہجے کو سرسری سا بناتے ہوئے کہا تھا۔ حالانکہ صرف وہی جانتی تھی کہ اسے کتنا برا لگتا تھا۔ جب اس کا بھائی اس فضول شخص سے بات کرتا تھا۔
"کزن؟ کون کزن؟ کیا نام ہے؟ کیا رشتہ ہے؟ کیا بہت ہینڈسم ہے؟ تم اب بتا رہی ہو۔" نمناں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کیے اور شکوہ بھی۔
"تم تو ایسے کہہ رہی ہو کہ جیسے میری پوری فیملی کو جانتی ہو۔ اتنی میں ایکسائیٹڈ نہیں ہوئی، جتنی تم ہو رہی ہو اور رہا ہینڈسم ہونے کا سوال تو میں نے اسے غور سے دیکھا نہیں۔" دیا نے بھی حساب برابر کیا۔
"ہاں تم تو ہو ہی بدذوق اپنے لیے نہیں تو میرے لیے ہی اسے دیکھ لیتیں کہ کیسا ہے وہ؟ کتنی ہائٹ تھی؟ مسکلر باڈی تھی یا نہیں؟ رنگت کیسی تھی؟ اور اسمائل؟"
"کیوں دیکھتی میں یہ سب، مجھے کون سا شادی کرنی ہے اس سے؟" دیا نے بہت تپ کر بغیر سوچے جواب دیا۔ چند لمحوں بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کیا کہا ہے تو ہونٹ چبانے لگی۔
"اوہو... تو محترمہ کے دل میں چور ہے... آہا... جسے دیکھا بھی نہیں ٹھیک سے اس کو اپنا ساجن بنانے کے خواب۔ بچی... بڑی صحیح جا رہی ہو۔" نمناں نے اس کی بات کا مزے لیتے ہوئے کہا۔
"فضول باتیں بند کرو اور میرا دماغ مت کھاؤ اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ بہت مغرور، گھمنڈی اور خود پسند ہے اور لڑکیوں کو تو ادنیٰ مخلوق

سمجھتا ہے اور خود کو پتا نہیں کہاں کا شہزادہ!" اس نے خوب دل کھول کر اپنی بھڑاس نکالی اور نمل کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کلاس لینے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے میلبورن واپس آئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ ہاسٹل میں اسے ایک پارسل ملا' خاصا ہیوی سا۔ پارسل کے اوپر بھیجنے والے کا نام پڑھ کر غصے سے اس کا دماغ کھول گیا تھا۔ پتا نہیں میرے ہاسٹل کا ایڈریس اسے کہاں سے ملا۔ کہیں بابا یا ثیزی سے تو.... نہیں اس میں اتنی جرأت نہیں کہ بابا سے ایڈریس مانگے۔ ضرور اپنے چیلے سے ہی لیا ہوگا ایڈریس.... اس نے جل کے سوچا۔

"سالار حسین...." نمل نے بلند آواز میں نام پڑھا۔ وہ کمبائن اسٹڈیز کے لیے آئی ہوئی تھی ہاسٹل....

"یہ کون ہے؟" اور لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس نے خود ہی پارسل کھول کے دیکھا۔ اندر سے نکلنے والے سامان نے جہاں نمل کو حیران کیا وہیں دیا کا چہرہ غصے سے مزید سرخ ہوگیا۔ یہ شخص میری سوچ سے بھی زیادہ کمینہ ہے۔ اس نے سلگ کے سوچا۔

وہ ایک لیپ ٹاپ تھا۔

i7... touch screen... latest - core

"اتنا مہنگا لیپ ٹاپ کم از کم اس کی قیمت تیس ہزار آسٹریلین ڈالرز ہوگی۔ یہ شاید تمہارے اس مغرور کزن نے ہی بھجوایا ہے نا؟ یار' کاش میرا بھی ایسا ہی ایک مغرور اور خود پسند کزن ہوتا۔" نمل نے حسرت سے کہا۔

"جی نہیں' یہ بابا نے بھجوایا ہوگا۔ انہیں بزنس ٹور پر ہانگ کانگ جانا تھا' اسی لیے اس سے کہہ دیا ہوگا۔" دیا نے وضاحت دینا ضروری سمجھا۔

"اچھا... تو ثیزی کو کیوں نہیں کہا انہوں نے؟" اس نے اچھا کو خاصا لمبا کھینچا... نمل کی بال کی کھال نکالنے والی عادت اسے آج سے زیادہ کبھی بری نہیں لگی۔

"وہ اپنے کام ڈھنگ سے کرلے یہی بہت ہے۔ میرا لیپ ٹاپ خراب ہوگیا تھا' تمہیں بتایا تھا نا میں نے' بس اسی لیے بابا نے اسے پیسے دے دیے ہوں گے۔"

"نہیں یار.... یہ ایشین لڑکے بڑے خوددار ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ غیرت مند بھی۔ اب ایک خوب صورت لڑکی کو گفٹ دینے کے لیے وہ لڑکی کے باپ سے پیسے تھوڑی لے گا۔" نمل نے بھی اس کا جھوٹ پکڑ ہی لیا آخر۔

"فضول باتیں مت کرو' وہ کیوں دینے لگا گفٹ اور دوبارہ پیک کرواسے میں ابھی واپس بھجواؤں گی۔"

"تو مان رہی ہو کہ یہ اسی کزن نے بھجوایا ہے' ورنہ واپس کیوں کرتی۔ یار کوئی پکچر ہی دکھادو اس کی ظالم.... سالار حسن نام ہے نا.... چلو فیس بک پہ سرچ کروں گی اسے۔" نمل بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

"پلیز واپس نہ بھجواؤ' مجھے ہی دے دو اتنا لیٹسٹ ماڈل ہے یہ۔"

"شٹ اپ نمل! پلیز' اسٹاپ اٹ اور اب وہ کرو جو کرنے آئی ہو۔"

پھر شام میں جب نمل گھر چلی گئی تو اس نے پارسل پر لکھے کونٹیکٹ نمبر پر کال کی۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ میرا پارسل مل گیا؟" دیا کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے اس نے کہا کہ جیسے اس کا نمبر پتا ہو پہلے سے سالار کو اور اسے یہ بھی یقین ہو کہ پارسل ملتے ہی وہ اسے کال کرے گی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ آپ سے کس نے کہا تھا لیپ ٹاپ بھجوانے کو؟" وہ غصے سے بولی۔

"مجھے پتا تھا کہ آپ نے انکل یا ثیزی سے نہیں کہا ہوگا' اس لیے خود ہی بھجوادیا' اچھا لگا نا؟" وہ جیسے بہت پرسکون تھا کہ اسے ضرور ہی پسند آئے گا۔

"لیکن آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"میں نے تو آپ کی مدد ہی کی ہے کہ بغیر لیپ ٹاپ کے آپ کو نیٹ سے اسائنمنٹ کاپی پیسٹ کرنے میں مشکل پیش آئے گی۔" سالار نے اپنی مسکراہٹ دبا کر اسے مزید تپایا۔

"ہر ایک کو آپ نے اپنے جیسا سمجھا ہوا ہے نا۔"

وہ واقعی تپ ہی تو گئی تھی اس بات پر۔

"نہیں میں تو خاصا جینئس ہوں۔۔۔ آپی نے بتائی تو ہو گی آپ کو یہ بات۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لالہ کیوں بتائیں گے مجھے آپ کی باتیں؟" اف یہ آدمی بہت شاطر ہے۔۔۔ اور لالہ انہیں تو میں دیکھ لوں گی۔

"ریئلی۔۔۔؟ کیا اس نے میرے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا؟ کیا واقعی؟ لیکن اس نے تو بتایا تھا کہ آپ دونوں میرے ہی متعلق باتیں کرتے تھے۔ آپ کو بہت شوق تھا مجھے جاننے کا۔" بلا کی حیرانی تھی اس کے لہجے میں۔۔۔ ایسی اداکاری پہ تو آسکر بنتا تھا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں اور مجھے اپنا ایڈریس بتایئے' میں واپس بھجوادوں گی۔" جن لمحوں کا وہ ذکر کر رہا تھا۔ اس کے لیے وہ لمحے اذیت کا باعث تھے۔ کتنا بے حس ہے یہ شخص۔۔۔ کتنی آسانی سے مجھے بتا رہا ہے کہ لالہ نے اسے بتایا تھا۔۔۔ اور اس نے جواب میں جو کچھ کہا تھا۔

"میں نے گفٹ واپس لینے کے لیے تو نہیں دیا تھا۔ آپ کو نہیں رکھنا تو اپنی کسی فرینڈ کو دے دیں' جس نے کافی تعریف کی ہو لیپ ٹاپ کی۔"

"آپ کو کیسے پتا؟" وہ حیران ہوئی۔ کہیں وہ جاسوسی تو نہیں کروا رہا ہے میری؟ اس نے دائیں بائیں دیکھا کہ جیسے واقعی کوئی جاسوس مل ہی جائے گا۔ دوسری طرف اپنے تکے کے سو فیصد صحیح ہونے پر وہ خود کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"کس رشتے سے آپ نے مجھے اتنا مہنگا گفٹ دیا ہے' آپ کی اتنی جرأت کہ۔۔۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔

"جیسے آپ تو جانتیں ہی نہیں محترمہ کے کیا رشتہ ہے ہمارا؟ اور جرأت کی بات تو نا ہی کریں آپ۔۔۔ مجھے چیلنج مت کریں۔ آپی نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میں کتنا ڈیرنگ ہوں۔ اتنی جرأت ہے مجھ میں کہ میں آپ کی یونی آکر کھلے عام اعلان کروں ہمارے رشتے کا۔" سالار کا انداز بہت کچھ سمجھا گیا اسے۔

"ہاں آپ میرا تماشا لگانے اور دنیا کے سامنے مجھے رسوا کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔" وہ تھک گئی تھی اس بحث سے۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس نے کہا تھا۔

اس کی یہ بات سن کر سالار سناٹے میں آگیا تھا۔

"اتنی بدگمانی؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ میں کیوں ایسا چاہوں گا؟ آپ کی عزت میری عزت ہے۔۔۔ میں۔۔۔" لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دیا نے کال کاٹ دی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسری طرف وہ اب بھی بے یقین تھا۔ وہ ایسا بھی سوچ سکتی ہے میرے بارے میں کہ میں اسے رسوا ہونے دوں گا؟ کہیں اسے پتا تو نہیں چل گیا میں کیا کرنے والا تھا اس کے ساتھ؟ اللہ مجھے اس کے سامنے رسوا مت کرنا' میرا بھرم رکھ لینا۔۔۔ اس نے بے ساختہ اللہ سے التجا کی۔۔۔ اس کے چہرے پر کرب اور بے چینی تھی۔

☼ ☼ ☼

بابا اور آپی سڈنی آچکے تھے۔ دیا کو جب پتا چلا ان کے آنے کا تو وہ خوب لڑی تھی ان سے کہ اس کی چھٹیوں میں کیوں نہیں آئے وہ لوگ۔۔۔ اب وہ ویک اینڈ کا شدت سے انتظار کر رہی تھی جب وہ گھر جاسکے' حسن مراد کے گھر ان سب کی محفل جمی ہوئی تھی۔ سالار آفس سے سیدھا وہیں آگیا تھا' سو اب تھکن کی وجہ سے صوفے پر بیٹھے آپی کے زانوں پر سر رکھے آرام دہ انداز میں اسی صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔

بابا ان دونوں کی محبت کا یہ انداز مسکراتی نظروں

سے دیکھ رہے تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ جس نے ان کی اولاد کے دل میں بے انتہا محبت ' عزت اور احترام دیا تھا۔ ورنہ جب وہ زینب اور عباد کو لے کر پاکستان آئے تھے تو انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں صارم یا شازمین ان دونوں کو ساتھ رکھنے سے انکار نہ کردیں مگر ایسا نہیں ہوا' وہ سب ہمیشہ ایک خاندان کی طرح رہے تھے' دکھ سکھ' سب میں ساتھی۔۔۔ اور یہ سب شازمین کی سمجھ داری اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ انہوں نے ہی عباد اور سالار کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔

"ہاں بابا! مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ آپ کو اصل سے زیادہ سود پیارا ہے۔ مجھے تو آپ نے کبھی ایسی عاشقانہ نظروں سے نہیں دیکھا۔" بابا کو سالار کی طرف دیکھتا پاکر عباد نے دکھ اور حسرت سے کہا تو بابا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں تو ہولے جیلس۔۔۔ بابا مجھے تجھ سے زیادہ کیوں چاہتے ہیں' بس یہی مسئلہ ہے تجھے۔" سالار بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ سب ان دونوں کی نوک جھونک کو انجوائے کر رہے تھے۔

"بھائی! ویسے آپ نانا کو بابا کیوں کہتے ہیں۔" شاہ زیب نے آج پوچھ ہی لیا۔

"میری وجہ سے' مجھ سے جلتا جو ہے یہ۔" عباد نے ہنستے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ "جب میں اسکاٹ لینڈ سے پاکستان آیا بابا کے ساتھ تو اس کو بہت برا لگتا تھا بابا کا مجھے توجہ دینا۔" سالار سمیت سب ہی اس کی بات غور سے سن رہے تھے۔

"ہاں اور جب اسے جلانے کے لیے میں نے بھی بابا کہنا شروع کیا تو بہت برا لگا تھا اسے۔ مجھ سے کہتا تھا یہ صرف میرے بابا ہیں اور تمہارے دادا اس لیے بابا کہنے کا حق صرف مجھے ہے۔" سالار نے آپی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزے سے بتایا تھا۔

"ویسے نانا آپ ان دونوں میں سے کسے زیادہ چاہتے ہیں؟ لالہ کو یا سالار بھائی کو؟" نیزی نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ تو ہمارے گھر کا شہزادہ ہے' مجھ سمیت سب ہی کا لاڈلا اور چہیتا۔" بابا کے بجائے آپی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ محبت اور شفقت تھی۔ سالار کو بے ساختہ اپنے اوپر رشک آیا تھا۔ اتنی محبت' اتنی چاہت؟ کیا وہ حق دار ہے ان سب کا؟ اگر انہیں میرے ماضی کی حقیقت کا پتا چل جائے کہ میں کیا کرنے جا رہا تھا ان سب محبتوں کے ساتھ تو کیا یہ سب ایسے ہی مجھے چاہیں گے؟

"ایسے مجھے مت دیکھ جیسے کہ کوئی ماں اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔"

سالار نے منفی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے آپی سے کہا۔

"ویسے یہ میں ہی ہوں اتنا اچھا اور شریف' ورنہ آپ لوگوں نے تو مجھے بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' اتنا سر چڑھایا مجھے' پھر بھی میں ذمہ دار' سمجھ دار' باکردار اور فرماں بردار ہوں۔" سالار نے اپنی اردو لغت کا بے دریغ استعمال کیا۔

"اور کوئی "دار" رہ گیا ہو تو وہ بھی بتادے جیسے وفادار' حیادار' دین دار وغیرہ۔" آپی نے اسے لتاڑا۔

"ہاں یہ سب تو میں کہنا بھول ہی گیا۔ اضافے کا شکریہ۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

ابھی یہ محفل جاری ہی تھی کہ حسن مراد کے ایک بہت پرانے دوست اپنی فیملی کے ساتھ وہاں آگئے۔ ان دونوں کی دوستی بیس سال پرانی تھی اور دونوں کے فیملی تعلقات تھے۔

"حسن یار! میں ہماری دوستی کو رشتہ داری میں بدلنا چاہتا ہوں۔ رضا کو بچپن سے جانتے ہو تم۔۔۔ ماشاء اللہ میرا پورا بزنس اسی نے سنبھالا ہوا ہے۔ مجھے امید ہے تم انکار نہیں کرو گے۔ میں دیا کو اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہوں۔" اجمل صاحب نے ایک ہی سانس میں بے تکلفی سے آنے کی وجہ بتائی۔۔۔ ان کی بات سن کر حسن مراد' زینب' کمال حسین' عباد اور شاہ زیب سب ہی کو سانپ سونگھ گیا اور سالار۔۔۔ اس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ اس کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ایکسکیوزمی"۔ کئی لمحوں بعد کمرے میں پہلی آواز سالار کی ہی گونجی تھی اور وہ تیزی سے گھر سے نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے کتنے گھنٹوں سے وہ بے مقصد سڑکوں پر گاڑی چلا رہا تھا۔ اشتعال تھا کہ کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہی آپی کی کال آئی تھی ، لیکن اس کا دل نہیں چاہا اس وقت کسی سے بات کرنے کو۔ اس نے سیل آف کر دیا تھا۔ آخر کار اس نے سمندر کے سامنے گاڑی روک ہی دی۔ پتا نہیں انکل نے کیا کہا ہو گا۔ اس نے گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے اداسی سے سوچا۔ اصولاً "تو انہیں انکار ہی کرنا چاہیے۔۔۔ میری بیوی کے لیے پروپوزل۔۔۔ اس کا دماغ یہ سوچ کے سلگ رہا تھا اور وہ گھونچو رضا۔۔۔ کیسا شرما رہا تھا کہ جیسے آج ولیمہ ہو اس کا۔۔۔

کیا انکل نے واقعی انکار کر دیا ہو گا؟ رضا کو وہ پچھلے بیس سال سے جانتے ہیں اور مجھے تو صرف چار مہینے ہی ہوئے ہیں آئے ہوئے۔ وہ بے اختیار اپنا اور رضا کا موازنہ کرنے لگا۔ انکل کو تو وہی بہتر لگے گا۔۔۔ جبکہ میں۔۔۔ منفی سوچیں یک دم اس پر حاوی ہوئی تھیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا۔

میں اس سے ہر طرح سے بہتر ہوں۔ اس کے دل نے کہا۔ فیملی وائز بھی۔۔۔ کوالیفکیشن میں بھی۔۔۔ پرسنالٹی میں بھی اور دولت میں بھی۔ یک دم وہ پرسکون ہو گیا تھا۔

لیکن اگر انکل نے مہدیہ کو فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا۔ تو کیا ہو گا اس کا فیصلہ؟ دماغ نے پھر حملہ کیا۔ کیا تم جانتے نہیں کہ کتنی نفرت کرتی ہے وہ تم سے۔ دماغ نے کہا تھا۔

نہیں۔۔۔ وہ صرف بدگمان ہے تم سے۔۔۔ یاد کرو تم نے کیسے اس کی زندگی تباہ کرنے کا سوچا تھا۔۔۔ ذلت کی کس گہرائی تک لے کے جانے والے تھے۔ اس معصوم لڑکی کو تم۔۔۔ دماغ اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

لیکن تم نے ایسا کچھ کیا تو نہیں۔۔۔ عالیان نے تمہیں روک لیا تھا، وہ سب کرنے سے۔۔۔ دل اب بھی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

جو بھی ہے لیکن تم اس لڑکی کے قابل نہیں ہو۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔۔۔ وہ ٹھیک سوچتی ہے کہ تم اسے رسوا کرنا چاہتے ہو۔۔۔ دماغ نے ایک اور وار کیا۔

نہیں۔۔۔ یہ جھوٹ ہے۔۔۔ وہ میری عزت ہے۔۔۔ میری بیوی۔۔۔ میں بہت چاہتا ہوں اسے۔۔۔ میں اسے کیسے رسوا کر سکتا ہوں۔۔۔ میں خود رسوا ہو سکتا ہوں لیکن اسے نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔" دل نے دماغ کی دلیل کو رد کر دیا اور جانے کب تک اس کے دل اور دماغ کے بیچ یہ جنگ چلتی رہی۔ جس نے اسے بہت نڈھال کر دیا تھا۔ وہ رات گئے تک ساحل سے ٹکراتی لہروں کو دیکھتا رہا اور اس کا ذہن ماضی میں سفر کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

نکاح نامے پر سائن کرنے کے بعد جب پاپا۔۔۔ بابا اور حسن انکل نے اسے گلے لگایا تو اس کا دل چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔۔۔ عافیہ دادی کی خوشی سے جھلملاتی آنکھیں بھی اسے ڈھونگ لگی تھیں۔۔۔ وہ فوراً" وہاں سے ایئرپورٹ چلا گیا اور کسی کو بتائے بغیر لندن روانہ ہو گیا تھا۔۔۔ اس کا رویہ دیکھتے ہوئے صارم حسین نے حسن مراد سے درخواست کی تھی کہ ابھی اس نکاح کا اعلان نہیں کرتے۔۔۔ جب دونوں بچے حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے تو تب ہی سارے خاندان اور جاننے والوں کو بتا دیا جائے گا نکاح کے بارے میں۔۔۔ انہیں بھی یہی مناسب لگا اور اس نکاح کی بات وہیں دب گئی۔

انگلینڈ آنے کے کئی مہینوں تک اس نے پاپا اور بابا سے کوئی بات نہیں کی وہ سخت خفا تھا۔ ان سے اس کی مرضی کے خلاف نکاح کروانے پر۔۔۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ وہ یہ رشتہ نہیں نبھائے گا۔۔۔ کسی قیمت پر

نہیں اور اس نے یہ بھی سوچا ہوا تھا کہ وہ اس لڑکی کو خاموشی سے طلاق بھی نہیں دے گا۔ کچھ ایسا کرے گا وہ کہ جس سے وہ لڑکی سارے زمانے میں بدنام ہو جائے۔ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے... وہ کیا کرے گا؟ اس کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک سال بعد اس نے کرسمس کی چھٹیوں پر آبی کے پاس کیلی فورنیا جانے کا پروگرام بنایا... کیونکہ ایک وہی تھا جس نے اب تک نکاح کے متعلق اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور پاکستان جانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیلی فورنیا آکے وہ کافی مطمئن ہو گیا تھا۔ آبی کے ساتھ مل کر اس نے خوب انجوائے کیا اپنی چھٹیوں کو... ایک رات ڈنر سے واپس آتے ہوئے آبی کو کوئی گفٹ شاپ نظر آئی تو اس نے اندر چلنے کو کہا۔

"کس کے لیے خریدنا ہے گفٹ۔" سالار نے پوچھا۔

"مهدیہ کے لیے..." آبی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "کون مہدیہ؟" سالار کے لہجے میں سادگی تھی۔

جیسے وہ واقعی نہیں جانتا تھا کہ مہدیہ کون تھی؟ آبی نے اس کے چہرے کی طرف کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ واقعی وہاں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ یعنی کہ اسے واقعی اپنی ایک سال پہلے بنی منکوحہ کا نام بھی یاد نہیں تھا اور کیسے یاد ہوتا' نکاح کے وقت وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ غصے میں بیٹھا اپنا اشتعال برداشت کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس لیے نام پر دھیان نہیں دیا۔ بس جب پاپا نے اشارہ کیا تو چپ کر کے دستخط کر دیے۔ ایک الاؤ تھا جو اس کے دماغ میں پک رہا تھا۔

"تمہاری بیوی! جس سے تمہارا ایک سال پہلے نکاح ہوا تھا۔" اور اس کی بات سمجھ کر سالار نے اپنے ہونٹ بھینچے تھے۔ وہ تیزی سے شاپ سے باہر جانے لگا' جب پیچھے سے آبی کی آواز آئی تھی۔ "تم نے بھی اسے نکاح اینیورسری پر کوئی گفٹ بھجوانا ہے تو یہیں سے خرید لو... اسے ٹیڈی بیئرز بہت پسند ہیں۔" جیسے وہ تو یہی جاننے کے لیے بے تاب تھا نا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتا باہر نکل گیا تھا اور اکیلے ہی آبی کے فلیٹ واپس چلا گیا۔

جب آبی گھر واپس آیا تو لاؤنج کی ابتر حالت نے اسے پریشان کر دیا اور پھر جب اس کی نظر سالار پر پڑی تو سیل اور گفٹ بیگ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئے... وہ بھول گیا تھا کہ وہ سیل پر بات کر رہا تھا۔ وہ فوراً" اس کی طرف بڑھا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟ کیسے زخمی ہوا تمہارا ہاتھ؟ دکھاؤ مجھے؟" وہ واقعی پریشان تھا اس کے لیے... شاید کوئی کانچ لگ گیا تھا اسے...

"ڈیوی... کچھ نہیں ہوا ہے مجھے... مرا نہیں ہوں میں ابھی... تمہاری بھابی ابھی بیوہ نہیں ہوئی ہے۔ سو پریشان نہ ہو۔" سالار نے بدتمیزی سے کہا تھا۔

"اچھا پلیز... ریلیکس ہو جاؤ۔" اس نے سالار کے غصے کو کم کرنے کی کوشش کی' ورنہ تو بیوہ ہونے والی بات اسے بہت ناگوار گزری تھی۔

"تم گفٹ والی بات پر اتنے غصے میں کیوں آگئے؟ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا' تاکہ تم دونوں قریب آسکو۔"

"شکریہ مجھے کوئی خواہش نہیں ہے اس لڑکی کے قریب جانے کی۔" وہ آج سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"آئی نو کہ یہ رشتہ تمہاری مرضی سے نہیں ہوا لیکن اب تو ہو گیا نا؟ میرا یقین کرو وہ بہت اچھی ہے اور وہ نکاح کے بعد سے تمہیں پسند بھی کرنے لگی ہے۔ میں نے اسے بہت کچھ بتایا ہے تمہارے متعلق اور وہ بہت شوق سے تمہارے بارے میں سنتی ہے۔" عباد نے اسے سمجھانا چاہا تھا آرام سے' لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اس بات کے بعد وہ پھٹ پڑے گا۔ اسے اپنے بہتے خون کی کوئی پروا نہیں تھی۔ نہ جانے کیسا جنون سوار تھا اس پر...

"اچھی مائی فٹ! تمہاری اور بابا کی تو بھانجی ہے وہ اس لیے تم لوگوں کو اچھی ہی لگے گی۔" سالار نے سلگ کر کہا تھا۔

"سالار پلیز کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" آپی کو اس سے اس قدر شدید رد عمل کی امید نہیں تھی۔ حالانکہ وہ اسے جانتا تھا' پھر بھی۔۔۔

"پاگل ہو گیا ہوں میں۔۔۔ پاگل کر دیا ہے تم لوگوں نے مجھے۔۔۔ تمہیں کیا لگتا ہے قبول کروں گا میں اس زبردستی کے نکاح کو؟ کبھی نہیں۔۔۔ پتا نہیں کس قسم کی لڑکی کو میرے گلے باندھ دیا ہے اور اس دو ٹکے کی لڑکی کو تو دیکھ لوں گا میں۔۔۔ انا اور عزت نفس نام کی چیز نہیں ہے اس لڑکی میں۔۔۔ پاکستان سے اسے اس کی اوقات بتا کے آیا تھا میں۔۔۔ اسے دیکھے اور ملے بغیر۔۔۔ اس بات سے بھی وہ اور اس کا باپ سمجھ نہیں سکے کہ نفرت کرتا ہوں میں اس سے۔ اپنی اوقات جاننے کے بعد بھی اسے شوق ہے میری باتیں تم سے کرنے کا؟ واقعی بہت ہی بے غیرت اور ڈھیٹ لڑکی ہے وہ اور ایسی گھٹیا لڑکی کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ضرور اس میں کوئی کمی یا کردار میں کوئی خرابی ہے' ورنہ کون باپ اس طرح سے اپنی بیٹی کا نکاح کرتا ہے۔" وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا وہ اتنی گھٹیا بات بھی سوچ سکتا ہے۔

"تم ہوش میں تو ہو' پتا ہے کہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمہیں اس کی توہین کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" آپی نے ساری مصلحت بالائے طاق رکھ کر غصے سے کہا۔

"اجازت؟ تمہاری اجازت چاہیے بھی کسے؟ دیکھنا میں کیا کرتا ہوں اس کے ساتھ' کیسے زمانے بھر میں رسوا کروں گا اسے۔ پچھتاؤ گے تم سب اس کو میرے ساتھ باندھنے پر" اور یہ کہتے ہی وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

آپی اب بھی بے یقین تھا کہ کچھ دیر پہلے کی گئی باتوں پر اور وہ نہیں جانتا تھا کہ فون پر جس سے وہ بات کر رہا تھا' اس نے بھی ایک ایک لفظ سنا تھا جو سالار کے منہ سے ادا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

26 دسمبر۔ اسے نہیں پتا تھا کہ یہ دن اس کے لیے اتنی ذلت اور اذیت کا باعث بن جائے گا۔۔۔ ابھی چند لمحوں پہلے ہی تو لالہ نے اسے بتایا تھا کہ سالار نے اس کے لیے اپنی ورسری کا ایک گفٹ خریدا ہے۔۔۔ وہ کتنا خوش ہوئی تھی یہ سن کر لیکن یہ کیا۔۔۔ حقیقت کیا ہے' یہ اسے اب پتا چلا' ایک سال بعد۔۔۔ سالار۔۔۔ اس کا شوہر۔۔۔ کتنی نفرت کرتا تھا اس سے۔۔۔ کیا حیثیت تھی اس کی وہ جان چکی تھی۔۔۔ وہ کتنی بے وقوف تھی کہ لالہ کی باتوں میں آ گئی۔۔۔ حالانکہ وہ سوچتی تھی کہ وہ اس سے ملا کیوں نہیں۔۔۔ جو رشتہ ان کے درمیان تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ اس سے ملتا نکاح کے بعد۔۔۔ اس سے رابطہ کرتا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

بے شمار خواب دیکھ چکی تھی وہ' اس کے حوالے سے۔۔۔ اس نے تو بوا سے سنا تھا کہ میاں بیوی عزت ہوتے ہیں ایک دوسرے کی۔۔۔ لیکن یہ کیا۔۔۔ اس کا شوہر اتنی غلیظ زبان استعمال کر رہا تھا اس کے لیے۔۔۔ کیسے انگارے نکل رہے تھے اس کے محرم کی زبان سے' جو اس کے پورے وجود اور روح کو جلا رہے تھے۔۔۔ راکھ بنا رہے تھے۔ ہاتھ میں فون پکڑے وہ اب تک گم صم سی بیٹھی تھی۔۔۔ سکتے میں۔۔۔ کیا جو میں نے سنا وہ سچ تھا؟ کیا واقعی وہ وہی شخص تھا جس کی لالہ اتنی تعریف کرتے تھے؟ کیا کچھ نہیں تھا اس کے لہجے میں میرے لیے؟ نفرت' حقارت' بے زاری' لاتعلقی' بے گانگی۔۔۔ جیسے وہ اپنی بیوی کے لیے نہیں کسی اور کے لیے بات کر رہا ہو۔

اوہ میرے خدا! یہ کیا ہو گیا۔۔۔ ابھی تو خواب دیکھنے شروع کیے تھے میں نے' اتنی بھیانک تعبیر۔۔۔ کتنی آسانی سے اس نے میرے کردار پر انگلی اٹھائی۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی بد کردار کہنا؟ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی میری سانسیں چل رہی کیسے؟ کیوں؟ اتنی ذلت کے بعد بھی؟ شاید میں واقعی بے غیرت ہوں۔

وہ ٹوٹ رہی تھی، بکھر رہی تھی اس کو توڑنے والا کوئی اور نہیں اس کا شوہر اس کا سائبان تھا۔ وہ اسے رسوا کرنا چاہتا تھا۔ اپنی عزت کو دنیا میں بے مول کرنا چاہتا تھا؟ کیوں؟ بہت عرصے تک وہ سنبھال نہیں سکی تھی خود کو۔ گھر میں سب اس کی خاموشی کی وجہ سے پوچھتے لیکن اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا کہ کیسے اس کی روح کو زخمی کیا گیا ہے۔ لالہ پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ سب سن چکی ہے۔ بس اب وہ مزید کچھ نہیں سن سکتی تھی۔ لالہ کو اس نے سالار کے بارے میں کچھ بھی بات کرنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس کی پڑھائی متاثر ہوتی ہیں ان باتوں سے۔

وہ اب نفرت کرتی تھی اس شخص سے۔ اس کا نام سننا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ بابا سے بات کرے گی کہ اسے شادی نہیں کرنی' وہ مان جائیں گے' وہ انہیں منالے گی۔ سب بتادے گی ان کو' جو اس کے نام نہاد شوہر نے کہا' تب وہ ضرور مانیں گے۔ بس چند سال انتظار۔

لیکن اتنا آسان بھی نہیں ہوتا کچی عمر کے خوابوں کو آنکھوں سے نوچنا۔ وہ شخص جو اس کی روح میں بھی بستا تھا' اتنی آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ کبھی کبھی دل اس کے اختیار میں نہیں رہتا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے سوچنے لگتی۔

محبت اور نفرت ساتھ ساتھ تھے۔

☆ ☆ ☆

آج کئی دن کے بعد بابا اور آپی زبردستی اسے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ پھوپھو کی طرف۔ حالانکہ اب وہ سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کسی کا بھی۔ اس کے جانے کے بعد جو بھی کچھ ہوا تھا' اس کا ذکر آپی یا بابا نے اس سے نہیں کیا اور وہ چاہنے کے باوجود پوچھ نہیں سکا۔ اتنا کم ہمت تو وہ کبھی نہیں رہا مگر اس کے دل میں ایک خوف تھا۔ ٹھکرائے جانے کا خوف۔ واقعی رد کیا جانا کتنا اذیت دیتا ہے۔ کل اس نے مہدیہ کو ٹھکرایا تھا' کہیں آج وہ۔ نہیں۔ اللہ نہ کرے۔ اس نے التجا کی۔

مہدیہ کو گھر پر دیکھ کر پھر اسے اپنا وجود اذیت کی بھٹی میں جلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے نظر انداز کیے آپی اور شاہ زیب کے ساتھ مصروف تھی۔ بابا' حسن انکل سے بزنس کی بات کر رہے تھے۔ اور وہ خاموش تھا۔ بالکل خاموش۔ اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا۔ "ہے نا سالار بھائی؟" شاہ زیب نے پتا نہیں کیا پوچھا تھا اس نے نہیں سنا وہ تو اپنا نام سن کے چونکا تھا۔ بابا نے بہت غور سے اپنے چہیتے پوتے کو دیکھا۔ کتنا الجھا' بکھرا' تھکا تھکا لگ رہا تھا وہ۔ پریشان' مضطرب۔ انہیں اس پر رحم آ ہی گیا۔

"حسن بیٹا! مجھے آپ سے آج بہت ضروری بات بات کرنی ہے۔" انہوں نے کچھ سوچ کر بات کا آغاز کیا۔ "اس دن جو کچھ ہوا میں سمجھتا ہوں وہ ہماری غلطی ہے۔ ہمیں رشتہ قائم کرکے اس کا اعلان بھی کرنا چاہیے تھا۔ میں اب اس غلطی کو سدھارنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" یہ کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی جیب سے سیاہ مخمل کا ایک خوب صورت بکس نکالا۔

"صارم اور شازمین بھی آج یہاں ہوتے تو اچھا ہوتا لیکن فی الحال ان کی غیر موجودگی میں چھوٹی سی رسم تو ہو ہی سکتی ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حسن مراد بھی مسکرا رہے تھے' ورنہ وہ بھی پریشان تھے اپنی بیٹی کے مستقبل سے۔ کمال حسین کی بات سمجھ کر وہ پرسکون ہوگئے۔ بے شک رضا کو وہ جانتے تھے لیکن سالار اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا' ہر لحاظ سے وہ بہتر تھا۔ پھر نکاح۔ سب سے بڑی وجہ۔ نکاح کے بعد انہوں نے اپنی بیٹی کے چہرے پر کئی رنگ بکھرے دیکھے تھے۔ وہ جانتے تھے اپنی بیٹی کی پسند' اس لیے کوئی دوسری سوچ کبھی نہیں آئی ان کے ذہن میں۔ اپنا معاملہ انہوں نے اللہ کے حوالے کیا تھا اور آج اللہ نے انہیں ان کی بیٹی کی خوشیاں دے دی تھیں۔

"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دیا آپ ہی کی بیٹی ہے۔" کمال حسین کی بات سن کر بچے بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپی اور شیزی پرجوش دکھائی دے رہے تھے، جبکہ دیا کچھ الجھی اور گھبرائی ہوئی۔۔۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سب نے اسے شرم کا تقاضا سمجھا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی اور سالار وہ تو بس بابا کو دیکھے جا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں کیا ان کا وہی مطلب ہے جو وہ سمجھ رہا ہے؟

"او ہیلو۔ بیٹا جی! آپ کدھر غائب ہیں، سنا نہیں بابا نے ۔ کیا کہا ہے ادھر تشریف رکھیے۔" آپی کو اس کے چہرے کے تاثرات مزہ دے رہے تھے۔ اس نے دیا کے برابر خالی جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا اور سالار جھینپ کے اٹھا اور اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔

اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور مضطرب سی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ ان دونوں کے لیے ہی سرپرائز تھا۔ اس نے پہلی بار اسے الجھتے ہوئے دیکھا تھا ورنہ تو ہر وقت اس کو غصے میں ہی دیکھا تھا سالار نے۔ سالار نے بابا کے ہاتھ سے پلیٹینم انگوٹھی لے کر دیا کا ہاتھ پکڑنے کے لیے اپنی ہتھیلی پھیلائی۔ اس کی نظریں مسلسل اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"بیٹا ہاتھ آگے کرو۔" کمال حسین نے کہا۔

"یار دیا! ہاتھ آگے کر بھی دو، ورنہ بھائی کا خون مزید انتظار سے خشک ہو جائے گا۔" شیزی نے شرارتی انداز میں کہا۔ بالآخر اس نے ہاتھ آگے کر دیا، سالار نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے وہ انگوٹھی اس کو پہنا دی تھی۔ پھر دیا نے بھی بہت دقت اور اصرار کے بعد اسے رسٹ واچ پہنائی۔

"دیکھا بابا آپ کا لاڈلہ کیسا خوش دکھائی دے رہا ہے ورنہ چند منٹ پہلے تک مجنوں بنا بیٹھا تھا یہ اور اب دانت ہی اندر نہیں جا رہے۔" بابا جانتے تھے کہ وہ پرسکون ہو گیا تھا۔ مطمئن اور خوش۔۔۔ آنکھوں کی شوخی اور روشنی بھی واپس آچکی تھی۔ نروس سی دیا اور بات بات پہ قہقہے لگاتا ان کا سب سے چہیتا پوتا۔

کتنے اچھے لگ رہے تھے دونوں ساتھ ساتھ۔۔۔ واقعی شان دار جوڑی تھی۔ سب نظروں ہی نظروں میں ان دونوں کی بلائیں لے رہے تھے۔

"تو اگر مجھے شرمندہ کرنا چاہ رہا ہے تو تجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میں شرمندہ ہونے والی چیزوں میں سے نہیں ہوں۔" سالار بھی اچانک ملنے والے سرپرائز سے نکل کر اپنے شوخ اور پراعتماد انداز میں واپس آگیا تھا۔

"جی اچھی طرح پتا ہے کہ تو کیا ہے۔ تو اس دن ایسا بھاگا کہ بس۔۔۔ قسم سے کیا مزے دار تاثرات تھے تیرے چہرے کے اس روز۔۔۔ ترس تو مجھے بڑا آیا، اسی لیے تجھے کال بھی کی لیکن تو نے ریسیو نہیں کی۔ یہ سب جو ہوا یہ تو اسی دن طے ہو گیا تھا، بس تم دونوں کو تھوڑا تنگ بھی تو کرنا تھا۔" آپی نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔

"آپ کو کیا لگا تھا کہ وہ نکلو رضا آپ کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ آپ کیوں میدان چھوڑ کے بھاگے تھے۔ میں تو خاصا بہادر سمجھتا تھا آپ کو۔" شیزی نے بھی شوخی سے پوچھا۔

"یار! وہ تو میں اس لیے گیا کہ کہیں وہ نکلو میرے ہاتھ سے ضائع نہ ہو جائے۔ یو نو آفٹر آل بلیک بیلٹ ہوں میں۔" سالار نے بھی اسی کے انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔

کچھ دیر بعد دیا تو اٹھ کر چلی گئی تھی، جبکہ وہ دونوں اس پر شوخ جملے کستے رہے اور وہ بھی بہادری سے ان کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑی وہ اپنے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنائی گئی انگوٹھی کو دیکھ کر سوچ رہی تھی، جب اس نے میرا ہاتھ تھاما تھا تو بہت اذیت ہوئی تھی مجھے۔ وہ شخص تو ذلیل اور رسوا کرنا چاہتا تھا مجھے؟ چھوڑنا چاہتا تھا مجھے؟ پھر یہ جو آج ڈرامہ ہوا وہ سب کیا

تھا؟ آخر کیا چاہتا ہے وہ؟ اب کون سی اذیت دینے آیا ہے وہ؟ نانا کو اس کے چہرے پر خوشی نظر آگئی اور میرے چہرے پر جو کرب تھا وہ کسی نے نہیں دیکھا؟ اسے تو نفرت تھی نا مجھ سے 'پھراب.....

کتنی بے بس تھی وہ کہ انکار بھی نہ کر سکی۔ ہم لڑکیاں کتنی بے بس اور مجبور ہوتی ہیں' ماں باپ کی عزت کی خاطر سب سہ لیتی ہیں۔ کاش وہ سب کچھ نہ بغیر اگر آج کا یہ دن آیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کتنی خوش ہوتی میں کہ..... مگراب کیسے؟

☼ ☼ ☼

"نانا! میں بہت ناراض ہوں آپ سے 'ابھی تو میں آئی ہوں اور آپ واپس بھی جارہے ہیں۔" لان میں کرسیوں پر بیٹھے' وہ بڑے لاڈ سے کمال حسین کے کندھے پر سر رکھے شکوے کر رہی تھی' جبکہ کمال حسین نواسی کی باتوں کو انجوائے کر کے مسکرا رہے تھے۔

ہاں..... وہ ایسی ہی تھی' دل میں جو بات ہوتی اسے اپنے تک ہی رکھتی تھی۔ وہ اب خوش ہے یا نہیں' اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سب کچھ اندر ہی اندر سہہ گئی تھی۔ شاید ایک اچھی لڑکی ایسی ہی ہوتی ہے۔ اپنا غم اور دکھ اندر رکھنے والی۔

"نانا..... ابھی تو میری پری بورڈ شروع ہوئی ہیں..... پیپرز میں ابھی کافی دن ہیں..... آپ ابھی یہیں رک جائیں نا۔"

"گڑیا میں ضرور رک جاتا لیکن ایک بہت اہم میٹنگ ہے میری۔"

"مطلب میٹنگ مجھ سے زیادہ امپورٹنٹ ہے۔" اس نے منہ بسور کر کہا۔ کمال حسین کو اپنی یہ نواسی بہت زیادہ عزیز تھی۔ شاید زینب سے بھی زیادہ۔ کیونکہ اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں بالکل فاطمہ کی طرح تھیں..... اور چہرے کی معصومیت اس سے بے اختیار پیار کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

"ہیلو بابا! کیا ہو رہا ہے؟ پیکنگ مکمل ہو گئی آپ کی؟" اسی وقت سالار بھی وہیں آکر بیٹھ گیا تھا۔

"بس ہو ہی گئی' تم سناؤ میٹنگ کیسی رہی۔"

"ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ....." اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ باتیں تو بابا سے کر رہا تھا جبکہ اس کی نظریں بابا کے ساتھ بیٹھی دیا پر تھیں..... اور وہ اس کی نظروں سے الجھ رہی تھی۔ سو چپ کر کے بیٹھی رہی۔ نفرت اپنی جگہ' لیکن اس کی نظروں کا مقابلہ وہ کانچ سی نازک لڑکی ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔

"شہزادے کچھ تو شرم کر..... دادا کے سامنے ہی مسلسل نظریں ایک ہی جگہ جمی ہوئی ہیں تمہاری۔" اس کی محویت نوٹ کر کے انہوں نے اسے شرم دلانی چاہی تھی۔

"تو؟ کیا ہوا؟ اپنی ہی بیوی کو دیکھ رہا ہوں' آپ پابندی تو نہیں لگا سکتے۔ لائسنس ہے میرے پاس....." وہ پرسکون سا بیٹھا' سر صوفے پر رکھے اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں..... اچھی طرح پتا ہے مجھے اور یہ لائسنس میری ہی وجہ سے ملا ہے تمہیں اور اب میری بیٹی کو مزید نروس اور تنگ کرنا بند کرو۔" بابا بھی پھر اس کے دادا ہی تھے۔

"میں کہاں تنگ کر رہا ہوں آپ کی لاڈلی کو' اتنے فاصلے پر تو بیٹھا ہوا ہوں محترمہ سے....." اس نے معصومیت کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے جواب دیا۔

"نانا..... آپ چائے پئیں گے؟ میں لاتی ہوں۔" دیا نے وہاں سے کھسکنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس کے شوخ جواب پر اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ غصے کی وجہ سے یا پھر شرم سے گالوں پر لالی کھلی تھی۔ کون جانے؟ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بات کرتا وہ تیزی سے اٹھ کر چلی گئی۔

"افسوس..... اتنی جلدی میدان چھوڑ کر چلی گئیں محترمہ۔!" سالار کو واقعی افسوس ہوا۔

"بکو مت....." بابا نے اسے گھر کا تھا۔ "جس طرح سے تم اسے دیکھ رہے تھے بھلا وہ معصوم کہاں مقابلہ کر سکتی تھی تمہاری نظروں کا۔"

"معصوم... آہم... آہم... یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی مجھے۔ اتنا خوار کروایا ہے اس نے مجھے اپنے پیچھے اور آپ اس کی سائڈ لے رہے ہیں۔ چلو جی بابا بھی گئے ہاتھ سے...."

"تو اتنا تو حق بنتا ہے اس کا.... اور رہا سوال سائڈ لینے کا تو تم بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ تم سب سے زیادہ عزیز ہو' مجھے اپنی سب اولادوں میں.... جس کا تم فائدہ بھی اٹھاتے رہتے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کبھی بھی ترس نہ کھاتا تمہارے اترے چہرے پر' کیونکہ میں جانتا ہوں وہ خفا ہے تم سے اور اب اسے منانا تمہارا کام ہے' سمجھے؟"

"جی بابا! بلکہ میرا خیال ہے یہ کام ابھی ہی کر لیتا ہوں' کیونکہ اس وقت گھر میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں اور آپ کے سامنے تو وہ مجھے کچھ اٹھا کر مار نہیں سکتی۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھا تھا۔ آج اس کی ساری ناراضی دور کرنے کا ارادہ تھا اس کا۔

گھر کے اندر داخل ہو کر اسے لاؤنج اور کچن میں وہ کہیں نہیں نظر آئی۔ پھر وہ ڈرائنگ روم میں آگیا لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اس کی کتابیں کھلی تھیں۔ اس نے وہیں اس کا انتظار کرنے کا سوچا اور پھر وقت گزاری کے لیے اس کا ایک رجسٹر اٹھالیا۔ یوں ہی صفحے آگے پیچھے کرتے ہوئے ایک صفحہ اس کے سامنے آیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا.... اس صفحے کی تحریر پڑھ کر اسے اپنا وجود پاتال میں اترتا محسوس ہوا۔ وہ بے یقین نظروں سے اب بھی صفحے کی تحریر کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ پیروں کے نیچے سے زمین نکلنا کیا ہوتا ہے اسے صحیح معنوں میں آج پتا چلا تھا۔ رجسٹر بند کر کے وہ تیزی سے باہر آیا۔ وہ اسے بابا کے ساتھ بیٹھی نظر آئی تھی۔

"بابا... میں جا رہا ہوں۔" اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا جو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے پریشان نظروں سے۔

"سالار کیا ہوا' سب ٹھیک تو ہے بیٹا؟" بابا نے پریشانی سے پوچھا۔ "جی... بس میں جا رہا ہوں' ضروری کام یاد آگیا ہے۔" اس کا چہرہ پتھریلا ہو رہا تھا۔

وہ کہتے ساتھ ہی تیزی سے نکل گیا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ واضح نظر آئی دیا کو۔ وہ حیران ہوئی تھی کہ ابھی تو وہ بہت خوش تھا اچانک کیا ہوا؟ چاہے وہ جیسا بھی تھا لیکن وہ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک بار پھر پریشان ہو چکی تھی کہ نہ جانے اب کیا ہوا ہے اسے جو وہ اس طرح سے چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے کس طرح وہ اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچا تھا۔ اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ کئی بار اس کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر فوراً" اس نے اے سی فل کیا... اپنے اندر کی گھٹن کو کم کرنے کی ایک ناکام کوشش.... اس کے ذہن کی اسکرین پر وہ الفاظ اب بھی واضح تھے۔ بے چینی اور بڑھی تھی.... وہ ایسا بھی سوچتی ہے اس کے بارے میں؟ اس صفحے پر کئی جملے لکھے تھے۔ کچھ آدھے ادھورے نام.... کہیں.... "ایم ایس ایچ" کہیں۔

"مہدیہ سالار حسین" تو کہیں مسز سالار حسین اور کہیں صرف اس کا نام سالار۔ لیکن یہ سب الفاظ تو اس کے لیے خوشی کا باعث ہونے چاہیے تھے نا... کہ وہ لڑکی اپنا نام اس کے نام کے ساتھ لگانا ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ ہاں شاید یہ تمام نام اسے خوشی سے پاگل کر دیتے" اگر اس صفحے پر ایک اور جملہ نہ لکھا ہوتا اس کے نام کے ساتھ...."

"سالار... کیا اس کا ساتھ اسے جنت میں لے جانے والا تھا؟ یا جہنم میں؟" یہ الفاظ اسے تازیانے کی طرح لگے۔ اس کی روح کو چھلنی کرنے کے لیے اس کا ماضی ہی کافی تھا کہ اب ایک اور بوجھ اس لڑکی نے اس کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ وہ لڑکی کیا جانتی ہے اس کے بارے میں جو اس سے اتنی امیدیں وابستہ کر کے بیٹھی ہوئی ہے؟

جب پہلی بار اس نے حسن انکل کے گھر میں اسے دیکھا تو اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ وہ

واقعی بہت حسین تھی۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا بابا نے بتایا تھا جب وہ سڈنی آرہا تھا۔ وہ تب بھی جانتا تھا کہ بابا اسے سڈنی ہی کیوں بھیج رہے ہیں۔ پاکستانی اور اسکاٹش نقوش کا خوب صورت امتزاج تھا اس کے چہرے پہ۔ اور اس پر اس کی نیلی آنکھیں۔۔۔ گلابی جوڑے اور اونچی پونی ٹیل میں نیلی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے باربی ڈول ہی لگی تھی۔۔۔ صرف لمحہ بھر ہی اس نے اس پر نظریں جمائی تھیں اور اسی ایک لمحے میں ہی دل نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہاں صرف وہی بسے گی۔

پھر اسے اس کے چہرے پر بے یقینی نظر آئی تو اس نے فوراً" شرمندگی سے اپنی نظریں ہٹالیں۔۔۔ یعنی کہ اسے اتنی بھی امید نہیں تھی کہ وہ آئے گا وہاں اس کے گھر۔۔۔ وہ واقعی شرمندہ ہوا کہ کبھی اس نے کانٹیکٹ کیوں نہیں کیا اس سے۔۔۔ نکاح کے بعد نہ سہی۔۔۔ پچھتاووں کے بعد ہی سہی۔۔۔ پھر ہر ملاقات میں وہ اسے روٹھی ہوئی ہی لگی لیکن خود سے مزید قریب۔۔۔ وہ سمجھتا تھا وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔۔۔ لیکن کیا واقعی ایسا تھا؟ جو لڑکی اس کی رہنمائی میں جنت تک کا سفر کرنا چاہتی ہو بلکہ یہ یقین رکھتی ہو کہ وہ اسے جنت تک لے جائے گا اپنے نام کی طرح۔ ایسی لڑکی اس سے محبت کرتی ہوگی یا نفرت؟ کیا ایسی لڑکی بری ہوسکتی ہے۔ برے کردار کی 'کیا اس میں کوئی خامی ہوسکتی ہے؟ یقیناً" نہیں' تو پھر کمی اور خامی تو مجھ میں ہے۔۔۔ ہاں ایسا ہی ہے اور میرا ماضی یہ ثابت بھی کرتا ہے۔ اس نے تھک کر سوچا۔ ایک بار پھر وہ الفاظ آئے تھے اس کی نظروں کے سامنے۔ وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے لگا کہ اب بھی اس کی توبہ قبول نہیں ہوئی ہے اللہ کی بارگاہ میں۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ غصے میں آپی کے فلیٹ سے نکل آیا تھا اور باقی دن اس نے ہوٹل میں گزارے۔ آپی نے بہت کالز کیں اسے 'لیکن اس نے ایک بھی ریسیو نہیں کی۔ وہ اب آپی سے بھی بات نہیں کرے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں بند اس نے سارا وقت یہی سوچنے میں صرف کیا کہ اسے اب آگے کیا کرنا ہے اور پھر کیمبرج واپس آنے کے کئی مہینوں بعد اس کی سمجھ میں آہی گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کچھ ایسا جو نہ صرف اس کو دنیا میں بدنام کرے گا بلکہ اس کی آخرت بھی برباد ہوگی۔

ایک رات وہ اپنی بلڈنگ کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے نکلا ہی تھا جب اسے اپنے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہنے والی پاکستانی فیملی نظر آئی۔ وہ بہت مذہبی اور کٹر مسلمان تھے۔ عبدل ہادی صاحب چیخ چیخ کر اپنی بیٹی کو کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کی بیٹی زاروقطار رو رہی تھی اور اس کا ہاتھ ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ اس لڑکے کے گلے میں لٹکی صلیب اس کے مذہب کا اعلان کررہی تھی۔ "مرکیوں نہیں گئی' تو یہ سب کرنے سے پہلے۔۔۔ ایک کرسچن سے شادی رچالی تو نے۔۔۔ جانتی ہے کہ مسلمان عورت کا ایک کرسچن مرد سے نکاح جائز ہی نہیں ہے۔۔۔ حرام رشتہ ہے یہ۔ پھر بھی تو نے ہمیں رسوا کروادیا زمانے بھر میں اور اپنی آخرت بھی برباد کرلی۔ دفعہ ہوجاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ آئندہ شکل مت دکھانا مجھے اپنی۔۔۔" وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے لیکن سالار کے ذہن میں چند الفاظ گونج رہے تھے۔

مسلمان عورت۔۔۔ کرسچن مرد۔۔۔ شادی۔۔۔

گناہ۔۔۔ ناجائز۔۔۔ آخرت برباد۔۔۔ رسوا۔۔۔ حرام۔۔۔ اور پھر اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔۔۔ کیا اچھوتا آئیڈیا ہے۔۔۔ یونیک۔۔۔ ہاں مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔۔۔ وہ مسکراتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مذہب کو اس نے کبھی بھی توجہ کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ وہ بس نام کا مسلمان تھا کیونکہ وہ ایک مسلم گھر میں پیدا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کے ماں باپ پانچ وقت کے نمازی تھے۔۔۔ تہجد گزار۔۔۔ پھر وہ کیوں ایسا تھا؟ صارم اور شازمین نے بہت کوشش کی کہ وہ مذہب میں دلچسپی لے۔۔۔ نماز قائم کرے۔۔۔ ایک اچھا مسلمان

بنے مگر جو خود پسندی اس کے اندر تھی اس نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے پر بہت زیادہ سختی بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جس مختلف انداز میں وہ سوچتا تھا اس سے انہیں یہ ڈر تھا کہ وہ باغی نہ بن جائے۔ پھر اس کی بیماری کی وجہ سے بھی وہ نرمی برتتے تھے اس کے ٹھیک ہونے کے بعد بھی۔ اس لیے کبھی نماز، قرآن پڑھنے اور اسلامی احکامات کے جاننے پر بہت زیادہ زور نہیں دیا انہوں نے اس کی مثال چراغ تلے اندھیرے کی سی تھی۔

سالار نے عیسائی ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہی وہ طریقہ تھا جس سے وہ اپنے خاندان والوں سے بدلہ لے سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ عیسائی بنے گا۔ پھر اس لڑکی سے شادی کرے گا وہ کسی کو اپنے مذہب کی تبدیلی کا نہیں بتائے گا۔ عیسائی ہوتے ہی اس لڑکی کا اس کے ساتھ نکاح باطل ہو جائے گا لیکن یہ بات اس لڑکی سمیت کوئی نہیں جانتا ہوگا اور پھر کچھ عرصہ جب وہ اس لڑکی کے ساتھ گزارے گا تو اسے اور اپنے باپ دادا کو حقیقت بتائے گا۔ کیا تاثرات ہوں گے ان کے چہروں پر۔ یہ سوچ ہی اسے مزہ دے گئی۔

کیسے اس لڑکی کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہوگی۔ رسوا، بدنام لڑکی، ایک ایسی لڑکی جو عیسائی کے ساتھ رہتی رہی شوہر سمجھ کر۔ سب کچھ چھن جائے گا اس کا گھر۔ عزت۔ اور سب سے بڑھ کر ایمان۔ پھر اسے اپنی اوقات سمجھ آئے گی۔ اور پاپا اور بابا دونوں حیران ہوں گے کہ میں ایسا بھی کر سکتا ہوں۔ پھر انہیں پتا چلے گا کہ کسی کی مرضی کے خلاف فیصلہ کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

سالار حسین نے ہر ایک کے انجام کے بارے میں سوچا تھا۔ سوائے اپنے انجام کے۔

وہ لندن آیا ہوا تھا۔ فادر جوزف سے سارے معاملات طے کرلیے تھے اس نے۔ انہوں نے اسے ابھی ایک کتاب دی تھی پڑھنے کے لیے۔ جس کا عنوان تھا۔ آر ریلیجن آف پیس؟ وائے کرسچن ازاینڈ اسلام ازناٹ کتاب کا عنوان پڑھ کے اسے تھوڑا عجیب سا لگا۔ ابھی تک اس نے عیسائی۔ ہونے کے بارے میں سوچا تھا۔ اسلام کے نہ ہونے کے بارے میں اس نے اب تک غور نہیں کیا تھا۔ اسے بے چینی ہوئی۔

اس کا کوئی خاص ارادہ تو نہیں تھا یہ کتاب پڑھنے کا، کیونکہ وہ تو صرف بدلے کے لیے مذہب تبدیل کر رہا تھا، ورنہ اسلام سے اس کی کیا دشمنی تھی جو وہ یہ کتاب پڑھتا؟ مگر پھر بھی اس نے خاموشی سے کتاب لے لی تھی۔

کتاب ہاتھ میں لیتے ہی اس کا اضطراب اور بڑھا تھا۔ وہ کتاب بہت بھاری تھی۔ یا شاید اس کا عنوان۔ Islam Isn't اس کے ہاتھوں میں نامحسوس ہونے والی لرزش تھی۔ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟ ضمیر نے اسے جھنجوڑنا چاہا۔ لیکن انتقام بھی تو ضروری ہے۔ نفس نے اپنا وار کر ہی دیا۔

جب وہ چرچ سے باہر نکلا تو وہ اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے سامنے آتی گاڑی نظر نہیں آئی اور اگلے لمحے وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹکرا کے زمین پر گرا۔ گاڑی کی رفتار آہستہ تھی اس لیے اسے کوئی شدید چوٹ نہیں آئی تھی۔

"اوہ! مجھے معاف کر دیجیے پلیز۔ آپ اچانک سامنے آگئے اور میں بریک نہیں لگا سکا۔" گاڑی کا ڈرائیور باہر اترا اور سالار کو اٹھنے میں مدد کرنے لگا۔

"آیئے۔ میں آپ کو اسپتال لے جاؤں ڈریسنگ کے لیے۔"

"نہیں۔ شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں۔" وہ غصے اور تلخی سے کہنا چاہتا تھا، پر نہ جانے مقابل کے چہرے پر ایسا کیا تھا کہ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"میں شرمندہ ہوں اور اب اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے ہی آپ کو اسپتال لے جانا چاہ رہا ہوں۔" اس نے اصرار کیا تھا۔

وہ تیس پینتیس سال کا ایک عام سے نقوش والا مرد تھا لیکن پھر بھی کچھ ایسا تھا اس میں جو اسے خاص بناتا

تھا۔۔۔ روشن پیشانی۔۔۔ نور۔۔۔ ہاں اس کی پیشانی نورانی تھی۔ چہرے پر نور ہی نور تھا اس کے۔ سیاہ داڑھی اس کو مزید باوقار بنا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں سالار اس کو منع نہیں کر پایا۔ کوئی طاقت تھی جو اسے انکار کرنے سے روک رہی تھی۔ وہ گاڑی کی اگلی نشست کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اگر اس کی ذہنی کیفیت نارمل ہوتی تو وہ اس شخص کو کھری کھری سنا کر کب کا جا چکا ہوتا۔۔۔ مگر۔۔۔؟

"میرا نام عالیان ہے' میں مصر سے یہاں روزگار کی تلاش میں آیا ہوں اور آپ؟"

"سالار حسین' پاکستان سے۔۔۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ اس نے اب غور کیا تھا' اس کی عربی لہجے میں بولی جانے والی انگلش پر۔

"یہ تمہاری کورس بک ہے؟" اس نے سالار کے ہاتھ میں موجود کتاب کے عنوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔" وہ ہاں کہنا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس نے نفی کر دی' عالیان کے خیال کی۔

"پھر کیا تمہیں دلچسپی ہے دیگر مذاہب کا اسلام سے موازنہ کرنے میں؟"

"نہیں ایسا بھی نہیں۔" ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انکار کر گیا۔

"تو پھر؟" اب کی بار اس نے الجھن اور حیرانی سے پوچھا تھا۔

"میں اس لیے پڑھ رہا ہوں کیونکہ میں اس مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے وضاحت کی۔ کون سی طاقت اسے سچ بولنے پر مجبور کر رہی ہے؟ حالانکہ جھوٹ بولنا اس کے لیے کبھی بھی مشکل نہیں رہا تھا۔

"لیکن کیوں؟ کوئی خاص وجہ۔۔۔" عالیان کے چہرے پر الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیونکہ۔۔۔ کیونکہ میں۔۔۔ میں کرسچن بننا چاہتا ہوں۔" اب کی بار اس نے اٹک اٹک کر صاف صاف بتا ہی دیا۔

وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ اس شخص کو یہ سب کیوں بتا رہا تھا؟ کیوں وہ بدتمیزی سے اسے اپنے کام سے کام رکھنے کا نہیں کہہ سکا؟ کیسا رعب تھا اس کے چہرے پر جو اسے اس شخص سے کوئی بھی غلط بات کہنے سے روک رہا تھا؟ وہ اپنے دل کی بہت کم سنتا تھا۔ ہمیشہ دماغ کی بات ہی مانی۔۔۔ مگر آج دل نے کہا کہ یہ شخص کچھ مختلف ہے۔ تم اس سے جھوٹ نہیں بول سکو گے۔

اس کی بات سن کر عالیان کا پاؤں بے ساختہ بریک پر پڑا تھا۔ وہ حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا' جبکہ وہ ونڈ اسکرین کے اس پار نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

ڈریسنگ کے بعد عالیان اسے ہائیڈ پارک میں لے گیا تھا۔ یہ پارک اپنے اسپیکر کارنر کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ اس جگہ جو بھی جب بھی چاہے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے۔ وہ اسے پارک میں بنی مصنوعی جھیل Serpentine lake کے کنارے بنے ایک بینچ کے قریب لے آیا۔ پارک کا یہ حصہ اس وقت خاصا سنسان اور پرسکون تھا۔

"بیٹھو۔۔۔" اس نے سالار کو بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا' پھر خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"مجھے چہرہ شناس ہونے کا دعوا تو نہیں مگر پھر بھی کچھ کچھ اندازہ تو لگا ہی لیتا ہوں لوگوں کی کیفیات کا' ان کے چہروں سے اور تمہارے چہرے پر اضطراب اور بے چینی میں صاف صاف دیکھ سکتا ہوں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہارے ذاتی معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ مجھے اس وقت تم میں دس سال پہلے والا عالیان نظر آ رہا ہے۔ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوا۔" سالار اب چہرہ اس کی جانب کر کے اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا لیکن عالیان کی نظریں جھیل پر تھیں اور اس کے چہرے پر ماضی کی پرچھائی تھی۔ اس کا لہجہ اتنا دھیما اور میٹھا تھا کہ وہ کھو گیا تھا' اس کی آواز کے سحر میں۔

"مجھے بھی کسی نے جہنم کی آگ کا ایندھن بننے سے بچایا تھا اور جب میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو جانتے ہو اس نے کیا کہا تھا؟" عالیان نے چہرہ اس کی جانب موڑا۔ "اس نے کہا تھا کہ میرا یہ قرض ہے تم پر اور یہ قرض تم اس وقت اتار دینا جب تمہیں اپنے جیسا کوئی شخص ملے' بدی کی جانب سفر کرتا ہوا تو اسے صحیح راستہ دکھا دینا۔" عالیان مسکرایا۔ "اس لیے

میرے دوست کیا تم میرا یہ قرض اتارنے میں میری مدد کرو گے؟"

اور پھر سالار اس کو سب کچھ بتاتا چلا گیا تھا۔ اپنے بچپن کی باتیں۔۔۔ کہ اس کے والدین نے کبھی اس کی بات نہیں ٹالی اور اب۔۔۔ زبردستی نکاح کے بارے میں۔۔۔ اس کا غصہ۔۔۔ اور اب انتقام۔۔۔

"تو تم صرف اپنی فیملی اور اس لڑکی سے انتقام کے لیے مذہب تبدیل کرنا چاہتے ہو۔" اس کی ساری بات عالیان نے خاموشی سے سنی تھی۔ بغیر ٹوکے۔ آخر میں اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ "انتقام بھی ایک عجیب شے ہے' اچھے بھلے انسان کو جنونی بنا دیتا ہے۔ حالانکہ تم واقعی بہت ذہین اور انٹیلی جنٹ لگتے ہو۔ میرا مطلب ہے جو اچھوتا منصوبہ تمہارے ذہن میں آیا ہے وہ کسی ایوریج ذہن میں آ نہیں سکتا۔ نہیں' نہیں میں طنز نہیں کر رہا' معافی چاہتا ہوں' تمہیں اگر یہ بات بری لگی ہے تو۔۔۔ ویسے ایک بات بتاؤ گے کہ یہ انتقام تم مذہب تبدیل کیے بغیر بھی تو لے سکتے تھے؟ مطلب کہ تم اصل میں کرسچن نہ بنتے اور شادی کر لیتے' یوں ہی اور پھر شادی کے بعد اپنی بیوی اور گھر والوں کو یہ بتاتے کہ تم کرسچن ہو تو کون جانتا کہ تم سچ بول رہے ہو یا جھوٹ؟ اپنے آپ کو کرسچن ظاہر کرنا کوئی مشکل نہیں' صرف گلے میں صلیب لٹکانی پڑتی اور ایک دو کتابیں رٹنا ہوتیں جو تمہارے لیے بالکل بھی مشکل نہیں تھا؟ ہے نا؟ پھر اتنی لمبی چوڑی پلاننگ کیوں؟"

"پتا نہیں۔" کافی دیر غور کرنے کے بعد وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"اس لیے کہ تم واقعی اس لڑکی کا ایمان تباہ کرنا چاہتے تھے۔ اپنا مذہب تبدیل تم اس لیے کر رہے تھے تاکہ تمہیں یقین ہو کہ وہ واقعی تباہ ہو گئی ہے لیکن شاید تم اسلام کی وسعتوں اور احکامات میں گنجائش کے بارے میں نہیں جانتے۔ اس سارے قصے میں تباہ صرف تم ہو گے۔ تمہارا ایمان جائے گا' اس لڑکی کی عزت برباد ہو گی لیکن ایمان قائم رہے گا۔ کیونکہ وہ

لاعلمی میں رہے گی' ایک کرسچن کے ساتھ۔۔۔ جان بوجھ کر نہیں۔ یعنی کہ وہ انجان تھی کہ اس کا شوہر جو کہ نہیں رہا' مذہب کی تبدیلی کے بعد۔۔۔ اسے انجان اور لاعلم رکھنے والے تم ہو گے۔۔۔ سو یہ گناہ بھی تمہارے حصے میں آئے گا۔۔۔ اس لڑکی کے نہیں۔" عالیان نے سہولت سے اسے آئینہ دکھایا۔

ہاں وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ وہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔ بچپن میں اسے مما نے بھی بتایا تھا کہ انجانے اور لاعلمی میں کیے جانے والے غلط کام کا گناہ نہیں ہوتا اور اگر گناہ ہے بھی تو وہ بہت غفور اور رحیم ہے۔ معافی دے دیتا ہے۔ کیا فائدہ ہوا اتنے مہینے دماغ کھپانے کا؟ اس نے تھک کے سوچا تھا۔

بہت دیر تک وہ اور عالیان وہاں بیٹھے رہے تھے۔ وہ اس کے ذہن کی بہت سی گرہیں کھول رہا تھا۔ الجھنیں دور ہو رہی تھیں۔ رات گئے جب وہ واپس آیا تو اس کا اضطراب قدرے کم ہو چکا تھا اور اب سونے سے پہلے وہ عالیان کی باتوں کو سوچ رہا تھا۔ اس کے ماں باپ کی دعائیں قبول ہو چکی تھیں' بلائیں ٹل گئی تھیں اس کے سر سے۔۔۔ دعاؤں کا حصار مزید مضبوط ہو گیا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ عالیان سے ملنے جائے گا اسلامک سینٹر' جہاں وہ شام کو رضاکارانہ طور پر پڑھاتا تھا۔

زندگی میں شاید کبھی ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے۔ جو کہ انسان کی زندگی کو مکمل تبدیل کر دیتا ہے۔ یا تو اسے شیطان سے انسان بنا دیتا ہے یا پھر انسان سے

شیطان۔۔۔ وہ ایک لمحہ ہی پوری ہستی کو بدل ڈالتا ہے اور کئی بار صدیاں لگ جاتی ہیں تبدیلی میں۔۔۔ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ وہ ایک لمحہ عطا کرتا ہے۔۔۔ آدمی سے دوبارہ اشرف المخلوقات بننے کے لیے اور سالار حسین بھی ایسے ہی خوش قسمت لوگوں کی فہرست میں تھا۔

"کیا تم مجھے اسلامی احکامات کے بارے میں تعلیم دے سکتے ہو؟ میرے ماں باپ نے بہت کوشش کی کہ میں ایک باعمل مسلمان بنوں لیکن میرے دل پر جو اثر تمہاری باتوں سے ہوا۔۔۔ وہ کبھی ان کی باتوں سے نہیں ہوا۔۔۔ پلیز کیا تم میری مدد کرسکتے ہو؟ میں راہ سے بھٹکا ہوا ہوں۔۔۔ مجھے میری منزل کا پتا بتا سکتے ہو؟" وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔ بہت سوچ سوچ کر۔ وہ بہت پریشان اور مضطرب دکھائی دے رہا تھا لیکن آج عالیان کو ایک اور چیز اس کے چہرے پر نظر آئی تھی جو اس دن پارک میں نہیں تھی۔۔۔ وہ تھا ڈر۔۔۔ خوف۔۔۔ اللہ کا خوف۔۔۔

اور پھر عالیان نے اسے اسلام سے متعلق بنیادی اور چھوٹی سے چھوٹی اور ضروری ساری باتیں بتائیں۔۔۔ بہت سی کتابیں بھی دیں اور سب سے بڑھ کر قرآن کا ترجمہ دیا پڑھنے اور سمجھنے کے لیے۔۔۔ اور اب وہ ترجمہ اور تفسیر پڑھ رہا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ ہر مشکل کا حل اس کتاب میں موجود ہے۔۔۔ اسے سکون کی تلاش تھی۔۔۔ سکون قرآن کے مطابق اللہ کے ذکر میں ہے۔

اس کی زندگی یک دم بدل گئی تھی' اس کی ترجیحات بدل گئی تھیں۔۔۔ وہ پہلے بہت سوشل تھا۔ یونی کے بعد زیادہ تر وقت دوستوں کے ساتھ کلبس یا تھیٹرز میں گزارتا تھا۔۔۔ لیکن اب وہ گھر آکر زیادہ سے زیادہ اسلامی احکامات کے بارے میں جاننے اور عمل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی ضد اور خود پسندی نے اس سے تمام رشتے دور کردیے تھے اور اسے انسان سے شیطان بنادیا تھا' اس لیے اب وہ اپنی تمام بری عادتوں کو ترک کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اللہ نے کرم کردیا تھا اس کی ذات پر۔۔۔ اس کا لہجہ خود بخود دھیما ہوتا چلا گیا۔ اس کی شخصیت میں ایک ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ہینڈسم تو وہ پہلے بھی تھا مگر اب ایک وقار جھلکتا تھا اس کی ذات میں۔۔۔

وہ اکثر سوچتا تھا کہ اگر اس دن عالیان اسے نہ ملتا یا وہ اس کے ساتھ جانے سے انکار کردیتا تو کیا ہوتا اس کے ساتھ؟ کیسے تباہ ہوجاتا وہ؟ ذلت اور رسوائی کی کس دلدل میں پھنس جاتا وہ؟ اس لڑکی کا تو کچھ نہ جاتا' البتہ وہ خود برباد ہوجاتا۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ دوسروں کے منہ پر کالک ملنے سے اپنے ہاتھ بھی سیاہ ہوجاتے ہیں۔

اور پھر پورے دو سال کے بعد وہ پاکستان گیا تھا سب سے معافی مانگنے۔۔۔ اس پر بھی عالیان نے ہی مجبور کیا تھا اسے' ورنہ اس میں تو ان سب کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

"تم نے اپنے والدین کا دل دکھایا ہے۔ تم اللہ سے بخشش کیسے طلب کرسکتے ہو' جبکہ تمہارے والدین دکھی ہیں؟ کیسے تمہیں سکون ملے گا؟ بولو؟ صرف نماز اور قرآن میں ہی اللہ نے سکون نہیں رکھا' بلکہ اپنے تمام رشتوں اور ذمہ داریوں کو نبھا کر بھی انسان کا دل مطمئن ہوتا ہے۔ اللہ نے ہمیں ہر چیز میں عدل کا حکم دیا ہے۔ اللہ کے حقوق اور اللہ کی مخلوق کے حقوق۔۔۔ سب میں عدل۔۔۔ یہ نہیں کہا کہ تم بس ان دونوں میں سے کوئی ایک کام کرلو۔۔۔ تمہیں سکون مل جائے گا۔"

بابا سے کتنی بدتمیزی کرچکا تھا وہ۔۔۔ کئی بار وہ لندن آئے تھے اس سے ملنے' لیکن وہ نہیں ملا۔ کتنا دکھ دیا تھا اس نے انہیں' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کتنی شدید محبت کرتے تھے وہ سب اس سے۔ اس کی ہر فرمائش پوری کی گئی تھی اور بدلے میں اس نے کیا کیا؟ صرف زندگی کا ایک فیصلہ تو انہوں نے اپنی مرضی سے کرنا چاہا وہ بھی اس سے برداشت نہیں ہوسکا؟

"السلام علیکم بابا!" رات کے اس پہر سالار کو اپنے

سامنے دیکھ کر صارم حسین واقعی سکتے میں آگئے تھے۔
"سالار۔۔۔ تم! اس وقت؟ اپنے آنے کا بتایا بھی نہیں۔" پاپا نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا تھا' جبکہ وہ تو سوچ کے آیا تھا کہ وہ سب اسے دھتکار دیں گے۔۔۔ لیکن واقعی ماں باپ کے دلوں میں اولاد کے لیے بہت وسعت ہوتی ہے۔ پاپا کے لہجے اور انداز میں اسے خوشی' حیرت اور بے پناہ محبت سب ہی کچھ محسوس ہوا۔

"پاپا پلیز! مجھے معاف کردیں' میں نے بہت دل دکھایا آپ کا۔۔۔ میں بہت برا بیٹا ہوں آپ کا لیکن اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔" وہ بھیگے لہجے میں پاپا کے گلے لگ کے کہتا چلا گیا۔
"میں جانتا تھا تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا ایک دن۔۔۔ لیکن یار یہ کیا کہ تم نے ہم سے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ مجھے اور کوئی شکوہ نہیں' تم سے بس ایک اس بات پہ گلہ تھا لیکن آج وہ بھی ختم ہوگیا۔" پاپا نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔ "تم تو میرا سہارا ہو' میرا رائٹ ہینڈ کیسے تم الگ ہوسکتے ہو ہم سے بیٹا!"
"سالار۔۔۔" اسے دیکھ کر شازمین کی آنکھیں برس پڑی تھیں۔ "بیٹا کہاں تھے؟ کتنا ترسایا تم نے ہمیں اپنی شکل دکھانے کے لیے۔۔۔ اور یہ تم اتنے کمزور کیوں ہوگئے ہو؟ کیا بالکل دھیان نہیں رکھا اپنا وہاں؟ کتنا تنگ کیا ہے اب تک ہمیں؟"
"مما ایسا کچھ نہیں ہے' ٹھیک ہوں میں اور اب یہاں آگیا ہوں نا تو آپ کے ہاتھ کے مزے مزے کے کھانے کھا کے مزید ٹھیک ہوجاؤں گا۔" اس نے ماں کو اپنے بازوؤں کے مضبوط حصار میں لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
"اب تو اس طرح غائب نہیں ہوگے نا بیٹا؟" مما یقین چاہتی تھیں۔
"نہیں مما! کبھی بھی نہیں اور پلیز مجھے معاف کردیں' میں نے آپ کا بہت دل دکھایا بہت رلایا آپ کو۔"
"اور مجھ سے معافی نہیں مانگو گے؟" اسے بابا کی شکوہ کرتی آواز آئی۔ "بابا۔" وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا تھا اور ان کے کھلے ہوئے بازوؤں میں سما گیا تھا۔ "پلیز مجھے معاف کردیں۔ سب سے زیادہ دکھ میں نے آپ کو دیا۔ میں ملا تک نہیں آپ سے۔۔۔ یہ پچھتاوا مجھے ساری زندگی رہے گا بابا آئی ایم رئیلی سوری۔۔۔ بس ایک بار مجھے معاف کردیں۔"
"اوئے شہزادے! میں تجھ سے ناراض ہی کب تھا جو تو معافی مانگ رہا ہے' ہاں بس تو ملا تک نہیں مجھ سے' اس بات نے مجھے واقعی دکھ پہنچایا تھا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی کرتا ہے بوڑھے دادا کے ساتھ۔۔۔"
صارم اور شازمین مسکراتی نظروں سے ان دادا پوتے کی یہ جذباتی ملاقات دیکھ رہے تھے۔ انہیں سالار میں بہت واضح تبدیلی نظر آئی تھی۔ کتنا بدل گیا تھا وہ ان دو سالوں میں۔۔۔ اس کی شخصیت مزید شان دار ہونے کے ساتھ ساتھ باوقار ہوگئی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی اسے اپنی کسی بھی غلط حرکت پر شرمندہ یا نادم ہوتے نہیں دیکھا تھا مگر اب وہ شرمندہ بھی تھا اور یہی نہیں اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی بھی طلب کررہا تھا۔ نہ جانے اتنی تبدیلی کہاں سے آئی اس میں؟
لیکن ابھی ایک اور پہاڑ سر کرنا باقی تھا۔ آپی کو منانے کا۔۔۔ وہ واپس پاکستان آچکا تھا اور بابا کا بزنس میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ روم فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکال کر اس نے سوتے ہوئے آپی کے اوپر الٹ دی تھی۔
"کیا بدتمیزی۔۔۔" اگلے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ "تم۔۔۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں میرے روم میں آنے کی؟ بلکہ اس گھر میں آنے کی؟ دفعہ ہوجاؤ یہاں سے۔" آپی غصے سے بیڈ سے اٹھا اور اسے جانے کا حکم دیا۔
"گھر میں' میں اس لیے آیا ہوں کہ یہ میرا بھی گھر ہے اور تمہارے کمرے سے نہیں جاؤں گا میں' جو کرنا ہے کرلو۔" سالار ریلیکس ہو کر صوفے پر بیٹھ کر اس کا روٹھا روٹھا ناراض چہرہ دیکھتا رہا۔
"اب کیوں آئے ہو میرے پاس؟ مزید کوئی بکواس

کرنا باقی رہ گئی ہے کیا؟" اس نے شرمندہ کرنا چاہا لیکن مقابل بھی پھر سالار تھا۔
"نہیں یار! میں وہ گفٹ لینے آیا ہوں جو تم نے میری طرف سے میری بیوی کو دینا تھا۔" اس نے آبی کو ڈھیٹ بن کر تپایا۔
"بکواس بند کرو اور نام بھی نہ لینا اس کا۔ بہت ہی فضول شخص ہو تم۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا سو گیٹ آؤٹ ناؤ۔" آبی کا غصہ کسی طرح بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
"نہیں۔۔۔ ایسے مت کہو میرے ہم دم۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ میں تم بن کیا کروں گا۔۔۔ مت جانے کو کہو مجھے' ورنہ میں پہاڑوں کی بلندی اور سمندر کی گہرائی ناپنے نکل جاؤں گا یا پھر جنگلوں کا رخ کر کے وہاں دیوانوں کی طرح آبی۔۔۔ آبی۔۔۔ پکاروں گا۔" سالار نے اداکاری کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے اپنی آواز میں درد پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔
"میں تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہوں جو اس طرح کے ڈائیلاگ بول رہے ہو مجھ سے۔ رشتے میں چچا لگتا ہوں تمہارا' سو ذرا تمیز سے بات کرو۔" اس کی شاندار اداکاری پر دل چاہا تھا منہ چوم لے اس کا لیکن تھوڑا تو غصہ دکھانا حق تھا اس کا۔
"جی چچا جان!" سالار بہت تمیز سے صوفے سے اٹھا اور ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ "میں واقعی شرمندہ ہوں اپنی اس دن والی حرکت اور باتوں پر۔۔۔ پلیز بس کردیں اور کتنی منتیں کروائیں گے آپ چچا جان۔۔۔ بچے کی جان لوگے کیا اب؟"
سالار نے چچا جان پر زور دیتے ہوئے کہا اور آخر میں ایک اور ڈائیلاگ بولا۔۔۔ اور پھر دونوں قہقہے لگاتے ہوئے بغل گیر ہوگئے۔
"کمینے! بہت ہی خبیث ہے تو۔۔۔ ایک تو شکل بھی اتنی اچھی ہے تیری کہ بندہ ناراض بھی نہیں رہ سکتا تجھ سے۔۔۔" آبی نے اس کی کمر پر ایک دھپ لگاتے ہوئے کہا۔
"اچھا جاتا تو وہ گفٹ گیا کہاں اور تھا کیا وہ؟" سالار نے پھر سے پوچھا۔
"خبیث انسان' تجھے یاد نہیں تو جب اپارٹمنٹ سے باہر جا رہا تھا تو اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو ٹھوکر ماری تھی تو نے۔ اس دہشت گردی کی زد میں وہ گفٹس اور میرا معصوم سا موبائل بھی آگیا تھا جو پھر کبھی دوبارہ زندہ نہ ہوسکا۔" آبی نے دنیا جہاں کا دکھ آواز میں سموتے ہوئے کہا۔
"مرمت۔۔۔ دلا دوں گا تجھے اس سے زیادہ اچھا فون۔۔۔" پھر ان کی بے تکی باتیں شروع ہوگئی تھیں اور کمرے سے باہر آتے ان کے قہقہے سازگار ماحول کی نوید دے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو صوفے پر سوتا پایا۔ نہ جانے کب وہ ماضی کو سوچتے سوچتے سو گیا تھا۔ ایک بار پھر وہی الفاظ اس کے ذہن میں آئے تھے۔ یعنی کہ مجھے مہدیہ کی وجہ سے۔۔۔ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔
"سالار آج ایک بات کہنے کو جی چاہ رہا ہے میرا۔ پہلے بھی کئی بار کہنا چاہتا تھا' پر کہہ نہیں پایا۔ جس دن تم نے پارک میں اپنے بارے میں بتایا تھا اس دن بھی میں یہ بات جانتا تھا کہ اللہ نے مجھے تمہارے پاس کیوں بھیجا ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں تمہیں اس لڑکی کی زندگی برباد کرنے سے روکوں۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں اس لڑکی کی زندگی آباد کرنے کے قابل بناؤں۔۔۔ اس لڑکی کی خاطر اللہ نے مجھے تمہاری زندگی میں بھیجا۔۔۔ شاید تم اس کی دعاؤں کا حصہ ہو۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بیوی پر اللہ کا خاص کرم ہے اور ایسی لڑکی کا تمہارے نکاح میں ہونا تمہاری خوش نصیبی ہے۔" جب عالیان اپنے ملک واپس جا رہا تھا تو آخری ملاقات میں عالیان نے اس سے یہ بات کہی تھی' تب تو نہیں پر آج وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔
اس نے فوری طور پر اپنا موبائل اٹھایا اور ایک میسج ٹائپ کر کے عالیان کے نمبر پر سینڈ کرنے لگا۔
"تم نے ٹھیک کہا تھا آخری ملاقات پر کہ اللہ نے میری

بیوی کی وجہ سے ہی مجھے تباہ ہونے سے بچانے کے لیے تمہیں بھیجا۔ میری بیوی کی خواہش ہے کہ اس کا شوہر اسے جنت تک لیڈ کرے اور یہ کام میں دوزخ میں رہ کر تو نہیں کر سکتا تھا۔"

چند لمحوں بعد دوسری طرف سے جواب آگیا تھا۔

"بہت خوب! میں بہت خوش ہوں۔ خوش رہو اور اپنی شادی کے بعد مجھ سے ملنے آنا' میں اس خوش قسمت لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"شادی..." اس نے مسکراتے ہوئے گہری سانس لی تھی۔ ابھی تو ایک اور مرحلہ ہے اسے منانے کا' اس کی تمام بدگمانیاں دور کرنے کا۔ پتا نہیں ہم دونوں کو کس کی نظر لگی ہے... کس کی بددعا ہے کہ ہم دونوں کے بیچ کی یہ دوریاں سمٹ ہی نہیں رہیں... بددعا... یہ واقعی بددعا تو نہیں... ہاں... جولی کی بددعا... اور بھی نہ جانے کتنی لڑکیوں کی...

اسے آج بے ساختہ جولی یاد آئی تھی... آج اتنے سالوں بعد اسے افسوس ہوا اس کی موت کا... شرمندگی ہوئی کہ اس کی گھٹیا باتوں کی وجہ سے اس لڑکی نے خودکشی کی... حالانکہ وہ اس وقت بھی جانتا تھا کہ جولی بری لڑکی نہیں مگر غصے میں اس نے اسے وہ سب کہہ دیا... آہ غصہ... اسی لیے تو حرام کہا گیا ہے کہ غصے کو... اب اسے اپنی ضدی اور نک چڑھی بیوی کو منانے کا کوئی نیک آئیڈیا سوچنا تھا اور یہ کام وہ خالی پیٹ تو نہیں کر سکتا تھا' اس لیے ایک تگڑا ناشتا کرنے کے لیے اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

دیا کو سرپرائز دینے کے چکر میں نمناں اسے بغیر بتائے اس کے گھر آگئی۔ سوچا تھا امتحانوں کی تیاری دونوں ساتھ مل کر کریں گی لیکن اسے یہ خبر نہیں تھی کہ وہاں اس کے لیے دیا نے ایک سرپرائز تیار کر رکھا ہے۔

"سرپرائز..." وہ زور سے کہتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی لیکن یہ کیا... اس کا پورا کمرہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں سے... اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"دیا... کیا ہوا تمہیں اور تمہارے گھر والے کہاں ہیں سب؟" وہ پریشانی سے آگے بڑھی۔ اسے دیکھ کر دیا اس کی طرف بڑھی اور اس کے گلے لگ کر پھر سے رونے لگی۔

"نمناں! میں کیا کروں' میرا دل اس سے نفرت کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔ ہر بار وہ مجھے دکھ دیتا ہے مگر پھر بھی میں خود کو اس سنگ دل شخص سے محبت کرنے سے روک نہیں پاتی۔" وہ اتنی ٹوٹی ہوئی اور بکھری ہوئی تھی کہ دوست کے ملتے ہی وہ بلا سوچے سمجھے بولتی گئی۔

"او کے پلیز... ریلیکس ہو جاؤ اور مجھے بتاؤ تم کس کی بات کر رہی ہو؟ اچھا پہلے اپنا حلیہ درست کرو اور پھر ہم لان میں چلتے ہیں۔ باہر اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے اور تم یہاں اندھیرے میں بیٹھی ہو۔" نمناں نے اسے اٹھایا اور پھر اس کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اسے گھر کے پچھلے حصے والے لان میں رکھے بینچ پر لے گئی۔ موسم واقعی بہت خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

"اچھا... اب مجھے بتاؤ کہ اب کیا کیا ہے تمہارے اس کزن نے؟" نمناں نے یقین کے ساتھ پوچھا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتی گئی۔

"محترمہ! میں اتنی بھی الو نہیں جتنا تم سمجھتی ہو مجھے۔ اس پارسل پر سالار حسین کا نام پڑھتے ہی میں MSH کا مطلب سمجھ گئی تھی اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اس سے شدید محبت کرتی ہو لیکن اس نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہے ماضی میں کہ تم اس سے سخت خفا ہو اور اب وہ تمہیں منانے کے لیے رومینٹک گفٹ کے بجائے مہنگا مگر بورنگ سا لیپ ٹاپ گفٹ کرتا ہے اور اب جو میں نہیں جانتی وہ تم مجھے بتاؤ۔" نمناں نے کچھ اس انداز میں آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا کہ وہ روتے روتے بھی ہنس پڑی تھی۔

"تم نے سب باتوں کا ٹھیک اندازہ لگایا ہے اور جانتی ہو میں کیوں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں' بلکہ شاید عشق..." دیا نے اپنی پیاری سہیلی کو سب کچھ بتانے کا

فیصلہ کر لیا۔

"ہاں۔۔۔ وہ تو ہے، ہی لیکن اس سے محبت کرنے کی وجہ اس کا میرا شوہر ہونا ہے۔ ہمارا چھ سال پہلے نکاح ہو چکا ہے۔" اس نے اطمینان سے بم پھوڑا۔

"کیا۔۔۔ نکاح۔۔۔؟ اور تم نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں بدتمیز۔۔۔" نہال کو پہلے حیرت ہوئی اور پھر صدمہ۔۔۔

"نہ بتانے کی بھی وجہ وہی ہے۔۔۔" اور پھر وہ اسے سب بتاتی چلی گئی نکاح کے بعد سے لے کر جو کچھ اس نے لالہ کو کہا تھا سب کچھ۔۔۔ یہاں تک کہ چند دن پہلے پہنائی انگوٹھی کے بارے میں بھی۔۔۔

"فون پر وہ سب سن کر میں بہت ہرٹ ہوئی تھی، بہت روئی تھی، اتنی بری باتیں کہی تھیں انہوں نے میرے بارے میں کہ میں اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ سنبھلی اور سوچ لیا کہ دوستوں میں سے کسی کو بھی یہ سب نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ میں رسوائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں جان گئی تھی کہ وہ مجھے کبھی بھی اپنی زندگی میں شامل نہیں کرے گا، پھر کیا فائدہ ایک نام نہاد رشتے کا ڈھنڈورا پیٹنے کا۔" دیا بہت دکھ سے بول رہی تھی۔ آج بھی اسے بہت اذیت اور سبکی ہو رہی تھی وہ سب دہرا کر۔

"اس کی پہنائی گئی انگوٹھی میرے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھی۔ میں بے یقین تھی اور اس ساری رات ڈسٹرب رہی تھی۔ مجھے دکھ تھا تو اس بات کا کہ جتنا انہوں نے مجھے ہرٹ کیا تھا میں اس کا آدھا بھی نہ کر سکی۔۔۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ آج بھی۔۔۔ شدید ترین محبت۔۔۔ اور اس محبت کو میں نفرت، لاتعلقی اور بیگانگی کے لبادے میں چھپایا کرتی تھی۔۔۔ سب سے۔۔۔ یہاں تک کہ خود سے بھی۔۔۔ مجھے رضا کے پروپوزل کے بارے میں سالار اور تیزی کی باتوں سے پتا لگا تھا اور۔۔۔ اور تب ہی مجھے سالار کی تھوڑی دیر پہلے کی پریشانی کی وجہ سمجھ آئی تھی۔

وہ اس دن بہت الجھے ہوئے تھے، خاموش، سوچوں میں گم، ورنہ میں نے ہمیشہ انہیں فریش اور ہنستا ہوا ہی دیکھا تھا اور اور شاید مجھے پسند بھی کرتے ہیں۔۔۔ ان کے مطمئن انداز سے تو مجھے یہی لگتا ہے۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہاں۔۔۔ شاید ایسا ہی ہے، مرد اسی وقت مجنوں والی حرکتیں کرتا ہے جب اسے اپنی محبت کے دور جانے کا ڈر ہو۔" نہال کبھی ڈائیلاگ مارنے سے باز نہیں آتی تھی۔

"رضا کے پروپوزل کے بارے میں جاننے کے بعد میرا دل ایک لمحے کے لیے تھم گیا تھا۔ اگر بابا، سالار سے میرا رشتہ ختم کروا دیتے تو۔۔۔ اس لمحے میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایسا نہیں ہوا۔۔۔ میں نے وہیں صوفے پر بیٹھے ہوئے اپنی تیسری انگلی میں پہنی پلاٹینیم رنگ کی طرف دیکھا تھا جو مجھے سالار نے چند منٹ پہلے پہنائی تھی۔ میں اندر سے بہت خوش ہوئی تھی اور مطمئن بھی۔۔۔ لیکن شاید اب بھی میں ان سے ناراض ہوں۔۔۔ خفا ہوں۔۔۔ اور شاید بدگمان بھی۔۔۔ لیکن میں ان سے نفرت نہیں کرتی، کبھی کر ہی نہیں سکی۔۔۔" اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"میں کل شام سے بہت پریشان ہوں، جب سے وہ اس طرح اچانک گھر سے چلے گئے تھے اور ان کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کے کہہ رہے تھے کہ ایک بار پھر سب غلط ہو گیا ہے۔۔۔ میں کچھ نہیں پا رہی کہ آخر اچانک کیا ہوا تھا انہیں؟ کیا میرا رویہ؟ میرا رویہ ان کی باتوں کا ری ایکشن تھا بس۔۔۔ اتنی انا تو مجھ میں بھی ہے۔۔۔ اتنا حق تو مجھے بھی پہنچتا ہے کہ جس شخص نے مجھے چھ سال انتظار کروایا، کیا میں چھ مہینے بھی اسے تنگ نہیں کر سکتی؟ میری خاموشی سے انہیں اب بھی اندازہ نہیں ہوا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ اس دن نانا نے تو کہا تھا کہ وہ مجھ سے معافی مانگنے اور منانے کے لیے مجھے اندر ڈھونڈنے گئے ہیں، پھر کیوں باہر آ کر مجھ پر ایک نگاہ ڈالے بغیر، کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے وہ؟" کچھ کھو دینے کا ڈر تھا اس کے چہرے پر۔

"پلیز۔۔۔ پریشان نہ ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے واقعی سالار بھائی کو کوئی کام یاد آ گیا ہو،

کیونکہ ایک بات تو ہم جانتے ہیں کہ وہ بھی تمہیں چاہتے ہیں بے انتہا۔" نمل نے اسے یاد دلایا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ سوری اپنی پریشانی میں تمہیں کھانے کا تو پوچھنا ہی بھول گئی۔ تم سے سب شیئر کر کے مجھے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگ رہا ہے۔

تھینک یو تم واقعی ایک اچھی اور مخلص دوست ہو۔" وہ اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔

"شکریہ۔ بس کبھی غرور نہیں کیا اور اب محبت کے امتحان کو چھوڑ کر ذرا اگلے ہفتے ہونے والے فائنل امتحانوں کی بھی فکر کر لو۔ کیا فیل ہونے کا ارادہ ہے؟ اپنے ہیرو کی فکر چھوڑو اور پڑھنے کی تیاری کرو۔" نمل نے اسے لتاڑا اور بائی دی وے اس شخص سے وہ موصوف ان کب سے ہو گئے؟" اس نے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

"جس دن انہوں نے مجھے مہدیہ کہہ کے پکارا تھا۔" اس نے بھی آنکھ دباتے ہوئے شرارت سے، مسکراتے ہوئے جواب دیا "سب مجھے دیا ہی کہتے ہیں لیکن اتنے سالوں میں پہلی بار جب سالار نے مجھے میرے مکمل نام سے پکارا تو مجھے بہت اچھا لگا۔ پہلی بار انہوں نے مجھے مخاطب کیا تھا' جب شیزی کو اسپتال سے لائے تھے وہ۔ اتنی پریشانی کے باوجود مجھے اچھا لگا تھا' خود کا مہدیہ پکارے جانا۔ ایک بات بولوں؟ یہ بات میں خود سے بھی چھپاتی ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ جب بھی سالار نے میرا نام لیا تو مجھے ان کے لہجے میں عزت' محبت اور احترام ہی محسوس ہوا اور ان کی نظروں میں بھی میرے لیے ہمیشہ پاکیزگی اور محبت ہی ہوتی ہے' وہ تو غصے میں مجھے بس گھن آتی تھی ان کی نظروں سے۔ شاید لالہ نے ٹھیک کہا تھا کہ آنٹی نے ان دونوں کو عورت کی عزت کرنا ہی سکھایا ہے۔"

"ہوئے۔ ہماری بنو تو گئی کام سے۔ کیا بات ہے آپ کے "ان" جناب کی۔ اس رومینٹک موسم میں رومینس سوجھ رہا ہے آپ کو لیکن افسوس کہ یہ سب آپ فی الحال مجھے ہی سنا سکتی ہیں اپنے "ان" کو نہیں۔" اور وہ دونوں ہنسنے لگی تھیں۔ اپنی باتوں میں وہ اس قدر مگن تھیں کہ وہ کسی کا آنا' تمام باتیں سننا اور پھر خاموشی سے پلٹ کر جانا محسوس نہیں کر سکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ جس خاموشی سے وہاں آیا تھا' اسی خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔ بابا کو ایئرپورٹ پر سی آف کر کے وہ سیدھا پھوپھو کے گھر آیا تھا' کیونکہ اسے لگا یہی بہترین موقع ہے اسے منانے کا۔ پھوپھو اور انکل ایئرپورٹ سے سیدھا کسی دوست کی طرف چلے گئے تھے اور وہ یہاں آ گیا مگر یہاں اس پر ایک نیا انکشاف ہوا۔

تو مہدیہ نے وہ سب کچھ سن لیا تھا جو میں نے اس دن آپی سے کہا تھا اور آپی وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ سب سن چکی ہے۔ اوہ میرے خدا۔ ایک اور گناہ۔ ایک اور بوجھ میرے کندھوں پر۔ کتنا ہرٹ کیا ہے میں نے اس کو' کتنی تکلیف ہوئی ہوگی اسے وہ سب کچھ سن کر۔ مجھے اپنے سامنے دیکھتے ہی پھر سے یاد آگئی ہوں گی اسے میری گھٹیا باتیں۔ اور انگوٹھی پہناتے ہوئے کیا سوچا ہوگا اس نے کہ کتنا بے غیرت ہوں میں اپنے الفاظ سے پھرنے والا۔ اور میری نظروں سے اسے گھن آتی ہے۔ میرے لیے یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ میری اپنی بیوی مجھے کیا سمجھتی ہے۔

پتا نہیں کیسے سمجھایا ہوگا اس نے خود کو۔ میں اس کی جگہ ہوتا تو ضرور اپنے کردار پر الزام لگانے والے کا گریبان ایک بار تو پکڑتا مگر وہ خاموش ہو گئی اور شاید اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ واقعی اس کا ایمان مجھ سے کہیں زیادہ مضبوط تھا اس ٹین ایج میں بھی۔ اسے رشک آیا تھا اپنی بیوی پر۔ میں تو یہ سوچ کر وہاں گیا تھا کہ اتنے سال اس سے کوئی رابطہ نہ کرنے کی معافی مانگ لوں گا اور اسے بتاؤں گا کہ کیوں میں اتنا لاتعلق رہا اس سے۔ لیکن اس ساری گفتگو کی اب میں کیا وضاحت دوں گا اسے؟ کیا وہ قبول کرلے گی؟ ہاں شاید اس نے ابھی کہا نا کہ وہ محبت۔ نہیں عشق کرتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے معاف کر دے وہ مجھے اللہ میری مدد کرنا۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی ابھی لاسٹ پیپر دے کر امتحانی ہال سے نکلی تھی وہ نہناں کو ڈھونڈنے لگی۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی یہ لڑکی اور اب فون بھی نہیں اٹھا رہی۔ اس نے کوفت سے سوچا۔

"مہدیہ!" کسی نے اسے پکارا تھا۔ وہ بغیر مڑے بھی جانتی تھی کہ اس کو پکارنے والا کون ہے۔ یہ یہاں؟ وہ حیران ہوئی۔

"السلام وعلیکم!" اس کے مڑنے پر اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا تھا۔ اف اس کی مسکراہٹ۔۔۔ واقعی اس کا کم کم مسکرانا ہی ٹھیک تھا۔ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نیلی جینز اور آسمانی شرٹ کے ساتھ وائٹ کوٹ میں آنکھوں پر چشمہ لگائے وہ اور بھی چارمنگ لگ رہا تھا۔

"کیا آپ میرے ساتھ کچھ دیر کے لیے آسکتی ہیں؟ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں آپ سے۔۔۔ آئی نو آپ کا آج لاسٹ پیپر تھا اور اب آپ فری ہیں۔" وہ پوری معلومات لے کر آیا تھا۔

"اب کیا بات کرنی ہے؟" اس نے تھوڑا سخت ہوتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے کہ وہ محبت کرتی ہے اس سے لیکن اب بھی ناراض ہے اس سے اور تھوڑا تو خوار کرنا بنتا تھا۔ اس کے انداز پر ایک بار پھر وہ مسکرایا تھا لیکن دیا کو اس کی مسکراہٹ کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

"وہ بات یہاں یونی میں نہیں ہو سکتی' اس لیے میں ساتھ چلنے کا کہہ رہا ہوں۔" اس نے وضاحت کی۔

"اوکے چلیے۔۔۔" کچھ سوچ کر اس نے جانے کا فیصلہ کیا۔ آج وہ صاف صاف بات کرنا چاہتی تھی کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور بہت اچھے لگ رہے تھے۔ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے۔

"پیپرز کیسے ہوئے؟" سالار نے چہرہ اس کی طرف کرکے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ نہ جانے کیوں آج وہ بات بات پر مسکرا رہا تھا۔

"بہت اچھے۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

لوگ مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ اتنا ہینڈسم بندہ اور اس مغرور اور روڈ دیا کے ساتھ؟ کیوں؟ کیسے؟ کیا تعلق ہے ان دونوں کا؟ کچھ کی نظروں میں ستائش اور رشک تھا۔۔۔ کچھ میں حیرت اور بے یقینی۔۔۔ اور کچھ کی نظروں میں حسد۔۔۔

"کیا تمہاری یونی میں سب کپلز کو ایسے ہی دیکھتے ہیں مڑ مڑ کر یا میں ہی کچھ زیادہ ہینڈسم ہوں؟" "اف اس شخص کی خود پسندی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس نے کوفت سے سوچا۔

"نہیں۔۔۔ میں یہ خود پسندی میں نہیں کہہ رہا بلکہ میں ہی یہاں پہلی بار آیا ہوں تو لوگ مجھے ہی دیکھیں گے' تمہیں تو جانتے ہوں گے سب۔" سالار نے اس کے ذہن کو پڑھتے ہوئے سنجیدگی سے وضاحت کی۔۔۔ اس نے سالار کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔۔۔ ایک بار پھر سنجیدہ اداکاری۔۔۔ ایکٹر تو یہ بندہ کمال کا ہے۔ اس نے جل کے سوچا۔

"آپ ہی کی وجہ سے۔۔۔ شاید ان سب کو آپ کی شکل مسٹر بین جیسی لگتی ہو۔" اس نے بھی بہت تیکھے لہجے میں طنز کیا جبکہ اس کی بات پر سالار کا قہقہہ بڑا جاندار تھا' جس پر لوگوں نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔۔۔ اتنی سڑیل لڑکی کے ساتھ چلتے ہوئے ایسا جاندار قہقہہ؟ کیا یہ شخص پاگل ہے؟

گاڑی کے قریب آکر اس نے اس کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا تھا اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ مینرز تو کمال کے ہیں اس بندے میں۔۔۔ دل مسکرایا مگر دماغ نے ڈانٹ دیا اس کی اس سوچ پر۔۔۔

☼ ☼ ☼

اس نے کوئین روڈ پر بنے شاندار ریذیڈینشل اپارٹمنٹس کے احاطے میں گاڑی پارک کی تھی۔۔۔ وہ بہت مطمئن اور خوش دکھائی دے رہا تھا' جبکہ مہدیہ بے یقینی سے سامنے بنی عمارت کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ یہ

شخص کیوں لایا ہے مجھے یہاں؟

"مهدیہ! کیا آپ کو مجھ پر ذرا سا بھی اعتبار نہیں ہے؟" سالار نے اسے زرد چہرہ لیے گم صم بیٹھا دیکھا تو بولا۔ "یقین جانو میں یہاں آپ کو کسی غلط ارادے سے نہیں لایا۔ صرف چند بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں' تاکہ آپ کے دل میں میرے لیے جو غلط فہمی اور ناراضی ہے وہ ختم ہوسکے۔ مجھے لگا کہ کسی ریسٹورنٹ یا کسی بھی پبلک پلیس پر یہ باتیں کرنا مناسب نہیں تو اس لیے یہاں لے آیا۔ اب آپ کا کیا اعتبار لوگوں کے سامنے مجھے گدھا یا مسٹر بین کہہ دیا تو کیا عزت رہ جائے گی میری۔" سنجیدگی سے کہتے کہتے آخر میں وہ شوخ ہوا۔

"ہاں اور اسی لیے آپ مجھے اپنے دوست کے اپارٹمنٹ لے آئے؟ تاکہ... تاکہ مجھے...." اس کی آنکھیں آخر چھلک ہی گئیں۔ ایک بار پھر اس شخص نے مجھے اذیت دی۔ آخر کب تک معاف کروں میں اسے؟

"دوست... کون دوست...." وہ حیران ہوا' یہاں میرا اپنا اپارٹمنٹ ہے۔ ابھی چند دن پہلے خریدا ہے میں نے کیونکہ شادی کے بعد تو ہمیں یہی رہنا ہے' جب تک آپ کی اسٹڈیز ختم نہیں ہوجاتیں۔" سالار نے اتنے عام سے لہجے میں وضاحت کی جیسے کہ وہ تو راضی ہے شادی کے لیے....

"اور آپ کو یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ میں آپ سے شادی کروں گی؟ کس نے کہا آپ سے؟" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"آپ نے...." اس نے دیا کے برعکس پرسکون لہجے میں کہا "لیکن مجھ سے نہیں اپنی دوست سے نمناں سے...." اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اس دن میں نے آپ دونوں کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ پلیز اگر آپ محبت کرتی ہیں تو کچھ تو بھروسا کریں مجھ پر اور آپ یہ بھی جانتی ہیں میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ کو... محبت اگر عزت اور احترام کی مقدس چادر میں نہ لپٹی ہو تو وہ سب کچھ ہو سکتی ہے مگر محبت نہیں۔ اس لیے پلیز میری ریکویسٹ ہے کہ آپ مجھ پر بھروسا کرلیں' میں آپ کو کبھی لیٹ ڈاؤن نہیں کروں گا۔"

نہ جانے اس کے دھیمے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ دیا کا دل چاہا وہ اس کی بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلے اور اس نے دل کی بات ماننے کا فیصلہ کیا۔

وہ اپارٹمنٹ میں آچکے تھے اور اب دیا ستائشی نظروں سے جائزہ لے رہی تھی ہر چیز کا۔ آرٹسٹک انداز میں پورے اپارٹمنٹ کو سجایا گیا تھا۔ ہر حصے کی کلر اسکیم بہت منفرد اور زبردست تھی۔ یعنی کہ بندہ اپنی فیلڈ میں واقعی ماہر ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ وہ واپس لاؤنج میں آئی تو وہ اسے کچن میں نظر آیا۔ کسی ماہر شیف کی طرح کٹنگ بورڈ پر سبزیاں کاٹ رہا تھا۔

"میں کچھ ہیلپ کروں؟" اس نے آفر کی نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں' ویسے بھی آج یہاں آپ مہمان ہو۔" اس نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سہولت سے انکار کیا۔ وہ حیران ہوئی تھی اس کے تیزی سے چلتے ہاتھوں کو دیکھ کر....

"اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔ جناب میں آٹھ سال اکیلا رہا ہوں انگلینڈ میں۔ روز روز ریسٹورنٹ کا کھانا کھا کھا کے تنگ آگیا تھا۔ اس لیے ایک دن فیصلہ کیا خود کچھ پکانے کا۔ اب تو خیر کافی پریکٹس ہوگئی ہے۔ اس لیے جب بھی آپ کا کوکنگ کا موڈ نہ ہو تو یہ شیف تو ہوگا نا۔" اس نے سر کو جھکاتے ہوئے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر مسکراتے لہجے میں کہا اور اس کا ساتھ دیا نے بھی دیا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا یا شاید ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب وہ دونوں کھانے سے فارغ ہوئے تو باہر شام کی سرخی پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اس وقت بالکونی میں ریلنگ کے ساتھ کھڑے تھے۔ سامنے نظر آتے البرٹ پارک کا آنکھوں کو تازگی بخشتا سبزہ' پارک

میں بنی خوب صورت جھیل کا ٹھہرا ہوا شفاف پانی... رنگوں بھرا آسمان... اور ان دونوں کا ساتھ... کتنا مکمل منظر تھا... دونوں ہی خاموش تھے اور وہ انتظار کر رہی تھی کہ وہ بات کا آغاز کرے کیونکہ وہی لایا تھا اسے بات کرنے کا کہہ کر۔

"میں ایک بہت خوش قسمت انسان رہا ہوں، ہمیشہ سے۔" اس نے جیسے سوچتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ماں باپ کا اکلوتا لاڈلا بیٹا، دادا کا چہیتا پوتا، بچپن میں اور پھر بڑے ہو کر بھی میری کوئی بات کبھی رد نہیں کی گئی تھی۔ ہمیشہ ہر فرمائش اور ضد پوری ہوئی تھی۔ میری بیماری کی وجہ سے کبھی میرے والدین نے مجھے مارا یا ڈانٹا نہیں تھا۔ شاید یہ ان کی محبت کی کمزوری تھی یا جو بھی لیکن اس سے میرا بہت نقصان ہوا اور یہ بات مجھے بہت بعد میں جا کر سمجھ میں آئی۔ ان تینوں کے لاڈ پیار نے مجھے ضدی اور بددماغ بنا دیا اور پھر اس لسٹ میں آپی بھی شامل ہو گیا۔

آپی جو مجھ سے صرف تین سال ہی بڑا تھا، جب میں یہ دیکھا کہ مجھے اس سے زیادہ اہمیت مل رہی ہے اور وہ بھی مجھے بے حساب چاہتا ہے تو میں بھی سمجھنے لگا کہ صرف میرا ہی حق ہے ان سب کی محبت پر۔ اس احساس نے مجھے خوش فہمی کیا اور خود پسند اور مغرور بھی بنا دیا۔ کوئی میری ذہانت کی وجہ سے مجھے سراہتا تو کوئی اچھی پرسنالٹی کی وجہ سے..." وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا جبکہ دیا غور سے اس کی باتیں سنتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب آپ ہی بتاؤ ایسے میں جب پاپا نے مجھے زبردستی آپ سے نکاح کرنے پر راضی کیا تو میرا کیا ری ایکشن ہونا چاہیے تھا؟ میں جسے لگتا تھا کہ اس کی کوئی بات نہیں رد کی جا سکتی میرے ساتھ زبردستی؟ میں واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ ایک جنون سوار تھا میرے سر پر اور پھر آہستہ آہستہ یہی جنون بدلے کی آگ میں بدل گیا۔" اب اس کے لہجے میں پچھتاوے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کے خود کو کنٹرول کیا۔

"اس دن آپی کے اپارٹمنٹ میں، میں نے آپ کے بارے میں جو بھی بکواس کی تھی میرا ہرگز ہرگز وہ مطلب نہیں تھا۔ میں واقعی بہت شرمندہ ہوں اس سب کے لیے، پلیز مجھے معاف کر دو۔ اس دن آپ کا دل دکھا کر پھر میں بھی کبھی سکون سے نہیں رہ پایا۔"

اس کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا شرمندگی، پچھتاوا، پشیمانی، دکھ اور اذیت...

"یہ کیسے جانتا ہے کہ مجھے سب پتا ہے؟ اوہ اچھا نہال کو بھی تو بتا دیا تھا میں نے... میں بھی کتنی پاگل ہوں... آخر کیوں دہرائیں میں نے وہ باتیں۔ اب یہ ساری زندگی پچھتاوے لیں رہیں گے۔" سالار نے اب نظریں اس پر جما دیں مگر اب وہ نیچے سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر نمی تھی۔ ہاں اسے دکھ ہوا تھا ان باتوں پر۔ بس وہ یہی چاہتی تھی کہ اسے احساس ہو جائے کہ اس نے کتنا غلط کہا تھا اور آج وہ شرمندہ بھی تھا اور معافی بھی مانگ رہا تھا اس لیے اس شکوے کی اب دل میں گنجائش نہیں رہی تھی۔

"آپ کو مجھ سے ایک شکوہ یہ بھی تھا کہ میں نے کبھی کانٹیکٹ کیوں نہیں کیا۔ پہلے دو سال تک تو غصے اور ضد میں اور پھر باقی کے چار سال میں خود کو آپ کے قابل بناتا رہا، بس اسی لیے۔" سالار نے بہت عام سے لہجے میں وضاحت کی تھی اور اس کی اس بات پر دیا نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ کہنا کیا چاہ رہا ہے؟ میرے قابل؟ مجھے تو لگا تھا وہ مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتا... "پھر امریکہ سے انگلینڈ جانے کے کئی مہینوں بعد مجھے احساس ہونا شروع ہوا کہ میں واقعی آپ کے قابل نہیں۔ مجھے اللہ کی طرف سے آپ پر کیے گئے خاص کرم کے بارے میں پتا لگا تھا اور میرا غرور وہیں خاک ہو گیا... میں... کیا تھا میں؟ کیا تھی میری حیثیت آپ کے سامنے کچھ بھی تو نہیں... بالکل زیرو۔" سالار کی یہ بے سروپا باتیں اس کے سر پر سے گزر رہی تھیں۔ خاص کرم؟ کون سا کرم؟

"ان دنوں میں عالیان نے میری بہت مدد کی۔ میری رہنمائی کی۔ وہ کسی دعا کی طرح میری زندگی میں آیا تھا

اور میری زندگی کے کینوس پر سے انا، ضد اور خود پسندی کو مٹا کر احساس اور انکساری کے رنگ بھر دیے۔ اسی نے مجھے ہمارے رشتے کی اصل پہچان کرائی تھی۔ یہ بتایا تھا کہ تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ عزت، محبت، وفا اور قربانی سے۔۔۔ وہ اکثر مجھے کہا کرتا تھا کہ حلال اور حرام رشتے کے فرق کا شاید تمہیں ابھی اندازہ نہیں۔ جس دن یہ فرق تمہیں پتا چلے گا اس دن کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی تم اپنی بیوی کو خود سے دور نہیں رکھو گے۔ وہ کہتا تھا کہ تمہیں سکون کی تلاش ہے اور اللہ نے مرض سے پہلے دوا بنائی ہے۔ تمہیں نکاح کے بعد ہی ڈپریشن کا مرض ہوا، جب تم نے حقیقت سے انکار کیا۔ اس نے تمہارے مرض کی دوا، تمہارا سکون، تمہاری بیوی میں رکھا ہے۔ یہ سکون کسی حرام رشتے سے حاصل ہو نہیں سکتا۔ ایسا اس رب کا ارادہ ہے اور واقعی آپ سے ملنے اور دیکھنے کے بعد برسوں سے جو بے چینی اور بے سکونی تھی میری ذات میں وہ ختم تو نہیں، ہاں کم ضرور ہو گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا ساتھ میرے اندر کی بے سکونی کو مکمل ختم کر دے گا۔" وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں بول رہا تھا، جبکہ اس کی باتوں کا مطلب سمجھ کر دیا کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔ اس نے یہ سب باتیں کہاں سے سیکھی تھیں؟ اتنی اچھی سوچ۔

"یہ تو مجھے ابھی چند دنوں پہلے پتا چلا کہ مجھے جہنم کی آگ سے بچانے والی آپ ہیں۔ آپ کی خواہش پر اللہ نے مجھے تباہی اور بربادی کے پاتال میں اترنے سے بچالیا۔ آپ کی محبت میرے لیے ابر رحمت بن گئی۔ آپ چاہتی تھیں کہ میں آپ کو جنت تک لیڈ کروں اور اللہ نے آپ کی اس دعا کے صدقے میں مجھے ہدایت دے دی۔ لیکن شاید آپ کو خود بھی اس بات کا احساس نہیں کہ جو الفاظ آپ نے رجسٹر پر لکھے تھے اللہ نے ان کی وجہ سے کسی کو رہنمائی عطا کر دی۔"

وہ ابھی اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ اسے بتا سکے۔ وہ ایسا کیا کرنے والا تھا کہ جس سے جہنم کی آگ اس پر واجب ہو جاتی۔ جب اللہ نے اس کا پردہ رکھ ہی لیا ہے تو پھر کیا فائدہ اس لڑکی کو مزید دکھ دینے کا۔

دوسری جانب وہ یہ سوچنے میں مصروف تھی کہ وہ رجسٹر پر لکھے نام اور وہ تحریر پڑھ چکا ہے۔ شاید اس دن جب وہ اچانک چلا گیا تھا۔ تب ہی تو اپنا رجسٹر اسے کارپٹ پر الٹا گرا ملا تھا لیکن اسے ان لفظوں میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس پر ایسا ردعمل دیا جا سکے۔ پھر؟ وہ اب صرف الجھن کا شکار ہو رہی تھی اس کی باتوں سے۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں، مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس رجسٹر پر ایسا بھی کیا لکھا تو جو آپ اتنے شاک میں آ گئے؟ صرف ہمارے نام اور وہ لیڈ ٹو جنت بس یہی تو تھا اور یہ جملہ میں نے یوں ہی آپ کے نام کے مطلب کی وجہ سے لکھا، ورنہ اور کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔" وہ واقعی الجھی ہوئی تھی۔

"کوئی بھی کام اللہ یوں ہی بلا مطلب و مقصد کے نہیں کرواتا۔ اس نے آپ سے وہ جملہ لکھوایا، تاکہ مجھے اپنی اوقات اور آپ کی حیثیت و مرتبے کا صحیح معنوں میں پتا چل جائے۔" سالار کی آنکھوں میں اب ہلکی سی نمی تھی۔

"میں اب بھی نہیں سمجھی۔"

"ابھی پوری زندگی پڑی ہے سمجھانے اور سمجھنے کے لیے۔" سالار نے گہری سانس فضا میں خارج کر کے اندر کے غبار کو روکنا چاہا۔ "آپ بھی تو کچھ کہو، میں ہی اتنی دیر سے بولے جا رہا ہوں، حالانکہ یہ تو لڑکیوں کا ڈپارٹمنٹ ہے۔" مسکراتے ہوئے سالار نے دیا کو بولنے پر اکسایا۔

"لالہ مجھے جو بھی آپ کے بارے میں بتاتے گئے میں یقین کرتی گئی۔" اس نے بہت دیر سوچنے کے بعد بات شروع کی، جبکہ سالار اس عرصے اس پر نظریں جمائے اس کے ایک ایک نقش کو دل میں محفوظ کر رہا تھا۔ "اس لیے مجھے واقعی آپ کی وہ سب باتیں بہت بری لگی تھیں اور شاید آپ بھی۔ برسوں بعد جب آپ یہاں آئے تو ایک بار پھر مجھے اپنی وہ توہین یاد آئی۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کیوں مجھے زمانے میں رسوا کرنا چاہتے ہیں؟ ایسا کیا کیا تھا میں نے؟

ہمارا نکاح دادی کی خواہش تھی میری تو نہیں... پھر کیوں؟ اور آپ نے لالہ سے کہا...'' وہ بہت دقت سے بول رہی تھی۔

''آپ کی باتوں ہی کی وجہ سے میں نے ہر ملاقات پر آپ سے بدتمیزی کی' یہاں تک میں نے آپ کو وہ... وہ بھی کہا۔'' وہ اصل لفظ استعمال کرنے کی اب ہمت نہیں کر سکتی تھی۔'' اس کے لیے میں واقعی شرمندہ ہوں۔'' اس نے بات مکمل کی۔

''آپ کو پتا ہے بابا آپ کی اس جرات پر آپ کو ''ستارۂ جرات'' سے نوازنا چاہتے ہیں۔'' اس کی بات سمجھ کر سالار نے مزے سے بتایا۔

''آپ نے انکل کو بتا دیا وہ سب؟ پتا نہیں کیا سوچیں گے وہ میرے بارے میں۔'' وہ پریشان ہو گئی۔

''ویسے ایک بات کی مجھے خوشی ہے کہ اچھے برے لفظوں میں' چاہے جس طرح بھی سہی میری بیوی نے مجھے ہی ہمیشہ سوچا' اس کی سوچوں کا محور میں ہی ہمیشہ رہا اور اس بات کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔'' اس نے شرارتی انداز میں کہا۔

''جی نہیں... اب ایسا بھی نہیں۔'' وہ واقعی جھینپ گئی تھی۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا لیکن وہ بھی پھر اپنے نام کی ایک ہی تھی... اتنی آسانی سے کیسے مانتی۔

''ویسے ایک شکوہ مجھے بھی ہے آپ سے جو باتیں آپ کو مجھ سے کرنی چاہیے تھیں۔ وہ آپ نے اپنی دوست سے کیں؟ اسپیشلی وہ محبت والی... نہیں بلکہ عشق والی بات پر صرف میرا حق تھا اور آپ نے اپنی دوست کو بتایا مجھے نہیں؟ اور پھر وہ آپ کا پورا نام پکارنے والی بات... میں تو سن کر بڑا حیران ہوا تھا کہ کوئی لڑکی اپنی ساری ناراضی اور بدگمانی صرف اپنا پورا نام پکارے جانے پر بھی ختم کر سکتی ہے۔ چلو زندگی بڑی آسان ہو گی میری' آپ کو منانے کا بڑا ہی آسان حل آپ نے خود ہی بتا دیا۔'' اس نے شوخی سے کہا تھا جبکہ وہ اس کی باتوں سے بلش کر گئی۔

وہ اب بھی آنکھوں میں شوق کا جہاں سجائے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی نظروں کے پیغام سے نروس ہو رہی تھی۔ ''مہدیہ...'' اسے سالار کی جذبات سے بوجھل لہجے میں سرگوشی اپنے کان کے بالکل پاس سنائی دی۔ ''بس بہت خوار کر لیا تم نے مجھے اپنے پیچھے اب اور نہیں۔ میں چند دنوں تک پاکستان واپس جا رہا ہوں' ماما پاپا سے ہماری شادی کی بات کرنے... جانتی ہو تمہاری یہ بھیگی پلکیں اس قدر حسین لگ رہی ہیں کہ میرا دل بے اختیار ہوا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں مزید اپنے حواس کھو دوں' چلو تمہیں ہاسٹل ڈراپ کر دوں۔'' وہ اس کی طرف چہرہ کیے الٹے قدموں چلتے ہوئے اس سے دور جا رہا تھا اور اپنی قربت کا اثر اس کے گلنار ہوتے چہرے پر دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

وہ اب تک ان لمحوں کے حصار میں بالکونی میں ہی کھڑی تھی۔ اپنی سانسوں اور دھڑکنوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی۔ اس نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پایا۔ ایک آخری نگاہ سامنے کے دلکش منظر پر ڈالتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''کہہ تو رہا ہوں کہیں بزی تھا۔ اس لیے فون نہیں اٹھایا۔'' اندر آ کر اسے سالار کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی تھی۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اگلے لمحے اسے اسپیکر سے دوسری طرف سے آتی آواز کی پہچان بھی ہو گئی تھی۔

''محترم سالار صاحب کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ کہاں اور کس کے ساتھ بزی تھے آپ' پچھلے سات گھنٹوں سے کہ میری ایک بھی کال ریسیو نہیں کی۔'' آپی کی طنز میں ڈوبی آواز آئی تھی۔

''یار نہیں بتا سکتا' شرم آتی ہے مجھے۔'' سالار کا چہرہ دوسری طرف تھا' اس لیے وہ اسے نہیں دیکھ پایا۔ اس کے لہجے میں مصنوعی جھجک اور شرم واضح تھی۔ یعنی کہ یہ بندہ لالہ سمیت ہر ایک کو چلانے کا ہنر رکھتا ہے۔ ایکٹنگ تو ختم تھی اس پر... دیا نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

''خبیث انسان' میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیرا اور شرم کا کبھی بھی کوئی کنیکشن نہیں رہا۔''

''دیکھ اب بچوں کو ہر بات بتانے والی تو نہیں ہوتی

نا۔" سالار نے رُخ دیا کی جانب کیا اور دوسری طرف کی بات کا جواب بھی دیا۔ "اچھا اب بہت سُن لی تیری بک بک اور رہا سوال میرے آنے کا تو ابھی سیٹ کنفرم نہیں' جب ہوگی سب سے پہلے تجھے ہی بتادوں گا۔ فکر نہ کر عید تیرے ساتھ ہی کروں گا میں۔"

"ہاں میں تو مر رہا ہوں نہ دیدارِ یار کے لیے۔" آبی نے جل کر کہا تھا۔ اسے ان دونوں کی گفتگو سننا اچھا لگ رہا تھا۔ آج اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کتنے بے تکلف ہیں ایک دوسرے سے۔

"میں کیسے بتاؤں تجھے کہ یہ جدائی کے دن..... ایک ایک پل گن گن کے کاٹ رہا ہوں..... کہ کب تُو میری بانہوں میں ہو اور میں تیری ہڈی پسلی ایک کرسکوں۔" سالار نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "چل او کے بائے' اب بند کر فون' مجھے اپنی بیوی کو ڈراپ بھی کرنے جانا ہے۔"

"کیا؟ تُو دیا کے ساتھ ہے....." اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سالار نے ہنستے ہوئے کال کاٹ دی اور سیل آف کردیا۔

"ایک تو یہ آبی کا بچہ ہمیشہ غلط وقت پر انٹری دیتا ہے۔ پوچھ رہا تھا کہ اتنی دیر سے کہاں غائب تھا میں؟ اب میں اسے کیا بتاتا کہ وہ اصل کام کر رہا تھا میں' جس کے لیے پاپا نے مجھے یہاں بھیجا تھا' ورنہ بزنس تو ایک بہانہ تھا۔ اب مجھ جیسے آرٹسٹک مائنڈ رکھنے والے بندے کو یہ امپورٹ ایکسپورٹ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔"

اس بات پر وہ دونوں ہی مسکرادیے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ پاکستان آچکا تھا اور جب اسے یہ پتا لگا کہ عید کے دن گھر میں گرینڈ فنکشن ہے جس میں سب فیملی اور دوست مدعو ہیں تو وہ سخت بدمزہ ہوا۔

"میں یہاں آپ لوگوں کے ساتھ عید کرنے آیا ہوں اور آپ کو پارٹی سے ہی فرصت نہیں۔ آخر کیا تک بنتی ہے اس فضول سی پارٹی کی؟"

"کیوں تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ بہت عرصے پہلے سے ہمارا ارادہ تھا اس پارٹی کا۔ سب کو انوائیٹ بھی کرچکے ہیں' اب کینسل نہیں ہوسکتی۔" کسی نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

"ہاں اب تو کوئی حیثیت نہیں میری اس گھر میں....." اس نے روٹھے انداز میں کہا۔

"سب ڈرامے جانتے ہیں ہم تیرے۔ میرا دعوا ہے کہ تم ہی سب سے زیادہ خوش ہوگے اس پارٹی میں۔ تمہارے ہی دانت اندر نہیں جارہے ہوں گے۔" پاپا نے بھی اس کی ایک نہ سنی اور ساتھ ہی اسے اس کے مطلب کا اشارہ بھی دیا۔ لیکن اس نے دھیان بھی نہیں دیا اور آخرکار عید کا دن آ ہی گیا۔

صبح عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے کلف لگا سفید کرتا شلوار پہنا تھا۔ ورنہ وہ ہر وقت جینز شرٹ ہی پہنتا تھا۔ اسی میں کمفرٹیبل فیل کرتا۔ تیار ہو کر وہ کمرے سے باہر آیا تو سب اس کا لاؤنج میں انتظار کر رہے تھے۔ آبی نے اسے اترتے دیکھا تو زور سے سیٹی ماری۔ مضبوط قدموں سے سیڑھیاں اترتا ہوا' اپنے پورے قد کے ساتھ وہ کسی ریاست کا شہزادہ ہی لگ رہا تھا جو طویل انتظار کے بعد رعایا کو اپنی ایک جھلک دکھاتا ہے۔

"پاپا یہ جو شخصیت سامنے سے آرہی ہے اسے ہم نے کب اور کہاں دیکھا تھا؟" آبی کہاں باز آنے والا تھا۔

"ان حضرت کو ہم نے پچھلے سال ٹھیک اسی جگہ..... اسی وقت اور آج ہی کے دن دیکھا تھا۔" پاپا کی نظروں میں ستائش تھی اپنے لاڈلے کے لیے۔

"میرا بیٹا بہت ہینڈسم لگ رہا ہے۔" مما نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ سب مجھے ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ پاپا پلیز ایسے تو مت دیکھیں۔ میں نروس ہو رہا ہوں۔" وہ واقعی جھنجلا گیا تھا ان سب کے تاثرات سے۔

"یار! ایک تو ہم تمہاری تعریف کر رہے ہیں۔ کیا

غضب ڈھا رہے ہو کم نہ جانے کتنوں پر بجلی گرے گی آج!" پاپا نے مسکراتی نظروں سے کہا وہ واقعی بہت زیادہ ڈیسنٹ اور شان دار لگ رہا تھا۔ اس طرح کی ڈریسنگ وہ بہت کم کرتا تھا لیکن جب بھی کی ہمیشہ لوگوں کی ستائش ہی وصول کی تھی۔

شام کے لیے آبی نے اسے زبردستی بلیک ڈنر سوٹ پہنایا تھا۔ فنکشن اپنے عروج پہ تھا۔ ایک پرانے دوست سے بات کرتے ہوئے اس کی نظر گیٹ سے اندر آتی گاڑی پر پڑی اور وہ الجھ گیا؟ گاڑی میں سے جو لوگ اتر رہے تھے انہیں دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا کہ یہ کیسے آگئے یہاں۔۔۔ کسی نے اس سے ذکر نہیں کیا۔ وہ چاروں ہی پاکستان آئے تھے۔ سب ان سے مل رہے تھے اور سب کے چہروں سے یہ لگ رہا تھا کہ وہ سب جانتے تھے ان کے یہاں آنے کے بارے میں۔۔۔ تو پھر مجھے کیوں نہیں بتایا کسی نے؟ وہ بھی ان سے ملنے آگے بڑھا تھا مگر۔۔۔

اس کی نظریں ایک منظر پر ٹھہر گئی تھیں۔ سفید رنگ کی موتیوں سے سجی، ٹخنوں تک آتی ریشمی فراک میں سج سج کر قدم اٹھاتی وہ واقعی کوئی پاکیزہ اور مقدس حور لگ رہی تھی۔ چہرے پر پڑتی روشنیاں، اس کے سادہ اور معصوم حسن کو مکمل کر رہی تھیں۔ اس رنگ میں آج پہلی بار اس نے دیکھا تھا اسے اور اتنا تیار بھی۔۔۔ سالار کا بے اختیار دل چاہا کہ باقی سب یہاں سے غائب ہو جائیں۔ صرف وہ دونوں ہوں اور وہ اسے دیکھتا رہے جب تک دل سیراب نہ ہو جائے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹل مین! پلیز کیا میں آپ کے چند منٹ لے سکتا ہوں۔" آبی نے سب کو متوجہ کیا۔

"آج کا یہ فنکشن یقیناً "عید" ہی کی خوشی کو بڑھانے کے لیے رکھا گیا تھا مگر اس کا ایک اور۔۔۔ بھی مقصد تھا۔" آبی نے تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "بابا اور بھائی کی اجازت سے میں آپ سب لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج کے اس فنکشن کا موسٹ ایلیجبل بیچلر در حقیقت بیچلر نہیں ہے۔" آبی اور کبھی سیدھی طرح بات کر لے۔۔۔ ناممکن۔

"جی ہاں آپ کا اندازہ درست ہے میں سالار ہی کی بات کر رہا ہوں۔ ان محترم کا نکاح آج سے سات سال پہلے حسن بھائی اور زینب آپی کی بیٹی یعنی کہ میری نیلی پری سے ہو چکا ہے۔" اس نے آخر کار بات ختم کر ہی دی۔

☆ ☆ ☆

وہ ماما کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، جب اسے لالہ کا میسج ملا، جس میں انہوں نے بیسمنٹ میں بنی لائبریری میں آنے کو کہا تھا، ساتھ راستہ بھی سمجھایا تھا۔

وہ ماما کو جانے کا بتا کر وہاں سے اٹھی اور ڈھونڈتی ہوئی آخر کار پہنچ ہی گئی بیسمنٹ میں۔ وہاں بائیں جانب پر شیشے کے اس پار آرٹسٹک سا انڈور سوئمنگ پول تھا اور سیدھی طرف پر اسے دروازہ نظر آیا۔ بلاشبہ یہ لائبریری کا ہی دروازہ تھا، کیونکہ اس پر لکھا ہوا تھا کہ۔۔۔

"آپ شور کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ صرف لائبریری نہیں تفریح گاہ بھی ہے۔"

وہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ وہاں پر ایک طرف سفید دیوار گیر شیلفز پر دنیا جہان کی کتابیں رکھی تھیں۔ اتنی کتابیں دیکھ کر تو ویسے بھی اسے چکر آتے تھے۔ کورس بکس کے علاوہ اسے کتابیں پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا اور لالہ یہ بات جانتے ہیں، پھر بھی یہاں بلایا۔ اس نے کوفت سے سوچا۔ کتابوں سے نظر ہٹا کر اس نے دوسری جانب دیکھا تھا، وہاں سفید کی بورڈ رکھا تھا اسے۔ Make some noise کا مطلب سمجھ آیا۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھی اور اپنی انگلی کو تمام کیز پر سے گزارتی چلی گئی۔ پیانو کی مدھر آواز گونجی چلی گئی پورے ہال میں۔۔۔ اس نے یہ مشغلہ کئی بار دہرایا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے دوبارہ چاروں طرف کا جائزہ لیا۔

ہال کے بالکل آخر میں اسے پلے ایریا بھی نظر آگیا تھا۔ وہاں ایک فل سائز اسنوکر ٹیبل رکھی تھی۔ واقعی اب وہ سمجھنے لگی تھی اپنے شوہر کی یونیک باتوں میں چھپے اشاروں کو۔۔۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ ٹیبل بہت منفرد تھی۔۔۔ مکمل طور پر شیشے اور

کرسٹلز سے بنی ہوئی۔ اس کی اوپری سطح بھی گلاس سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں اطراف میں سلور ایل ای ڈی لائٹس لگی ہوئی تھیں جو اسے مزید شفاف اور روشن بنا رہی تھیں۔ وہ ٹیبل اس ہال کی کشش میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اسنوکر ٹیبل کی طرف بڑھ رہی تھی کہ چلتے ہوئے اسے چاروں طرف اپنے بے شمار عکس نظر آئے۔

وہ اب ایک مرر کے نزدیک آگئی تھی اور اپنا عکس اس میں دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی شہزادی مکمل تیاری کے بعد ایک آخری نگاہ ڈالتی ہے اپنے حسن پہ۔۔۔ وہاں ہر چیز سفید رنگ سے ڈھکی ہوئی تھی۔۔۔ سفید دیوار۔۔۔ سفید فرش۔۔۔ سفید مررز۔۔۔ اور ان میں نظر آتے اس کے بے شمار سفید عکس۔۔۔ پھر اسے اپنے عکس کے برابر چھوٹا سا سیاہ عکس ابھرتا نظر آیا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا آئینے میں اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

اُف ایک بار پھر انفرادیت کی اعلا مثال۔۔۔ ہر چیز سفید اور وہ موصوف سیاہ ڈنر سوٹ میں اپنی ڈیشنگ پرسنالٹی سمیت کھڑے مسکرا رہے تھے۔ یہ بندہ واقعی عجیب تھا۔ اس کے ساتھ گزرنے والی زندگی بڑی انٹرسٹنگ ہونی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا عکس بڑا ہوتا چلا گیا اور پھر اس کا عکس دیا کے عکس کے بالکل برابر آکر کھڑا ہو گیا۔

"آئی ہوپ تم بور نہیں ہوگی اکیلے میں۔"

"ہاں میں اس روم کے دروازے پر لکھے جملے کے سارے پزلز ڈھونڈ رہی تھی۔"

"سیاہ باز اور سفید راج ہنس! ایک منفرد جوڑا' روحوں کا ملن' جو ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔"

سالار نے کچھ دیر تک دونوں عکس کو دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے عکس کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"اور اگر وائٹ سوان کی مرضی کچھ اور ہو تو۔۔۔"

"امپوسیبل۔۔۔ بلیک ایگل کو اپنے شکار کو قابو کرنا بڑے اچھے سے آتا ہے۔" بلا کا یقین تھا اس کے لہجے میں۔

"اور اگر وائٹ سوان شکار ہونے سے پہلے ہی اڑ جاتے پھر؟" اسے اب اس گفتگو میں مزہ آنے لگا۔

"نیور' بلیک ایگل بہت ہی چالاک اور شاطر ہے' اڑنے سے پہلے ہی وہ وائٹ سوان کے پر کاٹ دے گا۔"

"اور یہ کہتے ساتھ ہی وہ اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور اس کے دونوں بازو نرمی سے پکڑ لیے' جیسے اس کے دور جانے کے سارے راستے بند کر دیے ہوں۔ آج بھی اس نے ہمیشہ کی طرح پوری آستین کا ڈریس پہنا تھا۔ وہ اس کے بازوؤں کی نرمی محسوس کر سکتا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ وہ واقعی بہت نازک سی ہے۔۔۔ ساری زندگی اسے ہر سرد و گرم سے بچانا ہوگا۔ یہ ذمہ داری اللہ نے اسے دی ہے۔ دوسری طرف وہ تھوڑا بوکھلا گئی تھی۔

"یہ چیٹنگ ہے۔ تھوڑا ٹائم تو ملنا ہی چاہیے نا۔" اس نے منہ پھلاتے ہوئے شکوہ کیا۔

"بلیک ایگل کی تیز نظروں سے بچنے کی تدبیر کرنا تو وائٹ سوان کا کام ہے نا۔ بلیک ایگل کو تو بس اپنی سیاہ

چمکتی فر کے ذریعے شکار کو مسمرائز کرنے کا لر ہی آتا ہے۔" اس نے مسکرا کر اس کے کاندھے پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔

"بہت حسین لگ رہی ہو تم اس رنگ میں۔ یہ رنگ بہت جچتا ہے تم پہ اور تمہیں اس وائٹ لینڈ میں بلانے کا مقصد اس کے حسن کو مکمل کرنا تھا۔ تمہارے بغیر یہاں سب کچھ ادھورا تھا۔ ہمیشہ مجھے ایک کمی سی محسوس ہوئی تھی۔ آج وہ کمی پوری ہو گئی ہے۔" اس کے کولون کی مہک اس کے حواسوں پر چھانے لگی تھی۔

"اب چلنا چاہیے ہمیں سب ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" مزید تنہائی خطرہ تھی کیونکہ آج سالار کے الگ ہی انداز تھے۔

"یہ وہی پرفیوم ہے نا جو میں نے گفٹ کیا تھا۔" سالار نے اس کی مہک کو اپنی سانسوں میں اتارتے ہوئے پوچھا۔

"جانے سے پہلے ایک جسارت کا تو حق ہے نا مجھے، نہ جانے پھر کب ملاقات ہو تم سے تنہائی میں..." سالار نے دیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر بہت نرمی اور احتیاط سے اس کی پیشانی چومی۔

"جانتی ہو میں نے تمہاری پیشانی ہی کو کیوں اولیت دی؟" سالار نے اس کے چہرے کو اپنی نظروں کے حصار میں لے کر پوچھا۔ جبکہ وہ اس پوزیشن میں ہی نہیں تھی کہ غور کرتی۔

"کیونکہ پیشانی پر بوسا دینے کا مطلب مان ہے، عزت، احترام، محبت، اعتماد، خلوص سب ہی کچھ ہے۔" وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

"مجھے جانا ہے اب۔" اس کا یقین، اعتماد اور محبت ہی تو چاہیے تھا دیا کو۔ وہ تو مل ہی گیا تھا۔

"اوکے... جاؤ لیکن اپنے چہرے کی سرخی تو تھوڑی کم کر لو، ورنہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ تو پیا سے مل کر آئی ہے۔" وہ مسکرا کر گنگنایا تھا۔

وہ اب دروازے کی طرف جا رہی تھی اور وہ وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے کچھ سوچ کر وہ مڑی تھی۔

"اپنی ان یونیک حرکتوں پر تھوڑا کنٹرول کر لیں اب... میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی کہ ہماری شادی کسی... اسپتال یا زو میں ہو، کیونکہ اس سے زیادہ یونیک جگہ اور کوئی ہو نہیں سکتی شادی کے لیے۔" اس نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔

"تو آپ ہی بتا دیں میڈم کہ کہاں کرنا پسند کریں گی آپ شادی؟" وہ اس کی شرارت سمجھ گیا تھا۔

"وینس... بہت رومینٹک جگہ ہے، اس لائبریری کی طرح بورنگ نہیں ہے۔" لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس نے اپنی فنتیسی بتائی۔

"کیا؟ بورنگ؟ ابھی بتاتا ہوں میں تمہیں؟ یہ بورنگ جگہ تھی کیا؟" وہ واقعی صدمے میں آگیا تھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

"بلیک ایگل کو اب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کتنا ہی ہوشیار، شاطر اور تیز کیوں نہ ہو، وائٹ سوان نے بھی اپنی فردھوپ میں سفید نہیں کی۔ اللہ نے تھوڑی بہت چالاکی تو اسے بھی دی ہے۔" اسے چڑاتے ہوئے دیا فوراً دروازہ کھول کے باہر جا چکی تھی۔ جب وہ بیسمنٹ کی سیڑھیوں پر تھی تو پیچھے سے سالار کی آواز آئی تھی۔

"سنو ابھی تو چلی جاؤ لیکن آنا تو بالآخر میرے پاس ہی ہے نا..."

اس کے ارادے بہت مضبوط تھے۔ وہ بیسٹ آف لک کا انگوٹھا دکھاتی باقی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی... اور وہ جانتی تھی کہ اب ان کی شادی وینس میں ہی ہوگی... کیسے؟ یہ سب سوچنا سالار کا کام تھا۔ اسے تو بس اب اپنے برائیڈل ڈریس اور اپنے شوہر کے یونیک سرپرائز کو ہی سوچنا تھا۔

ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ' ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھودیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کردیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کرکے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کردیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہوجاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہوپاتی۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا' عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہوجاتی ہے۔

ستائیسویں قسط

”حیدر ولا“ اپنی پوری شان شوکت کے ہمراہ ماورا مرتضیٰ کے انتظار میں تیار کھڑا تھا۔ یوں جیسے اس کے درو دیوار کو صدیوں سے ماورا مرتضیٰ کا انتظار تھا اور آج وہ انتظار پورا ہونے جا رہا تھا۔

اور ایسا ہی ایک انتظار ماورا مرتضیٰ کو بھی تھا۔ اس نے بھی گیٹ کے سامنے گاڑی رکتے ہی بے اختیار سر اٹھا کر حیدر ولا کی روشنیوں سے جگمگاتی عمارت کو اس کی بنیاد سے لے کر اس کی اونچائی تک دیکھا تھا۔ جہاں جلی حروف میں ”حیدر ولا“ لکھا دکھائی دے رہا تھا۔

تیمور نے ہلکا سا ہارن دیا تھا جس پہ فوراً ہی حیدر ولا کا گیٹ پورے کا پورا کھول دیا گیا تھا اور وہ بڑی سبک رفتاری سے گاڑی اندر لے آیا تھا' پھر ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کی طرف آیا اور اسے اگلی نشست سے اترنے میں بھرپور مدد دی تھی۔ اور اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے اپنے ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھا تھا۔

ابھی وہ راہداری میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی' تیمور کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے اور اس کے ساتھ ماورا کے قدم بھی خود بخود ہی رک گئے تھے۔

”رئیس۔۔۔ رئیس۔۔۔ کہاں ہو سب۔۔۔ لائٹس آن کرو۔“ تیمور نے ماورا کا ہاتھ یونہی ہاتھ میں پکڑے ہوئے ملازم کو آواز دی تھی' مگر اسے کسی بھی ملازم کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔

”تم ٹھہرو۔۔۔ میں دیکھتا ہوں۔“ تیمور نے جیب سے موبائل نکال کر کہتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہا تھا' لیکن ماورا نے یک دم اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا تھا۔

”نہیں۔۔۔“ اس کے لبوں سے انکار کی سرگوشی ابھری تھی اور تیمور حیدر کی پوری زندگی تھم گئی تھی' اس کا دل اس کے ہاتھ میں دھڑک اٹھا تھا جسے ماورا نے اپنے پاس روکنے کے لیے اپنے ہاتھ میں دبوچ رکھا تھا۔

اور موبائل کی مدھم روشنی میں تیمور اس کے چہرے پہ اک نظر ڈال کے رہ گیا تھا۔ اندھیرا دھڑک اٹھا تھا اور خاموشی کے سینے میں یہ دھڑکن دھمک پیدا کرنے لگی تھی۔

”ہونہہ۔۔۔ ہوں۔۔۔!“ آس پاس کسی کے گلا کھنکارنے کی آواز سنائی دی تھی اور وہ دونوں یک دم چونک گئے تھے۔

اور ساتھ ہی تمام بتیاں روشن ہو گئی تھیں اور روشنیوں کے ساتھ ساتھ دونوں پہ اچانک پھولوں کی برسات شروع ہو گئی تھی۔

آفاق' قارہ' ولید اور سحرش سب یہیں پہ تھے اور تازہ پھولوں کی پتیوں سے ان دونوں کا بھرپور استقبال کیا گیا تھا۔ جس پہ تیمور کو بے پناہ خوشی ہوئی تھی اور ماورا کے چہرے پر بھی مدھم سی مسکراہٹ کا عکس لہرایا تھا۔

”ہم نے سوچا اس سے پہلے کہ رومینٹک سین طویل ہو جائے ہم خود ہی جلدی سے اپنی انٹری دے دیں۔“ ولید نے بے حد شرارت اور معنی خیزی سے کہتے ہوئے چھیڑا تھا اور ماورا نے بے ساختہ چہرہ جھکا لیا تھا جبکہ تیمور بھی جواباً شرارت سے مسکرا اٹھا تھا۔

”جن کے دوست تم جیسے ہوں ان کے رومینٹک سین کبھی بھی طویل نہیں ہو پاتے۔“ لہجے میں جیسے بے انتہا تاسف تھا اور اس کے اس تاسف پہ ولید اور آفاق بیک وقت قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ آپ لوگ آج رات یہیں کھڑے کھڑے گپیں لگاتے رہیں گے۔۔۔ نہ ریلیکس کریں گے۔۔۔ نہ کرنے دیں گے۔“ قارہ نے آگے بڑھ کے ماورا کو بازو سے تھام لیا تھا۔ اور ان لوگوں کو سرزنش کی تھی۔

”ارے کیوں نہیں۔۔۔ ہم نے کب روکا ہے؟ آپ جتنا مرضی ریلیکس کریں۔“ آفاق نے سیڑھیوں کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"چلیں۔۔۔؟" فارہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں ابھی بیڈ روم میں نہیں جانا چاہتی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"میں تیمور کے ساتھ بیڈ روم میں قدم رکھنا چاہتی ہوں۔" ماورا کا یہ جملہ فارہ کی ہی نہیں تیمور کی سماعتوں تک بھی پہنچ گیا تھا۔ تیمور کے دل کی دھڑکنیں ہر بڑھتے لمحے کے ساتھ تیز ہو رہی تھیں اور ان کی لے بدل رہی تھی۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔۔۔؟ پھر میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔" فارہ نے بھی چھیڑا تھا۔ ماورا قدرے جھینپ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچھ دیر بیٹھنے اور چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ لوگ چلے گئے تھے۔ اور ڈرائنگ روم میں وہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ تیمور نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ رکھ کر صوفے سے اٹھتے ہوئے ماورا کی طرف دیکھا، وہ آہستگی سے سر جھکا گئی تھی۔

"اب کیا ارادہ ہے؟ بیڈ روم میں چلیں یا پھر گھر دیکھنا ہے؟" تیمور نے خاصی مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

"گھر دیکھنا ہے۔" اس نے فوراً گھر دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"ویری گریٹ۔ مجھے بھی یہی توقع تھی کہ گھر دیکھنا ہے۔" وہ شرارت سے کہہ رہا تھا، ماو، اجواباً چپ ہی رہی۔

"آیئے۔۔۔ تو پھر گھر دیکھتے ہیں۔" تیمور نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا تھا ماورا ذرا جھجکی۔

"مسز تیمور حیدر۔۔۔ تھام لیجیے ہاتھ۔۔۔ یہ ہاتھ بھی آپ کا ہے' یہ گھر بھی آپ کا ہے اور یہ گھر دکھانے والا بندہ خاکسار بھی آپ کا ہے۔۔۔ یہ ہاتھ تھامے بغیر گھر کیسے دیکھیں گی؟" تیمور کی شوخیاں اس کے لہجے اور الفاظ سے ہی پھوٹی پڑ رہی تھیں۔

پھر ماورا نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ ہی دیا تھا اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تیمور اسے ساتھ لیے نچلے پورشن کا ایک ایک حصہ دکھا رہا تھا۔

"یہ گیسٹ روم ہے۔ یہ بیڈ روم اور یہ بابا کا بیڈ روم۔" ہر کمرے کا دروازہ کھول کر دکھاتے ہوئے تیمور آخر میں ایک کمرے کے دروازے پہ رک گیا تھا' اور ماورا کے قدم بھی رک گئے تھے۔ اس کے چہرے پہ اک سایہ سا لہرا گیا تھا۔

"آپ کا بیڈ روم کون سا ہے؟" چند سیکنڈز کے توقف سے ماورا نے اس کے کمرے کا پوچھا تھا۔ کیوں کہ وہ مزید یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔

"آپ کا نہیں۔۔۔ ہمارا بیڈ روم۔۔۔" تیمور نے جیسے تصحیح کی۔

"ہوں۔۔۔!" اس نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلیں۔۔۔؟" وہ چھیڑ رہا تھا۔

"ہوں!" اس کا انداز ہنوز تھا۔

"تھک گئی ہو۔۔۔؟" وہ اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔" انتہائی مختصر جواب موصول ہو رہے تھے۔

"تھکن اتارنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟" ایک اور شرارت بھرا سوال اٹھایا گیا تھا۔

جس پہ ماورا کے قدم اس کے ساتھ چلتے چلتے جھجکے تھے۔ اور اس کے قدموں کی یہ جھجک تیمور سے چھپی نہیں

رہ سکی تھی۔

"ڈونٹ وری۔۔۔ ابھی تو صرف پوچھا ہے۔" وہ پھر شرارت سے باز نہیں آیا تھا۔

اور ماورا بڑی مشکل سے اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتی اس کے ساتھ بیڈ روم تک پہنچی تھی 'لیکن بیڈ روم تک پہنچ کر وہ کہیں اور ہی پہنچ گئی تھی۔

اس کے دل و دماغ گنگ سے ہو گئے تھے۔ سرخ گلاب کے پھولوں سے سجا بیڈ نظر ہی نہیں آ رہا تھا ہر طرف بس پھول ہی پھول نظر آ رہے تھے اور دروازہ کھلتے ہی پھولوں کی مہک ان کے قدموں سے لپٹ لپٹ گئی تھی۔

"آؤ۔۔۔ تمہارا بیڈ روم۔۔۔ تمہارے انتظار میں ہے۔" تیمور نے اسے آگے بڑھنے پہ اکسایا تھا 'ماورا کا دل ان سرخ پھولوں کی طرح مہک مہک گیا تھا اور وہ اس مہک کو روک نہیں پائی تھی۔

اپنے ہاتھ پہ تیمور کے ہاتھ کی گرفت کو اس نے بھی اپنی گرفت کا احساس بخشا تھا اور تیمور اپنے ہاتھ پہ اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے روح تک سرشار ہو گیا تھا۔ اور اسی سرشاری کے عالم میں وہ اسے بیڈ تک لے آیا تھا اور پھر خود ہی اسے سہارا دے کر بیڈ پہ بٹھایا تھا اور خود یونہی بے خودی کے عالم میں اس کے سامنے نیچے قالین پہ دو زانو بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔۔۔؟ اوپر بیڈ پہ بیٹھیں نا۔" ماورا کو مزید جھجک ہوئی تھی۔

"آج میرا خواب ایک مجسم حقیقت۔۔۔ ایک تعبیر کی صورت میرے سامنے موجود ہے۔ میں اسے جی بھر کے دیکھوں نہ تو اور کیا کروں؟" تیمور اس کے سامنے بیٹھا بڑے شوق سے اور بڑے اشتیاق سے اسے دیکھتا ہوا اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔" ماورا نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"جانتی ہو۔۔۔ میرا خواب تھا کہ تم یوں سج سنور کر میری بن کر اس طرح میرے سامنے بیٹھی ہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں اور جب تھک جاؤں تو اپنا سر تمہاری گود میں رکھ کر آنکھیں موند لوں اور پلکوں کے اس پار بھی صرف تمہیں دیکھوں۔۔۔ صرف تمہیں۔۔۔"

تیمور نے انتہائی گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیے تھے اور بڑے استحقاق سے دونوں ہاتھوں کی پشت پہ بوسہ دیا تھا۔ جس کا لمس ماورا کے ہاتھوں پہ دہک کر آنچ دینے لگا تھا۔

"آپ جانتے بھی تھے کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔ پھر بھی آپ نے ایسے خواب دیکھے۔۔۔؟" ماورا اس کے روبرو بیٹھی سچ ہی تو بول رہی تھی۔

"جانتا تھا۔۔۔ اسی لیے تو محبت کے خواب دیکھتا تھا اور مجھے یہ بھی پتا ہے۔ جس روز تمہیں مجھ سے محبت ہوئی اس روز سچ میں مر جاؤں گا۔ تمہارے سر کی قسم۔۔۔" تیمور کا لہجہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا اور ماورا کا دل بے سبب سکڑ کر سمٹا تھا۔

"تو پھر اس سے بہتر ہے کہ مجھے آپ سے محبت ہی نہ ہو۔" ماورا کی آواز دھیمی تھی لہجہ بھی مدھم مدھم۔۔۔

"ارے۔۔۔ ایسا مت کرنا۔۔۔ تم بس محبت کرو۔۔۔ مجھے مرنا منظور ہے۔ تمہاری محبت کے لیے مر جانا کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔"

"کتنی محبت ہے مجھ سے؟" ماورا جان بوجھ کر ایسے سوال کر رہی تھی۔

"کاغذ قلم لاؤ۔۔۔ جان لکھ دوں تمہارے نام۔" تیمور نے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پہ رکھ لیا تھا 'اور ماورا کو لگ رہا تھا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔

"بتاؤ نا؟ لکھ دوں اپنی جان۔۔۔؟" اس نے ماورا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ماورا کے دل کی

دھڑکنیں سینے کے پنجرے سے باہر آنے لگی تھی جن کی دھمک تیمور کو با آسانی سنائی دے رہی تھی۔

"لکھ دیں... میرے ہاتھ پہ لکھ دیں۔" ماورا نے مدھم سی آواز میں کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا تھا اور تیمور نے آہستگی سے ہاتھ تھام کے اس کی ہتھیلی پہ اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔

"لو... لکھ دی اپنی جان... اب ہمیشہ تمہاری مٹھی میں رہے گی۔ جب چاہے لے لینا۔"

"لے لوں گی۔" وہ آہستگی سے کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"ابھی لے لو۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"ابھی موڈ نہیں ہے۔" ماورا کے مزاج میں قطرہ قطرہ کر کے خوشگواریت اتر رہی تھی۔

"میرا موڈ تو ہے نا۔" تیمور سر اٹھا کر یک دم سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ اور بڑی گہری اور لو دیتی نظروں سے اسے سرتاپا دیکھا تھا۔

"جان لینا ہوتی تو آج اس طرح سج سنور کر آپ کی بن کر آپ کے سامنے نہ بیٹھی ہوتی۔" اس نے کہتے ہوئے پلکیں جھکالی تھیں۔

"اچھا... تو پھر...؟" تیمور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" ماورا اس کی نظروں کی شرارت سے نروس ہو گئی۔

"کچھ تو ہے۔" وہ اور قریب ہوا تھا۔

"پلیز...!" ماورا نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اس کی منہ زوری کو روکنا چاہا۔

"پلیز... یہ ریکویسٹ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے معنی خیزی سے کہا۔

"میں چینج کرنا چاہتی ہوں۔" ماورا وہاں سے اٹھنے کا بہانا ڈھونڈنے لگی۔

"کس کو...؟ مجھے یا خود کو...؟" اس کی شرارت ہنوز تھی۔

"خود کو..." آواز دھیمی تھی۔

"وہ تو تم ہو گئی ہو... آل ریڈی..." تیمور اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ نے کر دیا ہے۔" ماورا اس کے بازو کے حصار میں سمٹ سی گئی تھی۔

"میں تو اور بھی بہت کچھ چینج کر دینا چاہتا ہوں۔" تیمور کی جسارتیں اور گستاخیاں بڑھ رہی تھیں۔

"پلیز تیمور...!" ماورا کی پھر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

"اچھا رکو... تمہاری منہ دکھائی کا تحفہ ابھی باقی ہے۔" تیمور کہتے ہوئے اٹھا اور بیڈ کے برابر رکھی میز کی دراز کھول کر کچھ نکالنے لگا۔ پھر پلٹ کر دوبارہ اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ وہ ایک نازک سی چین تھی اور چین میں بڑا سا ڈائمنڈ تھا۔

"یہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔ تمہاری شہ رگ سے قریب۔"

تیمور نے وہ لاکٹ پہنا کر ماورا کو جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باندھ لیا تھا وہ اپنی جگہ پہ جوں کی توں تھمی رہ گئی تھی۔

"آئی رئیلی لو یو ماورا تیمور...!" تیمور نے ایک بھرپور اظہار کیا تھا اور ماورا اس کی چاہتوں، اس کی شدتوں اور اس کے والہانہ پن کے سامنے بے بس ہو گئی تھی، اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ آخر وہ بھی مٹی سے بنی ایک انسان تھی۔ کب تک پتھر بن کے رہ سکتی تھی اور تیمور حیدر کی محبت نے تو بہت پہلے ہی اس پتھر کو ضرب لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس پتھر نے تڑخ کر ٹوٹنا ہی تو تھا۔

☼ ☼ ☼

ان کی نئی زندگی کی پہلی صبح بہت ہی چمکیلی اور روپہلی تھی۔ انتہائی پرسکون... ماورا کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلی

نظر تیمور کی سمت ہی اٹھی تھی' وہ اوندھے منہ لیٹا بے حد گہری نیند میں لگ رہا تھا اس کے ہمیشہ سلیقے سے سنورے بال آج خوب صورت پیشانی پہ بکھرے نظر آرہے تھے' وہ اس کی نظروں کی محویت سے نیند میں بھی ذرا سا کسمسایا تھا۔ اور ماورا اس کی نیند ٹوٹنے کے خیال سے بے حد آہستگی سے کمبل ہٹا کر اٹھ گئی تھی۔

اس کے کپڑے' تولیہ بلکہ ضرورت کی ہر چیز پہلے سے ہی واش روم میں تیار رکھی تھی' وہ شاور لے کر باہر نکل آئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے' دوپٹا شانوں پہ پھیلایا اور بے وجہ ہی کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

چند سیکنڈ اسی عمل میں گزر گئے تھے پھر اچانک اس کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آگئی تھی۔

اور اس کے قدم ہر سمت یوں اٹھ رہے تھے جیسے صدیوں سے اس فرش پہ چلنے کے عادی ہوں۔ جیسے وہ ہر اک کونے سے ہر اک گوشے سے واقف ہو۔

"سلام بیگم صاحب...!" وہ اپنے دھیان میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو اچانک ملازمہ سامنے آگئی تھی۔

"والسلام...!" ماورا نے آہستگی سے سرہلایا۔

"کچھ چاہیے بیگم صاحب...؟" وہ بہت ہی مؤدب کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"نہیں..." اس نے نفی میں سرہلایا۔

"چائے لاؤں؟"

"نہیں..." اس نے پھر انکار کیا۔

"ناشتا کریں گی... ؟ بنادوں...؟" ملازمہ کو تیمور حیدر کا آرڈر تھا کہ ماورا کے سامنے کوئی کوتاہی نظر نہ آئے اور نہ ہی کوئی شکایت موصول ہو۔

"نہیں... ابھی نہیں..." وہ نفی میں سرہلا کر پلٹ گئی تھی اور کوریڈور کی سمت جاتے جاتے ایک بار پھر رکی تھی۔

"تھینک یو...!" اس نے بڑی نرمی سے ملازمہ کا شکریہ ادا کیا تھا اور ملازمہ اس کے تھینکس پہ خوش ہوگئی تھی اور فوراً "دل ہی دل میں یہ رائے بھی قائم کرلی کہ نئی بیگم صاحبہ واقعی بہت اچھی ہے۔

"صاحب کی پسند لاجواب ہے۔" ملازمہ کے مسکراتے چہرے پہ نظر ڈال کر ماورا نے لان کا رخ کیا تھا۔ لیکن ملازمہ کا "بیگم صاحبہ" کہنا ابھی تک اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

وہ اس گھر کی بیٹی تھی اور بہو بن کے پکاری جارہی تھی۔ عجیب ہی موڑ تھا زندگی کا...

ماورا نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا تھا اور لان میں رکھی کرسیوں پہ نظر پڑتے ہی سوچ کی پرواز کہیں سے کہیں چلی گئی تھی۔

"بی گل...! عافیہ سے کہیں' ایک کپ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔" علی مرتضیٰ کی آواز پہ کرسی سے اٹھتی بی گل بڑے زور سے ہنسی تھیں۔

"ارے میرا بچہ! بی گل کو بھی بچہ سمجھتا ہے۔ سیدھے سیدھے بول ایک کپ چائے سے جا کر کہوں کہ عافیہ کی طلب ہو رہی ہے۔ چائے کا کپ بے چارا چپ چاپ عافیہ کو ساتھ لے آئے گا۔"

بی گل' علی مرتضیٰ کی رگ رگ سے واقف تھیں' جس پہ وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"یہ نا یہی بات...؟" بی گل نے تصدیق چاہی۔

"بالکل یہی بات ہے۔ دراصل کافی دیر ہوگئی تھی۔ وہ باہر نہیں نکلی۔ اسے دیکھا نہیں۔" انہوں نے اپنا سر

کھاتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔
"وہ تیار ہو رہی ہے۔" بی گل نے اطلاع دی۔
"اچھا؟ کس لیے۔۔۔؟" علی مرتضیٰ کافی دیر سے لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔
"کہتی ہے علی نے آج شاپنگ کا وعدہ کر رکھا ہے۔" بی گل کی اس نئی اطلاع پہ انہوں نے یک دم سر پہ ہاتھ مارا تھا۔
"اوہ مارا گیا۔۔۔ میں تو بھول گیا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ شاپنگ پہ بھی جانا ہے۔" ان کے انداز میں تاسف تھا۔
"تو اب کیا مسئلہ ہے۔۔۔ چلے جاؤ۔۔۔ فارغ ہی تو ہو۔" بی گل کو حیرت ہوئی۔
"فارغ نہیں ہوں نا۔۔۔ حیدر آنے والا ہے۔" انہوں نے اپنی پریشانی بتائی۔
"ارے تو اس میں ایسی کیا پریشانی ہے؟ حیدر سے مل کر چلے جانا۔ آخر وہ اتنے شوق سے تیار ہو رہی ہے کہ تم اتنے دنوں بعد گھر پہ فارغ ہو اور اسے شاپنگ کروا رہے ہو۔" بی گل نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"بی گل! اسے بھی کچھ کام ہے۔ آپ ایسا کریں، آپ عافیہ کے ساتھ چلی جائیں۔ اس نے جو بھی شاپنگ کرنی ہے آپ کروا دیں۔۔۔ پلیز۔۔۔" علی مرتضیٰ نے بی گل کے سامنے التجا کی تھی۔
"دیکھ مرتضیٰ۔۔۔ میری طرف سے جواب ہے۔۔۔ میں نہیں جانے والی۔۔۔ اس کا نکاح تیرے ساتھ ہوا ہے۔ میرے ساتھ نہیں۔۔۔ اسے تیرے ساتھ جانے کی خوشی ہوگی میرے ساتھ جانے کی نہیں۔" بی گل فوراً پلو جھاڑتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھیں۔
"پلیز بی گل۔۔۔" علی مرتضیٰ تیزی سے اٹھ کر بی گل کے سامنے آگئے تھے۔
"ہرگز نہیں۔۔۔" بی گل نے نفی میں سر ہلایا۔
"پیاری بی گل۔۔۔ میری دلاری بی گل۔۔۔ بس آج کے لیے پلیز۔۔۔" علی مرتضیٰ کی التجا میں اور بھی شدت آگئی تھی اور بی گل ان کے سامنے ہمیشہ کی طرح بے بس ہو گئی تھیں۔
"بہت بے غیرت ہو۔" وہ علی مرتضیٰ کے سر پہ چپت لگا کر چلی گئیں۔
"بی گل۔۔۔" انہوں نے پیچھے سے آواز دی بی گل نے جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔
"ایک کپ چائے۔۔۔!" ان کی آواز میں شرارت تھی۔
اور بی گل نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھیں، اتنے میں اندر سے عافیہ بھی باہر آتی دکھائی دی تھی۔
"تو گیا ایک کپ۔۔۔" بی گل کے جواب پہ علی مرتضیٰ کا قہقہہ بہت دور تک گونجا تھا۔ اتنا کہ ماورا مرتضیٰ کی سماعتوں نے اتنے سالوں بعد بھی وہ قہقہہ پورے لان میں گونجتا ہوا محسوس کیا تھا۔
"ماورا۔۔۔!" تیمور نے اس کے بے حد قریب آکر اس کے عقب سے اسے تھام لیا تھا اور ماورا ایک دم چونک گئی تھی۔
"ہوں۔۔۔؟" اس نے غائب دماغی سے گردن موڑ کر دیکھا۔
"تم رو رہی ہو۔۔۔؟" اس کی بھیگی پلکیں اور بھیگے رخسار دیکھ کر تیمور ٹھٹک گیا تھا۔
جس پہ ماورا کو بھی بے اختیار اپنے آنسوؤں کا خیال آیا اور ہاتھ بے ساختہ اپنے رخسار تک گیا تھا۔
"کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو۔۔۔؟" تیمور کی پریشانی دیدنی تھی۔
"کچھ نہیں۔۔۔ بس ایسے ہی۔۔۔" اس نے کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔
"ماورا۔۔۔ بتاؤ مجھے۔۔۔ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ آج کے دن تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ کیوں کہ آج

ہماری نئی زندگی کا پہلا دن ہے۔۔۔ آغاز ہے۔۔۔ اور اس آغاز پہ ہی تمہاری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں تو آئندہ کیا ہوگا؟" تیمور کے چہرے کی خوشی تشویش میں بدل چکی تھی۔

"ڈونٹ وری۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔" ماورا نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ آنسو کیوں۔۔۔؟" تیمور نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر عین اپنے سامنے کرلیا تھا۔

"بس وہ۔۔۔ امی اور بی گل یاد آرہی تھیں۔۔۔ وہ اکیلی ہوں گی اس لیے۔" ماورا نے بڑے ضبط سے علی مرتضیٰ کا ذکر اپنی زبان پہ ہی روکے رکھا تھا۔

"اوہ اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے؟" تیمور اس کی بات سن کر قدرے مطمئن ہوگیا تھا۔ کیوں کہ اس کے آنسوؤں کی وجہ معقول تھی۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں آج ان کو یہاں بلا لیتے ہیں۔ آج وہ ہمارے ساتھ رہیں گی پورا دن۔۔۔" اس نے ماورا کو خوش دیکھنے کے لیے بہت خوشگواری سے کہا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ یہاں نہیں آئیں گی۔" اس نے بڑی تیزی سے انکار کیا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟ وہ یہاں کیوں نہیں آئیں گی؟ یہ گھر اب ان کے داماد کا نہیں بلکہ ان کی بیٹی کا ہے۔ اب یہ حیدر ولا تمہاری ملکیت ہے۔۔۔ تم مالک ہو اس کی۔۔۔" تیمور نے اسے کندھوں سے پکڑ کے بہت مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

(مالک تو وہ بھی تھیں اس گھر کی۔۔۔) ماورا کے ذہن پہ پھر خیال کا سایہ گزرا۔

"ماورا! کیا بات ہے؟ کیوں بات بات پہ کھو جاتی ہو۔۔۔؟" تیمور نے پھر اسے ٹھوکا دیا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ آئیے' اندر چلتے ہیں۔" ماورا نے سر جھٹک کر کہا کیوں کہ اسے پتا تھا وہ یہاں کھڑی رہی تو یادوں میں ہی کھوئی رہے گی۔

وہ یادیں جن میں خود وہ موجود ہی نہیں تھی' مگر بی گل نے ایک ایک لمحہ ایک ایک منظر اس کے ذہن میں یوں محفوظ کردیا تھا کہ جیسے ماورا ہر لمحے ہر منظر میں ان کے ساتھ موجود تھی۔ جیسے سب کچھ خود دیکھا تھا اور خود محسوس کیا تھا۔

اسی لیے قدم قدم پہ اس کے قدم رک رہے تھے اور وہ تیمور کے ساتھ اندر آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بی گل نے فون کرکے اسے گھر آکر ملنے کا کہا تھا کیوں کہ عافیہ بیگم اس کے لیے اداس ہو رہی تھیں اور ماورا نے آنے کا کہہ کر فون بند کردیا تھا آخر وہ ان سے زیادہ اداس تھی۔

اور ابھی وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی جب تیمور اچانک دروازہ کھول کر اندر چلا آیا تھا۔

اور اسے بلیک لباس میں دیکھ کر اس کے قدم بے خود ہوگئے تھے۔ اس نے وہی ڈریس پہنا ہوا تھا جو تیمور نے پسند کیا تھا۔

"یہ ڈریس اتنا خوب صورت پہلے نہیں تھا جتنا اب ہوگیا ہے۔" تیمور نے بڑی بے خودی کے عالم میں کہا تھا اور ماورا نے آئینے میں اپنے اور اس کے عکس کو دیکھا۔ وہ اس کے عقب میں کھڑا اسے آئینے میں ہی دیکھ رہا تھا۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔۔۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" اس نے تیمور کی قربت کی آنچ سے بچنے کا بہانا ڈھونڈا۔

"میں نے اتنا انتظار کیا ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں۔۔۔" تیمور نے اس کے بال ایک ہاتھ سے سمیٹ کر اور لگے

دائیں کندھے پہ ڈال دیے تھے اب وہ اس کے بائیں کان میں پڑے جھمکے کو اور گلے میں لپٹی چین کو با آسانی دیکھ سکتا تھا۔

"آپ کا انتظار پورا ہو گیا۔ جو چاہا آپ کو مل گیا اور کیا باقی ہے؟" ماورا کا لہجہ مدھم تھا۔

"بہت کچھ باقی ہے۔ ابھی تشنگی نہیں مٹی۔۔۔ ابھی مل کے بھی بہت کچھ نہیں ملا۔۔۔ میرا انتظار وہیں کا وہیں ہے۔" تیمور کی اس کے جھمکے اور اس کی چین کے ساتھ جسارتیں ہنوز جاری تھیں اور ماورا اس کی ہر جسارت پہ سمٹ رہی تھی۔

"میں سمجھی نہیں۔۔۔؟" وہ الجھ کر بولی۔

"میرے دل پہ ہاتھ رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرو تو سب سمجھ جاؤ گی۔" تیمور نے کہتے ہوئے اس کا رخ اپنی سمت موڑ کر اس کا ہاتھ اپنے سینے پہ رکھ لیا تھا۔

"آپ سمجھائیں۔۔۔ میں دل کی زبان نہیں سمجھتی۔۔۔" ماورا نے نرم سی مسکراہٹ سے کہا۔

"سمجھ جاؤ گی۔۔۔ کبھی ایسا بھی ہو گا کہ تم صرف دل کی زبان سمجھو گی۔۔۔ صرف دل کی۔۔۔ وہ بھی میرے دل کی۔۔۔" تیمور نے بڑے یقین اور بڑے جذب سے کہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ کب ہو گا ایسا۔۔۔؟" وہ اسے چھیڑنے کے موڈ میں آچکی تھی۔

"جب میرے ساتھ ہنی مون پہ چلو گی۔" وہ بھی اس کی شرارت سمجھ کر شرارت سے ہی بولا تھا۔

"ہنی مون۔۔۔؟" ماورا اٹھکی۔ "کہاں۔۔۔؟" فوراً" پوچھا تھا۔

"جہاں تم کہو۔۔۔" وہ برجستہ بولا۔

"میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" ماورا پلٹ کر پھر تیار ہونے لگی۔

"میرا تو ہے نا۔۔۔؟" تیمور پرفیوم اٹھا کر اسپرے کرنے لگا اور ماورا اس پرفیوم کی خوشبو سے مہک گئی تھی۔

"امی اور بی گل اکیلی رہ جائیں گی۔" ماورا کو بس ان کا خیال دامن گیر تھا۔
"تو ان کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔" تیمور نے مسکراہٹ دبا کے کہا۔
"واٹ؟ ہنی مون پہ امی اور بی گل...؟" ماورا کو حیرت ہوئی تھی اور تیمور اس کی حیرت پہ یک دم قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
اور ماورا اس کی شرارت سمجھ کر اسے گھور کے رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

عافیہ بیگم اور بی گل دو دن بعد اس سے ملی تھیں اور اسے گلے لگا کر خوب پیار کیا تھا جبکہ ماورا ان کے گلے لگتے ہی رو پڑی تھی۔
اس نے اس گھر میں بی گل اور عافیہ بیگم کو بہت مس کیا تھا۔ اس لیے اس کے اندر کا غبار آنسوؤں کی صورت باہر نکلا تھا اور تیمور اس کے آنسو اور شدت دیکھ کر دلچسپی سے متوجہ ہوا تھا۔
"بی گل! ایک بات پوچھنا تھی۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"ہاں... پوچھو بیٹا۔" وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"اگر میں دو دن بعد ملوں تو کیا یہ مجھے بھی ایسے ہی ملے گی... یوں شدت سے رو کر... گلے لگ کر...؟" تیمور کا سوال ایسا تھا کہ روتے روتے بھی ماورا کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بی گل اور عافیہ بیگم بھی ہنس پڑی تھیں۔
"بتائیں نا...؟ اگر ایسا ہی ہوگا تو پھر میں دو دن بعد ملوں گا۔" تیمور کے لہجے اور انداز پہ نجانے کیوں بی گل کو علی مرتضیٰ کا گمان گزرا تھا وہ بھی عافیہ کے لیے ایسی ہی شرارت سے بات کرتا تھا۔
"پگلے... تو دو گھنٹے بعد ملے تب بھی وہ ایسے ہی پیار سے ملے گی۔"
"کہاں بی گل... ؟ دو دن گزر گئے... ایک بار بھی ایسے..."
"تیمور... پلیز...!" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ماورا نے سرخ ہوتے ہوئے اسے ٹوک دیا تھا۔ اور وہ یک دم ہنستا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔
"اچھا... میں اب چلتا ہوں... شام کو تمہیں پک کر لوں گا۔"
"شام کو کیوں؟ دو دن بعد کر لینا۔" ماورا نے یاد دلایا۔
"اب تو ایک دن بھی تمہارے بغیر گزارنا مشکل ہے۔" وہ اس کے ساتھ راہداری میں نکلتے ہوئے بولا۔
"دو دن زیادہ تو نہیں...؟" وہ تنگ کر رہی تھی۔
"بس شام کو تیار رہنا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔
اور ماورا دروازہ بند کر کے اندر آ گئی تھی۔
وہ ابھی امی اور بی گل کے ساتھ بیٹھی ہی تھی کہ تیمور کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ماورا نے چونک کر دیکھا تیمور اپنا موبائل یہیں بھول گیا تھا۔
اور اس کے نمبر پہ کال آ رہی تھی۔
ماورا نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا لیا تھا اور موبائل اسکرین کی سمت دیکھا...!

(باقی آئندہ)

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ
دُنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں ان دِنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جلتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دُنیا ترِی راہ میں کھڑی تھی

غم میں تھے کہ فراز آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فراز پنکھڑی تھی

احمد فراز

یہ مصرعہ نہیں ہے، وظیفہ میرا ہے
خدا ہے محبّت، محبّت خدا ہے

کہوں کس طرح میں کہ وہ بے وفا ہے
مجھے اس کی مجبوریوں کا پتا ہے

ہوا کو بہت سرکشی کا نشہ ہے
مگر یہ نہ بھولے دِیا بھی دیا ہے

نظر میں ہے جلتے مکانوں کا منظر
چمکتے ہیں جگنو تو دل کانپتا ہے

گزرتا ہے ہر شخص چہرہ چھپائے
کوئی راہ میں آئینہ رکھ گیا ہے

کبھی لمحے گِننا، کبھی سانسیں گِننا
وہ بچھڑے ہیں جب سے، یہی مشغلہ ہے

کہاں تُو خمار اور کہاں کفرِ توبہ
تجھے پارساؤں نے بہکا دیا ہے
خمار بارہ بنکوی

شاید

ماؤتھ پیس کو ٹھیک کرو
اک لمبا اور گہرا سانس لو
اور پھر بات کا رُخ بدل دو
جانتا ہوں میں
جیسے جلتے صحراؤں میں
پھول کبھی بھی کِھل نہیں سکتے
ایسے ہم بھی مل نہیں سکتے
پھر بھی اندر دُور کہیں اک آس پڑی ہے
شاید اک دن
اَن دیکھی دیوار گرے اور
ہجر کے سارے دروازوں کے پٹ کُھل جائیں
شاید اک دن
آنکھ کُھلے اور رَستے میں پھیلے ہوئے صحرا
سُکڑ سمٹ کر دُھول بنیں اور
پھر اُڑ جائیں
شاید اک دن رسموں اور رواجوں کے سب
زخم سل جائیں
لیکن شاید ایسا نہ ہو
شاید کا مطلب تو تم بھی جانتے ہو ناں

میثم علی آغا

وہی موسم ہے
بارش کی ہنسی
پیڑوں میں چھن چھن گونجتی ہے
ہری شاخیں
سُنہری پھول کے زیور پہن کر
تصوّر میں کسی کے مسکراتی ہیں
ہوا کی اوڑھنی کا رنگ پھر ہلکا گلابی ہے
شناسا باغ کو جاتا ہوا خوشبو بھرا رستہ
تمہاری راہ تکتا ہے
طلوعِ ماہ کی ساعت
تمہاری منتظر ہے
نیک تمنّاؤں کے ہمراہ
نیا سال مُبارک ہو

پروین شاکر

بندہ نواز

ایف اے کے ایگزام ہو رہے تھے' اردو کے امتحانی پرچے میں ایک شعر دیا گیا' جس کی تشریح کرنی تھی' شعر کچھ یوں تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

ایک طالب علم جو کہ اپنی قومی زبان سے بالکل نابلد تھا' اس نے اپنی فہم و فراست سے اس مشکل ترین شعر کی آخر تشریح کر ہی لی جو کچھ یوں تھی۔

"کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا محمود' جس کا ایک غلام تھا ایاز' ایک دفعہ بادشاہ محمود اپنے دشمن کے ساتھ جنگ کر رہا تھا لڑتے لڑتے عصر کی نماز کا وقت ہو گیا' محمود نے اپنے دشمن سے درخواست کی کہ ذرا ٹھہر جائیں ہمیں نماز ادا کر لینے دیں پھر باقی ماندہ لڑائی لڑیں گے۔" دشمن نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

اس طرح مسلمانوں نے جلدی جلدی صفیں باندھیں اور نماز پڑھنے لگے' اتفاق سے جب صفیں باندھی جا رہی تھیں تو محمود اور ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے' یہ بالکل لاشعوری طور پر ہوا ورنہ شاید ایسا نہ ہوتا۔

اب جبکہ وہ اپنی عبادت میں مشغول تھے' دشمن کو کسی نے بتایا کہ اگر مسلمان نماز پڑھ رہے ہوں تو بالکل بے جان اور موم کے پتلے ہوتے ہیں' اگر ان کو اس حالت میں قتل کر سکو تو ٹھیک ورنہ یہ تم سب کو مار دیں گے' دشمن نے موقع بہتر جانا اور شروع سے لے کر آخر تک سب کا صفایا کر دیا' یوں وہاں نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔"

علینہ طارق' لاہور

چوائس

ایک نوجوان کو چرچ میں پہلی بار دیکھ کر پادری نے کہا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے' آپ نیکی کے راستے پر آ گئے ضرور آپ کی دیندار بیوی نے آپ کو یہاں آنے کی تلقین کی ہو گی۔"

نوجوان بولا۔

"جی ہاں مجھے دو باتوں میں سے ایک کو چننا تھا' آپ کا وعظ سنوں یا اس کو۔"

مہناز فاطمہ' خوشاب

غلط الزام

ایک شخص نے پردیس سے اپنی محبوبہ کو خط لکھا جس کے آخری الفاظ یہ تھے "میں تمہیں اور بھی بہت سی باتیں لکھنا چاہتا تھا' لیکن مشکل یہ ہے کہ سینسر آفس خطوط کو کھول لیتا ہے!" تیسرے دن اس شخص کو سینسر آفس کی طرف سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا "ہم خط نہیں کھولا کرتے۔ یہ ہم پر غلط الزام ہے۔"

(حرا قریشی' بلال کالونی ملتان)

جان

ایک بچے نے اپنی ماں سے پوچھا۔ "ممی کیا آپ کو معلوم ہے جان کدھر سے جاتی ہے؟" ماں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید منہ سے ناک سے یا پھر آنکھوں سے" بچے نے کہا۔

"نہیں امی آپ غلط کہہ رہی ہیں۔"

جان ہمیشہ کھڑکی کے راستے جاتی ہے۔ کل ابا جان

نوکرانی کی لڑکی سے کہہ رہے تھے۔ جان کھڑکی سے کر نہ جانا۔" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔
عینی سحر کانگڑہ کالونی (ہری پور ہزارہ)

وجہ پریشانی

ایک عورت نے ویٹر کو اپنی میز پر بلایا اور ایک بے حد حسین نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا "تم اس خوب صورت نوجوان کو دیکھ رہے ہو؟
میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔
وہ مجھے کافی دیر سے تنگ کیے جا رہا ہے۔"
ویٹر نوجوان کی حمایت میں بولا۔ "محترمہ 'وہ تو آپ کو دیکھ بھی نہیں رہا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

عورت بے چارگی سے بولی۔ "یہی تو ساری پریشانی ہے کہ وہ مجھے دیکھ نہیں رہا۔"
سمعیہ ادریس۔ کراچی

سنجیدہ

مالکن نے گھر کی نوجوان ملازمہ سے کہا۔ "میں دیکھ رہی ہوں پڑوس کا مالی اکثر نظر بچا کر تم سے ملنے کے لیے آنے لگا ہے تمہارے بھلے کے لیے پوچھ رہی ہوں.... وہ یونہی دل لگی کے لیے آتا ہے یا تم سے شادی کے معاملے میں سنجیدہ ہے؟"
"میرے خیال میں تو سنجیدہ ہی ہے بی بی جی!" ملازمہ نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "اس نے تو میرے پکائے ہوئے کھانوں میں نقص نکالنے بھی شروع کر دیے ہیں۔"
نور آمنہ' رحیم یار خان

کیسا لگتا ہے

شوہر نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "بتاؤ کیسا لگتا ہے' جب میں آس پاس نہیں ہوتا جب میں گھر پر نہیں ہوتا۔ جب تم بالکل تنہا ہوتی ہو۔ جب تم سے کوئی پانی نہیں مانگتا' جب تم سے کوئی کھانا دینے کا تقاضا نہیں کرتا؟"
بیوی نے سوچتے ہوئے جواب دیا "ایسا لگتا ہے کہ میں ابھی تک غیر شادی شدہ ہوں اور خوشحال زندگی گزار رہی ہوں۔"

خطرے کا سائرن

ایک لڑکی کو گانا گانے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنی آواز کا ٹیسٹ کروانے کے لیے گانا گا چکی تو اس نے پوچھا۔
"جناب میری آواز آپ کو کیسی لگی؟"
آواز ٹیسٹ کرنے والے شخص نے جواب دیا۔
"خطرے کے سائرن کے لیے آپ کی آواز نہایت ہی موزوں ہے۔"
انعمتا خان۔ پشاور

جنت

بیوی "لگتا ہے کہ جنت میں شوہر کو بیوی کے ساتھ نہیں رہنے دیں گے۔"
شوہر "صحیح سنا ہے۔"
بیوی "ایسا کیوں؟"
شوہر "پگلی اسی لیے تو اسے جنت کہتے ہیں۔"
نسرین فاطمہ۔ کھوکھراپار

ضمیر کے کچوکے

ایک قرض خواہ نے اپنے دوست کو خط لکھا۔ "پیارے اسلم! آپ کو سو روپے کا منی آرڈر مل گیا ہوگا' جو میں نے آپ سے ادھار لیا تھا۔ ضمیر کے کچوکے مجھے سونے نہیں دیتے ساری رات جاگ کے گزارتا ہوں اس لیے روپے واپس بھجوائے ہیں۔"
اگر اب بھی نیند نہ آئی تو باقی کے نو سو روپے بھی بھجوا دوں گا۔

سیدہ ارم امید بخاری'

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

• مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ کفر سے مراد کبیرہ گناہ ہے یعنی یہ ایسا کام ہے جو مسلمان کے لائق نہیں، یہ تو کسی کافر کے کرنے کا کام ہے۔

2۔ جن کاموں کو کفر کے کام یا جاہلیت کے کام کہا جاتا ہے، ان سے انتہائی پرہیز کرنا چاہیے۔

زیادہ میٹھا،

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"جب کوئی آپ کا دل دکھائے تو ناراض نہ ہونا کیونکہ جس درخت کا پھل زیادہ میٹھا ہوتا ہے لوگ اسے زیادہ پتھر مارتے ہیں۔"

عمارہ رفیق۔ فاضل پور

یقین،

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"میں پوری زندگی میں صرف ایک رات سکون سے سویا۔"

پوچھا گیا۔ "وہ کون سی رات؟"

"آپ نے فرمایا۔" جس رات سرکار دو عالم۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی میرے بستر پر سو جاؤ اور کل صبح تم لوگوں کی امانتیں واپس کر کے مدینے آ جانا کیونکہ صرف اس رات مجھے یقین تھا کہ میں صبح زندہ اٹھوں گا۔"

صفیہ جعفر۔ کھوہ جیوے والا

خاموشی،

جیسے تم لوگ بات کرنا سیکھتے ہو، ایسے ہی خاموش رہنا بھی سیکھو کیونکہ خاموش رہنا بہت بڑی بُرد باری ہے اور تمہیں بولنے سے زیادہ سننے کا شوق ہونا چاہیے۔

اور کبھی لایعنی ... نہ بولو۔ ہنسی کی بات کے بغیر مت ہنسو اور بلا ضرورت کسی جگہ مت جاؤ"۔

(حیاۃ الصحابہ)

حنا سلیم اعوان۔ آغوں باندی ہری پور

حاصل،

ایک شخص باقاعدگی سے عبادت کرتا تھا۔ ایک آدمی نے اس سے پوچھا۔

"تم نے اس عبادت سے کیا حاصل کیا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں لیکن میں نے کچھ چیزوں سے نجات پالی ہے۔ پریشانیاں، غصہ، انا حرص، ڈپریشن، موت کا خوف اور بہت سی برائیوں سے نجات حاصل کر چکا ہوں"۔

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

محبت،

☆ محبت اپنی مرضی سے کھلے پنجرے میں طوطے کی طرح بیٹھے رہنے کی صلاحیت ہے۔

(بانو قدسیہ۔ حاصل گھاٹ)

☆ محبت کسی کے لیے اپنی جان قربان کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جان تو اللہ کی امانت ہے ہمارے پاس۔ محبت تو کسی کی رضا اور خوشی کے لیے اپنی رضا اور خوشی قربان کرنے کا نام ہے۔

(من چلے کا سودا۔ اشفاق احمد)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

جنگ اور امن

کسی نے سقراط سے پوچھا: "جنگ کیا ہے اور امن کیا ہے؟"

سقراط نے جواب دیا: "امن وہ زمانہ ہے جب جوان بوڑھوں کی لاشوں کو کندھوں پر اٹھا کر قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔ اور جنگ وہ زمانہ ہے جب بوڑھے جوانوں کی لاشوں کو اپنے کمزور و نحیف کندھوں پر اٹھا کر قبرستان پہنچاتے ہیں۔"

عزالہ ایمان۔ ملکانی شریف

بہت سے راستے

یانگ زی کے ایک پڑوسی کی بھیڑ کھو گئی تو اس نے سارے نوکروں کو حکم دیا کہ بھیڑ ڈھونڈ کر لائیں اور یانگ زی کے نوکر سے بھی کہا کہ بھیڑ تلاش کرے۔

"ہائیں!" یانگ زی حیرت زدہ ہو گیا۔ "ایک بھیڑ ڈھونڈنے کے لیے تم اتنے سارے آدمیوں کو بھیج رہے ہو؟"

"دیکھیے ناں، اتنے بہت سے راستے ہیں، جانے بھیڑ کس راستے پر چل پڑی ہو؟" پڑوسی نے وضاحت کی۔

نوکر لوٹ کر آیا تو یانگ زی نے پوچھا۔ "کہو، بھیڑ ملی؟"

اس نے نفی میں جواب دیا تو یانگ زی نے ناکامی کی وجہ پوچھی۔ "اتنے بہت سے راستے ہیں۔" نوکر نے جواب دیا۔ "ایک راستہ دوسرے سے جا ملتا تھا اور ہم فیصلہ نہ کر پائے کہ کون سے راستے پر تلاش کریں، چنانچہ لوٹ آئے۔"

یہ سن کر یانگ زی کسی سوچ میں غرق ہو گیا۔ وہ دیر تک چپ چاپ رہا اور دن بھر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے غائب رہی۔

اس کے شاگرد بڑے متعجب ہوئے۔

"بھیڑ کی گمشدگی معمولی سی بات ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اور پھر وہ بھیڑ آپ کی تھی بھی نہیں، آپ نے کیوں چپ سادھ لی اور مسکرانا بند کر دیا؟"

یانگ زی نے کوئی جواب نہ دیا اور شاگرد مزید مخمصے میں پڑ گئے۔ ایک شاگرد جس کا نام منگ شنگ یانگ تھا، شین تو زی کے پاس پہنچا اور سارا قصہ بیان کر دیا۔

شین تو زی نے جواب دیا۔ "جب بہت سے راستے ہوں تو آدمی اپنی بھیڑ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اسی طرح جب شاگرد طرح طرح کی دلچسپیاں اپنا لیں تو محنت سے جی چرانے لگتے ہیں۔ سارے علم کا منبع ایک، مگر علم کی شاخیں بے شمار ہیں۔ انسان بنیادی سچائی کی طرف رجوع کے بعد ہی گمراہی سے بچ سکتا ہے۔ تم یانگ زی کے شاگرد ہو اور اس سے تحصیل علم کرتے ہو، پھر بھی لگتا ہے تم اسے پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔"

(چین کی بہترین قدیم حکایتیں۔ مترجم: رشید بٹ)

عذرا ناصر۔ اقصیٰ ناصر۔ کراچی

ہٹلر

☆ عام لوگ کسی کمزور یا تامل کرنے والے شخص کی ذات سے اتنا متاثر نہیں ہوتے جتنا جری اور فاتح کے پکے آدمی کا اثر قبول کرتے ہیں۔

☆ جو قوم اپنی مرضی سے مطیع ہو جاتی ہے وہ اپنی سیرت کی جڑوں کو خود ہی کمزور کر لیتی ہے۔

☆ ایک بزدل آدمی کے ہاتھ میں دس پستول بھی پکڑا دو، جب اس پر حملہ ہو گا تو وہ ایک گولی بھی نہیں چلا سکے گا، لیکن بہادر بے دست و پا بھی میدان فتح کر لے گا۔

☆ حضرات آپ ہمارا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تاریخ کی ابدی عدالت نے یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ بہادر وقتی طور پر ہار سکتے ہیں لیکن شکست نہیں کھا سکتے۔ بکھر سکتے ہیں مٹ نہیں سکتے۔

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

میں کیوں نہ اللہ سے مانگوں

ایک بادشاہ شکار کرتے ہوئے کہیں دور نکل گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک دیہاتی شخص سے ہوئی۔ اس نے عزت و اکرام کا معاملہ کیا۔ بادشاہ نے کہا۔

"میں بادشاہ ہوں، اگر تمہیں کبھی کوئی ضرورت ہو تو دارالحکومت چلے آنا۔"

کافی عرصے بعد وہ شخص دارالحکومت آیا۔ دیکھا کہ بادشاہ مصلے پر بیٹھا دعا مانگ رہا ہے۔ اس نے بادشاہ سے پوچھا۔

"تم کس سے مانگ رہے ہو جبکہ تم تو خود بادشاہ ہو۔"

اس نے بتایا "میں رب العالمین سے مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر دیہاتی نے کہا۔ "جب تم بادشاہ ہو کر خدا کے محتاج ہو تو میں بھی صرف اسی سے مانگوں گا اور اب مجھے تم سے سوال کرنے کی حاجت نہیں۔"

(انمول موتی۔ جلد 6)

صدف عمران۔ کراچی

شیخ سعدیؒ نے کہا ہے

- دلوں میں اترنے کے لیے سیڑھیوں کی نہیں بلکہ اچھے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔
- توبہ کرنے والوں کی صحبت میں بیٹھو کیونکہ وہ سب سے زیادہ نرم دل ہوتے ہیں۔
- زندگی میں قسم، قدم اور قلم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔
- اگر آخرت میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اس دنیا میں اپنے رب کی مرضی کی زندگی گزارو۔
- تو پاک رہ اور کسی کا خوف نہ کر کیونکہ ناپاک کپڑے کو ہی دھوبی پتھر پر کوٹتے ہیں۔
- سچائی خدا کے راضی ہونے کا سبب ہے۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا، سیدھے رستے پر جو بھٹکا ہو۔
- تعلیم انسان کو بولنا سکھا دیتی ہے مگر یہ نہیں سکھاتی کہ کب اور کتنا بولنا ہے۔
- دن کی روشنی میں رزق تلاش کرو اور رات کو اس کو تلاش کرو، جو رزق دیتا ہے۔

نوال افضل گھمن۔ لاہور

راز کا افشا

سکندر بادشاہ نے اپنے ایک مصاحب کو اپنا ایک راز بتا کر اسے کسی پر ظاہر نہ کرنے کی ہدایت کی تھی سکندر کو پتا چلا کہ اس نے یہ راز کسی پر ظاہر کر دیا ہے۔ اس نے ارسطو کو جو اس کا استاد تھا، پورا واقعہ سنایا اور پوچھا کہ اس شخص کی کیا سزا ہے جو کسی کا راز فاش کر دے۔ ارسطو نے کہا۔ "اس شخص کا کوئی قصور نہیں۔ اپنے راز کو تم نے خود فاش کیا ہے۔ جو راز تم خود دل میں نہ رکھ سکے، دوسرا کیسے رکھ سکتا ہے۔"

اقصیٰ ناصر۔ عذرا ناصر۔ کراچی

کوزے

- دریا اور زندگی دونوں پر مضبوط بند باندھنا پڑتا ہے تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دریا کو مٹی کا بند درکار ہوتا ہے اور پیکر خاکی کو ضبط کا مضبوط بند۔
- جب دعا سے بھی بات نہ بنے تو فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔
- کمزور لمحے ہر انسان پر آتے ہیں۔ اگر ہم ان کمزور لمحوں کی گرفت سے نکل جائیں تو انسانیت کی معراج کو چھو لیتے ہیں۔
- جو احساس اندر سے جنم لیتا ہے اور باہر نکلتا ہے، وہ شخصیت کو سنوارتا ہے "باہر" کا احساس اندر نہ جانے دو، ورنہ شخصیت شکستہ ہو جاتی ہے۔
- عقل مند کا سینہ اس کے رازوں کا بہترین صندوق ہے۔
- انسان کو اپنے پچھلے گناہ اس وقت یاد آتے ہیں جب مزید گناہ کرنے کی سکت نہ ہو۔
- مجلس میں زبان پر، غصے میں ہاتھ پر اور دسترخوان پر بھوک پر قابو رکھنے والا کئی پریشانیوں اور بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

حرا قریشی ـــــ ملتان

یہ سوچ کر کہ غم کے خریدار آگئے
ہم خواب بیچنے سرِ بازار آگئے
آواز دے کے چھپ گئی ہر بار زندگی
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آگئے

عندرا یاسر، اقصیٰ ناصر ـــــ کراچی

تو عالم ہے سمجھتا ہے کتابوں کی زباں
میرا چہرہ بھی پڑھ میرے حالات بتا
بس ہو جائے مجھے تیری محبت حاصل
تو کوئی ایسی دعا ایسی مناجات بتا

سیدہ نسبت زہرا ـــــ کہروڑ پکا

میری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار کون روکے گا
فصیلِ آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا

حورین زینب ـــــ کہروڑ پکا

للہ! آپ مجھ سے محبت نہ کیجیے
دو روز ہی میں آپ کا چہرہ اتر گیا
پہلے تو زندگی کی تمنا تھی عشق میں
اب ڈھونڈتا ہوں کہ میرا قاتل کدھر گیا

صائمہ جبی ـــــ کراچی

صحرا کی طرح رہتے ہوئے تھک گئیں آنکھیں
دکھ کہتا ہے اب کوئی دریا بھی تو دیکھوں
یہ کیا کہ وہ جب چاہے چھین لے مجھ سے
اپنے لیے وہ شخص تڑپتا بھی تو دیکھوں

مدیحہ فہید ـــــ کورنگی

میرے لفظوں کو اتنی شدت سے نہ پڑھا کرو
کچھ یاد رہ گئے تو بھول نہیں پاؤ گے

ندا، فضہ ـــــ فیصل آباد

وہی ہوں میں، مرا دل بھی وہی، جنوں بھی وہی
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا، یہی مزاج اپنا
متاعِ درد سب ہی پر نثار اپنی ہو

اریبہ شمشاد، منیبہ شمشاد ـــــ باغ آزاد کشمیر

وہ کھیل تھا، مذاق تھا یا خوف تھا کوئی
اک چال چل کے اس نے مہرہ بدل دیا
کرتا رہا اسیری کے احساس کو شدید
زنجیر کھول دی، کبھی پہرہ بدل دیا

عائشہ، تحریم ـــــ گوجرہ

کوئی تو اس ہوا سے پوچھتا یہ محسن
ملا کیا ہے اسے کلیوں کو بے ثمر کر کے

عائشہ فاطمہ ـــــ لودھراں

کئی اور اہلِ طلب ملے مجھے راہِ شوق میں ہم قدم
جنہیں کر رہا تھا تلاش میں وہی لوگ مجھ کو ملے نہیں

فرحت ناز ـــــ گاؤں ہڈالی

محبت میں ان کی شدت ہی اس قدر تھی ساقی
گر اقرار سونپ آتے تو وہ جان سے گزر جاتے

گیلانی سسٹرز ـــــ کہروڑ پکا

کوئی تو ایسی بات کرو
جس سے لگے تم میرے ہو

کائنات اصغر لعندار ـــــ ڈہرکی

کمال کرتے ہو اے دل تم بھی
اسے فرصت نہیں، تمہیں چین نہیں

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔

غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی، نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا، طعنے تشنے ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ن۔ف، کراچی

اس ماہ سوالنامہ دیکھ کر بے ساختہ دل میں خواہش بیدار ہوئی کہ اس کے جوابات میں اپنی زندگی کا تجربہ شامل کر کے بہنوں کی خدمت میں پیش کروں اور یہ احساس دلاؤں کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہوتی کانٹوں کی رہ گزر بھی ہوتی ہے۔ لڑکی کو کبھی بھی بہت ساری توقعات کو دل میں جگہ دے کر نئے گھر میں قدم نہیں رکھنا چاہیے بلکہ یہ سوچ کر اپنی زندگی شروع کرنا چاہیے کہ اگر سراہیں تو مہربانی ہے ورنہ کسی خدمت کا حاصل کم ہی ملتا ہے۔ اب آتے ہیں اس سوال نامے کی طرف جو کہ بے حد خوب صورت اور آنے والی لڑکیوں کے لیے ایک روشن دریچہ ہے، جہاں سے وہ مستقبل میں جھانک سکتی ہیں۔

س۔ "شادی کب ہوئی؟"

ج۔ جناب ہماری شادی 19 اگست 2005ء کو ہوئی۔ جب لوگ تین دن پہلے جشن آزادی کی خوشیاں منا رہے تھے اور ہم اپنی زندگی کے نئے دائرے میں قید ہونے کے لیے بخوشی تیار تھے۔

ج۔ "شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟"

ج۔ "شادی سے پہلے کے مشاغل میں پڑھائی۔ کزنز کے ساتھ گپیں لگانا، حنا رانا، نادیہ الیاس، شیخ کو لمبے لمبے خط لکھنا ڈائجسٹ کو چاٹ جانا۔ نت نئے تجربے کر کے کھانا بنانا اور داد وصول کرنا۔ مہمانوں کی مہمان نوازی کرنا۔ پانچ سال اسکول جاب کرنا۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنا۔ صوفے کی ہتھی پر بیٹھ کر افسانے لکھنا۔ امی لاکھ کہتیں۔ صوفے پر آرام سے بیٹھ کر لکھ لو، مگر جناب ہم پہ کہاں اثر ہوتا تھا۔ جو مزہ ہتھی پر بیٹھ کر کشن پر پاؤں رکھ کر لکھنے میں تھا وہ آرام سے بیٹھ کر کہاں؟

شادی سے پہلے تمام افسانے اسی طرح بیٹھ کر لکھے، میز کرسی پر بیٹھ کر لکھنا مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میٹرک کے پیپر دے رہی ہوں۔ آج بھی گھر میں رائٹنگ چیئر بچوں کے جمپ لگانے میں استعمال ہوتی ہے۔ میرا ایک اسٹوڈنٹ عامر مجھے کتابیں لا کر دیتا تھا۔

میں اسے اپنے مطلوبہ پرچے کا نام بتاتی اور وہ لے آتا۔ دن میں تین چکر بھی لگانے پڑتے تو لگاتا۔ میرے افسانے بھی وہی پوسٹ کرتا اب بھی میرے شوہر سستی دکھاتے ہیں تو عامر شدت سے یاد آتا ہے۔ خدا خوش رکھے اسے ہمیشہ۔ اب تو ماشاء اللہ کافی بڑا ہو گیا۔ ہر ماہ یہ سب چاٹ جانے کے بعد بھی نواب بک ڈپو اینڈ لائبریری سے کتابیں

لے کر آنا بھی میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کتنے سہانے دن تھے وہ؟"

س ۔ "اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟"

ج ۔ یہ بالکل افسانوی روداد ہے۔ سوچوں تو ہنسی آتی ہے۔ میری ساس میری سب سے بڑی پھپھو ہیں۔ اور ابو سب سے چھوٹے بھائی۔ صاحب ان کی آخری اولاد ہیں اور میں پہلی۔

ایک مرتبہ پھپھو ابو سے باتیں کر رہی تھیں کہ "تیری ایک بیٹی میں لوں گی" اس وقت تک میری چھوٹی بہن فوزیہ بھی پیدا ہو چکی تھی۔

ابو نے جواب دیا "آپا ابھی بچے چھوٹے ہیں بڑے ہوں گے تو دیکھیں گے اگر ان کے رجحانات ملے تو رشتہ کر دیں گے۔"

اس وقت صاحب کی عمر دس سال تھی۔ انہوں نے یہ بات سن لی اور بہت خوش ہوئے' ساتھ سوچ لیا کہ میری شادی ماموں کی بیٹی سے ہوگی۔ لیکن کون سی بیٹی سے 'اس بات کا موصوف کو علم ہی نہیں تھا۔ خیر عمر کے ساتھ یہ خیال پختہ ہوتا گیا۔ ہم لوگ ان کے گھر نہیں جاتے تھے کیونکہ ہم عمر کوئی لڑکی نہیں چار عدد لڑکے تھے اور پھپھو جاب کرتی تھیں۔

صبح سب نکل جاتے شام کو لوٹتے ایسے میں آنے والا مہمان دیواروں سے سر ٹکرانے کے سوا کچھ نہ کرتا۔ پھپھو سال دو سال بعد چکر لگا لیتی تھیں۔ صاحب اٹھارہ سال کے ہوئے تو وہ حیدر آباد میری سب سے چھوٹی پھپھو کی شادی میں آئے۔ جو ابو کے بعد آخری اولاد تھیں ان کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ یہ کانگو بہت اچھا بجاتے تھے سو ہم انہیں گھیر گھار کر گانوں کی تیاری میں مصروف ہوئے بقول ان کے اسی وقت انہوں نے مجھے پسند کیا تھا۔

شادی سکون سے گزر گئی۔ یہ صاحب شادی کے بعد رک گئے۔ ہمیں کیا اعتراض ہونا تھا۔ ان کی نانی کا گھر تھا۔ اور ویسے بھی ہمارے گھر بہت مہمان آتے تھے۔ اس کی وجہ امی ابو کی مہمان نوازی تھی۔ کتنے ہی لوگ آتے۔ امی صبح صبح اٹھ کر سب لوگوں کو پراٹھے کا ناشتہ کراتیں۔ خستہ۔ نرم۔ مزے دار پراٹھے آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔

یہ موصوف پورا ایک مہینہ رہے' لوگوں نے باتیں بنائیں۔ امی نے منع کر دیا کہ زیادہ باتیں مت کیا کرو۔ خیال رکھو۔ اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ سو میں نے بالکل بات چیت بند کر دی۔

لگ بھگ پانچ سال کا عرصہ گزر گیا۔ ان پانچ سالوں میں صاحب نے کئی بار کوشش کی مگر میں نے دوبارہ بات نہیں کی' کچی عمر میں انا پر ٹھیس لگی تھی۔ اتنے چھوٹے تھے ہم ۔ اور لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ وقت گزرتا گیا میرے بات چیت بند کرنے کے باوجود صاحب نے آنا نہ چھوڑا۔

اس دوران میں نے سنا کہ صاحب کی کراچی میں کسی لڑکی سے دوستی ہے۔ ان کے بھائی کی شادی قریب تھی۔ ہم بات نہ کرتے تھے۔ لوگوں کو تب بھی پریشانی تھی۔ کیا بات ہے؟ لڑائی ہے۔ بات کیوں نہیں کرتے۔؟ ایسے سوالوں سے تنگ آکر میں نے سوچا کہ نارمل بات کروں تاکہ سوال کرنے والوں کا منہ بند ہو سکے۔ ویسے بھی تقریباً" سب لوگوں کو صاحب کی انہی پڑوسن لڑکی سے دوستی کا علم تھا دونوں ساتھ پڑھے اور کھیلے کودے تھے۔ اس وقت تک مجھے علم نہ ہو سکا تھا کہ میں ہی صاحب کی پسند ہوں۔ جب ان کے بھائی کی شادی میں' میں نے لڑکی کو دیکھا تو وہ بہت اچھی لگی۔ میں نے صاحب سے کہا کہ یہ لڑکی اتنی اچھی ہے رشتہ مانگ کر منگنی کر لو تاکہ تعلق مضبوط ہو۔

تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ "مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔ یہ میری صرف دوست ہے۔"

میں ٹھٹک گئی۔ "پھر وہ کون ہے؟" دو دن تو میں سوال کرتی رہی اور وہ آئیں بائیں شائیں کرتے رہے۔ جس دن مجھے حیدر آباد جانا تھا۔ اس دن کہنے لگے۔

"تم پوچھ رہی تھیں ناں! کہ وہ لڑکی کون ہے۔ جس سے مجھے شادی کرنی ہے۔ میں نے کہا ہاں بتاؤ ناں۔ دو دن سے سسپنس پھیلا رکھا ہے۔" انہوں نے دھماکا کیا۔ "تم ہو وہ لڑکی" اور یہ کہہ کر باہر غائب (دہشت جو ہماری بہت تھی) میں ہکا بکا حیران پریشان رہ گئی۔

اسی الجھن میں حیدر آباد آگئے۔ انہوں نے فون کیا اور ساری روداد سنائی۔ میں نے امی سے کہا۔ امی نے ابو سے بات کی۔ ابو نے کہا کہ اسٹیبلش ہو جائے تو رشتہ کر دیں گے۔

صاحب کے دل کی کلی۔ کھل گئی۔ پھر انہوں نے بہت محنت کی مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔

پھپھو نے پرپوزل دیا۔ مگر ابو نہیں مانے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ

لوگوں کو اچھا لگے تو رشتہ کرنا صرف میری پسند مت دیکھیے گا۔ آپ کو جو بھی پسند ہو گا مجھے پسند ہو گا۔

مگر دل میں صاحب کی کامیابی کے لیے دعا کرتی تھی کہ جتنی محنت وہ کر رہے ہیں' اس کا پھل ملے مگر صرف ناکامی ہی ناکامی تھی۔ کئی لوگوں نے کہا کہ اس کا نصیب نہیں مل رہا پیسہ لڑکی کے نصیب سے ہوتا ہے۔ لگ بھگ چار سال کے بعد ابو مان گئے۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ "تم بہت حمایت کرتی ہو صابر (امی کا نام صابرہ ہے مگر ابو صابر کہتے تھے) اگر میری بٹی کو کچھ دکھ ہوا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور امی کو یہ یقین کہ صاحب میرا بہت خیال رکھیں گے۔ اور یہ خیال بعد میں درست ثابت ہوا۔"

س ۔ "ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا؟ وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟"

ج ۔ "جیون ساتھی کے حوالے سے کبھی کچھ نہیں سوچا تھا کہ وہ خوب صورت ہو لمبا ہو' امیر ہو' میرے خیالات الفا براوو چارلی کی شہناز جیسے تھے کہ میں خود مضبوط اور باصلاحیت ہوں۔ مجھے دوسرے کے اہم اور خوب صورت ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ فراز کو چھوڑ کر گل شیر سے شادی کرتی ہے۔"

مجھے اپنے گھر میں بڑی ہونے کے ناتے بہت اہم مقام حاصل تھا۔ ڈائجسٹوں میں پائی جانے والی آپاؤں والی خصوصیات لیے میں سب کی آپی تھی۔ ہاں مجھے کردار کی مضبوطی ہمیشہ سے پسند رہی فلرٹ نظرباز لوگ مجھ سے کبھی برداشت نہیں ہوئے۔ صاحب کی طرف متوجہ ہونے کا سبب بھی یہی تھا۔ وہ ہمارے گھر آتے رہے مگر ان کے انداز میں چھچھورپن نہیں ہوتا تھا۔ ہاں خیال رکھنے والا بندہ چاہیے تھا جو غصے کا تیز نہ ہو۔ کیونکہ میرے والد غصے کے بہت تیز تھے مگر صرف امی کے لیے۔ صاحب میں یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹے تھے مگر گھر کا خیال رکھتے تھے اور اس خیال رکھنے والی عادت نے ہی ان کا خیال دل میں ڈالا۔

باقی شکل و صورت وغیرہ جیسی ظاہری خوبیاں الحمدللہ۔۔۔ اللہ عزوجل کی طرف سے تحفہ ہیں۔"

س ۔ "منگنی کتنا عرصہ رہی؟ شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟"

ج ۔ "بات تو جناب ہمارے جھولے میں جھولنے والے دنوں میں ہی طے ہو گئی تھی۔ جب صاحب نے مجھے پرپوز کیا تو وہ 97ء کا دور تھا۔ اس کے بعد خود کو مستحکم مالی پوزیشن میں لانے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ باقاعدہ رشتہ 2001ء میں آیا جہاں تک بات کا سوال ہے وہ ہمارے گھر آتے تھے۔ ایک ایک ہفتہ رک کر بھی گئے مگر میں نے بات نہیں کی۔ ہاں لمبے لمبے خطوط لکھتے تھے۔

جب رشتہ طے ہوا اور ان کے آنے پر پابندی لگی۔ جس کا آغاز پیارے ماموں اور ممانی سے ہوتا تھا اور اختتام فقط آپ کا بھانجے رہوتا تھا۔ ان ہی خطوں سے حالات کا پتا چل جاتا تھا خط لکھنا' پوسٹ کرنا اور انتظار کرنا کہ اب پہنچ چکا ہو گا۔ پھر آنے کا انتظار کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ حالانکہ خط کا جواب ہمیشہ فوزیہ لکھتی تھی۔ کافی عرصہ وہ اپنی طرف سے مجھے یقین دلاتے رہے کہ وہ مجھے عزت کے ساتھ اپنانا چاہتے ہیں' جب رشتہ طے ہوا تو ان دنوں مسائل بے حد تھے۔ گھر بنانا تھا۔ بزنس میں پے در پے نقصانات کی بنا پر ذہنی پریشانی تھی۔ سو وہ منگیتروں والی بات چیت نہیں ہوئی۔ گھریلو مسائل پر ہی بات ہوئی۔

6 ۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟"

ج۔ یہ سوال تو ایک جلتا ہوا انگارہ ہے' جو دل کی جگہ موجود ہر دم سلگتا رہتا ہے۔ ابو کے دو بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ ہمارے تایا پسند کی شادی کی خاطر گھر چھوڑ کر نکل گئے اور کبھی کسی کو پلٹ نہیں پوچھا۔ ایک شہر میں رہنے کے باوجود تعلق نہ رکھا۔ میں نے بچپن سے اپنے گھر میں کسی نہ کسی کزن کی رہائش دیکھی۔ کبھی ایک پھوپھو اپنا بیٹا چھوڑ جاتیں۔ "بھائی۔ یہ برے لڑکوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا ہے' خیال کرنا۔" اور ابو ان کا خیال رکھتے جب انسان کا بچہ بن جاتا تو بھیج دیتے۔

پھوپھو کے انتقال کے بعد ان کے بچے گھر میں رہے۔ سب لوگ ہی آتے تھے اور ابو بڑی فیاضی سے خرچ کرتے ان کا مزاج شاہانہ تھا۔ پیسہ ہاتھ کا میل تھا۔ بے دھڑک خرچ کرتے' کوئی لینڈ لارڈ نہ تھے مگر کبھی پیسے سے محبت نہ کی' کوئی تہوار ایسا نہ تھا کہ گھر میں کوئی نہ آتا ہو۔ خاص طور پر محرم الحرام اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیدر آباد میں پھلیلی بریٹ آباد کے علاقوں میں دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ سو کراچی والوں کا حیدر آباد دیکھنے آنا روایت سی بن گئی تھی۔

ہمارا دسترخوان وسیع رہا اور دروازے کھلے رہے۔ امی مجتبی میکے والوں سے زیادہ سسرال والوں کی خدمت کرنے والی۔ سب کا خیال رکھنا۔ یہ ہمارے گھر کی روایات تھیں۔ سو یہ ہی سوچا سکے لوگوں میں جا رہی ہوں۔ خوب واہ واہ ہوگی۔ نندوں کے بچے جو کچھ عمر میں بڑے اور کچھ میرے برابر تھے خوب دوستی ہوگی۔ رات کو محفلیں لگیں گی' جیسے حیدر آباد میں ہوتا تھا۔ سب خیال رکھیں گے۔ آخر بچپن سے سب خاندان والوں کو جہاں عزت و محبت ملی وہ ہمارا ہی تو گھر تھا اور رہنے والے ہمارے والدین.....

مگر جناب سپنوں کا محل دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔ جس اعتماد سے رخصت ہوکر آئی تھی وہ سمندر کی لہروں میں بہہ گیا۔ اپنے سسرالی بن گئے۔ رشتے بدل گئے۔ میں بھتیجی سے بہو اور بہن سے بھابھی بن گئی' تو خود بخود میرے وجود میں وہ کانٹے اگ آئے جو میرے سسرالیوں کے دل میں چبھنے لگے تھے۔ پھر وہ ہی ہوا جو کسی ڈرامے میں روتی دھوتی بہو کے ساتھ ہوتا ہے۔ شادی کرتے ہی سوائے صاحب کے سب ہی بدل گئے اور ایسے بدلے کہ آج تک ان دنوں کی خوشبو ڈھونڈتی ہوں جو بتائے تھے۔

س:۔ شادی کے لیے آپ کو اپنی تعلیم کی قربانی دینا پڑی یا کوئی اور.....؟

ج:۔ شادی کے لیے میں نے کوئی قربانی نہیں دی۔ ہاں اگر نہیں ہوتی تو ماسٹرز کرلیتی۔ بی ایس سی کرچکی تھی۔ سلائی کڑھائی' کھانا بنانا سب امی نے سکھا دیا تھا۔ انگلش لینگویج کا شوق تھا۔ وہ کورس بھی پورا کرلیا' فراٹے سے ڈائس پر انگلش میں لمبی تقریریں جھاڑ کر مقررہ ہونے کا فرض بھی ادا کرلیا۔ ٹیچر بن کر بچوں کو ڈنڈے لگانے تھے۔ سو جاب بھی کی۔ مگر ڈنڈے کم لگائے۔ صرف گھورنا کافی تھا۔ افسانے لکھنے کا شوق رہا' سو وہ بھی پورا ہوا۔ جناب شادی کے لیے کوئی خاص و عام قربانی نہ دی۔ سوائے والدین کو "اپنے شہر حیدر آباد اور بہن بھائیوں کے ساتھ کو چھوڑنے کے "اب کراچی سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا حیدر آباد سے تھا۔ شاید ساری قربانیاں مجھے شادی کے بعد دینی تھیں اور مسلسل دینی تھیں' اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے کوئی آزمائش نہیں دی۔

س ۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی۔

ج ۔ شادی اس وقت خیر و خوبی سے انجام پائی جب تک حیدر آباد میں تھی۔ گھر آنے کے بعد تو جیسے سارا سکون کہیں معلق ہوگیا۔ ہماری نند نے اپنی چچازاد بہن کے گھر اپنی بیٹی کا رشتہ کیا تو ایک لاکھ روپے مہر اور گھر کا وہ حصہ جو وراثت میں لڑکے کے نام تھا۔ اس کے نام لکھوایا۔ ساتھ وہ سارا زیور جو دولہا والوں نے دیا تھا۔ لڑکے سے لڑکی کی ملکیت کرایا۔

جب ہماری بات آئی تو ابو نے صرف اتنا کہا کہ مہر وہی ہوگا جو اس سے پہلے جن بچیوں کی شادی ہوئی ہے۔ ان کا تھا' یعنی ایک لاکھ روپے۔ میری ننھیالی کزن کا بھی سب کا ایک لاکھ مہر اور آگے کچھ شرائط کے ساتھ 'مگر ابو نے کہا کہ مجھے کوئی شرط نہیں لکھوانی صرف مہر سب کے برابر ہو۔ بس ایک طوفان مچ گیا' شور شرابا' ہنگامہ 'ابو کے سامنے تو کسی نے بولنے کی ہمت نہیں کی مگر صاحب کا ایسا برین واش کیا کہ حد نہیں' انہوں نے مجھے فون کیا اور سب باتیں کہیں' جو ان کے ذہن میں ڈالی گئی تھیں۔

میں نے کہہ دیا "شادی ابو کی شرط پر ہی ہوگی۔ انہوں نے آپ کی بہن کی طرح زمین' جائیداد' زیور نہیں مانگے ہیں' اس پر بھی آپ راضی نہیں تو میری طرف سے سوری۔ میری وجہ سے میرے والد کو سرجھکا کر بات کرنی پڑے اور آپ کے گھر والے خوشی کے شادیانے بجائیں کہ میرے ابو کی بات رد کرکے اپنی مرضی کی۔ یہ شادی ہوتی ہے تو ہو' ورنہ بھاڑ میں جائے۔" اس کے بعد تو جو زبانیں ماموں' ممانی کہتے نہ تھکتی تھیں' زہر اگلنے لگیں۔ بیٹی پر رقم کھا رہے ہیں۔ بیچ رہے ہیں۔ ابھی لڑکے کے حالات ٹھیک نہیں' کہاں سے دے گا۔"

سارے گناہ ثواب یاد آگئے۔ ابو جھکنے لگے تھے مگر میں اپنے عالی شان وقار کے ساتھ کھڑے ابو کو جھکتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میری بہن کے سسرال والوں کو بھی بھڑکایا کہ ایک لاکھ مہر بہت ہوتا ہے' مت لکھنا مگر ان لوگوں نے آرام سے مان لیا۔ میں نے امی سے کہا "آپ ابو کو کہہ دیں۔ آپ مہر کم نہیں کریں گے' یہ اب ہماری عزت کا مسئلہ ہے فہیم راضی ہے' صرف ان کی بہن اس لیے ہنگامہ کررہی ہیں کہ میرا مہر ان کی بیٹی کے مہر کے برابر ہوجائے گا اور وہ فخر سے کیسے کہہ سکیں گی کہ میری بیٹی گری پڑی نہیں تھی جو ایسے ہی رشتہ کردوں۔ مضبوط مہر کے ساتھ رشتہ دیا ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے' جو سب کی سمجھ میں آرہی ہے۔"

آخر کار صاحب مان گئے اور یہ معاملے طے ہوا مگر ابو نے چھوٹی بہنوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ شادی میں کوئی رسم نہیں ہوگی' ہم ان کی کوئی رقم نہیں لیں گے' سو صرف سلامی کی رسم ہوئی' جس میں ہم لوگوں نے ان کو دیا۔ ان لوگوں سے کچھ نہیں لیا۔ ہاں یہ ضرور رہا کہ جس نے دلہن کے روپ میں مجھے اور فوزیہ کو دیکھا تو وہ مجھے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ آج بھی میں اپنا روپ دیکھتی ہوں تو حیرانی ہوتی ہے' یہ میں ہوں۔ صاحب کہتے ہیں یہ تم نہیں میرا پیار ہے جس نے تمہیں اتنا اچھا روپ دیا تھا۔ خیر گھر پہنچے تو میرا چکروں سے برا حال تھا۔ ہماری گاڑی پہلے پہنچ چکی تھی اور بس رات ڈھائی بجے آئی تھی۔ میرا روم ڈیکوریٹ ہو رہا تھا' تو مجھے آرام کرنے جٹھانی کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ آرام کیا تو حواس قابو میں آئے' سب پہنچ گئے تو کھیر کی رسم کرنی چاہی' جناب کھیر کی ڈش فریج سے غائب۔ کہاں گئی' کچھ پتا نہیں' کون کھا گیا۔ اب کیا کریں؟ سو رس گلوں سے رسم کی۔ آج بھی تصویریں دیکھتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔

شادی کے بعد

س ۔ "شادی کے بعد شوہر نے آپ کو پہلی بار دیکھ کر کیا کہا؟"

ج ۔ شادی کے بعد صاحب نے یہ کہا۔ "اف! تم نے تو تھکا دیا۔" لیجیے آتے ہی پہلا الزام۔

میں نماز نہیں پڑھ سکی' کیونکہ بیوٹیشن نے جو نقلی ناخن لگائے تھے ان کے ساتھ ایک سخت گلو کی تہ ناخنوں پر جم گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وضو نہ ہوتا۔ صرف سجدہ شکر ادا کیا۔ صاحب نے بہت کوشش کی کہ وہ تہ ہٹ جائے۔ دیکھیے جناب شادی کی رات دولہا صاحب مختلف اوزار ڈھونڈ رہے ہیں' جس سے دلہن کے ناخنوں پر جمی تہ اتاری جائے۔ تھک ہار کر چھوڑ دیا۔ پہلی بار تعریف کی کہ اچھی لگ رہی ہو اور جناب دس سال بعد بھی یہ صرف ایک ہی جملہ بنا کسی رد و بدل کے ٹیپ کے مصرعے کی طرح دہرا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ آج تک کوئی تعریف وصول نہیں کی۔

س ۔ "شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟"

ج ۔ "نہ پوچھیں.... سر سے پاؤں تک بدل گئی' سوائے چہرے کے نقوش کے سب بدل گیا۔ وزن' رنگت' دل' دماغ' سوچیں' خیالات' میں خود پر حیرت کرتی ہوں کہ کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔

شادی کے بعد میں نے اپنے اندر کی ضد.... اکڑ.... ہٹ دھرمی.... تنک مزاجی سب کو ختم کر دیا' ایک بات اور.... میں حد درجہ ہتھ چھٹ تھی' معمولی سی بات پر بھی چھوٹے بہن بھائی کو تھپڑ رسید کر دیتی تھی۔ پیار بھی بہت تھا مگر غصے پر قابو نہ تھا۔

شادی ہوتے ہی صاحب جاب لیس ہو گئے' وہ تین ماہ گھر میں رہے۔ ایک ماہ بیماری میں اور دو ماہ نوکری ڈھونڈتے ہوئے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ میرے لیے بہت اچھا ہوا۔ میں نے اپنا آپ مٹا کر اس گھر میں سب کی خدمت کی' مگر میری خوبیاں ہی میری خامیاں تھیں۔ میں اس گھر کی سب سے پڑھی لکھی بہو تھی۔ میرا میکہ خاندان کے مضبوط گھرانوں میں شامل تھا۔ سو دونوں جٹھانیوں نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے کمر کس لی۔ مجھ سے ایک ماہ پہلے جس جیٹھ کی شادی ہوئی۔ ان کی مسز الگ ہی حسد کے مرض میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اس میں کچھ لوگوں کا بھی قصور تھا۔ پتا نہیں لوگ تقابل کیوں شروع کر دیتے ہیں۔ نہ روزی تمہارا فرنیچر بہت اچھا ہے۔ اس کا تو عام سا ہے۔ تمہیں اچھا زیور ملا۔ اس کی ماں نے تو ایسے ہی چھلکے دیے ہیں' تمہاری پہناونی کے کپڑے اچھے ہیں۔ ان کے تو بالکل بے کار ہیں۔ یہ باتیں مجھے فخر میں نہیں ٹینشن میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ جس کی جتنی حیثیت تھی وہ اس نے دیا۔ جب بیٹی دے دی تو سب کچھ دے دیا مگر لوگوں کو کون سمجھائے۔

میرا سارا سامان مال مفت دل بے رحم تھا۔ جٹھانی صاحبہ نے بکس کھول کر پتیلیاں نکال لیں کہ چائے بنانے کے لیے ضرورت ہے اور میرے کٹلری سیٹ سے ایک چھری نکال کر رکھ لی۔ مکھن لگانے کے لیے چاہیے۔ بھلا بتائیے میرے آنے سے پہلے کیا انگلی سے سلائس پر مکھن لگاتے تھے۔ میں بول بھی نہ پائی کہ یہ سیٹ کی ہے۔

صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ سب کہتے ہیں غصے والی ہے۔ تمہارا جینا حرام کر دے گی۔ گھر میں بڑی ہے اور دب کر رہنا نہیں سیکھا باپ کی سر چڑھی ہے' ہم ان کی باتیں غلط ثابت کرنا اور میرے جیسی بن جاؤ نرم اور پیار والی۔

میں نے خود کو سر تا پا بدل لیا۔ ہم چار فیملیاں ایک ساتھ تھیں۔ دو جٹھانیاں ایک پورشن میں اور دو جٹھانیاں ایک پورشن میں۔ میں پورے گھر کی صفائی کرتی تو بچے مجھے

حیرت سے دیکھتے۔ جب اپنا کمرہ اور پورشن صاف کر کے جٹھانی کا کرتی تو ایک بار بچے نے پوچھ لیا۔

"آنی! آپ چاچی کا کمرہ صاف کرتی ہو' ہمارا کب کرو گی؟" لیکن صاحب کا جملہ اس گھر کو اپنا سمجھنا اور کام کے حوالے سے شکایت کا موقع مت دینا' تو جناب گھر میں آٹھ عدد مختلف سائز کے بچے تھے۔ جو میرے کمرے میں دھما چوکڑی مچاتے۔ میری نئی بیڈ شیٹ پر کودتے۔ ڈریسنگ کے قد آدم شیشے کو لٹو کی طرح گھماتے مگر میں نے چپ رہنا سیکھ لیا تھا اور یقین کریں کہ یہ سیکھنا پڑتا ہے۔ چاہے وہ حسینہ معین کی ہیروئن سنیعہ ہو یا "تنہائیاں" والی مرینہ خان اس جیسی لڑکی کو بھی سنجیدہ ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے میری ان ماؤں سے گزارش ہے کہ اپنی بچیوں کو پرائے گھر کی امیدیں نہ دلائیں۔ اپنے بابل کے آنگن میں اچھل کود کرنے دیں' کھل کر ہنسنے دیں' کیا پتا آنے والی زندگی میں یہ موقع مل سکے یا نہیں۔

س۔ "شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟"

ج۔ " 19 اگست کو شادی 21 کو ولیمہ 22 کو حیدر آباد روانگی۔ چار دن بعد واپسی' جب واپس کراچی آئی تو پھپھو (ساس) نے کہہ دیا کہ سب کے کچن الگ الگ ہیں۔ لہٰذا کوئی پکا کر نہیں کھلائے گا۔ ابھی شادی کو آٹھواں دن لگا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور کھیر بنالی۔ اپنا نیا کھیر سیٹ نکالا۔ سب کو سرو کیا۔ کھیر تو اچھی لگی مگر بناتے وقت میری جٹھانی صاحبہ کے مشورے.... چاول پیس کر ڈالو۔ اتنا چمچہ کیوں چلا رہی ہو۔ تیز میٹھا رکھنا۔ میں نے خاموشی سے اپنا کام کیا' کھیر بنی' کھائی اور منہ بنایا۔ اپنے گھر جیسی نہیں بنی۔ حالانکہ باقی سب کو پسند آئی۔

سب کو کھلا کر کچن میں آئی تو کھیر سیٹ کا بڑا ڈونگہ دو ٹکڑے ہوا پڑا تھا۔ اس پر بھاری بھرکم کھیر اور سالن کے پتیلے دھرے تھے۔ باوجود ضبط کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ سیٹ میرا بھائی راغب کوئٹہ سے لایا تھا۔ جب اس کی عمر لگ بھگ بیس سال ہوگی۔ امی نے سگھڑ ماؤں کی طرح سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی پاکٹ منی سے جمع کر کے میرے اور فوزیہ کے لیے دو سیٹ خریدے تھے۔ یہ میرے بھائی کا پیار تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ کیا ہوا؟" سب لوگ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے۔

نمبر تین نے کہا۔ "نمبر دو تم سے جلتی ہے' اس لیے توڑ دیا۔"

ایک نے منہ بنایا۔ "کیا اتنا کچا سامان دیا ہے جو ہاتھ لگاتے ہی ٹوٹ گیا۔" میں خاموشی سے اندر کمرے میں آ گئی۔ میری جٹھانی نے صاحب کو شکایت لگائی۔ تمہاری بیوی منہ بنا کر کمرے میں بیٹھی ہے۔ ایک پیالہ ٹوٹ گیا۔ بھئی بھرا پرا گھر ہے' دل بڑا کر کے رہنا پڑے گا۔

صاحب نے کمرے میں آکر کہا۔ "یار.... ایک باؤل کی وجہ سے کیوں ٹینشن کری ایٹ کر رہی ہو۔"

اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میری غیر شادی شدہ زندگی کا جو رخ صاحب جانتے ہیں اس کو ختم کر کے مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ اب میں ویسی نہیں ہوں' ورنہ صاحب بھی ان لوگوں کی باتوں میں آکر میرا ساتھ نہیں دیں گے۔

کھیر کے بعد تو جیسے کاموں کا بوجھ لاد دیا۔ کام بھی ایسے جو نظر نہ آئیں۔ مثلاً" آٹا گوندھ دو' روٹی میں بناؤں گی' سالن کی تیاری کر دو' میں بھونوں گی' میرے میاں کو میرے ہاتھ کا ہی پسند ہے۔ برتن دھو لینا اور شام کی چائے بنا لینا۔

چار عدد بچوں کو ٹیوشن سے ہٹا دیا کہ اب یہ آ گئی ہے' بھاری فیس دینے کا فائدہ۔ سو چار بھی ساڑھے چار بجے میں کام سے فارغ ہو کر لیٹتی' پانچ بجے میرے کمرے کا دروازہ بجا دیا جاتا۔ اٹھو بچوں کو ٹیوشن پڑھاؤ اور میں تھکے دماغ' دکھتے جسم کے ساتھ ان سے مغز کھپاتی' جو ایک نمبر کے ڈفر تھے۔ منہ میں انگوٹھا لیے بیٹھے رہتے۔ ایک بار ڈانٹ دیا کہ کام ٹھیک سے کرو' بچہ دندناتا ماں کے پاس گیا اور ماں فوراً" آئیں کہ مجھے پسند نہیں' کوئی میرے بچے کو ڈانٹے یا مارے۔ بچے کو پیار سے پڑھاؤ۔ آپ تصور کریں کہ چار ڈھیٹ قسم کے بچے انگوٹھا منہ میں لیے بیٹھے ہیں اور آپ سامنے منمنا رہی ہیں۔ "بیٹا کتاب پکڑو' منہ سے انگوٹھا نکالو۔"

اور وہ اوں.... اوں.... کر کے آپ کا بلڈ پریشر بلند کر رہے ہوں۔ اس گھر میں ماسی نہیں آتی تھی گھر کا سارا کام سب عورتیں ہی کرتی تھیں۔ سو سب نے مجھے ماسی سمجھ لیا۔

میری دال بنا دینا۔

میرے کپڑے تہ کر دینا۔

ایک جٹھانی کا بلینڈر خراب ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ "اپنا بلینڈر دو' لہسن ادرک پیسنا ہے۔"

میں نے اتنا کہا کہ.... "میں شیک بناتی ہوں' صاحب نے سختی سے منع کیا ہے کہ لہسن ادرک مت پیسنا۔ میں

خود سل بٹہ استعمال کرتی ہوں۔"

بس پھر کیا تھا ایک دھماکہ تھا جو ہوا بہت غرور ہے اپنے سامان پر...." پھوپھو آئیں' بڑی بہو کی حمایت میں خوب ڈانٹا اور کہا کہ بلینڈر دو۔ صاحب کی عادت ہے کہ وہ کسی چیز کو منع نہیں کرتے اور جب کرتے ہیں' تو ان کی بات نہ مانی جائے تو بہت غصہ ہوتے ہیں' ان کے غصے کے پیش نظر میں نے بلینڈر سے منع کردیا تھا۔ میں نے وہ لہسن ادرک سل پر پیس کر انہیں دیا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ ساتھ ہی سنا کہ بڑی جٹھانی چھوٹی سے کہہ رہی تھیں۔

"بڑی پڑھی لکھی بنتی ہے' دیکھا کیسا سیدھا کیا۔"

اکثر ایسا ہوتا کہ سب بیٹھے ہیں' فون آیا۔ "فون اٹھاؤ۔"

میں اٹھاتی تو اگلا کہتا۔ فلاں سے بات کرنی ہے' پھر میں بتاتی آپ کا فون ہے۔ یوں لگتا میں آپریٹر ہوں۔ گلاس لاؤ' پانی لاؤ' یہ بیگ اٹھا کر رکھو۔

آرڈرز کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ پھر کہا جاتا' کچھ نہیں کرتی۔ کھانا میں بناتی ہوں روٹی میں بناتی ہوں۔ پھر ایک بار میں کہوں گی کہ اللہ کا شکر ہے کہ صاحب تین ماہ گھر میں رہے انہوں نے سب کے رنگ ڈھنگ دیکھ لیے۔ یہ بھی سمجھ لیا کہ حقیقت کیا ہے اور ان کے کانوں میں کیا بویا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے کہا جاتا تھا۔ صاحب کے لیے کہ یہ میرا دیور نہیں بیٹا ہے۔

صاحب بھی بھابھی کی محبت میں ڈوبے تھے' ان کے خلاف ایک لفظ سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ لہٰذا میں نے چپ سادھ لی۔ میرے سامنے میرے جہیز کے سامان کو بے دردی سے توڑا پھوڑا جاتا۔ مجھ سے غلاموں کی طرح کام کرایا جاتا۔ میں اندر سے مرنے لگی تھی۔

میکہ دور تھا۔ فون پر بات کرنے کی اجازت نہ تھی پی سی او پر تین روپے کال تھی۔ مجھ سے ایک کال کرنے کے پانچ روپے وصول کیے جاتے۔ میرا فون پاس تھا مگر کارڈ دلوانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی امتل کو فون کرتی تھی۔ شادی سے پہلے لکھے افسانوں کے لیے۔ امتل نے میری شادی کے بعد ایک دوست کی طرح مجھے سہارا دیا۔ آپ کو تو امتل پتا بھی نہ ہوگا کہ آپ کی طرف سے آنے والے رسالوں نے مجھے امید دی۔ جینے کی آرزو دی۔ شعاع اور خواتین کی ہر ماہ آمد نے مجھ میں جینے کی لگن جگائی۔

میں اس شہر میں بالکل انجان' راستے اجنبی' ہر کام کے لیے محتاج سی رہتی۔ باقی تینوں جٹھانیاں کراچی کی پیدائش تھیں۔ جب پہلی بار شعاع منگوایا تو ساس نے باتیں سنائیں۔ شوہر بے روزگار ہے اور بیوی کو "عیاشی" سوجھ رہی ہے اور میں اس عیاشی کو حیرت سے تک رہی تھی جس پر 35 روپے خرچ ہوئے تھے۔ خیر مشکل وقت تھا۔ صبر و شکر سے گزار لیا۔

س ۔ "کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے"

ج ۔ "سسرال اور میکے کے ذائقے میں بہت فرق تھا۔ ہمارے گھر دال اور گوشت کے کھانے بنتے تھے۔ سبزیاں بہت کم تعداد میں ہوتی تھیں اور یہاں سبزیوں کی بھرمار تھی۔ کوئی گوشت ایسا نہ تھا کہ جس کی ملاقات سبزیوں سے نہ کرائی گئی ہو۔ بینگن گوشت' چقندر گوشت اپنی رنگت کی وجہ سے بھی حلق سے نہ اترے۔ ہم لوگ نارمل شوربے کے ساتھ آلو گوشت' چنے کی دال گوشت' لوکی' بھنڈی' ٹنڈے گوشت سے نا آشنا تھے۔ حتیٰ کہ قورمے میں بھی آلو ہوتے تھے اور ہر سالن میں ٹماٹر' جبکہ حیدر آباد میں سبزیاں' سرسوں کے تیل میں' قورمہ وغیرہ.... گھی میں اور چاول گوشت وغیرہ تیل میں بنتا تھا۔ کچھ کھانوں میں دہی کا استعمال اور کچھ میں ٹماٹر' مگر یہاں مچھلی کے سالن میں بھی ٹماٹر تو پائے کے سالن میں بھی ٹماٹر' شوربے میں یہاں وہاں تیرتے ٹماٹر دل خراب کرتے تھے۔ ٹماٹر اور پیاز کا شوربے میں نظر آنا ہمارے حیدر آباد میں پھوہڑپن کی نشانی تھا اور یہاں شوربہ اسی سے بھرا ہوتا تھا۔

جب یہ لوگ حیدر آباد آکر کھاتے تھے تو انگلیاں چاٹتے لگ جاتے تھے۔ اب میں بنانے لگی تو پسند ہی نہیں آیا۔ دو ماہ ہوگئے تھے۔ مجھے سالن پکانے کے لیے ہاتھ تک نہیں لگانے دیا۔ میرا دل چاہتا میں صاحب کو اپنے ہاتھ کا کھلاؤں مگر نہ جانے کیا تحفظات تھے کہ میرا کچن میں داخلہ ممنوع تھا۔

ایک بار میرے تایا کی فیملی آئی۔ چائنیز پلاؤ اور قورمہ بنایا تھا۔ کھانا لگایا تو وہ کہنے لگے۔ روزی باجی نے بنایا ہوگا۔ بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔

تو جٹھانی نے منہ بنا کر کہا۔ "اسے کھانا بنانا کب آتا ہے۔ میں نے بنایا ہے سب کچھ۔"

وہ حیرت سے شکل دیکھنے لگے۔ تائی نے کہہ دیا۔

"بھئی.... شادی سے پہلے بھی ہم نے اس کے ہاتھ کا کھایا ہے۔ اچھا بناتی ہے اور یہ میرے گھر رہنے آئی تھی تو بھی اچھا بناتی تھی۔"

جٹھانی صاحبہ سلگ کر رہ گئیں۔

"یہاں تو نہیں بناتی۔" انہوں نے کہا "کیوں؟" میں نے کہہ دیا کہ سارا کام یہ کرواتی ہیں اور جب چمچہ چلانے کا کام آتا ہے تو خود لے لیتی ہیں کہ میں بناؤں گی۔ آج بھی سب سبزیاں میں نے تیار کیں۔ انہوں نے بھون کر ڈالیں، اس کے بعد دم وغیرہ بھی میں نے دیا۔ بس اس کے بعد کیا تھا مہمانوں کے جانے کے بعد وہ فساد اٹھا کہ الامان الحفیظ.... رو رو کر شوہر کو بتایا کہ اس نے مہمانوں کی آمد پر بے عزتی کی۔

ان کے شوہر صاحب نے صاحب کی کلاس لگوا دی اور کہا۔ "جب خود کما کر لاؤ تو کھانا پکوانا، ابھی میں کماتا ہوں اور میری بیوی ہی پکائے گی۔"

بیوی صاحبہ فخریہ بیٹھی تھیں اور میں خاموش۔

ذلت کی انتہا تھی، ہمارے گھر دسترخوان کو غیروں کے لیے وسیع کیا جاتا تھا اور یہاں میرے لیے ایک روٹی نہ تھی۔ حالانکہ پھوپھو (ساس) نے دو ماہ تک راشن ڈلوایا تھا مگر احسان تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

س۔ "میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟"

ج۔ "میکے اور سسرال میں فرق، زمین اور آسمان سا فرق تھا۔ نہ جانے کیوں یہ فرق شادی سے پہلے محسوس نہیں ہوا۔ اصل میں پھپھو جاب کرتی تھیں، یکے بعد دیگرے بیٹوں کی شادی کی تو بہوؤں نے اپنی اپنی مرضی چلائی۔ سب ہی خود مختار ہو گئیں۔ ساس کی ایک عادت خراب تھی، جس نے مجھے بے حد نقصان دیا۔ وہ کچے کانوں کا ہونا تھا، جس نے پہلے شکایت لگا دی۔ بس وہی ٹھیک ہے اور دوسرا اب دہائیاں دے کر مر جائے مگر وہ ایک نہ سنیں۔ ان کی دیگر بہوؤں نے یہ ہی کیا۔ مجھ سے پہلے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا دیتیں اور وہ گھر آکر مجھ پر غصے ہوتیں۔ حتیٰ کہ کبھی میں سوچتی کہ یہ بات غلط ہے، شام کو پھوپھو آئیں گی تو کہوں گی مگر اس سے پہلے ہی سارا معاملہ ان کے گوش گزار کر دیا جاتا اور وہ جب گھر آتی تھیں تو چیخ پا....

"اپنے باپ کے گھر بڑی تھیں، یہاں نہیں ہو۔ چھوٹی ہو چھوٹی بن کر رہو۔ طرم خانی مت دکھانا۔"

میں سارا وقت روتی رہتی تھی۔ دماغ کام ہی نہیں کرتا تھا، میکے میں سب لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ دل میں حسد، میل، کینہ کچھ نہ تھا اور یہاں آنکھوں، ہاتھوں کے اشاروں سے مذاق اڑایا جاتا۔ میرے ساتھ رہنے والی جٹھانی کا ایک الگ احسان کہ ہم کھلا رہے ہیں۔

سارا دن کام نپٹاتے تھک جاتی تھی۔ شادی سے پہلے صاحب کے پاس ٹی وی تھا۔ جب آخری جیٹھ کی شادی ہوئی تو انہوں نے لے لیا اور جب میری شادی ہوئی تو حالات نے یک دم ایسا پلٹا کھایا کہ فہیم بے روزگار بھی ہو گئے اور قرض دار بھی۔ میرے کمرے میں ذاتی ٹی وی نہ تھا۔ باقی سب کے کمروں میں تھا۔ صاحب جو ٹی وی کے آگے بیٹھتے پھر اٹھنا محال تھا۔ میرا حشر ہو جاتا۔ اکیلے کمرے میں دل گھبراتا اور صاحب بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔

صاحب کے سامنے جٹھانی کا رویہ شہد سا میٹھا ہوتا۔ صاحب کا آرڈر جب تک بھابھی کمرے کا دروازہ بند نہ کریں ہم نہیں کریں گے، ہم دونوں کے کمرے آمنے سامنے تھے۔ سو جب ان کا دروازہ بند ہوتا ہمیں بھی سکون کا سانس نصیب ہوتا اور لیٹ جانے کی اجازت ہوتی، ورنہ خالی کمرے میں بیٹھ کر نیند بھگاتی رہتی تھی۔

ہمارے گھر میں منرل پانی آیا کرتا تھا۔ وہ صاحبہ پانی کے گلاس پر بھی نظر رکھتیں۔ بچوں پر رکھ رکھ کر سناتیں، احتیاط کرو، پیسوں کا آتا ہے، پانی فری کالائن کا پانی نہیں پیتے ہم۔

اشارہ میرے میکے کی طرف ہوتا تھا۔ وہاں ہم لائن کے پانی کو بوائل کر کے پیتے تھے۔ میں نے تنگ آکر صاحب سے کہا۔ "چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لیں۔"

انہوں نے کہا۔ "گزارا نہیں ہو گا۔" میں نے سمجھایا کہ کچھ تو سکون ہو گا۔ وہ بہت معمولی تنخواہ پر جاب پر گئے۔

پہلی تنخواہ آئی، جٹھانی نے لے لی۔ ہم اس گھر میں میری شادی سے دو ماہ پہلے شفٹ ہوئے تھے۔ سو ہمارے سامنے گیس، بجلی، پانی اور فون کے بل رکھ دیے اور کہا کہ آدھا حصہ تم ادا کرو۔ حساب لگایا تو سر چکرا گیا۔ ان کے کمرے میں اے سی بھی تھا اور میرے کمرے میں صرف کمپیوٹر، پنکھا اور ایک سیور۔

پوری تنخواہ چلی گئی۔ دوسرے ماہ بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسرے ماہ جب حساب کلیئر ہوا تو کہا۔ اتنے ماہ سے کھانا کھلا رہے ہیں اس کے پیسے بھی دو۔ جب چوتھی تنخواہ

بھابھی نے پکڑنا چاہی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے کہا "آپ کا شکریہ' آپ نے ہمیں کھلایا مگر اب ہم اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے۔" تنگ کر بولیں۔ "تمہیں کمی کیا ہے۔ جب ضرورت ہو مجھ سے لے لینا۔"

میرے شوہر کی کمائی چند ہزار سہی مگر میرے ہاتھ دس روپے نہیں آتے تھے۔ میرے پاس شادی سے پہلے کچھ رقم جمع تھی' وہ بہت احتیاط سے خرچ کر رہی تھی۔ نند سے کہا کہ اب کیا کریں۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا اور کہا کہ چھ ماہ ہوگئے ہیں بس اب تم کچن الگ کرو اور اپنا خرچا اٹھاؤ۔

انہوں نے شکر ہے یہ فیصلہ کیا' تو ہم نے سب سے پہلے پانی کے کین خریدے اور پانی والے کو اپنے لیے الگ پانی لانے کا کہا اور ناشتے کا سامان لائی۔ آپ یقین کریں وہ چینی پتی دودھ ڈبل روٹی مجھے دنیا کی قیمتی ترین چیزیں لگیں' میں اپنی عزت نفس کے ساتھ کھا پی سکتی تھی۔

اس دن کے بعد باقاعدہ محاذ کھل گیا۔ بے ضمیری' خود غرضی کی تمام مثالیں افسانوں میں ہوتی ہیں' سب کو حقیقتاً جھیلا۔ پچھلے دنوں کسی بہن نے لکھا کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ میں کہتی ہوں' کچھ شعور آیا ہے مگر آج بھی میری کہانی کہیں دہرائی جا رہی ہوگی۔

س - "سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟"

ج - "سسرال میں تعریف.... کسی خوش نصیب کو یہ سعادت ملتی ہوگی۔ شروع میں مجھے نہیں ملی' بلکہ تنقید ہی ہوئی اور مزے کی بات یہ کہ جب یہ لوگ برائیاں کرتے تھے تو سامنے والے خود تردید کرتے تھے نہیں بھئی ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ ہم تو حیدر آباد جاتے تھے۔ ماموں' ممانی نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ روزی تو بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔ یہ باتیں ان لوگوں کو اور سلگا دیتی تھیں۔

ایک بار میری طبیعت خراب ہوئی' میں نے کہا۔ "ایسا معاملہ ہے۔"

انہوں نے گڑ اور اجوائن میں کچھ اور ابھی یاد نہیں آرہا ملا کر مجھے پکا کر دیا اور کہا۔ "پی لو" میں نے پی لیا۔ میری طبیعت اور خراب ہوئی۔ دوسرے دن بھی پلا دیا۔ میں بھی پی گئی۔

تیسرے دن بڑی جٹھانی کسی کام سے کچن میں آئیں تو وہ دوا پک رہی تھیں۔ وہ تیر کی طرح چھوٹی کے پاس گئیں اور کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو' تم ہوش میں تو ہو۔" ان کو ڈانٹ کر میرے پاس آئیں اور کہا۔

"پڑھی لکھی ہو' یہ کیا کر رہی ہو۔" یہ دوا تو بچہ گرا دیتی ہے۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے کہا کہ.... "یہ تو میں دو دن سے پی رہی ہوں۔"

انہوں نے سر پکڑ لیا اور مجھے ڈانٹا کہ.... "تم شادی شدہ ہو' سمجھ نہیں سکتی ہو۔ کچھ اور طرح کی طبیعت بھی خراب ہو سکتی ہے۔ چھوٹی جٹھانی بڑے آرام سے کہنے لگیں۔" بھئی میں نے تو پوچھ لیا تھا' کچھ ہے یا نہیں' اس نے کہا کہ نہیں ہے' سو دوا بنا دی۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔

اور ان کی یہ نیکی مجھے کتنی بھاری پڑی۔ میں جانتی ہوں' میرے میکے میں ایسی سیاست کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہم سب تو چھوٹی سی تکلیف پر سب کا ساتھ دیتے تھے۔ میری رخصتی پر میرے پانچوں بھائی اس طرح تڑپ کر روئے تھے کہ لوگ حیران تھے۔ آج بھی ان کی مثال دیتے ہیں۔ سسرال میں کوئی ایک چمچہ چینی کی مدد کردے تو اگلے دن مانگ لی جاتی تھی' وہ کل ہم نے چینی دی تھی نا واپس کردو۔ میں تو سسرال آکر ایلس بن گئی تھی جو ونڈر لینڈ میں کھو گئی۔

س - "سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟"

ج - "نہیں جناب توقعات تو کیا پوری ہونی تھیں' توقعات سے زیادہ خطرناک معاملات ہوئے جن سے دل کٹتا ہے۔ سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے یہ سب میں نے سہا۔ ایک بار صاحب نے بہت کرب اور دکھ سے کہا۔

"یہ بھابھیاں ایسی باتیں کرتی ہیں روزی! اگر میں تمہیں بچپن سے نہ جانتا ہوتا' تو شاید طلاق دے دیتا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ کیا توقعات پوری ہونی تھیں۔ مجھے حسد کا سامنا تھا اور حاسدین میرے اردگرد تھے۔"

س - "بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے' خصوصاً" پہلا بچہ؟"

ج - "بچوں کی پیدائش.... ایک بے حد مشکل مرحلہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی کہ سال گزر گیا۔ کوئی خوش خبری نہ تھی' مجھے اور فہیم کو فکر بھی نہ تھی مگر لوگوں کو بڑی تکلیف تھی' صرف ایک سال گزرنے پر مجھے بانجھ کہہ دیا گیا۔ میں حیران و پریشان کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ تو اللہ کا کام ہے۔ اس میں انسان کا دخل نہیں ہے۔ جب خوشی کی خبر ملی تو میں نے بتا دیا تو ہلچل مچ گئی۔ ذہنی دباؤ کی وجہ سے

میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ ڈاکٹرز نے بیڈ ریسٹ کہا۔ یہاں سسرال میں کون بیڈ ریسٹ کراتا۔ سب کام کرتے تھے۔ ڈاکٹرز نے جھک کر کچھ اٹھانے تک سے منع کردیا تھا۔ صرف میری بھتیجی حنا میرے پاس رہتی تھی مگر دس سال کی بچی کیا سنبھال سکتی تھی..... خیر اس نے اپنی عمر کے حساب سے میرا خیال رکھا۔

یہ سسرال میں واحد ہستی تھی جس کی وجہ سے کچھ سکون ملا تھا مگر اس کی والدہ کو جب پتا چلتا کہ وہ میرے پورشن میں ہے۔ ڈانٹ کر اپنے پورشن میں لے جاتیں۔ وہ چھپ چھپا کر آجاتی۔ میری حالت خراب ہوتی گئی۔ ایمان کی پیدائش کے چار ماہ پہلے میں حیدر آباد آگئی۔ امی نے بہت سنبھالا۔ خیال کیا، مگر جو بگاڑ ہونا تھا ہوگیا۔ آخر سات جولائی 2007ء کو ایمان پیدا ہوئی، ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ صاحب بے انتہا خوش تھے۔ تین چچا، تایا، تائیاں، ایک دادی، دو پھپھو کوئی ایک اسے دیکھنے نہ آیا۔ بلکہ ساس نے تو یہ کہا پیٹ کٹا کر پیدا کی تو بھی لڑکی۔

ننھیال کی پہلی بچی تھی، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور خوش ہوئے۔ ابو نے مٹھائی منگوائی، سب کو بانٹی۔ ایک ماہ کے بعد میں گھر آگئی، پہلی بچی ہم ناتجربہ کار، کسی نے کوئی خاص مدد نہ کی۔ ایمان روتی بہت تھی۔ ہم دونوں رات رات بھر جاگتے۔ بڑی مشکلوں سے ایمان کو پالا۔ دو سال بعد حذیفہ آگئے اور ان کے ڈیڑھ سال بعد راحم اشمان کی اچانک آمد نے مجھے بوکھلا دیا۔ تین چھوٹے بچوں کو کیسے سنبھالوں۔

جڑواں بچوں نے تو میری سدھ بدھ بھلا دی۔ کیسا افسانہ، کون سا ناولٹ، سب لپیٹ کر رکھ دیا۔ پے درپے پریشانیوں نے مجھے ذہنی طور پر بانجھ کردیا، میں لکھنا چاہتی تھی مگر لکھ نہیں پاتی تھی، کوئی مصنفہ بہن یہ محسوسات سمجھ سکتی ہے کہ لکھنے والے اگر نہ لکھ سکیں تو کیسی قیامت بھری ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اس کے اندر۔

سسرال والوں نے لکھنے کی صلاحیت کو طعنہ بنالیا تھا۔ افسانہ نگار ہے، معمولی باتوں کے افسانے تراش لیتی ہے۔ بات کا بتنگڑ بنالیتی ہے۔ دل فگار ہوجاتا تھا۔ امی حذیفہ کو ساتھ لے گئیں۔ وہ حیدر آباد میں رہا اور میں یہاں کراچی میں، صرف ڈیڑھ سال کا تھا۔ جب امی لے کر گئی تھیں۔ دو سال وہ حیدر آباد میں رہا اور میں اس کے لیے بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپا کرتی۔ دو جڑواں بچوں کو پالنا ایک بہت بڑا

امتحان تھا۔ اللہ نے سرخرو کردیا۔ اب ماشاء اللہ دونوں P.G میں ہیں شکر ہے اللہ کا۔ جو ہوا اس کی مرضی....

س ۔ "سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا۔ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟"

ج ۔ "سسرال میں مقام 2005ء سے 2013ء تک تو خاص تو کیا عام بھی نہیں ملا۔ ساس بیمار ہوئیں تو دونوں جٹھانیاں اسپتال لے گئیں۔ آٹھ بچے اور سارا کام چھوڑ کر، میں نے کہا' میں چلتی ہوں۔"

رکھائی سے کہا۔ "تم کو یہاں کے راستے اور اسپتالوں کا کیا پتا۔"

میں نے کہا۔ "نہیں پتا تو پتا چل جائے گا۔ ڈاکٹر وغیرہ سے بات کرکے صورت حال پتا کرلوں گی۔"

فرمایا۔ "تم اکیلی پڑھی لکھی نہیں ہو دنیا میں' ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔" میں خاموش....

بعد میں سب رشتہ داروں سے کہا گیا۔ "دیکھا سگی بھتیجی ہے۔ ذرا پروا نہیں گھر پر آرام فرمارہی ہے۔" جبکہ میں آٹھ عدد بچوں کو کھلانے پلانے میں ہلکان تھی۔ ان بچوں کو بغیر ماؤں کے سنبھالنا عذاب تھا۔

2013ء میں' میں نے الگ فلیٹ لے لیا۔ اس کے بعد تو جیسے انقلاب آگیا۔ حالات اچھے ہوتے گئے۔ اپنا ذاتی گھر' چھوٹی سی سواری' بچے' میں اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ میری قدر ہوئی' اب شادی بیاہ کے معاملات' بچوں کے ایڈمیشن' گھریلو آرائش' سب میں پسند پوچھی جاتی ہے اور رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بقیہ رشتہ دار بھی عزت دیتے ہیں۔

یہ سب اس وقت تک تھا جب ہم جوائنٹ فیملی تھے۔ اس لیے نیچا دکھانے کا مقابلہ رہتا تھا۔ آٹھ سال بہت اذیت میں گزارے۔ لوگوں کو ساس نندیں تنگ کرتی ہیں' مجھے جٹھانیوں نے کیا۔

آج میں بہت خوش ہوں۔

س ۔ "آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟"

ج ۔ "اس معاملے میں میری رائے یہ ہے کہ اگر گھر کے بزرگ میں قابلیت ہے تو جوائنٹ رہیں' ورنہ علیحدہ رہنا بہتر ہے۔ میری ساس ہمارے ساتھ رہتی ہیں لیکن ہم الگ رہتے ہیں تو سکون سے رہتے ہیں' مطلب شادی کے چند سال ساتھ رہو' پھر خوش دلی سے الگ ہوجاؤ' کچن الگ ہو۔ بہت سے مسائل کچن سے جنم لیتے ہیں' ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ میری رائے سے اتفاق نہ کریں مگر میرا تو یہ ہی تجربہ ہے۔"

س ۔ "آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟"

ج ۔ "میں نے سسرال کے ماحول کو سدھارنے کے لیے اپنی تعلیم کا سہارا لیا۔ حالانکہ تعلیم و تربیت ہی میرے لیے طعنہ تھی۔ میں نے بچوں کو ہمیشہ برائی سے روکا' بدتمیزی سے منع کیا۔ کبھی نند یا جٹھانیوں کی برائیاں کرکے ان کے دل خراب نہیں کیے۔ ایمان آٹھ سال کی ہے' بہت حساس بچی ہے۔ اس کے ذہن میں کچھ ناپسندیدہ مناظر محفوظ ہیں مگر میں نے ہمیشہ اس کو مثبت سوچ دی۔ جٹھانیوں کے بچوں کو پیار دیا۔ محبت دی' وہ سب آنی آنی کہتے نہیں تھکتے۔ ہر کام میں مشورہ لیتے ہیں۔

اب جٹھانی بھی بہت اچھی گئی ہیں۔ پیار سے ملتی ہیں ان کو میں بری الذمہ قرار دیتی ہوں۔ ان کا قصور نہیں۔ انہوں نے چھ سال میں محنت کرکے جو مقام بنایا تھا۔ میں اس کو شیئر کرنے آگئی تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے مقابلے پر اتر آئیں۔ یہ ان کی سوچ تھی۔ جواب بدل چکی ہے۔ حالات بہت اچھے ہیں۔ اس دوران صاحب نے میرا بہت ساتھ دیا۔ وہ صاف دل' کشادہ ذہن اور انصاف پسند بندے ہیں۔ جہاں میری غلطی تھی مجھے ٹوکا اور جہاں دوسروں کی انہیں وارن کیا کہ آپ غلط کررہے ہیں۔ وہ ہنس مکھ اور ملنسار ہیں' ان کی خوش مزاج طبیعت مجھے آج بھی اداس نہیں رہنے دیتی۔

انہوں نے مجھے اعتماد دیا' مجھ کو اپنا ساتھی مانا۔ ہر مشکل میں میرے ساتھ رہے۔ بے روزگاری اور پریشانی کا مشکل وقت کٹ گیا۔ اب مسائل کو حل کرتے وسائل ہیں۔

تین کمروں کا کشادہ فلیٹ ہے' لاؤنج ہے جہاں میرے بچے سکون سے کھیلتے ہیں۔ سب لوگ خوش دلی سے ملنے آتے ہیں' میں نہیں کہتی' مجھے لوگ کہتے ہیں' یہ تمہارے صبر کا پھل ہے۔ میں پرسکون ہوں۔ یہ اسی سکون کا نتیجہ ہے کہ میں اتنا طویل سوالنامہ حل کرپائی ہوں۔ میری زندگی میں خواتین اور شعاع کا بھی بہت ساتھ رہا۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ میرے لیے مشعل راہ بنے۔

✡

زندگی کبھی اتنی تیز نہ تھی جتنی اب ہے۔ پہلے وقت گزرتا نہیں تھا اور اب وقت گزر جانے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ مصروفیات اتنی ہیں کہ کسی کا حال چال پوچھنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ کسی کے گھر جانا تو دور کی بات ہے اب تو زندگی مشین بن کے رہ گئی ہے اور ایسا کیوں ہے؟ نئے سال کے حوالے سے ہم نے معروف شخصیات سے پوچھا۔

1 کیا نئے سال کو اسی طرح خوش آمدید کہتے ہیں جس طرح بچپن میں کہتے تھے؟
2 انٹرنیٹ اور فیس بک، واٹس اپ نے آپ کی زندگی پہ کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟
3 2015 کیا دے گیا، کامیابیاں یا ناکامیاں؟

سال گزشتہ آپ کو کیا دے گیا۔؟

شاہین رشید

ناہید شبیر۔ (معروف آرٹسٹ)

1 جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے ویسے ویسے آپ کی ترجیحات بھی تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ کام کے حوالے سے میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنے آپ کو تھوڑا سا فری رکھوں۔ گزشتہ چند سالوں سے نیا سال ملک سے باہر مناتی ہوں۔ کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ ہمارے ملک میں نئے سال کی آمد پر "کچھ" پابندیاں لگا دی جاتی ہیں۔ تو پھر مزہ نہیں آتا نئے سال کو ویلکم کرنے کا۔ اور ویسے بھی میری فیملی امریکہ اور یورپ میں ہے تو میں نئے سال کے آغاز سے پانچ یا چھ دن پہلے اپنی فیملی کے پاس چلی جاتی ہوں۔ جہاں بڑے مزے کی گیٹ ٹو گیدر ہوتی ہے۔ وہاں میری فرینڈز بھی ہیں تو نئے سال کو بڑی دعاؤں کے ساتھ ویلکم کرتے ہیں کہ نیا سال سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئے۔

2 جہاں تک انٹرنیٹ، فیس بک اور واٹس اپ کی بات ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے پوری دنیا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک بٹن پریس کریں اور ہر ایک سے رابطہ کرلیں، خواہ وہ ملک میں ہو یا ملک سے باہر، تو اگر یو نیٹو وے میں دیکھا جائے تو یہ چیزیں بہت اچھی ہیں مگر کبھی کبھی یہ چیزیں نگیٹو بھی بن جاتی ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ سب سے کال پہ بات کرلوں مگر جب مجبوری ہو تو واٹس اپ سے اچھی کوئی سہولت نہیں۔ ان سہولیات سے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ گیٹ ٹو گیدر رہنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے۔

3 آپ 2015 کی بات کررہی ہیں۔ تو الحمد اللہ

میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے کہ جب سے میں نے اپنا کیریئر شروع کیا ہے یعنی 2002ء سے تو اللہ کی مجھ پر خاص رحمت ہے کہ مجھے کامیابیاں ہی کامیابیاں ملی ہیں۔ ناکامی کیا ہوتی ہے یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن موازنہ ضرور کرتی ہوں کہ کل کو یہ عروج نہ ہو تو کیا ہونا ہے۔(اللہ نہ کرے) 2015 میرے لیے بہت زیادہ کامیاب رہا کہ بہت اچھے سیریلز کیے۔

پروڈکشن کی۔ میری طرف سے آپ کو آپ کے ادارے کو اور پڑھنے والوں کو نیا سال مبارک ہو۔ اور میری سب کے لیے دعائیں ہیں اور پلیز خوشیاں بانٹیں، خوش رہیں۔ اچھی سوچ رکھیں گے تو اچھا کام کریں گے۔ چھوٹی سی زندگی ہے، سب کے ساتھ خوش رہیں۔ میرا یہ چھوٹا سا پیغام ضرور ضرور لکھ دیجیے گا۔

عمرانہ مقصود۔(معروف رائٹر)

نیا سال ہمیشہ نئی امیدیں لے کر آتا ہے اور میں بہت پر اعتماد ہوتی ہوں کہ یہ سال پچھلے سال سے بہتر ہوگا۔ پر لگتا ہے کہ میں ہر دفعہ ناکام رہتی ہوں۔ اور میں اس دفعہ بھی پر امید ہوں کہ یہ سال گزشتہ سال سے بہترین ہوگا۔ میں اس سال کے لیے ہر سال سے

زیادہ پر امید ہوں۔ کیونکہ میں ہر اندھیرے کے آگے والی روشنی کو دیکھنے پہ یقین رکھتی ہوں۔ میری پوری فیملی رات بارہ بجے تک ضرور جاگتی ہے اور سب مل کر انجوائے کرتے ہیں اور نئے سال کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ مجھے وہ لوگ بہت پسند ہیں جو اس موقع پر رات کے وقت آتش بازی کرتے ہیں اور ہم سب گھر سے باہر "دسی ویو" پر آتش بازی کا نظارہ دیکھتے ہیں۔"

2 انٹرنیٹ، فیس بک، واٹس ایپ۔ ہماری زندگی میں بہت اچھی تبدیلی لے کر آیا ہے۔ انٹرنیٹ میری زندگی میں بھی بہت بڑا چینج لایا ہے اور میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں اپنی زندگی کا بونس ٹائم گزار رہی ہوں انٹرنیٹ کی وجہ سے انجوائے کرکے۔ اور یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ اگر پڑھی لکھی نہ ہوتی تو کبھی بھی ان چیزوں سے فائدہ نہ اٹھا سکتی۔ بہت نقصان اٹھاتی۔

3 میں اپنی ایک کتاب پر کام کر رہی ہوں، جس کے نام کے بارے میں ابھی کچھ ڈیسکس نہیں ہوا اور یہ میرے لیے بہت ہی زیادہ قیمتی ہوگی اور ہونی بھی چاہیے۔

ارسلان خالد (اینکر سچ ٹی وی)

1 شاید بچپن سے بہتر۔ اب زیادہ بہتر انداز میں ویلکم

کرتا ہوں۔ وقت گزرنے کا احساس بچپن سے زیادہ اب ہوتا ہے۔

2 ان چیزوں کے آجانے سے زندگی سے وہ مزہ ختم ہوگیا ہے۔ جو ان چیزوں کے بغیر تھا۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے لائف بہت کمرشلائز ہوگئی ہے۔ جب یہاں یہ سب چیزیں نہیں تھیں تب زندگی میں کافی زیادہ سکون تھا۔

3 ہر سال ہی بہت کچھ دے کر لے کر اور سکھا کے جاتا ہے۔ 2015 میں سب کچھ ہی تھا اور اگر دیکھا جائے تو 2015 بہت اچھا رہا۔

آفان وحید۔ (معروف آرٹسٹ)

1 بچپن میں نئے سال کی سیلبریشن اس طرح ہوتی تھی کہ نئی کلاس ہوتی تھی، نئی کتابیں کاپیاں آتی تھیں۔ سلیبس آتا تھا، نئے ٹیچرز ہوتے تھے کلاس کا لیول بڑھ جاتا تھا تو کچھ انجوائے منٹ کا احساس ہوتا تھا۔ سیلبریشن کا یہ مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ کوئی پارٹی کریں یا پارٹی میں جائیں۔ ایک سیلبریشن یہ بھی ہوتی ہے کہ جس میں آپ کو خوشی کا احساس ہوتا ہے کہ زندگی امپرومنٹ کی طرف جارہی ہے۔ اب کچھ مالی Goals ہوتے ہیں زندگی کو کس طرح بہتر بنانا ہے۔ یہ ساری کوشش ہوتی ہے۔ اپنے کیریئر میں کس طرح امپرومنٹ لے کر آنی ہے۔ میری نزدیک سلیبریشن یہی ہوتی ہے کہ نئے سال کے لیے پلان بنانے ہوتے ہیں۔

2 فیس بک، انٹرنیٹ، اور واٹس ایپ کا میرے خیال میں نقصان یہ ہوا ہے کہ بے شک انفارمیشن تو بہت حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن نالج بہت کم ہوگئی ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ بندہ ان چیزوں کا بہت زیادہ عادی ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب آپ کسی چیز کے عادی ہوجاتے ہیں تو پھر اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہوتا۔ اور باتیں SMS پہ ہوتی ہیں۔ بحث و مباحثہ اور دیگر باتیں فون کالز پہ ہوتی ہیں۔ اور ہمارے احساسات ہمارے Status بن کے رہ گئے ہیں۔ تو جب ہم کتابیں نہیں پڑھیں گے تو نالج نہیں بڑھے گی۔ پہلے آپ کسی سے ملاقات کرنے کے لیے گھر سے نکلتے تھے اور ان کے گھر جاکر روبرو ہوتے تھے اب اس طرح کی ملاقاتیں نہیں رہی ہیں اور اس سے ہمارا ویلیو سسٹم بھی متاثر ہورہا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس کا پلس پوائنٹ یہ ہے کہ آپ کو کوئی ریسرچ کرنی ہے کوئی معلومات لینی ہے تو آپ اپنے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے چند نمبرز گھماتے ہیں اور ساری معلومات کھل کر آپ کے سامنے آجاتی ہے اور تھوڑا نقصان مجھے بھی ہوا ہے کہ میں ہروقت فیس بک کھول کر بیٹھ جاتا ہوں یا میسجز پہ وقت لگاتا ہوں۔ لیکن میں اتنا زیادہ سوشل سائیڈ پہ نہیں ہوں جتنا دوسرے ہیں۔ میں ٹوئٹر پہ نہیں ہوں، انسٹا پہ نہیں ہوں۔ صرف فیس بک پہ ہوں۔ تو فائدے نقصان دونوں سائیڈ سے ہیں۔

3 2015 میرے لیے بہت اچھا رہا۔ اس سال نے مجھے بہت کچھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں مجھے نوازا وہاں کچھ بوجھ بھی میرے کم کیے تو میں اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ 2015 میرے لیے بہت اچھا رہا۔

میری پڑھائی مکمل ہوئی اور میں باقاعدہ طور پر اس فیلڈ میں آگئی۔ تو 2015 مجھے کامیابیاں ہی کامیابیاں دے گیا۔

یمنیٰ زیدی (معروف آرٹسٹ)

1 نئے سال کو میں بہت زیادہ ایکسائٹمنٹ کے ساتھ خوش آمدید کہوں گی کیونکہ گزشتہ تین سال سے ہر نیا سال میرے لیے سرپرائز لے کر آتا ہے اور ہر سال گزشتہ سال سے بہتر بلکہ بہترین ہوتا ہے اس لیے میں ایکسائیٹڈ ہو جاتی ہوں کہ دیکھیں کہ اس سال کیا ہوگا۔ اور یہ نیا سال میرے لیے کیا خوشیاں لے کر آتا ہے۔

2 میرے خیال سے ان تینوں سہولیات کے آجانے سے ہمارے فینز کو بہت آسانی ہوگئی ہے کہ ان کی رسائی ہم تک بہت آرام سے ہو جاتی ہے اور ویسے بھی لوگ جن سے پیار کرتے ہیں یا جن کو برا سمجھتے ہیں ان کے لیے اپنے جذبات کا اظہار ان چیزوں کی وجہ سے برملا کر دیتے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کیونکہ اس سے فیڈ بیک ملتا ہے اور ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تو میں تو یہی کہوں گی کہ یہ بہت کار آمد چیزیں ہیں اس سے ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں۔ خواہ ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتے ہوں۔

3 2015 اللہ کا شکر ہے کہ میرے لیے بہت اچھا رہا۔ مجھے بہت سی کامیابیاں دے گیا۔ اس سال

منیب بٹ (معروف آرٹسٹ)

ہر سال نیو ایئر کے موقع پر ملک سے باہر چلا جاتا ہوں گھومنے پھرنے اور نئے سال کو ویلکم کرنے۔ مجھے نئے سال کا بہت بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ اور ہاں اس سال مجھے لگتا ہے کہ میرا نیا سال کا ویلکم بہت پھیکا ہوگا کیونکہ میرے بھائی کی 29 دسمبر کو تو شادی ہے۔ تو بس سارا وقت اس میں گزر جائے گا۔

2 بہت گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ نارملی جو آپ کی زندگی ہوا کرتی تھی اب ہے ہی نہیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جہاں پانچ لوگ ایک جگہ پہ بیٹھتے تھے تو وہ ایک دوسرے سے حال چال پوچھتے تھے۔ ایک دوسرے کے مسائل سنتے تھے۔ اب پانچ لوگ ایک جگہ پر ہوتے ہیں تو پانچوں کے ہاتھوں میں فون ہوتا ہے۔

3 2015 بہت اچھا گزرا۔ کامیابیوں کا تناسب زیادہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر کہ 2015 میں ہی میں نے فلم سائن کی ہے جو میری سب سے بڑی اچیومنٹ ہے اور امید ہے کہ جب یہ فلم ریلیز ہوگی تو

میرے لیے کامیابیوں کے مزید دروازے کھلیں گے۔ باقی کامیابی اور ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

شگفتہ بھٹی (رائٹر+ڈرامہ نگار+شاعرہ)

1 میں نئے سال کی آمد کو پہلے بھی کوئی خاص اہتمام سے نہیں مناتی تھی۔ بس سوچتی تھی کہ گزرے ہوئے برس میں کیا کچھ نہیں کرپائی۔ اور کیوں نہیں کیا؟ ان ہی باتوں کو مدنظر رکھ کر نئے سال کی پلاننگ کرتی ہوں کہ فلاں فلاں کام ضرور کروں گی۔ ہائے مگر!

میری پلاننگ کا بہت کم حصہ عملاً ہوپاتا ہے' باقی سب زندگی کے مسائل کی نذر ہوجاتے ہیں۔ اب میرے بچوں کی تعلیم و تربیت اور غم روزگار کے ساتھ ساتھ گرتی ہوئی صحت کے بھی بہت سے مسائل ہیں۔ اس لیے ہر نئے سال کی آمد اب زور سے جھنجھوڑ کے بتاتی ہے کہ زندگی کا ایک اور برس کم ہوگیا ہے۔ اب تیزی پکڑو۔ اعمال نامہ بھی شرمندہ سا ہی نظر آتا ہے۔ گزشتہ برس میرا دامن خالی سا رہا۔ اس برس تو کچھ عنایت کرنا۔ اب نئے برس کی آمد مجھے اداس کردیتی ہے۔ لیکن ایک نئی جدوجہد کا عزم بھی دیتی ہے۔ نیو ایئر مناتی نہیں ہوں۔

2 انٹرنیٹ' فیس بک اور واٹس اپ نے میری زندگی پر اچھے اثرات مرتب کیے' اس کے استعمال سے مجھے لگا میں رات کو جب تھک ہار کے بستر پر جاتی ہوں تو اپنے دوستوں سے بات چیت کرکے فریش ہوجاتی ہوں' اس سے میرا حلقہ احباب بڑھ گیا ہے۔ ہم بے شمار لوگوں کے ساتھ ایک ہی ذریعے سے بندھے نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشی و غم کا پتا چلتا ہے اور ہم اسے شیئر بھی کرلیتے ہیں۔ اپنے پیغامات باآسانی دوسروں کو پہنچا دیتی ہوں۔ میں جب چاہے۔ اپنے دین کے معاملات کو۔ قرآن و حدیث کو بھی اس پر سرچ اینڈ شیئر کرتی ہوں۔ اس کے مثبت استعمال نے میری زندگی میں بہت خوشگوار اثرات مرتب کیے ہیں۔

3 2015 میں غم اور خوشی' کامیابی اور ناکامی۔ ساتھ ساتھ ہی رہیں' البتہ دو بڑے کاموں کا ضرور آغاز ہوگیا ہے۔ بڑے بیٹے کا "بی ایس" میڈیا سائنسز میں یونیورسٹی آف لاہور میں ایڈمیشن ہوگیا ہے اور الحمدللہ بیٹی نے میٹرک کرلیا۔ وہ قرآن پاک کو ترجمے کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے کا آغاز کرچکی ہے۔

سمیرا احسن (معروف آرٹسٹ)

1 بالکل جناب اسی جوش و جذبے کے ساتھ ویلکم کرتی ہوں' جس طرح بچپن میں کرتی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بچپن میں نئی کلاس' نئی بکس اور نئے یونی فارم کی خوشی ہوتی تھی۔ اور یہ بھی خوشی ہوتی تھی کہ ہم ایک سال بڑے ہوگئے ہیں' کیونکہ بچپن میں بڑے بننے کا بھی شوق ہوتا تھا۔ اب ویلکم کے ساتھ یہ جوش و جذبہ بھی ہوتا ہے کہ نئے سال میں' بہت کچھ کرنا ہے' بہت پلاننگ کرتی ہوں۔

2 انٹرنیٹ' فیس بک اور واٹس اپ نے میری زندگی میں کوئی بہت زیادہ اثرات نہیں ڈالے ہیں۔ کیونکہ میں بہت زیادہ ان چیزوں کا استعمال نہیں کرتی' ہاں واٹس اپ اور انٹرنیٹ کا مجھے فائدہ بہت ہوا ہے اس لیے کہ میری فیملی کے زیادہ تر لوگ ملک سے باہر رہتے ہیں۔ اور تم جیسے پیارے دوستوں سے بھی رابطہ رہتا ہے (شکریہ سمیرا) تو بہت اچھا لگتا ہے۔

3 تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ 2015 مجھے ہر لحاظ سے کامیابیاں دے گیا ہے۔ جناب میں نے یوں ہی امریکہ کا ویزا اپلائی کیا کہ لگ گیا تو ٹھیک ورنہ کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر بغیر کسی جدوجہد کے امریکہ کا پانچ سال کا ویزا لگ گیا۔ میں نے اس سال اپنا گھر بھی (رینیو ویشن) مرمت کروایا ہے۔

واصفہ سہیل

حوصلہ مند

امیتابھ بچن پچھلے پندرہ سال سے ہیپاٹائٹس کے مریض ہیں۔ 2000ء میں جب وہ اپنے عام چیک اپ کے لیے اسپتال گئے تو مختلف ٹیسٹس ہونے کے بعد اس بات کا پتا چلا کہ انہیں ہیپاٹائٹس بی ہے اور ان کا پچھتر فیصد جگر اس بیماری نے ختم کردیا ہے۔ بگ بی نے اس بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ آج وہ صرف پچیس فیصد جگر کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور یہ یقیناً "کوئی اچھی خبر نہیں" لیکن اچھی بات یہ ہے کہ انسان بارہ فیصد جگر کے ساتھ بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ تاہم کسی بھی شخص کو اس اسٹیج پر نہیں جانا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہوں نے ہیپاٹائٹس کا علاج بھارت میں ہی کرایا تھا اور انہیں فخر ہے کہ ان کے ملک میں اس بیماری کا علاج کرنے والے قابل ڈاکٹر موجود ہیں۔

خواہش

آسکر ایوارڈ یافتہ اداکارہ جینفر لارنس نے اپنی بلاک بسٹر فلم سیریز "ہنگر گیمز" کی چوتھی فلم "موکنگ جے پارٹ 2" میں اپنے چند ایکشن مناظر اسٹنٹ مین کے بجائے خود ہی فلم بند کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہدایت کار نے نوجوان اداکارہ کی بات مانتے ہوئے انہیں ایک سین میں دریا میں چھلانگ لگانے کے لیے کہا مگر پانی میں چھلانگ لگاتے ہی جینفر لارنس اپنا توازن کھو بیٹھیں کیونکہ دریا میں چھلانگ لگاتے وقت جینفر نے اپنے کندھے پر بارہ سے پندرہ کلو کا ترکش پہنا ہوا تھا اور ان کے ہاتھ میں تیر کمان بھی تھا' اس وزن کے باعث جینفر پانی میں گرتے ہی ڈوبنے لگیں۔ تاہم موقع پر موجود ریسکیو اہلکاروں نے فوری طور پر دریا میں کود کر اداکارہ کی جان بچالی۔ اس کے بعد اس منظر کو اسٹنٹ مین کے ذریعے ہی فلمایا گیا' کیونکہ اداکارہ سمجھ گئی تھیں کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔

بے چارگی

فہد شیخ جنہوں نے اپنے کیریر کا آغاز ہوسٹنگ سے

کیا' اب میوزک میں بھی اپنا نام بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ فہد شیخ اس بارے میں کہتے ہیں کہ ہوسٹنگ کا سفر کامیابی سے جاری تھا کہ مجھے ایکٹنگ کی آفرز آنے لگیں' میں نے ایک پرائیویٹ پروڈکشن کے ڈرامے میں کام بھی کیا مگر وہ چینل اس وقت کچھ پابندی کا شکار ہوگیا' یوں ناظرین میری اداکارانہ صلاحیتوں کو نہ دیکھ سکے۔ (تو اب دکھا دیں... بھئی صلاحیت...!) فہد شیخ کا کہنا ہے کہ میں نے میوزک کی تربیت بیرون ملک کام کرنے والے آن لائن میوزک انسٹی ٹیوٹ سے حاصل کی۔ (کیوں ملک کی صلاحیتوں پر آپ کو بھروسا نہ تھا؟) ڈیڑھ برس لگا کر میں نے اپنا میوزک البم تیار کیا جس کے لیے مجھے بہت پاپڑ بیلنے پڑے ہیں' اپنا پیسہ خرچ کرنے کے باوجود یہاں پر ڈیمانڈ کے مطابق کام نہیں کیا جاتا۔ (تو پھر کہاں کیا جاتا ہے...؟) اس لیے اپنا البم میں نے خود ہی پروڈیوس کیا۔ پاکستان میں موسیقی کے بڑے بڑے اساتذہ ہیں مگر کوئی نئے آنے والے کو نہیں سکھاتا۔ (سیکھنے کا حوصلہ بھی تو نہیں ہے نا آج کل نئے آنے والوں میں...) فہد کہتے ہیں کہ میں نے اپنا میوزک البم جدید ٹیکنالوجی پر تیار کیا ہے اور میں ایکٹنگ کے ساتھ ساتھ پروڈکشن اور ڈائریکشن کی تربیت بھی حاصل کررہا ہوں کہ یہ میرے لیے بہت ضروری ہے' کیونکہ جن لوگوں سے میں نے کام کروایا ہے۔ انہوں نے وہ کام ٹھیک سے نہیں کیے۔ پیسے پورے لیے ہیں۔ (فہد! یہ شکایت ہر ادارے سے ہی ہے سب کو... شاید آپ سے بھی ہوگی کسی کو...؟)

اِدھر اُدھر سے

معاملہ اتنا سادہ نہیں کہ حاکم وقت پر اچانک کام... کام صرف کام کی حقانیت آشکار ہوگئی ہو اور اس نے یوم اقبال کی چھٹی ختم کرنے کا اعلان کردیا ہو' بات نہیں پیچیدہ ہے۔ یہ یوم اقبال کی چھٹی کے خاتمے کا اعلان نہیں۔ یہ "اقبال کی چھٹی" کا اعلان ہے۔ یہ فیصلہ معلوم ہوتا ہے مقامی سیاست کی "بصیرت" سے

نہیں پھوٹا۔ اس کی جڑیں کہیں اور ہیں۔

(آصف محمود... نئی بات)

کراچی کی سڑکوں پر ہی ساری طبع آزمائی کیوں ہوتی ہے' کبھی کوئی قتل ہوگیا تو نمائش چورنگی بند' کوئی مطالبہ کرنا ہو تو صدر بند' اب رینجرز کی واپسی کے لیے شارع فیصل بلاک کردی گئی' یہ شہر ہے یا راستہ روکنے والوں کے لیے چراگاہ۔

(روزنامہ جسارت)

جو سلوک میرے ساتھ ہوا' وہ اس ملک کی تاریخ میں ایک سیاہ ترین باب رہے گا۔ ٹیکنالوجی میری تھی' میں لایا تھا اور پاکستان نے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا تھا اور ہم نے این پی ٹی اور این ایس جی پر دستخط بھی نہیں کیے تھے' پھر بھی ایک کم ظرف ڈکٹیٹر نے امریکی چمچہ بن کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے مجبور کرکے بیان پڑھوایا گیا کہ ملک کے مفاد میں ہے اور ملک کے خلاف ایف آئی آر کٹوادی اور خود ذلیل ہوکر چلا گیا مگر ملک کو تباہ کرگیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے پہلے سے زیادہ عزت و محبت دی ہے۔

(ڈاکٹر عبدالقدیر خان... سحر ہونے تک)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

سادہ ویجی سوپ

ضروری اشیا:

گاجر	پانچ سے چھ عدد
ہری پیاز	آدھا کپ
مرغی کی یخنی	چار کپ
سویا ساس	ایک چوتھائی کپ
ووسٹر شائر ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سوئیٹ چائینز ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سفید مرچ پاوڈر	ایک کھانے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاوڈر	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

گاجر اور ہری پیاز (باریک چوپ کرلیں) کو گرم کھولتے پانی میں ایک سے دو منٹ پکا کر چھلنی میں ڈال کر رکھ دیں اور اس کا پانی خشک کرلیں۔

ساس پین میں یخنی ڈال کر گرم کریں۔ جب اس میں ابال آجائے تو اس میں سویا ساس، ووسٹر شائر سوس سوئیٹ چائینز ساس، سفید پسی مرچ، نمک اور سیاہ پسی مرچ ڈال کر ایک سے دو منٹ پکائیں۔ اس میں ہری پیاز اور گاجر شامل کر کے دو سے تین منٹ پکائیں۔ کارن فلور تھوڑے سے پانی میں حل کر کے سوپ میں ملا کر کچھ دیر تک پکا کر اتار لیں۔ سادہ ویجی سوپ سرونگ باؤل میں نکال کر بریڈ کے ساتھ سرو کریں۔

فش چیز کباب

ضروری اشیا:

بون لیس مچھلی	ایک پاؤ
لہسن، ادرک	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	تین سے چار عدد
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
پودینے کے پتے	دس عدد
نمک	حسب ذائقہ
چیڈر چیز	سو گرام
ٹماٹر	دو عدد

ترکیب:

چوپر میں مچھلی، پسا ہوا لہسن، ادرک، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، پودینہ اور نمک ڈال کر اس کو باریک پیس لیں اور اس کے کباب بنا کر اس پر ایک ٹماٹر کا سلائس رکھیں اور اوپر سے چیز (کدوکش کی ہوئی) ڈال کر اوون میں رکھ کر 180.C ڈگری پر بیک کرلیں۔ کباب تیار ہو جانے کے بعد اس کو سرونگ ڈش میں رکھ کر گرما گرم سرو کریں۔

(اگر اوون نہ ہو تو پتیلی میں ہلکا سا تیل لگا کر کباب کے اوپر ٹماٹر اور پنیر لگا کر ڈھک دیں سا پانچ منٹ بعد اتار لیں مزے دار چیز کباب تیار ہیں)

ہڈی گڈی کا سالن

ضروری اشیا:

ہڈی گڈی	ایک کلو
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر (باریک چوپ کرلیں)	ایک عدد
لہسن کے جوے	تین عدد
ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لونگ	چھ سے آٹھ عدد
ثابت سیاہ مرچیں	چھ سے آٹھ عدد
پسی لال مرچ	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا	گارنش کے لیے

ہری مرچیں — دو عدد (باریک کاٹ لیں)
تیل — ایک چوتھائی کپ
پانی — ایک لیٹر

ترکیب :

ساس پین میں پانی' ہڈیاں گڈیاں' باریک کٹی ہوئی پیاز' ٹماٹر' لہسن' ادرک پیسٹ' لونگ' ثابت سیاہ مرچیں' پسی لال مرچ اور نمک ڈال کر پکائیں ابال آجائے تو ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر گلنے کے لیے چھوڑ دیں جب پانی خشک ہو جائے تو تیل ڈال کر مصالحہ بھون کر حسب ضرورت پانی ڈال کر گریوی تیار کر کے چولہا بند کردیں مزیدار ہڈی گڈی کا سالن تیار ہے۔ پیاز کا بگھار دے کر سرونگ ڈش میں نکالیں پھر ہرا دھنیا' ہری مرچیں ڈال کر سرو کریں۔

ٹیسٹی کوفتے

ضروری اشیا :

قیمہ — آدھا کلو
ڈبل روٹی کا چورا — ایک چوتھائی کپ
انڈا — ایک عدد
ہرا دھنیا — دو کھانے کے چمچے
کیچپ — تین کھانے کے چمچے
تیل — حسب ضرورت
پیاز — ایک عدد
لہسن — ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس — آدھا کپ
چینی — دو چائے کے چمچے
نمک — حسب ذائقہ
پسی لال مرچ — ایک چائے کا چمچہ
پودینہ — آدھی گٹھی

ترکیب :

قیمہ' ڈبل روٹی کا چورا' ہرا دھنیا' انڈا اور دو چمچے ٹماٹو کیچپ ڈال کر ملا دیں قیمہ مکس کریں۔ اس کے بعد آدھا نمک اور آدھی سرخ مرچ ملا کر اچھی طرح مکس کریں اور درمیانے سائز کے کوفتے بنا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ تیل گرم کریں۔ پیاز اور لہسن فرائی کریں۔ دو منٹ بعد نمک' لال مرچ' چینی اور کیچپ ملا کر ایک کپ پانی ڈال کر اسے آدھا گھنٹہ پکائیں۔ آدھے گھنٹے بعد اس آمیزے میں کوفتے شامل کر کے اچھی طرح بھونیں۔ دھیان رہے کہ کوفتے ٹوٹے نہیں۔ اس کے بعد معمولی مقدار میں پانی شامل کر کے پندرہ منٹ پکائیں۔ اور پانی قدرے خشک کر لیں۔ ٹیسٹی کوفتے تیار ہیں۔ گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

ملائی کھاجا

ضروری اشیا :

میدہ — دو کپ
گھی — حسب ضرورت
چینی — حسب ذائقہ یا پانچ چمچے
کھویا — آدھا پاؤ
کھانے کا سرخ اور سبز رنگ ایک چٹکی

دو کپ میدہ اچھی طرح گوندھ لیں۔ میدہ نہ زیادہ سخت ہو نہ نرم۔ روزمرہ کے روٹی کے آٹے سے تھوڑا سخت ہو۔ گندھے ہوئے میدے میں سے تھوڑا سا الگ کر کے اس میں سرخ رنگ اور مزید تھوڑا سا آٹا لے کر اس میں سبز رنگ ملا لیں۔ اب میدے کی پتلی روٹی بیل لیں۔ سرخ اور سبز آٹا بھی بیل لیں۔ سفید میدے پر بھر کے گھی لگائیں اور سبز اور سرخ پر ایک سائیڈ پر پانی لگا کر اسے سفید میدے کے اوپر چپکا دیں۔ پھر ان پر بھی گھی لگا دیں۔ اب سفید میدے کی روٹی جس پر سبز اور سرخ میدے کی پٹیاں لگائی ہوئی ہیں اسے رول کریں اور اس رول کے دو دو انچ کے ٹکڑے کاٹ لیں۔ پھر ان ٹکڑوں کو ہاتھ چپٹا کریں یہ گول ٹکیہ کی شکل کا ہو گا۔ ایک پر کھویا رکھیں اور دوسری ٹکیہ کو اس پر رکھ کر کنارے موڑ دیں۔ کڑاہی میں آدھی کڑاہی گھی ڈالیں اور انتہائی دھیمی آنچ پر ان کو تل لیں۔ الٹ پلٹ کرتی رہیں۔ سرخ ہو جائیں تو تیار شیرے میں ڈپ کر کے نکال لیں' اگر شیرے میں زیادہ دیر پڑے رہے تو نرم ہو جائیں گے۔

آپ کی شخصیت

شخصیت کی تکمیل میں جہاں خوش لباسی، شکل و صورت اور میک اپ اہمیت رکھتا ہے وہاں اپنی ذات پر مکمل اعتماد، آپ کا رہن سہن اور خوش گفتاری بھی ایک اہم حصہ ہے۔

کیونکہ یہی سب چیزیں مل کر آپ کو ایک مکمل اور بھرپور شخصیت کا روپ دیتی ہیں لیکن ان باتوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ہر انسان کی روزمرہ کی مصروفیات اور عادات اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں کیونکہ بہت سی عادتیں ایسی ہوتی ہیں جو زندگی کو نکھارتی اور سنوارتی ہیں۔ مثال کے طور پر سچ بولنے کی عادت، صاف ستھرا رہنا، ہر کام وقت پر کرنے کی عادت اور رات جلدی سونا اور صبح کو جلدی بیدار ہونا۔ یہ اچھی عادتیں انسان کی شخصیت اور اس کے ماحول پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اس کے برعکس کچھ عادتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان لاشعوری طور پر اپنا لیتا ہے اسے احساس نہیں ہوتا کہ یہ عادتیں بری ہیں جیسے چڑچڑے پن کا اظہار کرنا، ٹال مٹول سے کام لینا۔ اس کے ساتھ رہنے والے یا اس کے دوست احباب اس کی ان عادات کی وجہ سے اس سے کترانے لگتے ہیں۔

اپنی شخصیت کو نکھارنے کے لیے ضروری ہے کہ جہاں آپ خوش گفتاری کے فن سے واقف ہوں، وہاں آپ کو محفل میں بیٹھنے کے آداب بھی معلوم ہوں۔ ان باتوں کے لیے ضروری ہے۔ آپ سامنے بیٹھے شخص کے مزاج کو پہچانتے ہوں۔

اپنے مدمقابل سے اس طرح بات کریں کہ وہ آپ کی موجودگی میں بور نہ ہو رہا ہو۔

آپ صرف خود نہ بولتے رہیں بلکہ سامنے والے کو بھی بولنے کا موقع دیں۔

یعنی کسی کو متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ گفتگو کرتے وقت.... آواز دھیمی رکھی جائے کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص آپ کی بات کو آسانی سے سن اور سمجھ سکے اپنے لہجے میں نرمی رکھنی چاہیے۔

محفل میں بیٹھ کر زور زور سے بولنا، بہت زیادہ آنکھیں چلانا یا اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتے رہنا بھی آداب محفل کے خلاف ہے، جو آپ کی شخصیت پر برے اثرات ڈالتا ہے۔ کیونکہ جسمانی حرکات و سکنات اور چہرے کا اتار چڑھاؤ شخصیت پر کسی حد تک [illegible] ہے۔ اس بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنی شخصیت کو نکھارنے کے لیے آپ اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اپنی ذات کو دیں تاکہ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو آپ نے اپنائی ہیں اور جو آپ کے لیے باعث شرمندگی ہیں یا احساس کمتری کا سبب بن چکی ہیں آپ کی تھوڑی سی توجہ اور کوشش سے آپ کا اپنی ذات پر اعتماد بحال کریں گی۔ کیونکہ ضروری نہیں قیمتی لباس یا زیورات اور میک اپ ہی انسان کو منفرد اور قابل توجہ بنائیں بلکہ آپ کا اعتماد آپ کی شخصیت کا اہم ترین عنصر ہے۔ جیسے کہ کسی بھی محفل میں بہترین ملبوسات و زیورات زیب تن کیے خوب صورت خاتون کسی کونے میں الگ تھلگ [illegible] بیٹھی نظر آئے تو بہت کم لوگوں کی توجہ کا مرکز بن پاتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس معمولی خدوخال رکھنے والی سلیقے سے میک اپ کیے ہوئے پراعتماد شخصیت کی مالک خاتون بہت جلد محفل کی توجہ حاصل کر لیتی ہے۔

☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... شیزا

میک اپ .... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا